بیادِ محمود ریاض

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

مئی 2014

جلد 37 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ۔ ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

مئی کا کرن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس دارِ فانی میں جو بھی آیا ہے، اسے جلد یا بدیر واپس جانا ہے۔ آنے اور جانے کا درمیانی وقفہ جسے زندگی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے ایسے گزارتے ہیں کہ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کی حسین یادیں دل سے محو نہیں ہوتیں۔ محمود ریاض صاحب کا شمار بھی ان ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ریاض صاحب ایک عہد ساز شخصیت، صحافت کی دُنیا کا روشن باب، جنہوں نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی شمع کو فروزاں رکھنے میں گزار دی۔ وہ ایک شجرِ سایہ دار تھے جو موسم اور دُھوپ کی ساری سختیاں خود سہتا ہے اور اپنے زیرِ سایہ لوگوں کو چھاؤں اور سکون مہیا کرتا ہے۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن انہوں نے جو چراغ روشن کیے، وہ ایک جہاں میں اُجالا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم ان کے روشن کیے چراغوں کی لو مدھم نہ ہونے دیں۔ (آمین)

10 مئی کو ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین)

اس شمارے میں،

- بیادِ محمود ریاض،
- اداکارہ آغا عشنا شاہ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "ماں تجھے سلام"، شاہین رشید کا "ماں" کے حوالے سے خصوصی سروے،
- معروف کامیڈین رؤف لالہ کہتے ہیں "میری بھی سُنیے"،
- نگہت اسلم چوہدری کے اس ماہ "مقابل ہے آئینہ"،
- نبیلہ عزیز کا سلسلے وار ناول "دردِ دل" اختتامی مراحل میں،
- "شامِ آرزو"، فرحانہ ناز ملک کا دلچسپ سلسلے وار ناول،
- "زخم پھر سے گلاب ہوں"، نگہت سیما کا طویل مکمل ناول،
- "جھوٹ سچائیوں سے ڈرتا ہے" میمونہ صدف کا مکمل ناول،
- نازیہ جمال کا دلکش ناولٹ "محبت یوں نہیں اچھی"،
- "تیرے دھیان کی تیز ہوا" فرح بخاری کا ناولٹ،
- رفاقت جاوید، سلمیٰ فقیر حسین، فرحین اظفر، دیا شیرازی، تمثیلہ زاہد، طوبیٰ احسن اور رابعہ افتخار کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

موسمِ گرما میں مزے دار اچار، چٹنیاں مربے خود گھر میں بنائیں۔ اس سلسلے میں کرن کتاب "موسمِ گرما کے ذائقے" آپ کی مدد کرے گی۔ جو کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیشِ خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

تیری ذات اعلیٰ صفات ہے
تُو رحیم ہے تُو کریم ہے

تُو گمان و فہم سے دُور ہے
تیرا ذرے ذرے میں نُور ہے

تُو ہی کارسازِ جہان ہے
تیرے ہاتھ خلق کی جان ہے

ہے تیری رضا میری زندگی
تیری یاد ہے میری بندگی

تُو ہی جسم و جاں میں مقیم ہے
تیری ذات اعلیٰ صفات ہے

تیرا بندہ سالکِ بے نوا
کرے کس زباں سے تیری ثناء

کہ یہ ادنیٰ ہے تُو عظیم ہے
تیری ذاتِ اعلیٰ صفات ہے

شاہ محمد عثمان رضا

نعت رسولِ مقبول ﷺ

آئی نبیؐ کی یاد تو دل شاد کر گئی
ان کے مریضِ عشق کی قسمت سنور گئی

گھیرا ہوا تھا گردشِ ایام نے مجھے
یادِ نبیؐ یہ مشکلیں آساں کر گئی

سینے میں نور بھر گیا دل پر ہوئی جلا
نعتِ رسولِ پاک بڑا کام کر گئی

بادِ صبا دیارِ مدینہ سے آئی تھی
زلفِ نبیؐ کی خوشبو سے سرشار کر گئی

ان کی نگاہِ خاص پہ قربان جائیے
دُنیا کے پیچ و تاب سے آزاد کر گئی

بحرِ معصیت میں جو پھنس گئی کبھی
ان کے کرم سے ڈوبتی کشتی اُبھر گئی

سالک سیاہ تھے میرے اعمال تو مگر
فردِ عمل کچھ ان کے کرم سے سنور گئی

شاہ محمد عثمان رضا

زندگی جن کے تصور سے

مہناز عرفان

بہت ماہ و سال گزرے جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا۔ اپنی دوستوں کے ساتھ میں جامع کلاتھ مارکیٹ میں تھی اور رعنا نے واپسی پر بتایا تھا یہاں اورنگ زیب مارکیٹ میں خواتین ڈائجسٹ کا آفس ہے۔ ان دنوں بڑے ذوق و شوق سے ڈائجسٹ اور رسالے پڑھے جاتے تھے۔ حال یہ تھا کہ کلاس میں بیٹھے ہیں۔ گود میں ڈائجسٹ یا رسالہ ہے۔ لیکچر سننے کی آڑ میں افسانے پڑھے جاتے۔ اسی عالم شوق میں رائٹرز اور ڈائجسٹ سے متعلق لوگ بہت انوکھے لگتے، ملنے کو دل کرتا تھا اور جب رعنا نے بتایا، سامنے خواتین ڈائجسٹ کا آفس ہے تو آفس دیکھنے اور ملنے کا شوق بیدار ہوگیا۔ لہٰذا آفس جا پہنچے، ایک چھوٹا سا نیم تاریک کمرہ جابجا کتابوں اور مسودات کا ڈھیر اور ایک کالے صوفے پر وہ بھی موجود تھے، کسی نے تعارف کرایا۔

"یہ محمود ریاض ہیں۔ ابن انشا کے بھائی"۔

"ابن انشا کے بھائی۔" میں ذرا چونکی اور ان پر نظریں جما دیں۔ ملگجے کپڑے، سرخ آنکھیں اور بکھرے بال۔ میں اداس ہوگئی۔ ان ہی دنوں ان کا انتقال ہوا تھا اور ان ہی کے غم میں محمود ریاض صاحب کا حال بے حال تھا۔ انہوں نے کوک منگوا کر ہماری تواضع کی تھی اور یہ محمود ریاض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

کچھ عرصہ گزرا۔ ایک دن خواتین ڈائجسٹ میں نئے لکھنے والوں کو کہانی لکھنے کی دعوت دی گئی تھی اور اس پر انعام بھی ملنا تھا۔ پتا نہیں وہ ترغیب کا اثر تھا یا انعام کا لالچ، بس دل مچل اٹھا تھا کہ کہانی لکھنی ہے اور پھر اسی وقت بیٹھ کر اک نشست میں کہانی لکھ ڈالی

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے

زندگی ایک خوب صورت احساس جو رواں دواں اور اجل ایک بھیانک سایہ جو اس کے تعاقب میں۔ جانے کون، کب کہاں اس تعاقب کی بھینٹ چڑھ جائے۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گا، حیات ہے تو موت بھی ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج تم، کل ہماری باری ہے

زندگی کی شام ہو جائے تو جانے والے چلے جاتے ہیں، مگر پیچھے رہ جانے والوں کے ارد گرد اندھیرا پھیل جاتا ہے اور دکھ اور اداسی کے اس اندھیرے میں کچھ لمحے، کچھ ساعتیں روشن ہو رہی ہیں۔

تھی۔

محمود ریاض سے جب ملاقات ہوئی تھی تو وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے تھے کہ ہمیں لکھنے کا شوق ہے انہوں نے ہماری حوصلہ افزائی بھی کی تھی کہ اگر ہم کہانی لکھنا چاہیں تو وہ شائع کریں گے۔ یہ بات بھی ذہن میں تھی، بہرحال کہانی بھیجی جو شائع ہوئی اور اس پر انعام بھی ملا۔ انعامی رقم کے ساتھ ریاض صاحب کے ریمارکس بھی تھے اور بس یہ انعام حوصلہ افزائی کر گیا کہ مزید کہانیاں بھی لکھی جاسکتی ہیں اور یہ گویا ابتدا تھی خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے اور وہاں آنے جانے کی۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کردیا۔ تقریباً" ہر ماہ کہانی لکھتی اور خود ہی اسے آفس پہنچاتی۔ اب وہ تاریک کمرا نہیں تھا۔ بلکہ ریاض صاحب کا خوب صورت سا آفس تھا۔ جب میں اس نئے آفس میں پہلی بار ان سے ملی تو شاید وہ بھول بھی چکے تھے کہ میں ایک بار اپنی دوستوں کے ساتھ ان سے مل چکی ہوں، لیکن وہ بڑے مہربان انداز میں ملے اور جب پتا چلا میری کہانی انعامی کہانی تھی تو بہت خوش ہوئے اور مزید حوصلہ افزائی کی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ ایک نئی قلم کار کے ساتھ پہلی بار مل رہے ہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہر رائٹر کے ساتھ بلکہ اپنے آفس میں کام کرنے والے تمام ہی لوگوں کے ساتھ بے تکلف اور کمال مہربانی سے ملتے تھے۔

ہر ماہ میری ان سے ملاقات ہوتی تھی، امتل سے گپ شپ چلتی اور پھر ریاض صاحب کے پاس بیٹھ کر ڈھیروں باتیں ہوتیں، میں جب بھی جاتی آفس میں کوئی نہ کوئی موجود ہوتا تھا۔ ذرا سا دروازہ کھول کر میں سر آگے بڑھا کر جھانکتی، تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ میں آئی ہوں، میری بہن فلک ناز میرے ساتھ ہوتی تھی۔ جسے وہ ہمیشہ پیار سے فلک کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی عادت تھی ہمیشہ کوک یا آئس کریم منگوا کر تواضع ضرور کرتے تھے۔ حالانکہ میں منع کرتی تھی، مگر ان کا اصرار ہوتا تو خاموش ہونا پڑتا۔

خواتین ڈائجسٹ کے آفس آنا میرے لیے ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ رہا۔ امتل اور دوسری لڑکیوں سے دوستانہ گفتگو چلتی تو پھر کسی نہ کسی رائٹر کی موجودگی بھی بھلی لگتی، کیونکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ریاض صاحب کی اپنی شخصیت وہ ہمیشہ ایک شفیق بزرگوار اور پرخلوص دوست کی طرح نظر آتے۔ میری حوصلہ افزائی کرتے ان کا خلوص اور مہربان انداز ہی تھا جو مجھے مزید لکھنے کی ترغیب دلاتا اور جب ایک بار مجھے شوق ہوا کہ میں بھی کسی کا انٹرویو لوں تو انہوں نے فوراً" اس کو سراہا تھا اور ڈرائیور اور گاڑی کی خدمات پیش کردی تھیں۔ فیصلہ جاوید میاں داد سے انٹرویو کا ہوا تھا، اب یہ اور بات تھی کہ وہ انٹرویو کبھی لیا ہی نہیں جاسکا۔ بات یہ تھی کہ اس دن اچانک کسی ایمرجنسی کے تحت میاں داد کو لاہور جانا پڑ گیا تھا اور جتنے ذوق و شوق سے انٹرویو کرنے کا شوق چڑھا تھا اتنی ہی تیزی سے پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ بھی گیا۔ اسی ایک ناکامی سے۔ حالانکہ ریاض صاحب جوش

ولاتے رہے تھے۔
آفس میں عموماً" ان کے ملنے والے آتے ہی رہتے تھے اور وہ بڑا لہک کر تعارف کراتے۔ "بھئی یہ ہیں ہماری مشہور رائٹر ممتاز عرفان" اور میں نروس سی ہوجاتی۔
میں بہت سہمی ہوئی ڈرپوک سی لڑکی تھی اور وہ کہتے "بہادر بنو' لوگوں سے ملو جلو' اپنی شخصیت بناؤ۔"
میں مسکرا کر رہ جاتی۔ اکیلے کہیں آنا جانا میرے بس کا تو نہیں تھا۔ خوف آتا تھا' وہ فکر مند سے ہوجاتے۔
کہتے۔ "تم اکیلے نکلا تو کرو۔"
میں کہتی۔ "مجھے خوف سے کچھ ہوگیا تو۔"
عموماً" وہ مجھے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کو دیتے رہتے تھے۔ اسی طرح میں نے بہت سی کتابیں ان سے لے کر پڑھیں' ورنہ خرید کر پڑھنا آسان نہ تھا اور جب پہلی بار انہوں نے "اس بستی کے ایک کوچے میں" مجھے گفٹ کی تو میں بہت خوش ہوئی تھی۔ جیسے اسکول میں اپنی مہربان ٹیچرز کے تھوڑے سے التفات پر' وہ بھی ایک مشفق ٹیچر کی طرح ہی تھے۔ کبھی کبھی کسی بات پر بحث بھی ہوجایا کرتی تھی اور کبھی کبھی میں ان کو مشورے بھی دیا کرتی اور وہ مسکراتے ہوئے سنتے رہتے۔

پھر انہوں نے رائٹرز کے اعزاز میں ایک تقریب رکھی۔ ان کے گھر چاند نگر کی بڑی سی چھت پر یہ تقریب منعقد ہوئی۔ مل بیٹھنے کا موقع ملا۔ اس دن ریاض صاحب بھی ہم سب کے بیچ بیٹھ کر باتیں کرتے' ہنستے ہنساتے رہے۔ کبھی کبھی واپسی میں وہ ہمیں گھر بھی ڈراپ کردیا کرتے تھے' کیونکہ ہمارا گھر ان کے گھر کے راستے میں ہی پڑتا تھا۔
جانے کتنے یادگار لمحے ہیں' کتنی بہت سی یادیں ہیں جو ذہن کی اسکرین پر روشن ہیں۔ کتنی بہت سی یادوں کے کنکر ہیں' جو ماضی کی جھیل میں گر کر دائرے بنا رہے ہیں اور یہ دائرے پھیل کر وسیع ہو رہے ہیں۔
کتنے موسم بیتے' کتنے ماہ و سال گزرے' پہلے لاڈلے بیٹے بابر کا انتقال ہوا۔ وہ ٹوٹ گئے' پھر خاور بھی ساتھ چھوڑ گئے تو وہ بالکل بکھر گئے' پتا چلا آفس بھی بہت کم آتے ہیں۔
یادوں کا ایک ریلا ہے جو میری ذات کو گھیرے ہوئے ہے اور آنکھوں کے سامنے وہی ہنستا مسکراتا چہرہ ماتھے پر بکھرے بال' چمک دار آنکھیں اور میں فقط دعا ہی کرسکتی ہوں' خدا غریق رحمت کرے۔

ماں تجھے سلام

شاہین رشید

عورت خدا کی حسین تخلیق ہے اور عورت کے دو روپ تو بہت ہی خوب صورت ہیں۔ ایک ماں' جس کے پیروں تلے اللہ تعالیٰ نے جنت رکھ دی اور ایک بیٹی جس کو اپنی "رحمت" قرار دیا۔ دنیا میں سب رشتے غرض کے ہوتے ہیں لیکن ماں کا رشتہ بغیر کسی غرض کے ہوتا ہے۔ دنیا جہاں کی تکالیف اٹھا کر بھی شکوہ زبان پر نہیں لاتی۔ ماں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دے لے۔ بچوں کی زبان پر کوئی نہ کوئی شکایت ضرور رہتی ہے گو کہ یہ شکوہ پیار بھرا ہی ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے۔
ہم نے مدرز ڈے کے موقع پر ایک سروے کیا ہے کہ۔
"کیا آپ کو اپنی ماں سے کوئی پیار بھرا شکوہ ہے؟ ان کا غصہ' ڈانٹ' کوئی روک ٹوک' کیا بات پسند نہیں ہے؟"
آئیے دیکھیں معروف شخصیات نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے۔

منشا پاشا۔ (آرٹسٹ)

بے شک بڑے بھی غلطیاں کرتے ہیں لیکن الحمدللہ مجھے اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں' کیونکہ میری ماں نے ہمیشہ مجھے سپورٹ کیا ہے اور شکوہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی آپ سے زبردستی کام کروائے یا اپنی بات منوائے۔
میری شادی بھی میری پسند سے ہوئی' میرے شوہر میرے کالج فیلو تھے۔ امی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تو جو ماں اتنا خیال رکھے اپنی بیٹی کا اس سے بھلا کیا کبھی شکوہ ہوسکتا ہے۔

جنید خان۔ (آرٹسٹ)

مجھے اپنی ماں سے ایک ہی شکوہ ہے کہ انہوں نے اتنا نرم دل ہونے کی تربیت کیوں کی' کیونکہ نرم دل انسان ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتا ہے میں نے اپنی زندگی

میں اپنی ماں سے زیادہ نرم دل' خیال رکھنے والا' صابر اور میٹھی آواز رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ لیکن یہ شکوہ نہیں' پیار کا اظہار ہے' میں شکر گزار ہوں اس رب کا جس نے مجھے ایسی ماں دی' جس نے ہمیشہ پیار کرنا' درگزر کرنا' معاف کرنا' دوسروں کا خیال رکھنا سکھایا۔
مجھے اپنے والدین سے بہت محبت ہے اور میں ان ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں اور میں ان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔

سعدیہ خان۔(آرٹسٹ)

ماں سے ایک ہی شکوہ ہے کہ وہ روک ٹوک' ڈانٹ ڈپٹ اور غصہ کیوں نہیں کرتیں۔ وہ اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئیں' کاش وہ ہمارے درمیان ہوتیں تو پیار بھی کرتیں' غصہ بھی کرتیں روک ٹوک تو کرتیں اپنی موجودگی کا احساس دلاتیں' میں ان کے پاس بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرتی۔ وہ نہیں ہیں تو کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔

یاسر نواز۔(اداکار)

میری ماں صبح صبح بہت چڑچڑی ہوتی ہیں۔ میں ان کے کمرے میں 1 بجے جاتا ہوں جب وہ مکمل طور پر جاگ چکی ہوتی ہیں۔ اگر ایک بجے سے پہلے چلا جاؤں

تو بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔ کسی نہ کسی بات پر' خواہ وہ بات بہت چھوٹی ہی کیوں نہ ہو' بس میری ماں سے ملنے کا ٹائم ایک بجے سے شروع ہوتا ہے۔ اور انہیں کتنا ہی کیوں نہ سمجھالیں کہ آپ صبح صبح کیوں غصہ کرتی ہیں مگر انہوں نے کرنا وہی ہوتا ہے جو ان کا من چاہتا ہے وہ اس بات کو مان بھی جاتی ہیں کہ ہاں واقعی میں صبح صبح تم لوگوں پر غصہ کرتی ہوں' مگر صرف ماننے کی حد تک۔ اگلی صبح پھر ویسی ہی ہوتی ہیں۔ مگر میں اس بات سے خوش ہو جاتا ہوں کہ چلو ایک بجے کے بعد میری ماں صبح والی ماں نہیں ہوتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ بچے اسکول میں ہوتے ہیں۔ بیوی شو میں ورنہ تو سب کی شامت آجاتی۔

رز کمالی۔(آرٹسٹ)

ماں کی روک ٹوک کبھی کبھار لگتی ہے' مگر یہ بھی پتا ہے کہ وہ جو کہتی ہیں ہمارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہیں' اس میں ہم بچوں کی ہی بھلائی چھپی ہوئی ہوتی ہے کہیں نہ کہیں۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ پوری دنیا میں ماں سے زیادہ مخلص کوئی ہستی نہیں ہے' بس دعا یہ ہے کہ میری ماں کی ہر دعا جو وہ ہمیشہ اپنے بچوں کے لیے مانگتی ہیں اللہ تعالیٰ قبول کرے اور ہماری بھی اس دعا کو

قبول کرے کہ ہمارے والدین کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے ہمیشہ۔

اختر حسین (آرٹسٹ)

دنیا میں ماں سے بڑھ کر کوئی نعمت ہے ہی نہیں۔
مجھے اپنی ماں سے صرف ایک ہی شکوہ ہے کہ وہ اپنا خیال نہیں رکھتیں' اپنی صحت کا نہ اپنے کھانے پینے کا' میں ان کی صحت کے لیے بہت فکر مند رہتا ہوں۔
میری ماں نے کبھی ہمیں ڈانٹا نہ ہی کبھی کسی قسم کی روک ٹوک کی۔ ان کی تربیت ہی ایسی تھی ہم بگڑے نہیں۔

عدیل رزاق۔(صحافی' ڈرامہ رائٹر)

ماں سے دو شکوے ہیں' ایک تو یہ کہ وہ قائداعظم کے قول "کام کام اور صرف کام" کو کبھی تو بھول جایا کریں اور کبھی تو آرام کرلیا کریں۔
دوسری یہ کہ گھر سے سامان نہیں نکالتیں تو کوئی بات نہیں' سامان میں سے گھر ہی نکال دیں' روک ٹوک نہیں کرتیں۔ غصہ اور ڈانٹ ماں کے اندر محبت اور دعا کی طرح ہوتی ہیں اور جو ماں اپنی اولاد کے لیے ہر وقت دعائیں مانگتی ہے اور جس طرح ہمیں ان کی محبت اور دعائیں چاہئیں اسی طرح ان کے غصے اور ڈانٹ کو بھی فراخ دلی سے قبول کرنا چاہیے۔

مومل شیخ۔(آرٹسٹ)

سچ بات ہے اس میں بالکل بھی ملاوٹ یا بناوٹ نہیں ہے کہ مجھے اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ہماری تربیت جس انداز میں کی اور جتنی ہمارے لیے قربانیاں دیں وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم تو اپنی ایک زندگی دے کر بھی اپنی ماں کا احسان نہیں اتار سکیں گے۔ مجھے تو میری ماں اگر آدھی رات کو بھی کسی کام کے لیے آواز دیں گی تو میں بھاگ کر ان کے

پاس جاؤں گی۔

مدیحہ رضوی۔ (آرٹسٹ)

مجھے اپنی ماں سے کوئی شکوہ نہیں' اور ماں تو مجسم پیار ہوتی ہے۔ وہ عجیب بچے ہوتے ہیں جو اپنی ماں سے شکایت کرتے ہیں' ماں باپ تو ساری زندگی اپنی اولاد کو دے دیتے ہیں' اور پھر بھی ان سے شکایتیں کرنا بہت ہی بے وقوفوں والی بات ہے تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہے' اتنی مشکل سے پال پوس کر بڑا کرتے ہیں' ہمیں اور بڑا مشکل ہوتا ہے اولادوں کو سنبھالنا' ان کی اچھی تربیت کرنا' میں اپنی ماں سے تو شکوہ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

شکیل الدین۔ (FM 93 ریڈیو پاکستان کراچی)

مجھے اپنی امی سے کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا' ان کی محبت کی کوئی حد ہی نہیں ہے' رات دن کا کوئی لمحہ بھی اپنی اولاد کی محبت ان کی فکر سے خالی نہیں' میں بچپن میں بہت بیمار ہوا تو رات رات بھر جاگ کر دیکھ بھال کی بس شکوہ یہ ہے کہ ظاہری طور پر کبھی لپٹا کر اور چمٹا کر پیار نہیں کرتیں' ان کا اپنا منفرد اسٹائل ہے پیار کا' وہ دیگر ماؤں کی طرح پیار محبت کا اظہار بالکل بھی نہیں کرتیں بلکہ اگر ہم محبت میں آکر چمٹ جائیں تو علیحدہ کردیتی ہیں۔ ماں کی کوئی بات ناپسند نہیں ہے' انہوں نے کبھی روک ٹوک اور غصہ نہیں کیا؟ ہاں ضد کرنے پر پٹائی ضرور کی ہے اور ہاں ایک بات پسند نہیں کہ اپنا خیال نہیں رکھتیں اور بیمار ہونے کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتیں خواہ کتنا ہی سر پٹخ لوان کے آگے۔

یمنی زیدی۔ (آرٹسٹ)

بے حد پیار ہے مجھے اپنی ماں سے' میری زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہی وہ ہیں اور ان کی جگہ کوئی لے ہی نہیں سکتا اور شکایت ان سے یہ ہے کہ جب کسی پبلک

پلیس میں ان کا پیار سے ہاتھ پکڑلوں یا کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چلوں تو وہ منع کردیتی ہیں لیکن مجھے ان کا ہاتھ پکڑ کر چلنا اچھا لگتا ہے۔ ایک تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

دانش نواز۔ (ڈائریکٹر + رائٹر)

' ماں سے بہت پیار ہے مجھے اور یہ پیار ہی تو ہے کہ

جب وہ ڈانٹتی ہیں یا غصہ کرتی ہیں یا کبھی کبھار چڑچڑی ہوجاتی ہیں تو مجھے برا نہیں لگتا بلکہ اس ڈانٹ اور غصے میں بھی ان کا پیار جھلکتا ہے۔ انہوں نے بڑے پیار سے ہماری پرورش کی ہے۔ تربیت کی ہے۔ آج وہ اگر اپنی بزرگی کی وجہ سے تھوڑا غصہ کرلیتی ہیں تو ہمیں برا نہیں منانا چاہیے۔

محمد تقی۔ (آرٹسٹ)

ماں سے شکایت؟... جی بالکل ہے مجھے' میری ماں

میری شادی کرانا چاہتی ہیں جبکہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی بس اس بات پر تکرار ہوجاتی ہے' میں ان سے کہتا ہوں کہ بس ایک سال صبر کرلیں۔ مجھے کچھ کمالینے دیں' مگر ان کی ضد برقرار ہے' مگر دیکھیں کہ اس میں بھی ماں کا پیار چھپا ہوا ہے۔

صدف عمیر (آرٹسٹ)

ماں بہت پیار محبت سے اولاد کو پالتی ہے۔ اس کی روک ٹوک اور غصے میں بھی پیار ہوتا ہے' مگر جب بچے بڑے ہوجائیں تو پھر انہیں روک ٹوک تھوڑی بری لگتی ہے' تو میں بھی اپنی ماں سے یہی کہوں گی کہ اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔ ہماری شادی ہوگئی ہے' بچے بھی بڑے ہورہے ہیں تو اب روک ٹوک نہ کیا کریں۔ کیونکہ ہم اچھا برا سمجھنے لگے ہیں اور اس لیے میں اپنے بچوں کو زیادہ روکتی ٹوکتی نہیں ہوں کہ جس طرح ہمیں احساس ہوتا ہے انہیں بھی ہوتا ہوگا۔ بس یہی ایک شکایت ہے ورنہ ماں کی محبت چاہت کا تو اس دنیا میں کوئی نعم البدل ہی نہیں ہے۔

آغا فیضان۔ (پریزنٹر FM 100)

مجھے اپنی ماں سے وابستہ ہر ناراضی' ہر غصہ اور ہر روک ٹوک بہت اچھی لگتی ہے کیونکہ اس میں بھی ان کی محبت اور ممتا ظاہر ہوتی ہے' ہاں شکوہ یہ ہے کہ وہ میری حد سے زیادہ فکر کرتی ہیں اور میری وجہ سے اپنے آپ کو ٹینشن میں رکھتی ہیں۔

مصطفیٰ چوہدری (آرٹسٹ)

ماں سے کوئی شکایت نہیں اور کیوں کریں؟ وہ جو کچھ کرتی ہیں ہمارے مفاد کے لیے کرتی ہیں اور ہم کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوجائیں ان کے لیے بچے ہی رہیں گے اور وہ بھی ہمیں چھوٹے بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی ہیں تو مجھے اپنی ماں کی ہر بات پسند ہے خواہ وہ ان کا غصہ ہو' ڈانٹ ہو یا روک ٹوک' سب میں ان کا پیار شامل ہوتا ہے۔

عدیل اظہر۔ (ریڈیو پریزنٹر)

میری ماں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور وہ مجھ سے اتنا زیادہ پیار و محبت کرتی ہیں کہ ان کو مجھ میں کوئی خامی نظر ہی نہیں آتی۔ "امی کاش آپ تھوڑی تنقید کرنے والی بھی ہوتیں۔" بس اس کے علاوہ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔

صبا قمر۔ (آرٹسٹ+ہوسٹ)

ماں سے کیا شکایت کروں' سوائے اس کے وہ کبھی کبھی بھائیوں کی فیور کرجاتی ہیں اور انہیں زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ بس اور کچھ نہیں کہنا۔ میری ماں نے ہم سب کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں کیونکہ میرے والد کا انتقال میری کم عمری میں ہی ہوگیا تھا۔ پھر ماں نے ہی ہماری پرورش کی' اگرچہ میرے سوتیلے والد نے بھی

ہمارے لیے بہت کچھ کیا' مگر پھر بھی ماں' ماں ہی ہوتی ہے۔

صائمہ قریشی۔ (فنکارہ)

ہر اولاد کی طرح مجھے بھی اپنی ماں سے بہت پیار ہے' کیونکہ وہ ہستی ہی ایسی ہے کہ جس سے پیار کیا جائے' ماں کا اپنی اولاد پر حق ہوتا ہے' مگر وہ جب بڑی ہوجائے تو پھر یہ ریلائز کرنا چاہیے کہ اب اولاد اپنے فیصلے خود کرسکتی ہے۔ امی بہت اچھی ہیں مگر ان سے یہی شکایت ہے کہ وہ ہر بات میں interfere کرتی ہیں۔ بس یہی بات مجھے پسند نہیں ہے۔

فیضان خواجہ۔ (آرٹسٹ)

نہیں جی مجھے اپنی ماں سے کوئی شکایت نہیں' کیونکہ انہوں نے کبھی شکایت کا موقع دیا ہی نہیں۔

غزالہ عزیز (رائٹر)

میری امی کا انتقال ہوچکا ہے' ان سے مجھے ان کی زندگی میں کوئی شکایت نہیں تھی تو اب کیا ہوگی' وہ بہت جلدی ہمارا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ آج زندہ ہوتیں اور مجھے اس مقام پر دیکھتی تو بہت خوش ہوتیں۔ انہیں بھی لکھنے کا بہت شوق تھا اور میرے لیے بھی وہ دعا کرتی تھیں' ان کی اس خواہش کو میں نے پورا کیا' مگر وہ میری کوئی کامیابی نہیں دیکھ سکیں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے (آمین)

سہیل سمیر۔ (آرٹسٹ)

ہاں مجھے اپنی ماں سے شکایت ہے کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر اتنی جلدی اوپر کیوں چلی گئیں۔ خدا میری ماں کے درجات بلند کرے' آج وہ حیات ہوتیں تو میں ان کی خدمت کرتا۔

تنویر آفریدی۔ (گلوکار)

نہیں ماں سے کوئی شکایت نہیں' بلکہ ان کو حق ہے کہ وہ ہم سے ہزار گلے کریں' شکایتیں کریں کیونکہ جن مسائل اور تکلیفوں سے انہوں نے ہماری پرورش کی' ہم بہترین وسائل کے باوجود ان کی ایک رات کی خدمت کا احسان نہیں اتار سکتے۔

آغا عشنا شاہ سے ملاقات

شاہین رشید

"جب میں نے پہلی بار عشنا شاہ کو اسکرین پہ دیکھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لڑکی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے گی۔ کیونکہ اس میں بہت ٹیلنٹ چھپا ہوا ہے جو جیسے جیسے باہر آئے گا اس کی ڈیمانڈ بڑھتی جائے گی۔ اور اب آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے کہ ہر دوسرے ڈرامے میں عشنا نظر آرہی ہوتی ہیں۔ آج کل آپ عشنا کو "میں گناہ گار نہیں" "رخسار" "بشر مومن" اور "شہر یاراں" میں دیکھ رہے ہیں۔

* "جی عشنا کیسی ہیں؟ ماشاء اللہ بہت اچھی پرفارمر ہیں۔ خاص طور پر "شہر یاراں" میں اور دیگر ڈراموں میں آپ کے رونے کی اداکاری بہت خوب ہوتی ہے؟"

★ "جی میں ٹھیک ہوں۔ اور آپ کو میرے رونے کی اداکاری پسند ہے؟ او گاڈ۔ آج کل رونے دھونے والے کردار کچھ زیادہ ہی کر رہی ہوں۔ "بشر مومن" تو آپ دیکھ ہی رہی ہوں گی' یہ تو کافی بڑا پروجیکٹ ہے اور فیصل بھائی کے ساتھ کام کرنے میں بہت مزا آرہا ہے' بہت ہی اچھے انسان ہیں وہ۔"

* "پہلا پروجیکٹ کیا تھا آپ کا؟"

★ "پہلا پروجیکٹ "آگ" تھا جو میں نے جمال شاہ صاحب کے ساتھ کیا تھا وہ پی ٹی وی پہ آن ایر آیا تھا۔"

* "سب میں اپنے رولز سے مطمئن ہیں؟"

★ "جی بالکل۔ بہت اچھے ہیں رولز میرے کوئی ایک دوسرے سے ملتا ہوا نہیں ہے' خواہ وہ "بشر مومن" "شہر یاراں" یا "رخسار" ہو' "گناہ گار" ہو تو میں بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے خیال سے اچھی طرح اسکرپٹ کا مطالعہ کر کے کردار پسند کرتی ہوں۔"

* "ہوں' گڈ۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں' پھر فیلڈ کی طرف آتے ہیں؟"

★ "جی جی ضرور۔ میرا پورا نام آغا عشنا شاہ ہے' والد کا نام آغا قزلباش ہے اور والدہ کا نام عصمت طاہرہ ہے۔ میرے پیار کے بہت سے نام ہیں' جس کو جتنا پیار آتا ہے وہ اسی حساب سے بلاتا ہے ویسے زیادہ تر "عشی' عشو" کہہ کر ہی بلاتے ہیں' میں 12 فروری کو لاہور میں پیدا ہوئی' کینیڈا میں پلی بڑھی اور وہیں سے تعلیم بھی حاصل کی اور وہاں ایک سال "سکھوں" کے ریڈیو پہ بھی کام کیا اور سکھوں کی پنجابی کینیڈا میں ہی سیکھی اور ہم چھ بہن بھائی ہیں' سب سے بڑی ارسہ غزل اور سب سے چھوٹی میں ہوں۔"

* "گڈ۔ عصمت طاہرہ صاحبہ تو اپنے زمانے کی

معروف آرٹسٹ رہ چکی ہیں انہوں نے اس فیلڈ کو کیوں خیرباد کہہ دیا؟"

★ "اب ان شاء اللہ جلدی ہی آپ ان کو اسکرین پہ دیکھیں گی اور امی تو خیر ماں کے رول ہی کریں گی۔ میری بڑی بہن ارسہ غزل بھی اب تو ماں کے ہی رول کر رہی ہیں۔"

* "مجھے آج بہت اچھا لگ رہا ہے آپ سے بات کر کے کہ ماشاء اللہ آپ کی فیملی میں سب ہی بہت اچھے فنکار ہیں اور آپ خود بھی۔ آپ کا ایک سیریل تھا "خوابوں کا دیا" اس میں آپ نے بہت کرانسس دیکھے' اگر آپ کے ساتھ سچ میں ایسا ہوتا تو کیا اس طرح ہینڈل کر لیتیں؟"

★ "ہاں کر لیتی' مگر والدہ کے تعاون کے ساتھ' کیونکہ جو ڈرامے میں میری والدہ دکھائی گئی تھیں ان سے بہت مختلف ہیں میری والدہ' اور اللہ کا شکر ہے کہ زندگی میں ایسے کوئی کرائسس نہیں آئے۔"

* "کیا بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا؟"

★ "بالکل جی' اداکاری تو ماشاء اللہ ورثے میں ملی ہے اور اداکاری کے ساتھ ساتھ مجھے لکھنے کا بھی شوق ہے اور ڈائریکشن کا بھی شوق ہے اور ان شاء اللہ فیوچر میں یہ سب کام ضرور کروں گی۔"

* "اور اگر شادی ہو گئی تو پھر تو سب کچھ چھوڑنا پڑے گا؟"

★ "نہیں جی' ابھی تو کیریئر کا آغاز ہوا ہے' ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے یہاں یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ شادی کے بعد خواتین کا کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں۔"

* "آپ اس فیلڈ میں تھوڑا لیٹ نہیں آئیں؟"

★ "بچپن میں جب ماما کے ساتھ پی ٹی وی جاتی تھی تو ایک چھوٹا موٹا رول مجھے ماما کروا دیا کرتی تھیں۔ ایسے ہی شغل کے طور پر' اور جب چھ سال کی تھی تو ریڈیو پہ پہلا شو کیا' ماما نے ہمیشہ کہا کہ پہلے پڑھائی ختم کرنی ہے جب میں کینیڈا میں تھی تو میں نے انہی کے سرکل میں رہ کر کچھ مارننگ شو کیے۔ تو جناب میں نے کیریئر کا آغاز 21 سال کی عمر سے کیا اور میرا نہیں خیال کہ میں لیٹ آئی ہوں۔"

* "کینیڈا سے پاکستان آکر کیسا لگا؟ اچھا یا برا؟"

★ "پاکستان آکر بہت Change لگا' مجھے پاکستان سے بہت محبت ہے کیونکہ میں یہاں پیدا ہوئی' زندگی کے چار پانچ سال گزارے' پھر یہاں سے ہی او لیول کیا' پاکستان میں میرا گھر ہے' لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ یہاں آکر تھوڑی سی مشکل ہوئی کیونکہ مجھے عادت ہے اصولوں پر چلنے کی' قوانین کے تحت چلنے کی' مگر یہاں سب ماہر ہیں دھجیاں اڑاتے ہیں۔"

* "شوبز کی دنیا کیسی لگ رہی ہے؟ کوئی برائی نظر آتی ہے؟"

★ "بہت زیادہ نظر آتی ہے اور مزا بھی آرہا ہے کام کرنے کا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنے بچپن یا لڑکپن سے دیکھ رہے ہوتے ہیں' پھر آپ ان کے فین بن جاتے ہیں اور آپ کے ذہن میں ہوتا ہے کہ یہ بہت سینئر رائٹر' ڈائریکٹر اور ایکٹر ہیں اور ان کے

لیے آپ کے دل میں بہت عزت بن جاتی ہے لیکن جب آپ ان سے ملتے ہیں تو پھر دل کو تھوڑا دکھ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایسے ہیں؟؟ تو اگر شوبز بدنام ہے تو اس وجہ سے بدنام ہے برائیاں تو ہیں اور وہ مجھے نہیں کرنی چاہئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جتنی اچھائیاں میں نے دیکھی ہیں جتنے اچھے لوگ دیکھے اور جتنے میں نے دوست بنائے ہیں تو یہ اچھائیاں برائیوں پر حاوی ہو گئی ہیں۔"

٭ "نئی لڑکیاں جن کی کوئی واقفیت نہیں ہوتی اس فیلڈ میں انہیں مشکل ہوتی ہے یا ٹیلنٹ کو دیکھا جاتا ہے؟"

★ "میرے لیے اس فیلڈ میں آنا بہت آسان رہا نئی لڑکیوں کے لیے واقعی بہت مشکل ہوتا ہے اپنے آپ کو منوانا' اپنی جگہ بنانا۔ ان کو بہت کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔ تو میری ماں' بہن اور بھائی جو کہ ڈائریکٹر ہے تو ان کی وجہ سے میرے لیے سارے کام آسان ہوتے گئے' جو عزت مجھے ملی وہ عموماً" نئی لڑکیوں کو شروع شروع میں بالکل نہیں ملتی۔"

٭ "گھر میں سب سے چھوٹی ہیں تو لاڈلی ہیں؟"

★ "لاڈلی تو خیر ہوں' لیکن چونکہ سب سے چھوٹی ہوں تو میرے بڑے' بہن بھائی بڑے' بہن بھائی کم اور ماں باپ زیادہ ہیں۔ تو ہر کوئی اپنے حساب سے نصیحت اور ہدایات دے رہا ہوتا ہے کہ یہ نہیں کرنا' یوں نہیں کرنا' وغیرہ وغیرہ۔ میں جتنی بھی بڑی ہو جاؤں ان کے لیے چھوٹی ہی رہوں گی۔ اور میری طبیعت میں تھوڑا ضدی پن بھی ہے۔"

٭ "کبھی کسی نے کہا کہ عشنا فلاں سیریل میں پرفارمنس اچھی نہیں تھی یا فلاں میں بہت عمدہ تھی؟"

★ "نہیں ایسا کچھ نہیں کہتے' لیکن مجھے فضول کی تعریف بھی پسند نہیں ہے اور فضول کی تنقید بھی برداشت نہیں ہے' مجھے پوزیٹو تنقید پسند ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے برا کام کیا تو مجھے بتائیں کہ میں نے کہاں اور کیسے برا کام کیا اور تعریف کریں تو بتائیں کہ کیا بات زیادہ اچھی لگی' کہاں میری پرفارمنس میں جھول تھا۔"

٭ "گھر میں سب سے زیادہ کون پسند کرتا ہے آپ کی پرفارمنس کو؟"

★ "میری ماں۔ میری ماں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور ماں تو ایک ایسی ہستی ہے کہ ہم اس کو کتنا بھی ہرٹ کریں وہ ہمیشہ اپنی اولاد کے لیے اچھا ہی چاہتی ہے۔"

٭ "کوئی کردار جس کو کرنے کی حسرت ہو؟"

★ "حسرت تو نہیں ہے' مگر خواہش ضرور ہے کہ ایک قاتلہ کا رول کرنا چاہتی ہوں وہ نگیٹو رول ہو گا' ایک ایسی قاتلہ جو رات میں لوگوں کی جانیں لیتی ہے اور صبح وہ ایسی معصوم ہوتی ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ لڑکی ایسی ہو گی۔"

٭ "اور پوزیٹو رول میں رومینٹک رولز؟ اور لیڈ رول پسند ہیں یا اچھے رول پسند ہیں؟"

★ "مجھے رومینٹک رولز بہت اچھے لگتے ہیں' مگر بدقسمتی سے پاکستان میں سب رومینٹک رولز ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے ڈرامہ سیریل "رخسار" تو دیکھا ہی ہو گا۔ میرا واحد ڈرامہ سیریل جس میں میرا لیڈ رول نہیں ہے اور نگیٹو رول بھی ہے۔ باقی جتنے بھی سیریل آن ایر ہیں یا جو آن ایر ہونے والے ہیں ان سب میں لیڈ رول ہے۔ تو میں اب یہی چاہوں گی کہ لیڈ بھی اور پاور فل بھی ہوں وہ ہی کردار کروں گی۔"

٭ "نگیٹو رول ہوں یا رومینٹک رول ہوں' مشکل ہوتی ہے کرنے میں؟"

★ "اگر سامنے والا اچھا پرفارمر ہے تو پھر کوئی بھی سین ہو کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔ لیکن اگر کوئی "ڈل" ہو تو پھر یقیناً" مشکل ہوتی ہے۔"

٭ "کوئی رول ایسا ملا کہ جس کو کرنے سے انکار کیا ہو' یا جس کو کر کے پچھتاوا ہوا ہو؟"

★ "ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ رول پسند نہیں آتا تو بندہ انکار کر دیتا ہے کہ ۔۔۔ سوری مجھے تو یہ جاندار نہیں لگ رہا۔ لیکن ابھی تک ایسا کوئی رول نہیں کیا کہ جس

کو کر کے پچھتاوا ہوا ہو' کیونکہ میں کردار کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔"

٭ "آج کل کے فنکار بیک وقت دو تین ڈراموں کی شوٹ میں ضرور مصروف رہتے ہیں۔ کبھی لوگوں کو شکایت ہوئی کہ دیر ہو گئی' وقت پر کیوں نہیں آئیں وغیرہ؟"

★ "میں تو وقت کی اچھی خاصی پابند ہوں' اور اس کی وجہ ایک تو یہ کہ میں نے ریڈیو پہ کام کیا جو وقت کی پابندی سکھاتا ہے پھر میں نے زندگی کے کافی سال ملک سے باہر گزارے ہیں جہاں وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے تو میں تو کرتی ہوں' مگر سامنے والا۔ لہٰذا کچھ نہیں کہہ سکتی؟"

٭ "ڈرامے کے کردار آپ کی شخصیت سے میچ کرتے ہیں؟"

★ "ہمیشہ ایک حد تک کیونکہ جب تک آپ کردار کا حصہ نہیں بنیں گے آپ ٹھیک طرح پرفارم نہیں کر پائیں گے جیسے "خوابوں کا دیا" "شہریاراں" اور ایک دو اور ڈراموں کی کچھ باتیں ہیں جو مجھ میں بھی ہیں اور کچھ باتیں میں نے اپنے ذہن سے بنائی ہیں۔"

٭ "ڈراموں میں مار پیٹ والے سین حقیقی ہوتے ہیں کیا؟"

★ "میں تو ریل ہی کرواتی ہوں' باقی کا پتا نہیں' "تیرے خوابوں کا دیا" میں تھپڑ کھایا تھا اصلی والا ایک سین تھا جس میں ایک کار سے میری ٹکر ہونی ہوتی ہے اور یہ سین چھ مرتبہ کروایا گیا ہر مرتبہ حقیقی سین کیا' ڈرامہ سیریل "آگ" میں جمال شاہ صاحب نے لاتوں سے مارا اس وقت میں نے ان کو نہیں بتایا سچ مچ مجھے ان کی لاتیں لگ رہی تھیں' وہ سمجھے کہ ٹیبل کو لگ رہی ہیں مگر وہ میری پسلیوں میں لگ رہی تھیں۔ اس طرح رخسار میں بھی ایک دو جگہ اصلی میں مار پڑی۔"

٭ "بعد میں معذرت کرتے ہیں؟"

★ "بعد میں بہت معذرت کرتے ہیں' بار بار پوچھتے ہیں تم ٹھیک ہو' زیادہ چوٹ تو نہیں لگی' کیا کریں مجبوری تھی' وغیرہ وغیرہ۔"

* "ماشاء اللہ آج کل کافی ڈراموں میں نظر آرہی ہیں' امید تھی اتنی کامیابی کی' اور لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

★ "جب انسان محنت کرتا ہے تو اس امید کے ساتھ کہ اسے اس کا صلہ ملے گا اور اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ اس نے کم وقت میں مجھے اس قدر کامیابیاں دیں۔ لوگ بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں اور مجھے دیکھ کر بے ساختہ کہتے ہیں کہ "آپ ڈراموں میں آتی ہیں نا" پھر تصاویر بنوانے کے لیے بھی کہتے ہیں اور یہ بات مجھے ذرا عجیب سی لگتی ہے۔"

* "مارننگ شوز اچھے لگتے ہیں؟ کبھی گئیں ان میں؟"

★ "تین چار مارننگ شوز میں جاچکی ہوں۔ ان میں فیصل قریشی' ندایاسر' شائستہ کا اور ایک عید شو بھی کیا' اور مجھے انٹرویوز اچھے لگتے ہیں۔ فن ٹائپ چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ مگر شادی بیاہ والے آئٹم مجھے بہت ہی واہیات لگتے ہیں۔"

* "زندگی میں کب Change آیا؟"

★ "جب میں نے ڈرامہ سیریل "خوابوں کا دیا کیا" کیونکہ اس کے بعد سے میں مسلسل کام کررہی ہوں۔ اور لوگ بھی میری پرفارمنس کو پسند کررہے ہیں۔"

* "کردار کے لیے مشاہدہ کرتی ہیں؟"

★ "مجھے آج تک کوئی ایسا کردار نہیں ملا جو کسی زندہ انسان یا اصلی انسان پر Base کرتا ہو' ہمیشہ وہ کردار ملے جو کسی رائٹر نے اپنے دماغ سے سوچے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو پھر میں بھی ان کو اپنے دماغ سے ہی بناتی ہوں ان کو کاپی نہیں کرتی۔"

* "لوگوں کو جج کرنے کا کیا طریقہ ہے؟"

★ "دیکھیں کہ وہ اپنے سے نیچے لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں جو لوگ ان کو کچھ نہیں دے سکتے ان کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے۔"

* "کیا ڈراموں سے معاشرے میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے؟"

★ "معاشرے کو سدھارنے کے لیے بہت سے ڈرامے بن چکے ہیں بہت سے پروگرام ہوچکے ہیں۔ قدرتی آفات اتنی آئیں مگر ہم لوگ نہ سنبھلے نہ انقلاب آیا اور نہ ہی کوئی تبدیلی آئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جس دن ملک میں غیرت آگئی اس دن تبدیلی بھی آجائے گی اور انقلاب بھی آجائے گا۔ قوم کا باغیرت ہونا بہت ضروری ہے۔"

* "فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے؟ ماڈلنگ کی؟"

★ "فلموں میں کام کرنے کا بہت زیادہ شوق ہے۔ اگر اچھی کوالٹی کی ہوں' اچھے رولز ہوں' تو ضرور کروں گی' ماڈلنگ ابھی کچھ خاص کی نہیں ہے۔"

* "انڈین فلموں میں کام کرنے کا کریز ہے؟"

★ "بہت ہے۔ انڈین فلموں میں کام کرنے کا بھی' ہالی ووڈ کا بھی ہے اور اگر مجھے عربی اور فارسی آتی ہوتی تو ان کی فلموں میں بھی کام کرنے کا کریز ہوتا۔ مجھے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ تمہاری شکل "ودیا بالن" سے ملتی ہے تو میں کہتی ہوں کہ نہیں ودیا بالن کی شکل مجھ سے ملتی ہے۔"

* "پہچان تو آپ کی ایک بہترین آرٹسٹ کے حوالے سے ہی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو اپنی پہچان عصمت طاہرہ (ماں) کے حوالے سے اچھی لگتی ہے یا ارسہ غزل (بہن) کے حوالے سے یا صرف اپنے حوالے سے اچھی لگتی ہے؟"

★ "میں چاہتی ہوں کہ میری پہلی پہچان میں ہی بنوں لوگ مجھے میرے نام سے اور میرے ٹیلنٹ کے حوالے سے ہی پہچانیں۔ لیکن جو عزت مجھے میری بہن اور خاص طور پر میری ماں کے حوالے سے ملتی ہے وہ میرے لیے ایک اونر کی بات ہوتی ہے کیونکہ میری ماں نے بہت محنت کی اپنی زندگی میں اور اس کا ریونیو جو مجھے مل رہا ہے اس سے میں بہت خوش ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عشنا سے اجازت چاہی۔

☆ ☆

میری بھی سنیے

روؤف لالہ

شاہین رشید

* "میرا پورا نام؟"

★ "عبدالرؤف۔"

* "دوست یاروں میں مشہور ہوں؟"

★ "لالہ کے نام سے۔ سب پیار سے لالہ کہتے ہیں اور مجھے بھی لالہ کہلوانا بہت اچھا لگتا ہے۔"

* "جنم دن' جنم شہر؟"

★ "نہ دن کا پتا ہے نہ شہر کا صحیح علم ہے۔ ویسے ماں نے بتایا تھا کہ لاڑکانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ شناختی کارڈ میں کیا تاریخ لکھی ہے وہ بھی دیکھ کر بتانی پڑے گی۔"

* "قد کاٹھ۔"

★ "پانچ فٹ آٹھ انچ۔ اچھا خاصا لمبا ہوں۔"

* "تعلیم؟"

★ "الحمدللہ انٹر کیا ہے اور بہت سے ڈگری یافتہ لوگوں سے اچھا ہوں۔"

* "فیملی ممبرز؟"

★ "رہنے دیں۔ ویسے پانچ بہنیں اور دو بھائی۔"

* "شوبز میں آمد؟"

★ "رکشا میں آیا تھا۔ اپنی کوئی سواری نہیں تھی اور یہ بات ہے 1978ء کی اور تھیٹر سے شروعات کی۔"

* "وجہ شہرت؟"

★ "بکرا قسطوں پر۔ بس پھر شہرت و مقبولیت کا دروازہ کھل گیا تھا اور آج تک کھلا ہوا ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوگیا تھا مجھ پر۔"

✻ "پریکٹیکل لائف میں کب آیا؟"

★ "کم عمری میں ہی آگیا تھا اور میری محنت کی پہلی کمائی 35 روپے تھے ماں کو دیے تو ان کی خوشی دیکھ کر میری بھی آنکھوں میں آنسو آگئے۔"

✻ "زندگی میں کمی محسوس کرتا ہوں؟"

★ "اپنی ماں کی۔"

✻ "شوبز میں کیا برا ہے؟"

★ "بہت کچھ برا ہے۔ بہت کچھ اچھا بھی ہے۔۔۔ مگر سب سے زیادہ برا وقت کی پابندی نہ کرنا ہے اور میں ایسے لوگوں سے بہت ناراض ہوتا ہوں جو وقت کی پابندی نہیں کرتے۔"

✻ "لوگ سوال کرتے ہیں؟"

★ "کس نے آپ کی زندگی کو بدلا تو میں ہنس کر کہتا ہوں جو مجھے بدلنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود بدل جاتا ہے ہے نا مزے کی بات۔"

✻ "کبھی کبھی سوچتا ہوں؟"

★ "کہ الیکشن لڑوں حکومت میں آجاؤں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ لوگ قبول نہیں کریں گے، بولیں گے کامیڈین ہے، یہ کیا کرے گا۔"

✻ "کس شخصیت کو ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں؟"

★ "اپنی ماں کی تصویر کو، میرے والٹ میں میری ماں کی تصویر ہے، لگتا ہے دعاؤں کا خزانہ میرے ساتھ ہے۔"

✻ "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتا ہوں؟"

★ "پہلے امی کے ہاتھ کا۔۔۔ پھر ماں رخصت ہوئی تو بیوی کے ہاتھ کا اور اب جب سے بیٹی پکانے کے قابل ہوئی ہے تو اس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند کرتا ہوں۔"

✻ "گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

★ "کہ بیٹی مجھے اپنے ہاتھوں سے پانی کا گلاس دے اور میں اس کو پیار کروں اور ڈھیر ساری باتیں بھی کروں۔"

✻ "نیند کب آتی ہے؟"

★ "نوجوانی میں تو جلدی آجاتی تھی، بے فکری میں بھی جلدی آجاتی تھی، مگر اب جلدی نہیں آتی، اب تو کروٹیں بدلتا رہتا ہوں اور پھر پتا نہیں کس وقت سو جاتا ہوں۔"

✻ "زندہ رہنا مشکل ہے؟"

★ قہقہہ۔۔۔ "سانس کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔ ہوا کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔۔۔ باقی تو سب دعوے ہیں کہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، سب ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہ لیتے ہیں۔"

✻ "زندگی کب حسین لگتی ہے؟"

★ "ہمیشہ۔۔۔ مجھے کبھی زندگی بری نہیں لگی، کرائسس اور پریشانیوں میں بھی زندگی کو برا نہیں کہا کیونکہ انسان کی زندگی میں ہر دور آتا ہے۔"

✻ "میری عادت جو بری ہے؟"

★ "کہ مجھے غصہ جلدی آجاتا ہے، کبھی کبھی برداشت سے بھی باہر ہو جاتا ہے۔"

✻ "میری اچھی عادت؟"

★ "مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں کچھ اچھی عادتیں بھی ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ یاروں کا یار ہوں جلدی دوست بنا لیتا ہوں بلکہ دوست بنانے میں ماہر ہوں۔"

✻ "اکثر موڈ آف ہو جاتا ہے؟"

★ "جب کوئی میری مرضی کے خلاف، میری مرضی جانے بغیر کوئی کام کرتا ہے۔"

✻ "کچھ بھی لکھتے وقت پہلے کیا لکھتا ہوں؟"

★ " 786 کے بغیر یعنی لکھے بغیر اپنا کوئی کام شروع نہیں کرتا۔ بہت برکت ہوتی ہے۔"

✻ "مجھے یقین ہے؟"

★ "صرف اور صرف تقدیر پر، کیونکہ میری سوچ یہ ہے کہ ستارے بھی ٹوٹتے بنتے رہتے ہیں اور ہاتھ کی لکیریں بھی بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔"

✻ "ایک بات جس کا میں ہمیشہ خیال رکھتا ہوں؟"

★ "میری وجہ سے کسی کا دل نہ دکھے، کسی کو میری وجہ سے تکلیف نہ ہو اور سب مجھ سے خوش رہیں۔"

✻ "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"

★ "کسی ایک بات پر نہیں نکلتیں، راہ چلتے کوئی لوٹ لے، گھر میں لائٹ چلی جائے، بلکہ کہیں بھی بیٹھے ہوں اور لائٹ چلی جائے، کوئی کسی کے ساتھ یا میرے ساتھ برا سلوک کرے تب۔ بہت لمبی فہرست ہے۔ کیا کیا بتاؤں آپ کو۔"

✻ "اپنے لیے ہمیشہ کیا خریدتا ہوں؟"

★ "اپنے لیے صرف ضرورت کی چیزیں خریدتا ہوں۔ اپنے لیے کبھی کوئی قیمتی چیز نہیں خریدی، جو کچھ بھی خریدا جو کچھ بھی کمایا صرف اور صرف اپنے گھر والوں کے لیے۔"

✻ "خدا سے ایک دعا جو روزانہ کرتا ہوں؟"

★ "یا اللہ مجھے مرتے وقت کلمہ پڑھنا ضرور نصیب کرنا اور جب قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جاؤں تب بھی میرے لبوں پر کلمہ ہی ہو۔"

✻ "سچی خوشی کب ملتی ہے؟"

★ "جب میری بیٹی اور میرے گھر والے خوش ہوں، تب لگتا ہے کہ دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئی ہیں۔"

✻ "اکثر بھول جاتا ہوں؟"

★ "گاڑی کی چابی لینا۔۔۔ پھر گاڑی کے پاس جا کر دوبارہ آنا پڑتا ہے تو بہت غصہ آتا ہے اپنے آپ پر۔ حالانکہ یہی چیز زیادہ اہم ہوتی ہے۔"

✻ "میری کس بات کی تعریف دوسرے کرتے ہیں؟"

★ "میں وقت کی پابندی کرتا ہوں اور یہاں اپنے ملک میں تو سب میری تعریف کرتے ہیں۔ انڈیا کے لوگ اور انڈیا کے اخبارات بھی میری اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ "لالہ" وقت کا بہت پابند ہے۔"

✻ "جب بلڈ پریشر ہائی ہوتا ہے تو؟"

★ "تو غصہ بہت آنے لگتا ہے، مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ میرا پریشر ہائی ہے اس پوزیشن میں جو سامنے آتا ہے اس پر برسنے لگتا ہوں، ورنہ میں ایسا نہیں ہوں۔"

✻ "کون میرے لیے جان دے سکتا ہے؟"

★ "اس دنیا میں کون کس کے لیے جان دے سکتا ہے؟۔۔۔ میرے خیال میں کوئی بھی نہیں دے سکتا۔۔۔ ویسے بھی زندگی موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"

✻ "اگر بازار میں انسان بکتا تو آپ اپنے آپ کو بیچ کر کیا خریدتے؟"

★ "ایسا کب ہوتا ہے؟۔۔۔ اگر ہوتا تو اپنے آپ کو بیچ

کراس ملک کے لیے امن و امان خرید لیتا۔ پاکستان کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں خرید لیتا۔"

* "موبائل سے کال کرنا پسند ہے یا SMS کرنا؟"

★ "مجھے کال کرنا اچھا لگتا ہے۔ SMS کرنا مجھے مشکل لگتا ہے عادت ہی نہیں ہے مجھے ایس ایم ایس کرنے کی۔"

* "کھانا کہاں کھانا پسند کرتا ہوں' اپنے بیڈ پر' چٹائی پر یا ڈائننگ ٹیبل پر؟"

★ "بیڈ پر نہیں' پہلے زیادہ تر چٹائی پہ کھاتا تھا' مگر جب سے جسم تھوڑا بھاری ہوا ہے زمین پر یا چٹائی پر بیٹھا نہیں جاتا۔ اس لیے اب ڈائننگ ٹیبل چیئر پر ہی بیٹھ کر کھانا' کھانا پسند کرتا ہوں۔"

* " 24 گھنٹوں میں کون سا وقت اچھا لگتا تھا؟"

★ "عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت۔"

* "بگڑا مزاج کتنی دیر میں درست ہو جاتا ہے؟"

★ "صرف اور صرف پندرہ بیس منٹ میں۔ میں زیادہ دیر کسی سے ناراض نہیں رہ سکتا اور خود بخود بگڑا مزاج درست ہو جاتا ہے۔"

* "آنکھ کھلتے ہی کس کو دیکھنا چاہتا ہوں؟"

★ "سچ بتاؤں۔۔۔ اپنے آپ کو۔" ہاہاہا۔۔۔

* "ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے؟"

★ "ہمارے ملک میں سوائے "قانون" کے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ سب کچھ وافر مقدار میں ہے۔ قوانین بھی صرف کاغذات میں ہیں یہ لاگو ہو جائیں تو کیا کہنے۔"

* "مجھے متاثر کرتے ہیں؟"

★ "باہر کے ملکوں کے قوانین' ڈسپلن' یونٹی' ملاوٹ سے پاک چیزیں' ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنا' لائن میں لگ کر سب کام کرنا اور سب سے بڑھ کر وقت کی پابندی کرنا۔"

* "میں اس بات سے نہیں گھبراتا کہ۔۔۔؟"

★ "میں لوگوں کے درمیان نہ چلوں کہ لوگ پہچان لیں گے تو روک روک کر سلام کریں گے' میں اس بات سے نہیں گھبراتا کہ ٹھیلے سے چیزیں کھاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ عام بازار سے شاپنگ کروں گا تو لوگ حیران ہوں گے کیونکہ میں اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتا ہوں' جیسے سب ہیں ویسے میں بھی ہوں۔"

* "میری ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"

★ "میرا غصہ تیز ہے' بس اس سے سب گھبراتے ہیں۔ حالانکہ اب تو میرا غصہ کافی کنٹرول میں آگیا ہے۔"

* "ایک شخصیت جس سے میں ڈرتا تھا؟"

★ "بچپن سے اپنے ماموں سے بلکہ ماموؤں سے ڈرتا تھا اور بہت ڈرتا تھا۔ حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔"

* "کامیڈی کرنے کے لیے آئیڈیاز کہاں سے لیتے ہیں؟"

★ "آپ حیران ہوں گی' لیکن جب سگنل آتا ہے تو ادھر ادھر نظر دوڑاتا ہوں تو پھر بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں کامیڈی کے لیے۔"

* "میں شکر گزار ہوں اپنے رب کا؟"

★ "کہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے اور مجھے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔"

* "کن لوگوں پر بہت خرچ کرتا ہوں؟"

★ "یہ بتانے والی بات تو نہیں ہے' لیکن میں مستحق لوگوں پر بہت خرچ کرتا ہوں' اللہ کی راہ میں خرچ کرکے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

* "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

★ "لالہ بھائی آپ کا پیٹ نکل آیا ہے اس پر کنٹرول کریں۔" ارے بھائی آپ کو کیا پرابلم ہے میرا پیٹ اندر ہو یا باہر۔

* "صبح کب اٹھتا ہوں؟"

★ "کوئی ٹائم فکس نہیں ہے' جلدی سو جاؤں تو جلدی اٹھ جاتا ہوں اور دیر سے سوؤں تو پھر دیر سے اٹھتا ہوں۔"

* "صبح صبح آنکھ کھل جائے تو۔۔۔؟"

★ "دوبارہ سونے کی کوشش کرتا ہوں اور پھر بھی نیند نہ آئے تو بالکونی پہ کھڑا ہو کر شہر کا نظارہ کرتا ہوں۔"

* "زندگی میں کچھ دھوکہ کھایا؟"

★ "ہاں۔۔۔ کئی بار۔۔۔ اصل میں' میں دوسروں پر جلدی بھروسا کرلیتا ہوں اور پھر نقصان اٹھاتا ہوں۔"

* "رشتے دکھ دیتے ہیں؟"

★ "رشتوں سے زیادہ بچھڑنے والے دکھ دیتے ہیں۔ رشتے داری میں تو اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اور مگر جو بچھڑ جاتے ہیں ان کے لیے بہت دکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔"

* "ناشتا جو پسند ہے؟"

★ "پہلے تو بہت کچھ پسند کرتا تھا' مگر تھوڑا فربہ ہونے کے بعد ایک چائے کا کپ اور دو پاپے کھاتا ہوں۔ اب تو کافی کنٹرول کرلیا ہے' میں نے اپنے موٹاپے پر۔"

* "بیڈ کی سائیڈ پہ رکھتا ہوں؟"

★ "گاڑی کی چابی' موبائل فون اور اپنی دوائیاں۔"

* "ایک خواہش کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں؟"

★ "ایک خواہش۔۔۔؟ ہر خواہش کے پورا ہونے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں' مگر پتا نہیں زندگی اتنی سہولت دے نہ دے۔"

* "کیا محبت بار بار ہوتی ہے؟"

★ "محبت بار بار ہوتی ہے' مگر سچی محبت ایک ہی بار ہوتی ہے۔"

* "فیوچر پلاننگ؟"

★ "اگلے لمحے کا کچھ پتا نہیں تو پلاننگ کیا کریں۔۔۔ بس اللہ توکل کام ہو رہا ہے۔ وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔"

* "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ منتظر رہتا ہوں؟"

★ "عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے۔ دل چاہتا ہے کہ ہر سال جاؤں۔"

* "لڑکیوں کے لیے کوئی ایک نصیحت؟"

★ "شادی ہو جائے تو اچھی بیوی بن کر رہیں اور اپنے شوہر کا ہر طرح سے خیال رکھیں۔"

* "کبھی رشوت لی یا دی؟"

★ "لی تو کبھی نہیں البتہ پولیس والوں کو دے کر اور دیگر لوگوں کو دے کر اپنا کام ضرور نکالا ہے' مگر یہ بری بات ہے' مگر ہمارے یہاں کوئی کام بغیر رشوت کے ہوتا نہیں۔"

☼ ☼

نگہت اسلم چوہدری

ادارہ

س : آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟

ج : نگہت اسلم چوہدری' پاپا جانی پیار سے مونا پکارتے تھے' بڑے بھیا بھی پیار سے مونا پکارتے ہیں جبکہ چھوٹے بھیا پٹھانی پکارتے ہیں اور منجھلے بھیا افوہ وہ تو میرے نام سے گ ہٹا کر غ لگا دیتے ہیں شاید یہ بھی پیار کی ایک قسم ہے۔

س : آپ نے کبھی آئینے سے کچھ کہا یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟

ج : اوں ہوں! کافی مشکل سوال ہے' ارے ہاں ہاں یاد آیا آئینہ ہمیشہ مجھے مطلع کرتا رہتا ہے کہ یو ر دا پرفیکٹ اور جواباً" ہم بھی کہتے ہیں (بٹر نگ کرتے ہوئے) دیکھیے مسٹر آئینہ آپ خود پرفیکٹ ہیں جبھی ہم آپ کو پرفیکٹ لگتے ہیں۔

س : آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟

ج : ہائے آپ کے اس سوال نے مجھے کافی سنجیدگی سونپ دی ہے اوں ہوں سوچنا پڑے گا چلیں جی بہت سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میرے بچپن کی ڈھیر ساری بے بی ڈولز میری متاع حیات ہیں اور انہیں میں ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں اور رکھوں گی کیونکہ وہ مجھے ہر دکھ' ہر غم اور ہر فکر سے بیگانہ بچپن جو یاد دلاتی ہیں۔ میرے خیال سے بچپن ہی وہ زمانہ ہے جس میں آپ لائف کو Fully انجوائے کرتے ہو۔ کیونکہ اس وقت آپ کی ذہنی اپروچ لوگوں کے رویوں کو پرکھنے کے لیے ناکافی ہوتی ہے (am i right)

س : اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟

ج : میرے ذہن کے پردے پر بہت سے لمحات لہرا رہے ہیں مگر میرے خیال سے جو زیادہ جاں گسل اور جان لیوا ہیں وہ وہی لمحات ہیں جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے پیارے پاپا جانی ہمیں چھوڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں' اتنے دور کہ جہاں سے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور وہ اب کبھی بھی نہیں آئیں گے پیار سے میرا ماتھا چومنے اور میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھنے۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے مگر مجھے لگتا ہے یہ سب غلط ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یتیموں کے زخموں کو مندمل بنانے کے لیے اس دنیا کا ہر مرہم ناکام رہتا ہے۔

س : آپ کے لیے محبت کیا ہے؟

ج : لفظوں کی ضرورت سے عاری سچا جذبہ جسے بیان کرنے کے لیے میرا قلم اور میرے الفاظ ہیچ ہیں۔

س : مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟

ج : ریڈیو پر سوشل پروگرامز جن سے ہماری سوسائٹی کی اویرنیس ہو سکے' عورتوں کو ان کے حقوق مل سکیں' مجرم کو سزا مل سکے' مظلوم کو انصاف مل سکے اور کرپشن کا خاتمہ ہو سکے۔ ریڈیو پر ایز اے کمپیئر یہ پروگرامز آن ایئر کرنا میرا مستقبل قریب کا منصوبہ ہے جس پر عمل کرنا میری ترجیحات کی فہرست میں آتا ہے۔

س : پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کر دیا ہو؟

ج : میں نے Highest ___ First ___ ڈویژن میں اپنا ایف ایس سی کمپلیٹ کیا' یہی میرے لیے باعث خوشی ہے کیونکہ ایک اسٹوڈنٹ کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

س : اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں بیان کریں؟

ج : آزمائش۔

س : اپنے آپ کو بیان کریں؟

ج : خوددار' انا پرست' حساس' نرم دل اتنی کہ دوسروں کے آنسوؤں کو دیکھ کر اپنے آنسوؤں پر ضبط مشکل ہو جاتا ہے۔ منہ پھٹ اتنی کہ مما سے ڈانٹ کھانا معمول ہے ڈرپوک اتنی کہ چھپکلی' کاکروچ' آسمانی بجلی اور اندھیرے کے نام سے جان جاتی ہے کچھ کچھ ایٹی ٹیوڈ بھی ہوں موڈی بھی' چھوٹی چھوٹی بات پہ رونا معمول ہے' ہر بات بھول سکتی ہوں مگر اپنی انسلٹ کبھی نہیں جبھی تو انتقام کے لیے موقع کی تلاش میں رہتی ہوں اور کیا کہوں اپنے بارے میں الغرض میں ایسی الجھن ہوں جسے سلجھاتے سلجھاتے آپ خود بھی الجھ جائیں گے۔

س : کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟

ج : رشتوں میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں سے خائف رہتی ہوں۔

س : آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟

ج : بارش ___ میرے بہن بھائی۔

س : آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟

ج : میں خوشگوار لمحات میں خوشیوں کو اپنے آنچل میں یوں سمیٹ لیتی ہوں کہ آئندہ زندگی میں آنے والے غم بھی بہت کم لگتے ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں خود سے سیلبریٹ کر کے مزا آتا ہے اور میں اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بہت کم شریک کرتی ہوں (اگر رونا اکیلے میں ہو تو ہنسنا بھی اکیلے میں چاہیے کیا خیال ہے۔)

س : آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟

ج : پیسہ ایک ایسا جادوئی کھیل ہے جو اپنی عدم موجودگی میں آپ کے بہت ہی قریبی لوگوں کے چہروں پہ سجا اپنے پن کا نقاب اتار کر ان کا بھیانک روپ آپ پہ ظاہر کرتا ہے۔

س : گھر آپ کی نظر میں؟

ج : دن بھر کی تھکن سے فراغت پا کر گھر میں قیام' تپتے صحرا میں اچانک پانی مل جانے کے سکون کی مانند ہوتا ہے۔

س : کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟

ج : اوں ہوں! امپاسبل میں تو موقع تلاش کرتے ہی انتقامی کارروائی میں لگ جاتی ہوں (تسی بچ کے رہنڑاں ساڈے کولوں)

س : اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟

ج : یہ سوال رئیلی بہت مزے کا ہے۔ میں اپنی کامیابیوں میں اپنی ذات کو صرف 1٪ یعنی کہ ایک فیصد ذمہ دار ٹھہراتی ہوں۔ اوں ہوں۔

آپ متجسس ہیں ناں کہ ایسی کون سی ذات ہے جس کا 99٪ ہاتھ میری کامیابیوں میں ہے تو سن لیجیے آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ میں اپنی کامیابی کے لیے ذرا بھی محتاط نہ ہوتی اگر مجھے ڈر نہ ہوتا جی ہاں پتا ہے کس کا" اپنے دشمنوں کا ان لوگوں کا جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں کر سکتی' وہ جو اپنے تئیں مجھے ناکام بنانے کی کوشش کرتے ہیں' وہ جو اپنی جلی کٹی باتوں سے مجھے بہت کچھ کرنے پہ اکسا جاتے ہیں' وہ جن کی طنزیہ اور تمسخر اڑاتی نگاہیں میرے اندر کچھ کر دینے کا جذبہ ابھارتی ہیں' جی ہاں وہی لوگ اصل ذمہ دار ہیں میری کامیابی کے میں ان سب کو سلیوٹ پیش کرتی ہوں اور

بقیہ: صفحہ 264 پر

فرحانہ ناز ملک

شامِ آرزو

عقیدت اپنی اماں اور جمیلہ کے ساتھ اپنے آبائی شہر کو چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئی ہے۔ اس بات سے عقیدت کے بہن بھائی تحریم اور شہریار سخت ناراض ہیں۔ عقیدت ایک کم ہمت، کم گو اور اپنی ذات میں بند رہنے والی لڑکی ہے' اس کی اماں بے حد حسین ہیں۔ سنعان ماں' باپ کی توجہ کو ترسا بکھرا ہوا نوجوان ہے۔ اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ وہ اکلوتا ہے، مگر محبتوں سے محروم ہے۔ اس کی ماں فائزہ شوہر کی بے رخی اور ظلم کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن چکی ہیں۔ "غوری منزل" میں تین پورشنز ہیں۔ جہاں کریم تین بیٹوں' بہوؤں اور پوتے' پوتیوں کے ہوتے بھی تنہا ہیں۔ نورین اور سلمان صاحب کی بیٹی حبہ سلمان ٹی وی پر اینکر ہے۔ اس کے چچا کا بیٹا حارث اسے پسند کرتا ہے۔ لیکن حبہ شادی کرنے کے حق میں نہیں۔ عالم صاحب ایک مشہور و معروف جاگیردار ہیں۔ زندگی کی تمام عیاشیوں کے مزے لوٹنے کے بعد وہ اب احتسابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کا ایک مفلوج و اپاہج بیٹا جلال بھی ہے۔ جو ان کی بہو سحر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ عالم صاحب کو جلال کی فکر ہے۔

تیسری قسط

یہ ایک مشہور و معروف کالج تھا۔ یہاں زندگی اپنے نئے رنگوں سے روشناس کرانے کے لیے بانہیں وا کیے منتظر تھی۔ مگر اس جیسوں کا کیا جو صرف خود میں مقید رہنا پسند کرتے ہیں۔ جن کی دوستی، دشمنی، باتیں، عداوتیں، ہنسنا، بولنا سب اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ خول میں بند اس جیسے لوگوں کے لیے ان جانا اور ان چاہا ماحول کسی موسم کی طرح غیر موافق ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ارد گرد ترو تازہ چہرے تھے۔ ہنستے کھلکھلاتے، بے فکرے۔ دھنک رنگ اوڑھے اور وہ ان سب میں "بھوا چی گاں" نہ سہی۔ ڈار سے بچھڑی کونج ضرور لگ رہی تھی۔

اماں کہتی تھیں۔ میڈیکل کی پڑھائی اپنا ہوش تک بھلا دیتی ہے۔ مگر یہاں کی دنیا الگ داستانیں سنا رہی تھی۔ کہیں ٹولیاں۔ تو کہیں جوڑیاں۔ وہ لمحوں میں وحشت زدہ ہوگئی۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا کہ یہاں کی ساری مخلوق اعلا طبقے سے اٹھ آئی تھی۔ یقیناً "بہت سے اس جیسے پس منظر کے بھی تھے اور آنکھوں کے سامنے عبایا میں لپٹی یا سر پر حجاب پہننے والی لڑکیاں بھی گھوم رہی تھیں۔ ایک اکیلی وہی بڑی سی شال میں ملفوف نہیں تھی۔ بال۔ مگر اس جیسا بد حواس کوئی نہیں نظر آرہا تھا۔ اس کی شکل سے عیاں تھا کہ وہ ایک الگ دنیا میں آگئی ہے اور جس سے وہ مرعوب تو کیا ہوتی، خوف زدہ ضرور ہوگئی تھی اور ابھی پہلا لیکچر شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننے کے اپنے ارادے۔ اور اماں کی خواہش سے اچھے بچوں کی طرح دستبردار ہونے کا سوچ چکی تھی، جو چیز مزاج سے ہی میل نہ کھائے۔ وہ کیریئر کیسے بن سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سفید سر اور سفید ہی داڑھی والے وہ سر تابش تھے۔ بے شک ان کے چہرے پر خاص قسم کی شفقت اور اپنائیت تھی۔ مگر آتے ہی انہوں نے جس انداز سے کلاس پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے لگا وہ ضرور اس نظر کی زد میں آگئی ہے۔ اس پر نامحسوس سی کپکپی طاری ہوگئی۔

"ماشاءاللہ۔" تقریباً "تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ سر نے یقیناً" اسی لیے ایسا کہا۔

"کسی اور پروف کے بچے تو نہیں بٹھا لیے؟" ان کا لہجہ شرارتی تھا۔

"نو نو سر۔" پچھلی رو میں سے آواز گونجی۔ "سب اپنے ہی بچے ہیں۔" اپنے ہی بچے کی اصطلاح پر سر بے ساختہ مسکرائے۔

"سر پہلا دن ہے۔ کلاس ہری بھری لگ رہی ہے۔"

"ہوں۔ کافی نئے چہرے نظر آرہے ہیں۔" سر نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئے چہروں پر نظر ڈالی۔ عقیدت نے فوراً" گود میں رکھے بیگ پر آنکھیں جیسے چپکا لیں۔ یہاں سر ریت میں دے کر خود کو چھپانا یقیناً "خواب تھا، لیکن اس کی طرح آنکھیں ضرور بند کی جاسکتی تھیں۔

"سر لیکچر تو روزانہ ہوتے رہیں گے۔ کیوں نا آج تعارف ہو جائے۔" سر کو مشورہ خوب پسند آیا اور عقیدت کو اتنا ہی بدحواس کر گیا۔ ایک ناممکن مرحلہ اس کے سامنے آیا چاہتا تھا۔ وہ درندیدہ نظروں سے تعاون کراتے اسٹوڈنٹس کو دیکھتی رہی۔ کس اعتماد کے ساتھ وہ اپنا شجرہ نسب تک بتا رہے تھے اور وہ "میں کیسے" سوچتے سوچتے نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ رجاء اور مائدہ اس کے دائیں طرف بیٹھی تھیں۔ بھلے ہی دونوں صبح سے لے کر اب تک اس کا آسرا بنی رہیں، لیکن اس وقت وہ دونوں بھی کام نہیں آئی تھیں۔ اسے اپنا تعارف خود کرانا تھا۔

اپنی باری آنے تک اس نے دل ہی دل میں کتنی دعائیں کر ڈالیں۔ کاش سر کو کوئی کام یاد آجائے۔ یا کچھ بھی ہو جائے جس سے اسے اس مشکل کام سے نجات مل جائے۔ مگر ہر دعا پوری ہونی ہوتی تو وہ یہاں کیوں بیٹھی ہوتی؟ پہلے مائدہ۔ پھر رجاء۔ اور اب اسے اٹھنا تھا۔ مگر وہ سر کی سوالیہ نظروں سے خائف ہنوز بیٹھی رہی۔ یہاں

تک کہ رجاء اور مائدہ بھی مشکوک ہوگئیں۔

"تم اٹھ کیوں نہیں رہیں؟" رجاء نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے دیکھا سر اس کی طرف متوجہ تھے اور پوری کلاس بھی یعنی جو نہیں بھی تھے۔ وہ بھی اسے جاننے کے مشتاق ہوگئے۔ تعارف کے دو جملے بولنے کی خاطر کھڑے ہونے کے لیے وہ اتنا وقت لے چکی تھی کہ سب کو متوجہ ہونا ہی پڑا۔ اسے اٹھتے بنی شال کو اس نے ماتھے تک کس کر لپیٹ رکھا تھا اور اپنے گرد بھی۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی کہیں سے آواز آئی۔

" Alian "اور ساتھ ہی دبی دبی ہنسی گونجنے لگی۔ عقیدت نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑ لیا۔ ان کی لرزش مزید شرمندگی کا باعث بن سکتی تھی۔ "سر یہ طالبان کی بھیجی ہوئی لگ رہی ہیں۔"

"کوئی چیک کرے انہوں نے سوسائیڈ جیکٹ تو نہیں پہن رکھی؟"

"پلیز۔ نو مور بد تمیزی۔" سر کو اپنی موجودگی کا ثبوت دینا پڑا۔ مگر تب تک عقیدت کا دل بیٹھ چکا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کا تعارف پیش کرنے لائق با اعتماد پہلے بھی نہیں تھی۔ اب مزید ہراساں ہو چکی تھی۔

"جی بیٹا۔ بتایئے۔" کسی ڈاکٹر کی طرح سر نے گویا اس سے مرض دریافت کرنا چاہا۔ اس نے سوکھا حلق تر کرکے آہستہ سروں میں "عقیدت فاطمہ" کہا۔

"تالیاں۔" بڑی شوخی سے کہا گیا ساتھ ہی اسی ٹولے نے تالیاں بھی بجا ڈالیں۔ عقیدت کے لیے یہ سب ناگہانی صورت حال جیسا تھا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا آپھنسا۔

"عقیدت صاحبہ۔ آپ سے عقیدت مندی کے ساتھ عرض ہے تعارف تھوڑا مختصر کرلیں۔ اور کتنا طویل کریں گی۔" یہ سراسر مذاق تھا۔ سر نے کہنے والے کو خشمگیں نظروں سے گھورا اور مسکرا کر بولے۔

"بہت یونیک ہے۔ میں نے لائف میں فرسٹ ٹائم سنا۔ آپ کہاں سے ہیں؟" یعنی ابھی اسے مزید بولنا تھا۔ کس بہادری اور ہمت کے ساتھ اس نے آنسوؤں کا گولہ نگلا "ڈیرہ غازی خان۔" بتایا۔ جملہ دیکھ کر بھی یقین نہ کرتی۔

"سر سنا ہے۔ ہمارا ایٹم بم وہیں کہیں رکھا ہے۔" اس جملے میں غضب کی تشویش تھی۔

"اور ہمارے سابقہ پریذیڈنٹ سی ایم بھی اسی علاقے سے بی لونگ کرتے تھے۔"

"اس کا مطلب عقیدت فاطمہ سے عقیدت مندی کے ساتھ پیش آیا جائے۔" اگر اب بھی سر بیٹھنے کا نہ کہتے تو وہ خود بخود گر جاتی۔

کالج میں پہلے دن کا یہ انتہائی ناخوشگوار و ناگوار تجربہ تھا۔ اس کی ہمت و برداشت کا جنازہ نکل چکا تھا۔ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو اندر دھکیلنے کی کوشش میں نڈھال ہوئی، وہ دائیں طرف بیٹھی رجاء کو بھول گئی، جو مائدہ کے کان میں کہہ رہی تھی۔

"یہ کانپ رہی ہے۔" مائدہ نے تھوڑا سا سر آگے کر کے اسے باقاعدہ دیکھا بھی۔

"رو بھی رہی ہے۔"

"عجیب ہے۔" رجاء نے کندھے اچکا لیے۔ کلاس ختم ہو چکی تھی۔

"اسے چپ کراؤ۔" مائدہ کو اس کی حالت پہ افسوس ہو رہا تھا۔ رجاء نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بیگ اور کتابیں سمیٹتی کھڑی ہوگئی۔

"گراؤنڈ میں چلتے ہیں۔ وہاں بات کریں گے۔" عقیدت بنا حیل و حجت کے ان کے پیچھے چل دی۔ آج وہ ان کے رحم و کرم پر تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس میں نعیم صاحب کے ساتھ نئی فیکٹری کے بارے میں کچھ معاملات دیکھ رہا تھا۔ جب اطلاع دی گئی۔

"زکریا صاحب آرہے ہیں" وہ چند لمحوں کے لیے ہونٹ سکوڑے جیسے آگے کی سوچنے لگا۔ یعنی اب کیا' کیا جائے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار یا پھر استقبال۔۔۔ اور دونوں ہی کرنے کی عادت تھی نہ خواہش۔

"تو باس آرہے ہیں۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔ جہاں اطلاع ہی سیکریٹری کے ذریعے ملے وہاں انتظار اور استقبال جیسے تکلفات کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"نعیم صاحب آپ نے سن لیا۔ زکریا آفندی کمنگ۔" اور نعیم صاحب جانتے تھے۔ یہ اس کی جانب سے آفس سے جانے کی اطلاع تھی۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ پاتے سنعان گاڑی کی چابی اٹھاتا آفس سے نکل بھی گیا۔ وہ ایک گہری سانس لینے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ باپ' بیٹے کے سرد و تلخ تعلقات کی کہانیاں سب کو معلوم تھیں۔ اب آفس میں سنعان آفندی نے خال خال ہی نظر آنا تھا۔ بلکہ اس نے گھر سمیت ہر اس جگہ پر کم جانا تھا جہاں زکریا آفندی کی موجودگی کی امید ہو۔

ابھی بھی لنچ ٹائم تھا۔ اسے مما کے ساتھ بنتے ان نئے تعلقات کو تقویت دینے کی خاطر اصولاً "گھر چلے جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی گاڑی ہارون کے ہوٹل کی جانب گامزن تھی۔ اس نے ہارون کے نمبر پر کال بھی ملالی۔ جس نے ایک بیل بجتے ہی کال منقطع کردی۔ فوراً" بعد اس کا پیغام موصول ہوا۔ "بے سسرال بیٹھا ہوں۔۔۔ یہیں آجا۔" اس تک جیسے بو پہنچ گئی تھی۔ سنعان کے ہوٹل کے آس پاس ہونے کی Text کا متن پڑھتے ہی وہ ٹھیک ٹھاک بدمزا ہوا۔ "سسرال نہ ہوا مسافر خانہ ہوگیا۔" اس نے چڑ کر سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"باجی۔۔۔ باجی۔" عقیدت کو کالج چھوڑ آنے کے بعد سے وہ لیٹی ہوئی تھیں۔ جمیلہ کی چیخ نما پکار پر ہڑبڑا کر اٹھیں۔ غنیمت رہی کہ وہ جاگ رہی تھیں' ورنہ جمیلہ کو جھاڑتیں ضرور۔

"باجی۔۔۔ یہ۔۔۔ فون۔" ان کے باہر جانے سے قبل جمیلہ خود کمرے میں کانپتی آگئی۔ ہاتھ میں موبائل تھا اور اس کی گرمجوشی کسی خاص کال کی طرف اشارہ کررہی تھی۔

"شہری بھائی ہیں۔" تب اماں نے بعجلت موبائل لیا اور بے صبری سے کان پہ رکھا۔ جس شکل پر ابھی چند لمحوں پہلے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی رونق لوٹتے دیر نہیں لگی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جیتے رہو میری جان۔" ان کی آواز کی کپکپاہٹ جمیلہ نے بھی محسوس کی۔ وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔ اچھا تھا وہ اکیلے اپنے جگر گوشے سے باتیں کرتیں۔ جن کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح اس سے بات کرتے ہوئے نم ہو چلی تھیں۔ نہ جانے کیوں ان کا صبر بیٹے کے سامنے لڑکھڑانے لگتا۔

"کیسے ہو؟" سلام کے بعد شہریار نے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ انہیں خود ہی پوچھنا پڑا تھا۔ وہ جتنا شہریار سے بات کرنے کے معاملے میں بے صبری دکھاتیں۔۔۔ شہریار اتنا ہی ناپ تول کر بولتا۔ اللہ نے بھی عجیب امتحان ان کی زندگی میں لکھ دیے تھے۔ تین اولادیں دیں۔۔۔ تینوں سے ہی بات کرنے کے لیے ترسنا پڑتا۔ عقیدت کم گو تھی۔ اسے ڈنڈے کے زور پر بھی بولنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جبکہ تحریم اور شہریار ایک دوسرے کے ساتھ۔۔۔ زمانے بھر کے ساتھ خوب ہنستے بولتے۔۔۔ ماں سے بولنا ہوتا تو وہ گونگے ہوجاتے۔ انہیں تحریم کی ہی طرح شہریار سے بھی الفاظ اگلوانے پڑجاتے۔

"بہت دنوں بعد فون کیا۔۔۔ خیر تو رہی نا۔۔۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟" ایک ہی سانس میں انہوں نے کتنے سوال پوچھ ڈالے۔ ممتا سے لبریز لہجہ شہریار پر کتنا اثر پذیر ہوا یہ اس کے جواب نے ظاہر کردیا۔

"آپ لاہور شفٹ ہو گئی ہیں؟" اماں بالکل چپ ہو گئیں۔ اندر کہیں کچھ چھنا کے سے ٹوٹا تھا۔ وہ جانتی تھیں یوں منظر پر آجانے سے وہ قابل گرفت ہو جائیں گی۔ مگر گناہ گار بھی ٹھہرائی جائیں گی۔ یہ نہیں جانتی تھیں۔ انہیں اپنی ہی اولاد کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہو کر جواب دہ ہونا پڑ رہا تھا۔

"مم۔۔۔ میں۔۔۔ عقیدت کی۔"

"اماں آپ تھوڑا سا اس بات کو سمجھ لیتیں کہ آپ کا یہ فیصلہ ہمارے لیے کتنی مشکلات لے کر آئے گا تو آپ ایسا نہ کرتیں۔ کوئی ضروری پڑھائی نہیں تھی۔ عقیدت کی زندگی گزر جاتی' وہ ختم نہیں ہوجاتی۔ ڈاکٹر نہیں بنتی تو۔۔۔ غلط کیا آپ نے۔۔۔ غلط۔" وہ سخت کبیدہ خاطر تھا۔ اماں دم سادھے یوں سنتی رہیں گویا بے جان ہو گئی ہوں۔

"آپ تحریم سے نہ سہی' مجھ سے تو بات کرلیتیں' پوچھ لیتیں' بتادیں کچھ تو کہتیں۔۔۔ مگر آپ جانتی تھیں' ہم آپ کو منع کردیں گے۔ آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔۔۔ آپ نے ہمیں تکلیف دی۔" جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ ہر صفائی' ہر وضاحت انہوں نے اپنے حلق میں دبالی۔

"ہیلو۔۔۔ اماں۔" ان کے کسی بھی رد عمل سے مایوس ہو کر شہریار کو کہنا "آپ سن رہی ہیں؟"

"میں سن رہی ہوں۔۔۔ تم بولتے رہو۔" اس بار ان کا لہجہ قطعی بے تاثر تھا اور ہمیشہ کی طرح ٹھوس بھی۔

"آپ۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" ماں کا بدلتا لہجہ شہریار نے بھی محسوس کرلیا۔ اس نے غیر ارادتاً "بات بدلی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ تم اپنی کہو۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔ تحریم نے بتایا تو میں پریشان ہو گیا۔" ایک تمسخرانہ مسکراہٹ نے ان کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔ ایسا کچھ انہوں نے کیوں نہیں سوچا۔

"عقیدت جب گھر پہ ہو پھر فون کرنا۔۔۔ اسے بھی تم سے بات کرنا ہوتی ہے۔ آج اس کا پہلا دن ہے کالج کا۔۔۔ کافی پریشان تھی۔ پتا نہیں کیا کررہی ہوگی۔" نامعلوم انہوں نے عقیدت کا ذکر کیوں چھیڑ دیا تھا۔ اس بار خاموش ہونے کی باری شہریار کی تھی۔ اماں کے دل پر آنسو گرنے لگے۔

"ٹھیک ہے اب میں فون بند کرتا ہوں۔۔۔ بعد میں بات کروں گا۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" کال منقطع ہو گئی تھی۔ وہ کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح یوں بستر پر ڈھیر ہوئیں جیسے کسی طویل سفر سے لوٹی ہوں۔ اپنا تمام مال و اسباب لٹوا کر۔

☼ ☼ ☼

وہ سب گراؤنڈ میں بیٹھی تھیں۔ عقیدت کے علاوہ رجاء کے ساتھ حمنی اور مائدہ اور فائنل پروف کی افشاں بھی موجود تھی۔ وہ حمنی اور مائدہ کی ہاسٹل فیلو تھی اور اکثر ان کے گروپ میں آدھمکتی۔ رجاء باقاعدہ اداکاری کرکے سب کو صبح والا واقعہ بتارہی تھی۔

"کیا بتاؤں۔۔۔ میں تو شاکڈ رہ گئی۔ اس کی مما نے مجھے ایسے دبوچ لیا۔" رجاء نے قریب بیٹھی مائدہ کا بازو ویسے ہی دبوچ کر جھٹکا دیا۔ مائدہ ہنسنے لگی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی گر پڑا۔

"میں ڈر گئی۔۔۔ میں نے سمجھا مجھ سے کچھ غلط ہوا ہے' جس کی پوچھ گچھ کے لیے مجھے روکا گیا۔۔۔ اینی وے۔۔۔ پھر مجھ سے نام اور ایئر پوچھا اور پھر کہتی ہیں۔۔۔ یہ میری بیٹی ہے۔ تمہارے ہی پروف کی ہے۔ پلیز اس کی دوست بن جاؤ۔ اور اس کو اپنے ساتھ ساتھ رکھو۔" عقیدت کے لیے سر اٹھانا محال ہو گیا۔ اچھا شرمندہ کروایا تھا اماں نے۔ اگرچہ اس کا فائدہ بھی بھرپور ہوا۔ رجاء نے اسے سارا وقت نہ صرف اپنے ساتھ رکھا بلکہ دوستی بھی گانٹھ لی تھی۔

www.paksociety.com

مائدہ اور حمنی بھی اسی دوستی کی دین تھیں۔

"واہ! کیا بات ہے۔ کاش ہر کسی کی مدر ایسی کیئرنگ ہوں۔" پتا نہیں اسے کیوں لگا حمنی مذاق اڑا رہی ہے اور اس کی مما اتنی حسین ہیں۔ اف۔ کانٹ ٹیل یو۔" آنکھیں میچ میچ کر رجاء نے مطلع کیا۔
"رئیلی۔"

"بالکل۔ رئیل بیوٹی۔ ملکاؤں جیسی۔ میں بس ان کو دیکھتی رہ گئی۔" رجاء کی بات پر باقی سب نے عقیدت کو یوں عقیدت کے ساتھ دیکھا گویا اماں کے حسن میں سارا کمال اس کا ہو۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔

"اور تم ان سے اتنی امپریس ہو میں کہ سر جھکا کر ان کی بیٹی کی چوکیدار بن گئیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" رجاء نے بخوشی تسلیم کیا۔ "مجھ سے ہاں' نا کچھ بولا ہی نہیں گیا۔"

"پھر یہ کس پر چلی گئی؟" اور جو دل اماں کی اس درجہ تعریف پر بہلنا شروع ہوا تھا۔ افشاں کے یوں تمسخرانہ کہنے پر پھر سے دبک گیا۔ اماں اور اپنی شکل کا تقابل شاید ہی اس نے کبھی کیا ہو۔ جمیلہ کے علاوہ اس کی زندگی میں اور تھا ہی کون جو اسے یہ فرق بتاتا۔ ویسے بھی وہ اماں کی بیٹی تھی۔ اس کے لیے یہی کافی تھا۔ مگر تحریم کو دیکھنے کے بعد اور اب افشاں کی بات سن کر اس کا چہرہ تاریک پڑنے لگا۔

"اور جب اس کی مما سب کہہ چکیں تب میں نے اس کو دیکھا اور میں پھر سے شاکڈ رہ گئی۔ یار یہ ون پرسنٹ بھی نہیں ملتی اپنی مما سے اتنی سی بھی نہیں۔" رجاء کا لہجہ نارمل تھا۔ اس کے دل پر برسات ہونے لگی۔

"ہوتا ہے ایسا۔ میں خود اپنے بابا پہ گئی ہوں اور میری چھوٹی بہن مما جیسی ہے۔" مائدہ ان جانے میں ان کے لیے سہارا ثابت ہوئی۔ واقعی بچے ماں باپ کسی پر بھی جاسکتے ہیں۔ یہ تو قانون فطرت ہے۔ اس پر کیسا اعتراض اور کیسا دکھ۔ اسے تھوڑی تسلی ہوئی تھی۔

"اور میں اپنی دادی پر۔" واجبی سی شکل کی افشاں نے بھی ہاتھ لہرا کر اپنا "جائے حسن" جتایا۔ "آپ کی دادی بہت حسین ہوں گی۔" عقیدت کو ٹھوکا مارنے کے بعد مائدہ نے بظاہر ستائش دکھائی۔ مگر سب جانتی تھیں۔ وہ مذاق اڑا رہی تھی۔ سوائے افشاں اور عقیدت کے۔ اب جبکہ اس نے خود کو دادی کا پرتو بتا دیا تھا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس نے اگلے پانچ منٹ تک دادی کو حسین بھی ثابت کردیا۔ رجاء' حمنی کھا جانے والی نظروں سے مائدہ کو گھور رہی تھیں۔ ایک عقیدت تھی جس نے ہونق بن کر ہی سہی مگر انتہائی غور سے افشاں کی "داستان حسن" سنی۔

"آپ کی دادی واقعی بہت حسین تھیں۔" بڑی رونی شکل بنا کر مائدہ نے کہا تھا۔ افشاں نے گردن تان کر تعریف وصول کی۔ افشاں کی موجودگی یوں بھی سب کو ناگوار لگتی تھی۔ وہ جب اس قسم کی شیخیاں بگھار کر خود کو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کرتی تب اور بھی بری لگتی۔ اس وقت بھی رجاء اس سے پیچھا چھڑانے کا کوئی نسخہ سوچ رہی تھی کہ ایک لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی ان کے قریب آئی۔

"آپ فائنل پروف کی افشاں غفار ہیں نا۔"

"ہاں۔" افشاں حیران ہوئی تھی۔

"یہ نمبر لیں۔" اس نے ایک چٹ افشاں کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ مجھے کجل آنٹی نے دیا ہے۔" افشاں نے جھٹ دیکھی۔ اس پر "حسن ضیاء" اور سیل نمبر لکھا تھا۔

"میری نیبر ہیں وہ۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ آنہیں سکیں۔ انہوں نے یہ مجھے آپ کو دینے کا کہا ہے۔ حسن ضیاء آج کالج آیا ہے۔ اس کا فرسٹ ڈے ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیں گی۔ ایسا انہوں نے کہا۔" افشاں اس دوران متواتر مسکراتی رہی۔ لڑکی چلی گئی تو وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ عقیدت سے مخاطب ہوئی۔

"لو بھئی عقیدت' تمہارے جیسا ایک اور پیس آگیا۔ میری دور کی ریلیٹو کا بیٹا ہے' مماز بوائے۔ مما کی انگلی پکڑ کر چلنے والا۔ مجھے اس کی کیئر کا حکم ملا ہے۔ جیسے تمہاری مما نے صبح رجاء کو دیا' چلو بھئی۔ میں ڈھونڈوں حسن ضیاء کو۔ کہیں رو نہ رہا ہو۔" بڑے مزے سے کہتی وہ اٹھ گئی۔ "اللہ کرے آپا کو تین' چار حسن ضیاء مل جائیں۔ سارا دن ان کی کیئر میں گزر جائے۔" حمنی نے بڑے دل سے بددعا دی تھی۔

"چلو کیفے چلتے ہیں۔" عقیدت نے چپ چاپ ان کی تقلید کی۔

☼ ☼ ☼

اس دن کے بعد وہ اسے نظر نہیں آیا۔

ساری شادی کے دوران وہ منتظر رہی۔ کہیں سے بھی وہ اچانک آدھمکے گا۔ اور اسی بے خوفی سے کہے گا۔

"سنو۔ تم میرے حواسوں پر سوار ہو گئی ہو' میں تمہارے علاوہ کچھ اور سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ دیکھو۔ تمہاری اس چند روزہ محبت نے مجھے کیا سے کیا کردیا ہے۔ میرے دن' رات' میرے خواب و خیال' سب پر قابض ہو گئی ہو۔"

اور درحقیقت تو یہ اس کے اپنے دل کی کیفیت تھی۔ محض چند لمحوں کی دید اسے اپنا آپ فراموش کروا چکی تھی۔ وہ ماہی بے آب کی مانند ہو گئی۔ خود سے نگاہیں چرانے لگی۔ ان کی واپسی کے دن قریب آرہے تھے اور وہ تھا کہ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ فروغ ماہ کی بے چینی بڑھنے لگی۔ کہاں تو وہ گاؤں آنے پر تیار ہی نہیں تھی اور کہاں اب جانے کا سوچ کر دل گھبراہٹ میں مبتلا ہونے لگا۔ بھائی اسے زبردستی یہاں لے آئے تھے۔

"پلیز فروغ ماہ۔ انکار مت کرو۔ اس نے بہت اصرار سے بلایا ہے۔ یاسمین میکے گئی ہوئی ہے۔ ورنہ میں اسے لے جاتا۔" وہ جانتی تھی بھابھی کو میکے سے گاؤں لے جانا کوئی مشکل نہیں۔ بھائی محض اس کی وجہ سے مصر تھے۔ وہ بہت آدم بے زار واقع ہوئی تھی۔ ہجوم اور شور سے دور بھاگنے والی' اب جبکہ تینوں بھائی سر جوڑ کر اس کی شادی کا سوچنے لگے تھے تو ضروری تھا اس کی عادات میں تھوڑی تبدیلی بھی لائی جائے۔ ورنہ تو نشاط بھابھی کے بقول جوتیوں کے زور پر سسرال سے نکال دی جاتی۔ بڑی اکتاہٹ و بے زاری کے ساتھ وہ گاؤں آئی اور سب کچھ ہار گئی۔ وہ سحر طاری کرتا وجیہہ سا بندہ اسے اپنا اسیر بنا کر نہ جانے کہاں جا چھپا تھا۔

"میں کس سے پوچھوں' وہ کہاں ہے؟ وہ کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟" اتنا وہ جانتی تھی' وہ یقیناً بھائی کا دوست تھا اور یہ دوستی شاید گزشتہ کچھ عرصے سے پروان چڑھی تھی' ورنہ وہ ضرور اس کے متعلق معلومات رکھتی۔ تینوں بھائیوں کے۔ قریبی دوستوں کو مع اہلیہ کے وہ جانتی تھی۔ کیونکہ سب کی بے تکلفانہ ایک دوسرے کے گھر آمد و رفت تھی۔ مگر یہ یقیناً ان ہی کچھ دنوں میں بھائی کے حلقہ احباب میں شامل ہوا تھا۔

"یا خدا۔ مجھے صبر دے۔ یا اس سے ملوادے کہ مجھے سکون آجائے۔" اپنی حالت پر وہ خود حیران تھی۔ ایسی دیوانگی' ایسا جنون۔ محض چند لفظوں کے جرات اظہار کے بعد؟ کیا وہ اتنی کمزور تھی؟ یا یوں مقابل کھڑے ہو کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کسی مرد نے پہلی بار راہ روکی تھی۔ اور وہ پگھل گئی' ہار گئی۔

آج شادی کا دن تھا۔ ان کی واپسی آج شام بالکل صبح متوقع تھی اور دل ہر صورت اسے دیکھنے پر بضد تھا اور وہ بے بس۔

☼ ☼ ☼

"یہ لیجیے۔" شانزے اور علیزہ بڑے درد بھرے لہجے میں محو گفتگو تھیں' جب معیز نے ٹشو کا ڈبا علیزہ کے سامنے کیا۔ وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے تو نہیں چاہیے۔"

"اگلے پانچ منٹوں میں چاہیے ہوگا۔"

"وہ کیوں؟"

"جس دکھ سے آپ مسز انور کی تقریب اور پھر اپنے ریجیکشن کی اسٹوری سنا رہی ہیں۔۔۔ مجھے ڈر ہے پانچ منٹ بعد آپ دونوں گلے لگ کے دھاڑیں بھی مار رہی ہوں گی۔"

"خوامخواہ ہی۔۔۔" علیزہ کو بہت برا لگا۔۔۔ شانزے مسکرانے لگی تھی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن مجھے جلنے کی بو آرہی ہے۔"

"تمہاری ناک کا قصور ہے۔۔۔ ویسے سالہا سال بند رہتی ہے۔ جب سونگھتی ہے غلط سونگھتی ہے۔"

"کیا ہورہا ہے؟ معیز تم یہاں ہو مطلب علیزہ کا موڈ خراب ہے۔" خوشگوار سی مسکراہٹ کے ساتھ زینب لیونگ روم میں آئی تھیں۔ معیز کے بے ضرر مذاق علیزہ کی سمجھ سے ہمیشہ باہر رہتے تھے۔

"میں ایسے ہی بدنام ہوں مما۔۔۔ میں تو ان کی ہمت بندھا رہا تھا۔ حوصلہ دے رہا تھا۔"

"تم اپنی نیکیاں اپنے پاس رکھو۔۔۔ ہمیں نہیں بننا ہمت والا۔" حسب عادت علیزہ کے ہونٹ لٹک گئے تھے۔

"دیکھا دیکھا یہ آپ کے اندر کا درد بول رہا ہے۔ لگ رہا ہے آپ دکھی ہیں۔"

"زینب چاچی منع کریں نا اسے۔" اس بار علیزہ کے تاثرات حقیقتاً "روکھے ہوگئے۔ معیز کو ٹشو پیش کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے فوراً" ڈبا اٹھا کر اس کے سامنے لہرایا۔

"میں نہیں کہہ رہا تھا اس کی ضرورت پڑے گی۔۔۔ آنسو نکل ہی آئے۔" علیزہ نے ٹشو کا ڈبا جھپٹ کر دور کونے میں اچھال دیا اور ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گئی۔ لگ رہا تھا مزید نہیں بولے گی۔

"خود پر ظلم نہ کریں، رولیں۔۔۔ رونے سے دل کا درد کم ہوجاتا ہے، طبیعت فریش ہوجاتی ہے۔" علیزہ ہنوز خاموش رہی۔

"معیز۔۔۔" زینب نے گھر کنا مناسب سمجھا۔۔۔ ایسی کسی بھی چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ علیزہ کے دھواں دھار رونے کی صورت میں نکلتا تھا اور پھر علیزہ کی تندوتیز نظریں ہوتی تھیں اور زبان سے نکلتے طنزیہ گولہ بارود۔۔۔ بہتر تھا معیز کو چپ کرایا جائے۔ وہ دیورانی سے چونچ لڑانا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"مما آپ گواہ ہیں۔۔۔ میں ان کے ساتھ محض ہمدردی کررہا ہوں۔ مسز انور نے جلد آپی کو پسند کرلیا۔ ان کی لش پش تیاری رائیگاں گئی۔۔۔ میں تسلی کے دو بول بھی نہ بولوں۔"

"تمہاری بہن بھی تھی اس پارٹی میں۔" تڑپ کر علیزہ نے جیسے باور کرانا چاہا۔۔۔ کہ ہمدردی کی مستحق وہ اکیلی نہیں تھی۔

"ہاں تو میں دونوں کی بات کررہا ہوں نا۔"

"بائے دا وے وہاں خود کو پسند کروانے کے مقصد سے گیا کون تھا؟" شانزے کے میدان میں آنے کا مطلب تھا۔ معیز کی پسپائی، علیزہ پھر سے چارج ہوئی۔

"ہم تو خود کو خوش کرنے گئی تھیں۔" شانزے اور زینب بے ساختہ مسکرادیں۔ علیزہ کی خود کو خوش کرنے والی بات دوبارہ اس کے گلے پڑنے والی تھی۔

"آپ کوئی چوبیس گھنٹے گھر میں سڑتی رہنے والی ہاؤس وائف ہیں کیا؟ خود کو خوش کرنے کے لیے اس ٹائپ کی پارٹیز بھی جا گھسیں۔" علیزہ نے پھر سے ہونٹ سی لیے۔

"معیز تم جاؤ یہاں سے۔ اوٹگیاں بونگیاں مار رہے ہو۔"

"نیکی کا زمانہ نہیں رہا۔۔۔ میں ہمدردی۔۔۔"

"تم نے ہم سے ہمدردی کرلی۔۔۔ بہت شکریہ۔۔۔ اب جاؤ نورین تائی کے پاس۔ انہیں یقین دلاؤ مسز انور نے حبہ آپی کو ہی پسند کیا۔ انہیں سننے میں غلطی نہیں ہوئی۔ انہیں اس شاک سے باہر نکالو۔" یہ سراسر بے پر کی اڑائی تھی۔ شانزے نے۔۔۔ مسز انور کے فون کے بعد کہ انہیں حبہ پسند آگئی ہے اور وہ اس کے لیے آنا چاہ رہی ہیں۔ انہیں بے یقینی ضرور ہوئی تھی۔ لیکن بات صدمے بھری خوشی تک پہنچی تھی' شاک تک نہیں۔

"کیا شاک۔۔۔ کہاں کا شاک۔۔۔ ان کی بیٹی پسند آگئی ہے۔۔۔ وہ کسی ریڈیو کی طرح بج بج کر ہر سامنے آئے کو بتاتے نہیں تھک رہیں کہ کیسے حبہ آپی اول جلول حلیے میں گئیں۔۔۔ اور اس کے باوجود بھی پسندیدہ ٹھہریں۔۔۔ قسم سے مسز انور کی فون کال کے بعد میرا تین بار ان سے سامنا ہوا۔۔۔ تینوں بار انہوں نے اپنا یہ ریکارڈ پلے کیا۔۔۔ میں کسی قصوروار کی طرح سنتا رہا۔ کاش کہ ریڈیو کی طرح ان کا بھی آف آن کا بٹن ہوتا۔" تینوں خواتین معیز کی اس داستان پر ہنسنے لگی تھیں۔

"بہت برے ہو تم۔۔۔" ہنسی کے بیچ شانزے نے کہا۔

"لیکن تائی کا قصور نہیں۔۔۔ حبہ آپی غیر متوقع طور پر پسند آگئیں۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ آپ دونوں خواتین نے اس دن پارلر تک جوتے گھسا لیے تھے اور وہ جیسی بیٹھی تھیں ویسی چلی گئیں۔۔۔ اور روز بھی ہوئیں۔" نرگس عین اسی پل چائے لیے آئی۔ معیز نے بات کے بیچ اسے مخاطب کیا۔ "یار نرگس اس پر کوئی سوٹ ایبل مثال فٹ کرونا۔" چونکہ معیز کی آخری پوری بات وہ سن چکی تھی۔ اس لیے بے دھڑک بولی۔

"ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔"

"بالکل وہی۔۔۔ ویسے اس کی تشریح میں تم سے فری ٹائم میں پوچھوں گا۔" نرگس مسکاتی ہوئی واپس ہولی۔ حبہ کے رشتے کے لیے مسز انور کا آنا آج گھر کا ہاٹ ٹاپک تھا۔ وہ خود ابھی چائے بنانے کے دوران صفورا سے اسی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کر آئی تھی۔

"اور مما کہہ رہی تھیں۔۔۔ مسز انور سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ہی پسند کرتیں۔۔۔ چاہے وہ کالی ہوتی' چاہے سفید۔" علیزہ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ چائے پیتے معیز کو اچھو لگ گیا۔

"یہ بات آپ پہلے بتا دیتیں تو اب تک ہم دی اینڈ بھی کرچکے ہوتے۔۔۔ ساری باتوں کی ایک بات ہو جاتی۔" علیزہ ہونق بنی معیز کو دیکھتی رہی۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا اس نے۔۔۔ جبکہ شانزے اور زینب نے اپنی مسکراہٹ چائے کے کپوں میں چھپائی۔

☼ ☼ ☼

گھڑی کی ہر سرکتی سوئی ان کے احساسات کو ایک بار پھر منجمد کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ بس تھوڑی دیر مزید۔۔۔ اور پھر زکریا آجاتے۔۔۔ انہیں لگ رہا تھا اعصاب پھر سے بوجھل ہونے لگے ہیں۔۔۔ وہ پھر سے اندھے کنویں میں گرنے لگی ہیں۔

بے شک وہ پر کٹے پنچھی کی طرح قید مسلسل میں تھیں۔ زکریا کی کچھ دنوں کی غیر موجودگی بھلے ان کے لیے آزادی کا پروانہ نہیں بنتی تھی۔ لیکن ان کے احساسات جاگ جاتے تھے۔۔۔ وہ خود کو زندہ محسوس کرنے لگتی تھیں۔ زکریا نے ان کی زندگی کے قیمتی ماہ و سال زنگ آلود کردیے تھے۔۔۔ وہ ایک قید مسلسل میں آگئی تھیں اور ایک عرصہ بیت جانے کے باوجود یہ بات باعث آزار تھی کہ وہ عادی نہیں ہو پائی تھیں۔ ان کی تمنائیں' ان کی آرزوئیں' ان کے خواب سب زندہ درگور ہوچکے تھے' ان کے دل میں کہر زدہ موسم رہنے لگا تھا۔ ان کا دفاع مفلوج ہوچکا تھا۔۔۔ وہ پھر بھی تازہ ہوا کی متمنی تھیں۔۔۔ روشنی چاہتی تھیں۔۔۔ زندگی چاہتی تھیں۔۔۔ وہ اپنی قید کی عادی نہیں ہو پائی تھیں۔۔۔ مگر خود کو ایک دائمی اذیت میں جھونکنے کے بعد انہیں اب محسوس ہونے لگا تھا۔ روشنی کہیں قریب ہے۔۔۔ زندگی آس پاس سرگوشیاں کررہی ہے' امید ہاتھ پکڑنے کو منتظر کھڑی ہے۔ کوئی ہے جو ان کا درماں بن سکتا ہے۔۔۔ مسیحا۔۔۔ ہاں ان کا مسیحا۔۔۔

☼ ☼ ☼

"باجی آپ اتنی گولیاں تو نہیں نا کھاؤ' روز کوئی نہ کوئی پھانک رہی ہوتی ہو۔ قسم سے اندر جاکر جگر گردوں میں تیزاب بن جاتی ہوں گی' نرا نقصان۔" جمیلہ کی سمجھ جتنی تھی' وہ اس کے مطابق پریشان حال کھڑی تھی اور اپنی ڈاکٹری بھی دکھا رہی تھی۔

"یہ بلڈ پریشر کی ہے' روز لینی پڑتی ہے۔ اس کے نہ کھانے سے نقصان ہوتا ہے۔ کھا لینے سے نہیں۔" اماں کا بات کرنے کا بالکل بھی دل نہیں کررہا تھا۔ لیکن جمیلہ اتنی پریشان ہو رہی تھی کہ انہیں ناچار بولنا پڑا۔

جمیلہ دیکھ رہی تھی وہ عقیدت کو کالج چھوڑ آنے کے بعد سے چپ چپ تھیں۔ عجیب پژمردہ اور مضمحل سی۔۔۔ وہ توقع کررہی تھی اماں آتے ہی کالج کے نقشے کھینچنے لگیں گی۔ اسے عقیدت کی طرف سے مطمئن کریں گی۔ مگر وہ آتے ہی لیٹ گئیں۔۔۔ اور پھر شہریار کے فون کے بعد تو جیسے نیم جان ہوگئی تھیں۔ سر منہ لپیٹے دیر تک پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھیں بھی تو کوئی ٹیبلٹ کھانے کی خاطر۔۔۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

"باجی میں آپ کا سر دباؤں؟" باجی کے لیے کسی سہیلی کے جیسی جمیلہ بے چین ہوئی۔

"نہیں۔" انہوں نے سہولت سے منع کردیا۔ جمیلہ پھر بھی ان کے بستر کے پاس کھڑی رہی۔ وہ شاید کچھ سوچ رہی تھیں۔

"جمیلہ۔۔۔" پھر انہوں نے شکستہ آواز میں یوں پکارا کہ جمیلہ سرتاپا ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"جی باجی۔" وہ ان کی پائنتی کے کنارے ٹک گئی تھی۔

"شہریار کی فون کال کا عقیدت کو نہیں بتانا۔" وہ نہ بھی کہتیں تو بھی جمیلہ نہ بتاتی۔

"وہ پریشان ہو جاتی ہے۔۔۔ تحریم کی وجہ سے اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے اثر میں ہے۔"

"میں نہیں بتاؤں گی' فکر نہیں کرو۔" اماں چپ ہوگئیں۔ جمیلہ سے ادھر ادھر کی لایعنی باتیں کرنے والی اماں کے پاس گویا باتیں ہی ختم ہوگئی تھیں۔ یا یوں خاموش رہ کر وہ چاہتی تھیں جمیلہ اٹھ جائے۔ شاید انہیں تنہائی کی خواہش ہو رہی تھی۔

"کیا کہتے تھے شہریار بھائی؟" کہنے کے بعد جمیلہ نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ ان کے پاس بیٹھے رہنے کے لیے اس نے جس سوال کا انتخاب کیا تھا۔ وہ انتہائی غلط تھا۔ اماں کے ستے ہوئے چہرے پر دکھ ہلکورے لینے لگا۔ جمیلہ پوچھ کر پچھتائی۔

"تحریم کی زبان بول رہا تھا۔ مجھ سے جواب طلب کررہا تھا۔ مجھے میرے قصور گنوا رہا تھا۔" اماں نے بے تاثر لہجے میں یہ سب کہا۔ جمیلہ کے پاس خود کو لعن طعن کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اماں پھر خاموش ہو بیٹھیں۔ کچھ لمحے جمیلہ نے اس خاموشی کا ساتھ دیا۔ پھر لہجے میں اشتیاق سمو کر بولی۔

"اچھا چھوڑو باجی۔۔۔ آپ بی کا بتاؤ نا۔۔۔ کالج کیسا تھا۔۔۔ بی ڈر تو نہیں رہی تھی؟ جاتے وقت تو جان نکل رہی تھی اس کی۔" ایک گہری لمبی سانس لینے کے بعد اماں نے جب جواب دیا تو وہ اس کرب انگیز کیفیت سے مکمل طور پر

نکل چکی تھیں۔ انہیں خود کو سنبھال لینے میں ملکہ حاصل تھا۔ "مت پوچھو۔۔۔ وہاں بھی گھروالا حال تھا اور سچ پوچھو تو اس کا قصور نہیں۔۔۔ میں خود چکرا کر رہ گئی۔ کالج میں تو اور ہی دنیا تھی۔ لڑکیاں ماڈل فیشن کے مقابلے میں آئی ہوئی ہوں۔ ان کے کپڑے، جوتے، بال، میں خود گم سم، سوچو عقیدت کا کیا حال ہوگا۔"

"ہاں۔ پھر۔۔۔" اشتیاق سے سنتی جمیلہ یک بیک فکر مند ہوئی۔

"ہمارے والے زمانے گئے۔۔۔ یہ تو کوئی اور ہی دور آگیا ہے۔ میرے ذہن میں تو سالوں پہلے والا نقشہ تھا۔۔۔ پر اب سب بدل گیا ہے۔ ہم لوگ اب تک پچھلے کسی دور میں جیتے آئے ہیں۔ میں تو بہت ڈر گئی ہوں۔ پتا نہیں میری عقیدت اس سب کا مقابلہ کر پائے گی یا نہیں۔" کل تک جمیلہ اس لیے پرجوش تھی کہ اماں حوصلہ مند تھیں۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا جیسے وہ ان چیزوں کا حصہ رہی ہوں، یہ ساری دنیا دیکھ آئی ہوں، مگر اب ان کی یہ پریشان کن گفتگو جمیلہ کے اپنے ہاتھ پیر پھلا گئی۔

"مجھے تو لگ رہا تھا وہاں کوئی بھی عقیدت جیسی نہیں۔۔۔ نہ اتنی غریب اور نہ اتنی عجیب۔۔۔ اور جو موبائل فون انہوں نے اٹھا رکھے تھے۔۔۔ ان کی قیمت اتنی جتنے عقیدت کے دو، تین سالوں کے کپڑے لے لوں۔"

"اتنے مہنگے؟" جمیلہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"موبائل سے یاد آیا۔۔۔ عقیدت کے لیے بھی موبائل لینا پڑے گا۔ میں اب روز، روز تو نہیں آجاپاؤں گی۔ آخر کو اسے اکیلے آنے جانے کی عادت ڈالنی ہی ہوگی۔ موبائل ہوگا تو رابطے میں رہے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے باجی، چلو پھر ابھی چلتے ہیں۔"

"ابھی۔۔۔" اماں جمیلہ کے اتاولے پن سے واقف تھیں۔ پھر بھی حیران ہوئیں۔

"ہاں باجی۔۔۔ ابھی بلی کے آنے میں ٹیم ہے۔ کھانا واپس آکر بنالوں گی اور کچھ نہیں تو بلی کے کپڑے لے آتے ہیں۔ آپ دیکھ تو آئی ہو لڑکیوں کو۔۔۔ بلی کو کپڑوں کی زیادہ لوڑھ (ضرورت) ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، پر میں سوچ رہی تھی عقیدت کے ساتھ چلتے۔۔۔ اس کی پسند کی چیز لیتے۔" سن کر جمیلہ نے بڑے بے تکلفانہ قہقہے لگائے۔۔۔ اماں خود مسکرادیں۔

"باجی آپ بھی مخول کر رہی ہو۔ بلی کو سوئی تک خریدنا نہیں آتا۔ کپڑے، جوتے کیا لے گی۔۔۔ پہلے بھی تو ہماری پسند کے پہنتی ہے۔ اب بھی اعتراض نہیں کرے گی۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔ چلو میں پھر منہ دھو کے بال بنالوں۔ پھر چلتے ہیں۔" اماں خوشی خوشی اٹھ گئیں۔ جمیلہ کا مقصد پورا ہوا تھا۔ وہ انہیں فی الحال اداسی کے اثر سے نکالنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

روڈ پر ہارون کی پراڈو نہ جانے کتنی دیر تک لڑھکتی رہتی۔ اگر اس کی چمکتی دمکتی رام پیاری (گاڑی) روڈ کے ایک طرف کھڑی نظر نہ آجاتی۔

"بیٹا تیری تو میں۔۔۔" ہارون زیر لب بڑبڑایا تھا۔ یعنی وہ اور اس کی پراڈو سارے شہر میں خوار ہوئے اور وہ ملا بھی تو کہاں شہر کے اس پار۔۔۔ اس غلیظ سے ڈھابے پر۔

"سادھو کہیں کا۔۔۔ مراقبوں کے لیے ایسی جگہیں ڈھونڈتا ہے جہاں اس کے ملازم بھی نہ آئیں۔" اپنی کار ایک طرف پارک کر کے وہ مسلسل تاؤ کھاتا رہا۔ فائزہ آنٹی کا خیال نہ ہوتا تو وہ یوں اس کے پیچھے کبھی بھی نہ آتا کہ اس نے تو عادت ہی بنالی تھی ویرانوں کو چھاننے کی۔

شہربانو کے گھر پر تکلف لنچ کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا۔ جب فائزہ آنٹی کی کال موصول ہوئی۔

"ارے۔۔۔ آنٹی آپ؟" ہارون خوشگوار حیرت میں گرفتار ہوا تھا۔ یاد کے گھوڑے دوڑانے پر بھی وہ ناکام رہا کہ فائزہ آنٹی نے آخری بار کال کب کی تھی؟ سو اس کوشش کو بے کار جانتے ہوئے فوراً" پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

"میں پوچھنا چاہ رہی تھی۔۔۔ سنعان تمہارے ساتھ ہے؟" ان کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ رک رک کر پوچھ رہی تھیں۔ ہارون پر حیرتوں کے مزید پہاڑ ٹوٹے۔ فائزہ آنٹی کا فون۔۔۔ اور سنعان کی بابت جاننے کے لیے۔۔۔ اسے سنعان پر بے طرح پیار آیا۔ اس کی ذرا سی توجہ یہ رنگ لائی تھی۔

"نہیں آنٹی۔۔۔ وہ لنچ ٹائم میں ہی آفس سے اٹھ گیا تھا۔"

"اچھا۔۔۔" اسے لگا فائزہ مایوس ہوئی ہیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ وہ گھر نہیں آیا؟"

"نہیں۔۔۔"

"مجھے لگا وہ لنچ کرنے گھر آیا ہوگا۔"

"نہیں۔" فائزہ کی آواز مزید مدھم ہوگئی۔

"او کے میں کال کر کے دیکھتا ہوں کہاں ہے؟" اس نے گویا تسلی دینا چاہی۔

"اس کا نمبر بند جا رہا ہے۔" بڑا ہی خوش کن احساس تھا۔ آنٹی خلیج پاٹنے کو تھیں۔ وہ آج سنعان کو کال بھی کرتی رہی تھیں۔ جن جن محرومیوں پر سنعان غم زدہ رہتا تھا۔ ان کا ایک طرف سے ازالہ ہونے کی امید بندھی تھی۔ رہے زکریا صاحب تو وہ بھی ٹھیک ہوتے ہوتے ہو ہی جاتے۔

"آج زکریا کی واپسی ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے گھر نہیں آیا۔ آفس بھی اب نہیں جائے گا۔" وہ فکر مند تھیں۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔" اور اب وہ اس کے سر پر کھڑا خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔

"ہم نے کنوئیں میں بانس ڈلوا لیے۔ اور آپ یہاں پدھارے ہوئے ہیں؟" سنعان ہونٹ بھینچے اسے دیکھنے لگا۔ ایک شاہانہ قسم کی تنہائی میں وہ مخل ہوا تھا' اسے برا لگا۔

"تو پچھلے کسی جنم میں تیری اوقات یہ تو نہیں تھی؟" عین اس کے سامنے بیٹھ کر ہارون نے عادتاً" پھلجھڑیاں چھوڑیں۔ سنعان بے تاثر نظروں سے دیکھتا رہا۔

"ضرور تو ایسے ہی کسی ڈھابے' کسی دو نمبر' دو چھتی کے ہوٹل کا چھوٹا رہا ہوگا۔ میز میز دوڑتا' کالی بھجنگ کرسیاں اور پیالیاں صاف کرتا۔" وہ اگر سمجھ رہا تھا کہ وہ مذاق کررہا ہے' تو بھونڈے مذاق کررہا تھا۔ یقیناً" کہ سنعان کے تاثرات میں سرمو فرق نہ آیا۔

"یار کیا ہے۔ تیرے پیچھے لور۔ لور پھرتے' میں اپنی قیمتی گاڑیوں کا ستیاناس مار چکا ہوں۔ یہ بارہویں ہے جو تو دیکھ رہا ہے۔" اس نے دور کھڑی پراڈو کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"گیارہویں وہ تھی۔ جو میں نے اسی رات لی تھی' جس رات تو یوں ہی جنگلوں میں نکل بھاگا تھا۔ اور وہ اسی رات ہی تجھے ڈھونڈنے کے چکر میں ڈاکوؤں کو دان کردی تھی۔ ہاتھ' پاؤں' منہ باندھ کے ڈاکو بھائی مجھے اسی جنگل میں چھوڑ گئے تھے جہاں تو مراقبے میں تھا۔"

"میرے پیچھے مت آیا کرو۔" سنعان کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"حضور والا۔ آج تو بالکل بھی نہ آتا۔ لاسٹ ٹائم تمہیں ڈھونڈتے ہوئے جو مجھے جان کے لالے پڑ گئے تھے اس کے بعد تو میں نے تجھے طلاق دے دی تھی۔ یہ تو آج فائزہ آنٹی کا فون آگیا۔" آخری بات پر سنعان نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے آنا پڑا۔"

"مما کا فون۔" اسے بے یقینی نے گھیر لیا۔

"جی بیٹا۔ مما کا؟"

"کیا کہتی تھیں؟" اسے ہلکی سی بے چینی لاحق ہوئی۔

"تجھے فون کیا' مگر وہ بند جا رہا تھا' پھر مجھے کیا' وہ تیرا لنچ پر انتظار کررہی تھیں۔" سنعان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اس نے بے ساختہ گہری سانس لی تھی۔

"ہو گیا نا مالیخولیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ہارون کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو یہ کیا ہوتا ہے۔

"یہ ایک طرح کی بیماری ہے۔ جو تب ہوتی ہے جب وقت گزر جاتا ہے۔ اسے پچھتاوا بھی کہتے ہیں۔" ہارون نے چہک کر وضاحت کی۔ سنعان بے وجہ یہاں وہاں دیکھنے لگا۔

"نہ تجھے غم کیا ہے۔ آج یہ بتا؟" پھر اس کی خاموشی سے چڑ کر ہارون نے شہادت کی انگلی باقاعدہ میز پر بجا کر کہا۔ سنعان پھر بھی چپ رہا۔

"لوگ غم بھگانے کے لیے کیسی کیسی جگہوں پر جاتے ہیں' خوشبودار' رنگ دار' ذائقے دار۔" سنعان نے دیکھا۔ آنکھ مارنے کے بعد وہ مزید شروع ہوا تھا۔ "خانم کی کوٹھی۔ زمرد کا بنگلہ۔ اور نہیں تو پھر پچھلی کالونی۔ اور تجھے ملتے ہیں یہ ڈھابے' جنگل' صحرا۔" ہر کوشش رائیگاں گئی۔ سنعان کا آسن پھر بھی نہ ٹوٹا۔ ہارون ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

"گھر چل نبی۔ آنٹی پریشان ہورہی تھیں۔" بڑی زہریلی سی مسکراہٹ نے اس کے دلفریب چہرے پر قبضہ جمایا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ ٹھیک ہورہی ہیں یار۔ انہیں تمہاری فکر ہورہی ہے۔"

"صرف اپنی خاطر۔"

"میں ان دونوں انسانوں سے دور رہنے کے باوجود ان دونوں کو ان سے زیادہ جانتا ہوں۔ اگر میری ماں آج میری فکر پال رہی ہے تو صرف اپنی خاطر۔ ضرور ان کا کوئی مفاد ہوگا۔"

"شاباش۔ اب تو پیچھے ہٹ جا۔" ہارون نے طنز کیا۔

"وہ ٹھیک ہورہی ہیں۔ ہونا چاہ رہی ہیں۔ تو ساتھ دے ان کا' نہیں امید دلا یار۔"

"ان کے رائٹ مین پہنچتے ہی ہوں گے۔ وہ پھر سے سنعان کو بھول جائیں گی' وہ پھر سے بیمار پڑ جائیں گی' وہ پھر سے مظلوم بن جائیں گی۔"

"تجھے آنٹی سے زیادہ علاج کی ضرورت ہے۔" ہارون نے دانت پیسے۔ وہ چپ ہو گیا۔

"چل یار۔ گھر چل۔ یا تیرا شاہی لنچ آرہا ہے؟" ہارون کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بادشاہ سلامت آرہے ہیں۔" اس کا اشارہ زکریا کی آمد کی طرف تھا۔ ہارون نے ان سنی کردی بات۔

"چل تیری رام پیاری پر چلتے ہیں۔ میں اپنی گاڑی بعد میں منگوا لوں گا۔ اغوا ہونے سے بچ گئی تو۔" سنعان نے مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

حلق پھاڑ کر آلکسی سے جمائی لیتی سحر نے جب صحن میں قدم رکھا۔ شاداں روٹیاں دسترخوان میں باندھ کر باٹ باٹ میں رکھ رہی تھی۔ جلال چارپائی سے رسی کی مدد سے بندھا سجدے میں گرا ہوا تھا۔ بار بار اس کی طرف دیکھتی شاداں کی نظروں کا ترحم سحر سے چھپا نہ رہا۔

"اپنی روٹیاں باندھو اور جاؤ۔" شاداں نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی۔ آج جلال مکمل طور پر سحر کے رحم و کرم پر تھا۔

عالم صاحب بحالت مجبوری برکت منشی اور اپنے ایک جاننے والے کے ہمراہ شہر گئے ہوئے تھے۔ پیچھے جلال کے ساتھ دتو کو چھوڑ کر۔ لیکن دتو ان سے زیادہ سحر کی مانتا تھا۔ سحر مٹھی گرم کرتی۔ عالم صاحب کے کئی کاموں سے جی چرا لیتا۔ ابھی بھی سحر نے اسے کہیں چلتا کردیا تھا۔

کنیز دو دن سے آنہیں رہی تھی۔ اس کی اماں بیمار تھی۔ جلال گویا تن تنہا تھا۔ اسے دیکھ کر سحر کی انسانیت مر جاتی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد پہلے جلال کو باندھا' پھر سونے چل دی۔ اور اب دن کے کھانے کے وقت جاگی۔ جلال سرد و گرم سے بے نیاز چارپائی سے بندھا بیٹھا تھا۔ اس پر فاتحانہ سی نظر ڈالتے ہوئی سحر پر انکشاف ہوا وہ غلاظت میں بیٹھا ہے۔ سارے میں ناگوار پھیلی ہوئی تھی۔ سحر کا دماغ الٹ گیا۔

دتو' کنیز کوئی نہیں۔ اور شاداں کو وہ اپنے ہاتھوں سے بھیج چکی تھی۔ اب اس مفلوج کی غلاظت کیسے صاف ہوتی۔

"ذلیل' منحوس مرن جوگا۔ میری جان کو آگیا۔ انسانوں کے رہنے لائق نہیں چھوڑا اس گھر کو۔ کوئی جھانکنا گوارہ نہیں کرتا اور میں اس بدنصیب کے ساتھ جراثیموں میں پل رہی ہوں۔" کوئی دوسری سوچ ذہن میں لائے

بغیر گالیاں اگلتی وہ اس مفلوج اپاہج کو ٹانگوں اور ٹھڈوں سے پیٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کے وقت اماں کے ساتھ جمیلہ کو اور وہ بھی لدا پھندا دیکھ کر اسے اچنبھا نہیں ہوا۔ جتنی وہ اماں کی چہیتی تھی اسے یقین تھا اماں اسے کالج دکھانے کے بہانے لا کر رہیں گی۔ لیکن آج ہی لے آئیں گی یہ نہیں پتا تھا۔

سوبائدہ اور حمنی لوگوں کو اماں سے پھر کبھی ملوانے کا سوچتی وہ بھاگ کر ان سے پہلے چنگ چی میں جا بیٹھی کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی گاڑیوں بیچ یہ "پھٹ پھٹی" اسے دن کی آخری شرمندگی بخشنے والی تھی۔

"ٹلی... ہم شاپنگ کرنے گئے تھے۔ قسم سے تیرے لیے ایسے ایسے کپڑے لیے تو دیکھے گی تو پاگل ہو جائے گی۔ موبائل بھی لیا ہے۔ کیمرے والا تو نہیں ہے۔ پھر اچھا ہے، تجھے خوش کرے گا۔"

اماں کے چہرے پر مسکراہٹ چپک سی گئی تھی اور وہ پڑھائی سے زیادہ خود پر کڑھتی رہنے کی اتنی زیادہ ذہنی مشقت کر آئی تھی کہ جمیلہ کی کوئی بھی بات ڈھنگ سے نہیں سن سکی اور جمیلہ اتنی پرجوش کہ گھر پہنچنے تک پوری شاپنگ الف تا یے بنا دکھائے ایسے بتاتی رہی کہ اسے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

کھانا بنانے کا وقت نکل چلا تھا۔ دونوں بازار سے کھانے کا بھی کچھ انتظام کر آئی تھیں۔ عقیدت نے گھر داخل ہوتے ہی چادر، جوتوں سے خلاصی پائی۔ بیگ کتابیں صوفے پر پٹخیں، سر بھاری اور رنگت دہک رہی تھی۔ اسے شدید آرام کی طلب ہو رہی تھی۔ مگر اماں اور جمیلہ شاپروں کے منہ کھول بیٹھیں۔ سارے ریڈی میڈ کپڑے تھے۔ ایک نئی جوتی بھی تھی۔ سب سے آخر میں جمیلہ نے موبائل کا ڈبا اس کی آنکھوں کے آگے نچایا۔

"دیکھو ذرا... اپنی ٹلی موبائل والی ہو گئی۔" سارا کچھ اس نے کوفت و بے زاری کے ساتھ دیکھا تھا۔

"بے کار میں اتنے پیسے لگا دیے۔" اسے خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔

"نہیں... بہت سستا ملا ہے۔"

"میں نہیں استعمال کروں گی۔" جو بات کل کرنی تھی وہ آج سہی۔

"وہاں پر یہ ضرورت ہے کام آئے گا۔ تجھے دیر سویر ہو جائے تو ہمیں بتا دیا کرے گی۔"

"ضرورت نہیں... کیونکہ میں کالج نہیں جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ اماں اور جمیلہ ٹھٹکیں۔

"میں آگے نہیں پڑھوں گی۔ مجھے زبردستی نہیں پڑھنا۔" کالج کے پہلے ہی دن ایسی جی داری۔ ٹھوس لہجے میں لفظ لفظ کہتی وہ کمرے میں گھس گئی۔ اماں کو لگا انہیں سننے میں مغالطہ ہوا۔ مگر جمیلہ بھی منہ کھولے ہوئے تھی۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

رابعہ افتخار

"ڈیڈی کی وفات کے بعد تو امی بالکل ہی سٹھیا گئی ہیں۔ حد ہو گئی کل آپا کی فیملی کے سامنے میری وہ انسلٹ کی ہے کہ خدا کی پناہ۔" سوہا نے ہلکے ہلکے سر دباتے ہوئے کہا۔ فیاض نے ریموٹ سے چینل تبدیل کرتے ہوئے ہمدردی اور محبت سے اس کی سمت دیکھا۔ پچھلے بیس برس سے وہ اس کے بوڑھے والدین کی خدمت کر رہی تھی اور ہر بار ان کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر خاموش ہو جاتی تھی۔ ڈیڈی کی وفات کے بعد امی کا ذہنی توازن پہلے جیسا نہ رہا تھا وہ بے حد چڑچڑی ہو گئی تھیں اور بات بات پر سوہا کو ڈانٹنے لگتی تھیں۔

"میں جانتا ہوں سوہا کہ تم تھک جاتی ہو' لیکن مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ بھائی جان بھی پردیس میں بیٹھے ہیں اور آپا کے شوہر کے مزاج سے تو تم واقف ہی ہو۔" وہ پوری دلچسپی سے میچ دیکھ رہا تھا' لیکن سوہا کو پریشان دیکھ کر ساری دلچسپی غائب ہو گئی۔

"کیا کروں آپ سے بات بھی نہ کروں تو کیا کروں؟ اب دیکھیں نا کل آپا کی فیملی کے سامنے اتنا اونچا اونچا بولنے لگیں کہ خدا کی پناہ' کہنے لگیں کہ ایک مہینہ ہو گیا ہے کسی نے میری کنگھی نہیں کی۔

میں اکیلی جان کیا کیا کروں؟ لڑکے دونوں ہاسٹل میں ہیں کہ وہ گھر ہوں تو میری کچھ مدد کروا دیں اور عائشہ کو بھی آپ نے اتنی کم عمری میں بیاہ دیا' بے چاری گھر اور سسرال کے جھمیلوں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔"

"اچھا کچھ سوچتا ہوں۔ اس معاملے میں' باہر کے لوگ اچھے رہتے ہیں نا کہ "اولڈ ہوم" تو ہیں۔" فیاض نے دوبارہ ریموٹ اٹھا لیا۔

"خیر اب میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا فیاض۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میں نے کب کہا۔ کل آپا سے بھی مشورہ کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں۔" فیاض کے ذہن میں خیال آیا۔

"رہنے دیں' وہ تو کہیں گی کہ بھاوج پر بوجھ ہے ہماری ماں۔" سوہا نے منع کر دیا۔

اگلی صبح فیاض خود ہی بریڈ اور مکھن کا ناشتا کر کے کام پر چلا گیا۔ سوہا اٹھی تو امی اپنے بیڈ پر لیٹی چھت کو گھور رہی تھیں وہ دودھ گرم کر کے ان کے پاس ہی آ بیٹھی۔

"امی دودھ پی لیں۔"

"ہاں بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ نقاہت سے بولیں۔ سوہا کی نظریں گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ امی جب صحت یاب تھیں تو فجر کی نماز کے بعد چائے پیا کرتی تھیں اور پھر پورے آٹھ بجے ناشتا بھی کر لیتی تھیں' اسے کچھ شرمندگی سی ہوئی۔

"چلیں شاباش آپ دودھ پی لیں۔ کام والی ماسی آ گئی ہے' میں اسے کام سمجھا کر ابھی آئی۔ آج پورچ کا فرش سرف ڈال کر دھلوانا ہے۔" وہ دودھ کا کپ ان کے پاس رکھ کر اٹھ گئی۔ تقریباً" آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آئی تو دودھ کا کپ جوں کا توں رکھا تھا اور اس کے اوپر موٹی سی بالائی کی تہ بھی جم چکی تھی۔

"کیا ہوا امی! آپ نے دودھ نہیں پیا؟"

"ہاں تو کیسے پیٹی' میری کمر کے پیچھے تکیہ تو رکھو۔ میں اٹھ کر خود تو نہیں بیٹھ سکتی۔" ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کمزور جھریوں والے ہاتھ دوپٹے سے آنسو صاف کرنے لگے۔

"اچھا چلیں میں رکھ دیتی ہوں۔" اس نے غصہ ضبط کیا اور انہیں بٹھانے لگی۔

"دودھ بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے' نہ کھانے کا مزا ہے نہ پینے کا۔ ارے تمہیں خود تو عقل آئے گی نہیں کہ ڈھنگ سے کیسے کام کرتے ہیں۔ نا دودھ کے کپ کے نیچے پلیٹ رکھی نا اوپر سے ڈھکا۔" وہ شروع ہو گئیں۔ سوہا کا جی چاہا کہ کپ اٹھا کر زمین پر دے مارے' لیکن خاموشی سے ——— انہیں دودھ کا کپ تھما کر باہر نکلی۔

ڈرائیور کے ہاتھ فیاض نے سارا سودا سلف بھیج دیا تھا مالی بھی باغ کی صفائی کے لیے آگیا' ماسی نے صفائی ختم کی اور کپڑے استری کرنے لگی۔

"زلیخاں بھئی کل مشین لگا لینا' امی کے کمرے سے دوائیوں کی بہت بو آرہی ہے۔ ان کی بیڈ شیٹ بھی اتار لینا اور امی کو نہلا کر ان کے کپڑے بھی تبدیل کروا دینا۔ میں تمہیں تنخواہ کے ساتھ اضافی رقم دے دوں گی۔" قیمہ پکانے کی تیاری کرتے ہوئے اس نے زلیخاں کو مخاطب کیا۔

"جی باجی کر دوں گی۔" وہ سعادت مندی سے بولی۔

"یہ مالی کو پیسے دو' قریب کے تندور سے روٹیاں لے آئے گا۔ اتنی گرمی میں کون چولہے کے سامنے کھڑا ہو۔ یہ ہانڈی بن جائے بہت ہے۔" اس نے فریج کے اوپر رکھے پیسے زلیخاں کو تھماتے ہوئے کہا۔

"بڑی مصروف ہو سوہا' دو گھڑی آکر پاؤں ہی دبا دو۔" امی کے کمرے سے آواز بلند ہوئی۔

"لو جی۔ اب باقی کے سارے کام کون کرے گا جو میں ان کے پاؤں دبانے بیٹھ جاؤں تو؟" وہ بڑبڑانے لگی۔ برتن دھونے والی چھوٹی فرشتہ بن کر آئی۔

"چھوٹی۔ برتن کچھ دیر ٹھہر کر دھو لینا' جا کر امی کے پاؤں دبا دو۔ پورے دو سو روپے دوں گی' فارغ ہو کر ذرا میرے بھی پاؤں دبا دینا سارا دن بھاگ بھاگ کر دکھنے لگتے ہیں۔" اس نے چھوٹی کو لالچ دیا۔ وہ جھٹ کیبنٹ سے زیتون کے تیل کی شیشی نکال کر امی کے کمرے میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

چائے کا مگ ہاتھ میں لیے موبائل کان سے لگائے وہ سکون سے بیٹھی آپا سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ سکون اسے اس وقت ہی نصیب ہوتا تھا جب امی سو رہی ہوتی تھیں۔

"کیا بتاؤں آپا میں تو گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہوں کوئی مزا رہا ہی نہیں زندگی میں۔ عافیہ تک کو ملنے نہیں جا سکی میں۔" وہ اپنے دکھڑے رو رہی تھی جب فیاض گھر میں داخل ہوا۔ اس کی آمد کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ارے یہ تو میری عقل مندی ہے کہ برتن دھونے کے لیے میں نے چھوٹی کو رکھ لیا ورنہ یہ زلیخاں تو چھ' سات ہزار تک پڑ جاتی مجھے۔ ایک کام کے پندرہ سولہ لیتی ہے کم بخت' چھوٹی کو تو میں سو دو سو کر کے دیتی ہوں۔ بے چاری کپڑوں اور کھانے' پینے کے لالچ میں آجاتی ہے۔" فیاض نے تعریفی نظروں سے اس کی سمت دیکھا کیسے اس نے ہر چیز کو سنبھالا ہوا تھا۔

"ارے آپا مالی اور ڈرائیور تک سے خوش اخلاقی سے بات کرنی پڑتی ہے صرف اپنے مطلب کے لیے۔ کباب اور چائے کی تواضع کے بعد باہر کا ہر کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔" اس کی عقل مندی پر فیاض مسکرانے لگا۔

"ہاں امی بہتر ہیں۔ دعا کریں۔" اس نے فون بند کر دیا۔ فیاض کی مسکراہٹ سے وہ سمجھ گئی کہ کوئی بات اچھی لگی ہے اسے۔

"آپ فریش ہو جائیں' میں کھانا لگاتی ہوں۔ امی تو سو رہی ہیں۔"

"ارے نہیں کھانے کو چھوڑو' چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔" فیاض کا موڈ اچھا تھا اور یہ بات تو بہت ہی اچھی لگی تھی اس نے۔

"مگر امی۔؟" سوہا اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹی۔

"میں نے زلیخاں کو روک لیا ہے' جب میں آرہا تھا تو وہ سامنے والے گھر سے کام کر کے نکل رہی تھی۔ آرہی ہے وہ' واپسی پر اس کے لیے بھی کچھ لے آئیں گے خوش ہو جائے گی۔" فیاض تو بہت ہی مہربان ہو رہا تھا۔ سوہا خوشی سے تیار ہونے چل دی۔

لانگ ڈرائیو کے بعد شاندار ساڈنر کرنے کے بعد انہوں نے زلیخاں کے لیے کاٹن کا سوٹ خریدا اور فروٹ چاٹ پیک کروائی۔ گھر پہنچے تو وہ امی کے پیروں میں بیٹھی نیند سے اونگھ رہی تھی' امی نقاہت سے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھیں۔

"زلیخاں بھئی بہت شکریہ۔ یہ لو اور گھر جاؤ بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔" سوہا نے اسے شاپر تھمائے تو وہ خوشی سے چلی گئی۔ فیاض امی کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے امی؟"

"بھوک لگی ہے۔" وہ بہت نقاہت سے بولیں۔

"میں امی کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔" سوہا باہر نکل گئی۔

"روٹی کھانی ہے فیاض۔" بہت نحیف آواز میں بولیں۔

"نہیں امی ڈاکٹر نے آپ کو روٹی منع کی ہے۔" وہ انہیں پیار سے سمجھانے لگا۔

"بھلا روٹی کھانے سے بھی کوئی مرتا ہے۔ تم تو چاہتے ہی یہ ہو کہ مر جائے بڑھیا' ہمیں آزادی مل جائے۔ عیش کریں۔ آج محتاج ہو گئی ہوں نا۔ تو ۔۔۔" وہ اونچا اونچا بولنے لگیں۔

"اُفوہ امی۔ آپ کے پاس تو دو گھڑی بیٹھ جاؤ شروع ہو جاتی ہیں آپ۔ دشمن نہیں ہیں آپ کے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"امی جوس۔" سوہا نے گلاس ان کے سامنے کیا۔

"زہر لا دو مجھے۔" گلاس کو ایک جھٹکے سے پھینک کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ وہ گلاس کی کرچیاں اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"سوہا۔ یار وہ مالی کے ساتھ ایک عورت آرہی ہے' امی کے لیے میڈ رکھی ہے میں نے' ذرا دیکھ لینا۔" فیاض کا فون آیا تھا۔ وہ امی کے لیے ہی سوپ تیار کر رہی تھی۔ اپنے لیے تو اس نے فون کر کے کھانا آرڈر کر دیا تھا۔ وہ اکثر ایسا ہی کیا کرتی تھی۔

"جیسی بھی ہوئی رکھ لوں گی۔" وہ دل میں پختہ ارادہ کرتی ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ تقریباً" آدھے گھنٹے بعد ہی مالی اور ایک عمر رسیدہ خاتون اندر داخل ہوئے۔

"توبہ۔ اس کی تو اپنی ٹانگیں قبر میں ہیں' یہ کیا سنبھالے گی؟" اسے فیاض پر بے حد غصہ آیا' یہ ہی ملی تھی انہیں۔

"باجی جی یہ عنایت صاحب کے گھر کام کرتی تھیں۔ ان کی بیوی کی دیکھ بھال کرتی تھیں اب وہ فوت ہو گئیں یہ بے روزگار ہو گئی۔ بھائی جان نے کہا تھا میں نے اس کی بات کی یہ راضی ہو گئی۔ بھائی جان نے پانچ ہزار کا کہا ہے مان گئی ہے' آپ کام سمجھا دیں۔" ملی نے ساری تفصیل بتادی۔ عنایت صاحب ان کی کالونی میں ہی رہتے تھے۔

"نام کیا ہے بھئی؟" سوہا نے دیکھا وہ سارے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

"یاسمین نام ہے جی میرا۔"

"تمہیں پتا ہے نا کہ اب یہیں رہنا ہے مہینے بعد چھٹی دوں گی صرف دو دن کی بہت سخت ڈیوٹی ہے۔ امی رات کو بھی جاگتی ہیں۔ تنخواہ کے ساتھ کھانا کپڑے اور باقی ضرورت کی چیزیں بھی ملیں گی۔"

"جی باجی مجھے پتا ہے۔" وہ پہلے بھی میڈ رہ چکی تھی جانتی تھی۔

"فیملی کہاں ہے تمہاری؟"

"لاہور میں ہے جی' دو بیٹے ہیں گھر والے' بیٹی کی بھی شادی کردی ہے۔" وہ اپنے بارے میں بتانے لگی۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی نمی تھی۔ یوں جیسے بس آنکھوں میں یہ چند قطرے ہی بچے ہوں اور انہیں وہ جھپک جھپک کر اندر اتار رہی تھی۔

"چلو۔ کوئی ذمہ داری تو نہیں ہے نا بے فکری سے رہو۔" سوہا مطمئن سی ہو گئی۔

"اچھا ہے نا اپنی ہم عمر کے ساتھ امی کی دوستی بھی ہو جائے گی زیادہ تنگ نہیں کریں گی۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی وہاں سے اٹھ گئی۔

"میں تمہارا بستر امی کے کمرے میں سیٹ کروا دیتی ہوں کھانا اور دوائیاں بھی سمجھ لو آسانی رہے گی۔" وہ امی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

"لو امی تو سو رہی ہیں تم یہ ڈائٹ شیڈول سمجھ لو اور ہاں دوائی بھی وقت پر دینی ہے۔" وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی ادویات اٹھا اٹھا کر سمجھانے لگی۔

"زیادہ ٹھوس غذا نہیں کھا سکتیں تو تم ایسا کرو کہ ملک شیک بنا دیا کرو۔ دودھ پتی یا پھر دلیہ کسٹرڈ وغیرہ۔" اسے سب کچھ سمجھا کر وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ ایک بوجھ سا تھا جو دماغ سے سرک گیا تھا۔

"جی باجی۔" اس نے اپنے جھریوں زدہ ہاتھ سے اپنا بدرنگ دوپٹا ٹھیک کیا اور وہیں قالین پر بیٹھ گئی۔

"امی انہیں کی تو ذرا دوستانہ انداز میں بات چیت کرنا۔"

"جی باجی آپ فکر ہی نہ کریں۔" وہ اپنے دوپٹے کے کونے سے کچھ کھول رہی تھی۔ پلو میں بندھی دوائی اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ سوہا مطمئن سی ہو کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

یاسمین کے آنے سے تو جیسے سوہا کا سارا بوجھ ہی اتر گیا تھا۔ دن میں دو بار امی کے کمرے میں جھانک کر ان کی خیریت معلوم کر لیتی تھی۔ یاسمین انہیں وہیل چیئر پر بٹھا کر لان کی سیر بھی کرواتی تھی۔ اس کے ساتھ امی اپنی ماضی کی باتیں بھی کرتی تھیں۔ کھانے پینے میں بھی پہلے سے بہت بہتری آئی تھی۔

"بھئی فیاض یہ یاسمین کے آنے سے امی بھی خوش ہیں۔ میرا تو دماغ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔" سوہا مزے سے چائے کا کپ لے کر فیاض کے پاس آبیٹھی۔

"اچھی بات ہے نا اب تمہیں جہاں جہاں جانا ہے تم ہو آؤ۔ عافیہ کی طرف چکر لگا آؤ ——— اور اگر شاپنگ کرنی ہے تو میرا اے ٹی ایم کارڈ تو تمہارے پاس ہی ہے۔" فیاض اسے خوش دیکھ کر خوش تھا۔

"پہلے دن بے چاری یاسمین کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہ امی کو کیا سنبھالے گی اتنی کمزور اور بوڑھی عورت۔ لیکن وہ تو بہت پھرتیلی ہے بھئی۔"

"ہوں۔ شروع سے ہی مزدوری کرتی ہے۔ یہ غربت انسان سے بہت کچھ کرواتی ہے سوہا۔ جب تک سانس ہے پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہے نا۔" فیاض کی بات پر وہ سر ہلانے لگی۔ اتنے دنوں میں یاسمین کے گھر سے

کوئی فون نہیں آیا تھا۔ سوہا کو حیرت تھی کہ اس کے بچے ایسے کیوں ہیں' اپنی ماں کی خیر خیریت بھی معلوم نہیں کرتے۔

"یاسمین۔ تمہارے پاس موبائل ہے؟" اس روز امی کے سونے کے بعد وہ لان میں بیٹھی پرانے سے موبائل پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نمبر ملا رہی تھی جب سوہا نے اسے دیکھ لیا۔

"جی باجی۔" وہ بیٹے کا نمبر ملا رہی تھی۔

"میں تو پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ اگر تمہارے پاس موبائل نہیں ہے تو بتاؤ تمہیں لے دوں۔ بچوں کی یاد تو آتی ہوگی۔"

"ماں ہوں نا جی۔ کیسے بھول سکتی ہوں۔ آپ کے ہاں اچھے اچھے کھانے کھاتی ہوں تو سوچتی ہوں پتا نہیں غریبوں کو آج مزدوری بھی ملی ہوگی کہ نہیں۔" وہ رونے لگی۔ وہی خشک آنسوؤں والا رونا۔

"آخر اپنا بھی تو پیٹ بھرتے ہیں نا۔ ایک تم ہی بوجھ ہو ان پر۔" سوہا کو برا لگا۔

"اولاد کبھی بھی ماں باپ پر بوجھ نہیں ہوتی باجی ہاں ماں باپ بوجھ بن جاتے ہیں۔ ماں تو بچے کا گند بھی صاف کرتی ہے' اسے دودھ بھی پلاتی ہے اور اس کو سینے سے لگا کر مسکراتی بھی ہے لیکن اولاد ــــ اولاد کے لیے ماں باپ کبھی کبھی سردرد اور بوجھ بن جاتے ہیں۔" وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ سوہا کو عجیب سے احساس نے آگھیرا۔

"انسان مٹی میں گندم بیجے گا نا باجی تو گندم ہی کاٹے گا آج میں انہیں بوجھ لگتی ہوں تو کل کو انہیں بھی ان کی اولاد بوجھ سمجھ کر پھینک دے گی۔" آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ سوہا کو محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا گریبان تھامے کھڑا ہو۔

"بولو سوہا تم بھی تو فیاض کی ماں کو بوجھ سمجھ رہی ہو نا۔"

"آپ کی امی بھی بہت اچھی ہیں جی' بس بیماری سے چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ بہت فکر کرتی ہیں آپ سب کی۔ آپ کمرے میں نہیں جاتیں تو مجھ سے بار بار پوچھتی ہیں کہ کہاں گئی ہے؟ میں پوچھتی ہوں کون؟ تو نام بھول جاتی ہیں پھر کہتی ہیں وہی جو تم سے پہلے مجھے دودھ گرم کرکے دیتی تھی' میرے کپڑے بدلتی تھی۔ میری بیٹی۔ نہیں بہو اس گھر کی مالکن۔" سوہا کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ تو اتنے اتنے دن امی کی کنگھی نہیں کرتی تھی۔ ان کے کپڑے تبدیل نہیں کرواتی تھی۔

"وہ تو مسافر ہیں جی۔ بس منزل قریب ہی ہے بس ایک دو برس کی مسافت باقی ہوگی یا پھر ایک دو مہینے کی۔ کسے خبر ہے؟ اصل مالکن تو آپ ہی ہو جی۔ پر انہیں پھر بھی آپ سب کی فکر ہے۔" وہ بول رہی تھی۔ اندر سے امی کی کھانسی کی آواز آئی۔

"جاگ گئی ہیں شاید۔ میں چائے بنا دوں۔" یاسمین آنکھیں صاف کرتی اٹھی۔

"نہیں۔ آپ بیٹھیں۔ آج میں چائے بناتی ہوں۔ آپ کو بھی دیتی ہوں اور امی کو بھی یہیں لان میں لے آتی ہوں' تینوں مل کر چائے پئیں گے۔ میری ماں مجھ پر بوجھ تھوڑی ہے۔" وہ بہت مضبوط لہجے میں بولی تھی اور مسکراتے ہوئے امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ یاسمین کے چہرے پر بھی ممتا کی مسکراہٹ چھلکنے لگی تھی۔ شاید یہ احساس میری اولاد کو بھی ہو جائے کہ ماں باپ بوجھ نہیں ہوتے۔

☼ ☼

ڈگ۔۔۔ ڈگ۔۔۔ ڈگ۔۔۔

"ہاں بھئی بندریا سلام کر باجی کو۔" بندریا مالک کے اشارے پر ہاتھ پیشانی پہ رکھ کر سلام کرنے لگی۔۔۔ ڈگڈگی پھر بجنے لگی۔

"ہاں بھئی بندریا شاہ رخ خان کی طرح چل کے دکھا۔" ایک اور حکم صادر ہوا۔ بندریا کسی روبوٹ کی طرح ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ کے چلنے لگی۔ تماش بین شوق سے سارا کھیل دیکھتے رہے۔ مجمعے میں کھڑے لوگوں میں سے ایک کے پاس بھٹا دیکھ کر بندریا اس پر جھپٹی۔ تماش بین گھبرا کر پیچھے ہوا۔ بندر والے نے اس ڈر سے کہ تماش بین کہیں ناراض نہ ہو جائے بندریا کی پیٹھ پہ چھڑی دے ماری۔ وہ یہاں تماشا دکھانے کے لیے لائی گئی تھی۔ یہاں اس کی اپنی منشا نہیں چلنی تھی۔ بندریا زور' زور سے اپنی پیٹھ کھجانے لگی۔ بندر والا ڈگڈگی بجانے لگا۔

"ہاں بھئی بندریا' الٹی قلابازیاں کھا کے دکھا۔" بندریا بھوک سے بے تاب ایک مرتبہ پھر بھٹے پر لپکی۔ شڑاپ سے زوردار چھڑی اس کی پیٹھ کو سلگا گئی۔ بھوک پہ درد غالب آگیا۔ وہ پیچھے ہٹی اور مالک کے حکم پر قلابازیاں کھانے لگی۔ بندر والا اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔ تماشا ختم ہوا۔ لوگ پیسے اس کی ٹوپی میں ڈالنے لگے۔ بھٹے والے شخص نے خالی بھٹا بندریا کی طرف اچھال دیا۔ بندریا بھوک سے بے حال اس چیز سے غیر واقف کہ اب اس کے کھانے لائق کوئی چیز بھٹے میں باقی نہیں بچی۔ بڑی بے تابی سے اسے بھنبھوڑنے لگی۔

"کیوں بھئی کھانا دانا نہیں دیتے کیا اس بے زبان کو' تمہاری ہی روزی کے لیے سارا دن ناچتی ہے۔ کھانا تو حق بنتا ہے نا اس کا۔" تماش بین نے حق بات کہنا اپنا فرض سمجھا۔ بندر والا کھسیانا ہو کر بولا۔

"بہت کھلاتا ہوں صاحب پر ایک نمبر کی بھوکی اور ندیدی ہے۔ جتنا بھی کھلاؤ پیٹ نہیں بھرتا اس کا۔" بندر والے کے لہجے میں ہلکا سا غصہ در آیا۔

تماش بین نے آخری نظر بندریا پر ڈالی' جواب بھی خالی بھٹے کو چبا رہی تھی اور اپنی راہ ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

"صبح مجھے سویرے اٹھا دینا آفس کا کچھ کام ہے' وہ کر کے جانا ہے۔" اظفر نے کروٹ بدلتے ہوئے ہدایت کی۔

"جی اچھا۔" وہ تابعداری سے بولی۔

"عاصم کو ابھی سلا دو' ٹی وی بند کر دو' دیر سے سوئے گا تو کل اٹھے گا نہیں اسکول کے لیے۔"

"جی ابھی سلاتی ہوں' بس آپ کے لیے دودھ گرم کر لوں۔" وہ کچن میں جانے کے لیے ابھی پلٹی ہی تھی کہ اظفر نے پھر بلا لیا۔

"سنو۔"

"جی۔" وہ پلٹ آئی۔

"کپڑے استری کر دیے۔ میرے اور بچوں کا یونیفارم تیار ہے۔" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

"جی تیار ہیں' بس جوتے پالش کرنے ہیں' وہ ابھی کروں گی۔" وہ دودھ لے کر آئی تو اظفر ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔

"اظفر۔" اس کی پہلی ہی آواز پر وہ اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

"دودھ لے لیں۔" دودھ دے کر وہ بچوں کے شوز اٹھا کر پالش کرنے لگی۔

"عاصم سو گیا۔" اظفر نے گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ابھی سلا کے آئی ہوں۔"

"جوتے لاؤنج میں جا کر پالش کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ لائٹ آف کرتی جاؤ۔"

"جی اچھا۔" وہ جوتے لے کر باہر نکل آئی۔ نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"مدیحہ۔۔۔ تم آرہی ہو نا کل۔۔۔ تم آؤ گی تو ہی میں نمرہ کی بات پکی کروں گی۔ لڑکے والے بہت اصرار کر کے گئے ہیں۔ مجھے بھی زیادہ انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔

ان کے ایک بیٹے کا نام مانگا ہے۔ بس اب تمہارا انتظار ہے۔" شمسہ بیگم ساری باتیں طے کیے بیٹھی تھیں۔ صرف مدیحہ کے آنے کی دیر تھی۔

"امی آپ بلالیں انہیں، میں نہیں آسکتی فی الحال۔" وہ دل پہ پتھر رکھ کر بولی۔

"ارے ایسے کیسے بلالوں۔ بڑی بہن ہو تم اس کی، کل کو سسرال جائے گی تو سو باتیں سننا پڑیں گی اسے تمہاری وجہ سے۔" شمسہ بیگم اس کے صاف انکار پہ بدمزا سی ہو گئیں۔

"امی بچوں کے ایگزام ہونے والے ہیں اور اظفر کو بھی چھٹی نہیں مل رہی، پھر آپ ہیں بھی اتنی دور آنے جانے میں دو دن لگ جائیں گے۔ ویسے بھی بات ہی تو پکی کرنی ہے، منگنی پہ تو آجاؤں گی نا۔" وہ انہیں سمجھانے لگی۔

"بچوں کے ایگزام کون سا کل پرسوں ہو رہے ہیں۔ مہینہ پڑا ہے اور میں کون سا تم کو رہنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ ایک دن کی بات ہے دوسرے دن چلی جانا۔" وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔

"امی نہیں آسکتی نا فی الحال سمجھا کریں بات کو۔" وہ عاجز آگئی۔

"نمرہ کو تو تمہارے ابو نے ویسے ہی لڑکے والوں کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم ہوتیں تو میرا ہاتھ بٹا دیتیں۔ پھر اپنی گاڑی ہے، چار گھنٹے کا تو سفر ہے، کون سا تمہیں بسوں میں دھکے کھانے ہیں۔ تم اظفر کو فون دو میں خود بات کر لیتی ہوں اس سے۔" وہ بڑے استحقاق سے بولیں۔

"نہیں امی آپ ان سے بات مت کیجیے گا۔ وہ سمجھیں گے میں نے ان کی شکایت لگا دی ہے آپ سے۔ ویسے بھی وہ تو منع نہیں کر رہے، میں خود آنا نہیں چاہ رہی۔ آپ کو پتا تو ہے۔ آج کل اٹینڈنس کے بھی الگ سے مارکس ملتے ہیں۔ دعا نے مڈٹرم میں بھی اچھا اسکور نہیں کیا تھا۔ اب کی بار مارکس کم آئے تو اظفر کو شکایت کا موقع مل جائے گا۔ پلیز امی سمجھنے کی کوشش کریں۔" مدیحہ نے اظفر کے حصے کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر لاد کے اسے بری الذمہ قرار دے دیا۔ وہ امی کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔" شمسہ بیگم مایوس ہو کر بولیں۔

☼ ☼ ☼

وہ دعا اور عاصم کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ جب اظفر غصے میں لال بھبھوکا اندر داخل ہوا اور آتے ہی اس پر برس پڑا۔

"کوئی فائدہ نہیں ان پر سر کھپانے کا۔ پیسہ برباد کر رہا ہوں ان پہ۔ کھوٹے سکے ہیں یہ جتنی بھی محنت کرلو نتیجہ صفر ہی آئے گا۔" وہ دہل گئی۔

"کیا ہوا اظفر، خیر تو ہے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ عاصم غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے سرک گیا۔ دعا کی گردن مزید جھک گئی۔ وہ بظاہر انگلش کا ٹیسٹ لکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی ساری توجہ ماں، باپ کی باتوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

"تماشا کیا ہے تمہارے ہونہار سپوت نے پورے اسکول میں، اعزاز دینے کے لیے بلایا تھا اس کے پرنسپل نے مجھے۔ کہہ رہا تھا ایسے ہونہار سپوت تو خوش نصیبوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کے گھر کیسے پیدا ہوگیا۔" اظفر کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔

"کیا ہوا عاصم اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے۔" وہ اپنے پیچھے دبکے عاصم سے استفسار کرنے لگی۔ عاصم نے نفی میں گردن ہلائی، وہ سخت خوف زدہ لگ رہا تھا۔ مدیحہ ناسمجھی کے عالم میں شوہر اور بیٹے کو دیکھنے لگی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔

"اس سے کیا پوچھ رہی ہو مجھ سے پوچھو جو بیٹے کی وجہ سے عزت افزائی کروا کے آیا ہوں پرنسپل سے۔"

"آپ کچھ بتائیں گے بھی یا پہیلیاں ہی بوجھواتے رہیں گے۔"

"یہ لو رزلٹ خود ہی دیکھ لو۔ چار، چار سپلیاں لگی ہیں تمہارے ہونہار سپوت کو۔" اظفر نے رزلٹ کارڈ اس کی طرف اچھالا۔

"اور تمہیں تو میں اچھی طرح سے سیدھا کر رہا ہوں گدھے کے بچے۔" وہ عاصم کی طرف لپکا۔ مدیحہ حواس باختہ ہو گئی۔

"خدا کے لیے اظفر بچہ ہے۔" مدیحہ نے عاصم کے گرد بازو حائل کر دیے۔

"تمہاری اسی ڈھیل کی وجہ سے یہ اتنا سر چڑھا ہے۔ آج تو اسے میں سبق سکھا کے رہوں گا۔" اظفر نے عاصم کا کان پکڑ لیا۔

"سی۔ امی۔" عاصم درد کی شدت سے رونے لگا۔ باپ کے ڈر سے وہ کھل کے رو بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں مدیحہ کو تڑپا گئیں۔

"اظفر کیا کر رہے ہیں، چھوڑ دیں پلیز۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ آئی پرامس۔ صرف آخری بار معاف کر دیں۔" وہ بے بسی سے گڑگڑانے لگی۔ اظفر غصے کا بہت تیز تھا۔ غصے کی حالت میں اسے سامنے کھڑا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ چاہے کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو۔ مدیحہ کے پاس سوائے گڑگڑانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا وہ اسے بھی ایک آدھ ہاتھ جڑ دیتا۔ بہت مشکلوں سے وہ عاصم کو چھڑا کر کمرے میں لے آئی تھی۔

عاصم کا کان سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ مدیحہ کا دل بھر آیا۔ عاصم کو چپ کراتے کراتے اس کے اپنے گال بھی بھیگنے لگے تھے۔

عاصم بہت حساس بچہ تھا۔ گھر میں باپ کا سخت رویہ اسے بہت تکلیف دیتا تھا۔ باپ سے بے تکلف نہ ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹی چھوٹی خواہشیں اندر ہی دبا لیتا۔ نتیجتاً وہ دن بہ دن ہٹ دھرم اور ضدی ہوتا چلا گیا۔ مدیحہ کو اسے کنٹرول کرنا مشکل ترین کام لگنے لگا تھا۔ وہ جو کبھی اسکول میں شائننگ اسٹار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اب پڑھائی میں عدم دلچسپی کی وجہ سے ایوریج اسٹوڈنٹس میں بھی نہیں آتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر پیپرز میں الٹی سیدھی لکیریں پھیر کر چلا آتا۔ اس کے ڈاکٹر کے مطابق سارا مسئلہ توجہ کا تھا۔ وہ ماں باپ دونوں کو خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے ماں کے ساتھ ساتھ باپ کی توجہ اور محبت کی بھی ضرورت تھی اور یہ معمولی بات اظفر کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس کے خیال میں بچے کو اچھا کھانا پہننا اور بہترین اسکول ہی دینا چاہیے۔ اس سے زیادہ کی اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ باپ بیٹے میں دوریاں دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھیں اور مدیحہ گیہوں کی طرح دو پاٹوں میں پس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ آپ جا کر صاف صاف ابو کو بول دیں۔ مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔ جب میرا ایسا کوئی ارادہ ہوا میں آپ کو بتا دوں گا۔" عاصم کے صاف انکار پر وہ سر تھام کے رہ گئی۔

ارسہ اظفر کی بڑی بہن سلمیٰ کی بیٹی تھی۔ وہ اور عاصم بچپن میں ساتھ کھیلے تھے۔ بڑے ہو کر دونوں نے ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لیا۔ جس میں ارسہ کی شعوری اور عاصم کی لاشعوری کوشش شامل تھی۔ سلمیٰ کو ڈاکٹر نے انجیو پلاسٹی کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ بہت گھبرا رہی تھیں اور انجیو پلاسٹی کرانے سے پہلے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے فوراً بیٹے کا نام لے لیا۔ سلمیٰ آپا کی تو گویا مراد بر آئی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو عاصم بڑی خوشی سے یہ رشتہ قبول کرتا، لیکن اسے جیسے ہی پتا چلا کہ اظفر نے بات طے کر دی ہے وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گیا۔ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کسی ایسے شخص کی مرضی سے نہیں کر سکتا تھا۔ جس سے وہ ساری عمر پیار کو ترستا رہا تھا۔

مدیحہ نے بیٹے کو بہت سمجھایا۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ یہ شادی نہیں کر سکتا۔ مدیحہ کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ایک طرف شوہر اور نند تھے تو دوسری طرف اکلوتا بیٹا۔

"امی پلیز۔ آپ روز، روز ابو کی وکیل بن کے مت آجایا کریں۔" وہ زچ ہو گیا۔

"بیٹا ارسہ میں آخر کمی کیا ہے اور وہ....."

ابھی وہ بولنے ہی والی تھی کہ عاصم نے بات کاٹ

دی۔

"میں نے کب کہا ہے ارسہ میں کوئی کمی ہے۔"

"تو پھر تم انکار کیوں کر رہے ہو بار بار۔" وہ جھنکنے لگی۔

"میں انکار نہیں کر رہا' میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔" وہ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا اور اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

"تو منگنی کر دیتے ہیں' شادی بھلے ایک' دو سال بعد کرنا۔"

"نہیں۔۔۔ میں اسے لٹکا نہیں سکتا اپنے انتظار میں۔۔۔ میں پتا نہیں کب شادی کروں۔۔۔ کروں بھی یا نہیں۔۔۔ آپ میری طرف سے انہیں صاف انکار کردیں۔" عاصم کا انکار اظفر تک پہنچانا ہی سوہان روح تھا۔ وہ شدید کشمکش کا شکار تھی۔ باپ' بیٹے کے بیچ پل بنتے بنتے اس کی کمر ٹوٹنے لگی تھی۔ سفر طویل تھا۔ وہ تھکنے لگی تھی۔ اس نے ساری عمر اظفر کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر حکم بجالاتی۔ جیسا چاہا ویسی بن جاتی۔ سسرال والوں کے ماتھے پہ شکن نہ آنے دیتی۔ اظفر نے اسے کسی کٹھ پتلی کی طرح نچایا تھا اور وہ اس کے اشاروں پہ ناچتی رہی تھی۔

ساری عمر وہ اظفر اور ساس' اظفر اور نندیں' اظفر اور بچوں کے درمیان پل بناتی رہی تھی۔ ان کے درمیان غلط فہمیاں اور رنجشیں دور کرتی رہی تھی۔ سب اپنی اپنی انا کے حصے میں قید تھے۔ ایک وہ ہی امن کی فاختہ بنی ادھر ادھر منڈلاتی رہتی۔ اس سب کے باوجود کبھی اظفر نے اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا' نہ ہی شکریے کے دو بول کہے تھے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ مدیحہ تم میری زندگی میں ریزر کی طرح ہو جو میری زندگی کے صفحات سے غلط تحریریں مٹاتا رہا ہے۔ یہ سب سننے کے لیے ایک عرصے سے اس کے کان ترس گئے تھے۔ وہ جانتی تھی یہ سب سننے کے لیے اس کے کان ترستے ہی رہیں گے۔

☆ ☆ ☆

بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچی تھی کہ عاصم کا انکار سنا کر وہ باپ' بیٹے میں مزید دوریاں نہیں بڑھائے گی۔ اس نے ساری عمر اظفر کے اشاروں پہ چل کے گزاری تھی۔ اب وہ اسے اس کا خراج ضرور دے گا۔ آج میں اس سے مانگوں گی اور وہ انکار نہیں کر پائے گا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ساری پریشانیاں اور الزام اپنے سر لے کر اپنے گھر کو بکھرنے سے بچالے گی۔

بہت سوچ بچار کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اظفر رائٹنگ ٹیبل پہ جھکا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ قریب ہی کھڑی ہو گئی۔

"اظفر مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" تمہید باندھ کر وہ آگے کے لیے جملے ترتیب دینے لگی۔

"ہوں۔۔۔ بولو۔" اظفر نے جھکے سر کے ساتھ مصروف انداز میں اسے بولنے کی اجازت دی۔ اس سے زیادہ کی وہ امید بھی لے کر نہیں آئی تھی۔ اسے یہی بہت لگا۔

"آپ نے عاصم سے ارسہ کی بات کرنے کا کہا تھا۔" اظفر کا پین ایک لمحے کو رکا۔

"تو۔۔۔" لہجہ سنجیدہ تھا۔

"میں نے اس سے بات نہیں کی۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ لیمپ کی پیلی روشنی میں اظفر کی پیشانی پہ پڑنے والی سلوٹیں اسے صاف دکھائی دیں۔

"میں نے اظفر کے لیے کسی اور لڑکی کو پسند کیا ہے۔" ایک بم تھا جو اس نے نادانستگی میں اپنے ہی سر پر پھوڑا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ اس کے وجود کی دھجیاں اڑا دے گا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔" اظفر پین پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"تم ہوتی کون ہو فیصلہ کرنے والی۔" اظفر کے لہجے میں اتنی ہتک تھی کہ وہ زمین میں گڑنے لگی۔

"میں ماں ہوں اس کی۔" وہ منمنائی۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے لیے اچھے برے سارے فیصلے میں کروں گا۔ سمجھیں تم۔ میں نے سلمیٰ آپا کو زبان دی ہے۔ اب یہ میری عزت کا سوال ہے۔ جاؤ جا کر بتا دو اپنے چہیتے بیٹے کو اس ہفتے ان دونوں کی منگنی ہے۔"

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔" اظفر کے لہجے میں چٹانوں کی سختی رچی تھی۔

"یہ میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر میں آپ کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے نہیں دوں گی۔" وہ اس پل ایسی زخمی بلی بن گئی تھی۔ جس کا بچہ کسی بھیڑیے کے منہ میں دبا ہو اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنا بچہ بچا نہیں پائے گی۔ بھیڑیے کا منہ نوچے جا رہی ہو۔ زندگی میں پہلی بار وہ لڑنے کے لیے نکلی تھی زندگی میں پہلی بار وہ سب کچھ ہارنے والی تھی۔

"کیا کر لوگی تم۔۔۔" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"کیا کر لوگی۔ میرے ہی بیٹے کو مجھ سے لڑواؤ گی' کمینی بدتمیز عورت۔" اظفر نے اسے بالوں سے جکڑ کر پیچھے کھینچا' درد کی شدت کی وجہ سے مدیحہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔" وہ اس کے اوپر جھک کر سرد لہجے میں بولا۔

"اگر عاصم نے اس رشتے سے انکار کیا تو میں تمہیں اسی وقت طلاق دے دوں گا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا اپنے بیٹے کو۔" مدیحہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے ایک اشارے پر وہ ساری عمر ناچتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا اس کے گلے میں پڑی رسی کا سرا اظفر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یہاں اپنی مرضی سے جینے نہیں آئی تھی۔ اسے لایا گیا تھا۔ وہ شکست خوردہ حالت میں قدم اٹھاتی عاصم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بندریا کی پیٹھ پر چابک پڑا تھا۔ درد خواہش پر غالب آ گیا۔ وہ پیٹھ سہلا کر ایک بار پھر قلابازیاں کھانے لگی۔

بندر والا اپنی کامیابی پہ مسکرانے لگا۔

☆ ☆

مکمل ناول

میمونہ صدف

"ہماری اماں اصل میں بہت پرانے وقتوں کی ہیں۔ سو سال پرانی جبھی تو اتنے اچھے خاصے پوش علاقے میں رہ کر بھی پنجابی میں بات کرتی ہیں اور نا صرف بات کرتی ہیں بلکہ فخر بھی محسوس کرتی ہیں۔ صلوقہ بی کہتی ہیں کہ اماں کی پنجابی کیسے نئے علاقے کی پنجابی ہے جو خالصتاً "اماں کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔" ابوبکر بڑے مزے سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے طلحہ کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ طلحہ ٹکٹکی باندھے اسے ایسے سن رہا تھا جیسے وہ وعظ کر رہا ہو۔

"دراصل اماں کا ددھیال پوٹھوہار سے تعلق رکھتا تھا اور اماں کا ننھیال وسطی پنجاب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اماں ایسی خود ساختہ مدغم سی پنجابی بولتی ہیں۔"

"ویسے کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے جب ہم آدھی اردو، آدھی انگریزی اور آدھی پنجابی بولتے ہیں تو پھواں کیوں مختلف علاقوں کی پنجابی ملا کر نہیں بول سکتیں۔" طلحہ نے عشرت ناہید کی حمایت کی ہی تھی کہ بجلی چلی گئی؟ "تیری یہ بات بجلی سے ہضم نہیں ہو سکی۔" ابوبکر نے جاندار سا قہقہہ لگایا۔

"عرض کیا ہے کہ

پانچ دن ملے زندگی کے مگر

گزرے تھے ابھی چار کہ 32 چلی گئی

کل واپڈا کے دفتر میٹنگ تھی کچھ خاص

ہونے لگی تکرار کہ 32 چلی گئی

طلحہ نے صوفے پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہی دونوں ہاتھ بلند کر کے باآواز بلند مشاعرہ شروع کیا۔ بجلی ابھی گئے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ آہستہ آہستہ سارے مکین ہی کام چھوڑ کر لاؤنج میں جمع ہونے لگے۔ حالانکہ یو پی ایس پر تقریباً "سارے گھر کی لائٹیں اور پنکھے چل رہے تھے مگر پاکستانی قوم کی "سائیکی" کہ واپڈا کی بجلی ہی بجلی لگتی تھی باقی جنریٹر ہوں یا یو پی ایس۔ سب مصنوعی ڈھکوسلے محسوس ہوتے ہیں۔

"موت کی طرح اس کا بھی وقت نہ رہا۔" طلحہ نے برابر بیٹھے ابوبکر کی طرف جھک کر داد سمیٹی۔

"واہ واہ واہ مقرر مقرر۔" ابوبکر نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے شانہ تھپکا تو طلحہ آداب آداب کرتا ہوا اگلا کھنکارنے لگا۔

اجی۔ موت کی طرح اس کا بھی وقت نہ رہا۔

عید کی شاپنگ اور بھرا بازار کہ 32 بجلی گئی

"واہ واہ واہ۔۔۔ عید کی شاپنگ کیا کہنے واہ واہ۔"

ابوبکر بڑی دلجمعی سے اس کی داد رسی کر رہا تھا۔

"شکریہ شکریہ۔۔۔ آگے سنیے بھائی۔

اسکول ٹائم اور واپڈا کی ذہانت

اسکول ٹائم اور واپڈا کی ذہانت

ناشتا ہونے لگا تیار کہ 32 چلی گئی

"سبحان اللہ۔۔۔ سبحان اللہ۔" تفہیم نے اس بار ابوبکر کے ساتھ جگہ بنائی اور ساتھ ہی طلحہ کو داد دی۔

"شادی والے دن بڑے خوش تھے ہم

گلے پڑنے لگے تھے ہار کہ 32 چلی گئی۔"

"آہا۔۔۔" تفہیم نے سامنے میز پر پانی کا لبالب گلاس اٹھا کر غٹاغٹ چڑھالیا۔

"اب یہ ذرا غور سے سنیے گا ابوبکر بھائی۔۔۔

زندگی رہی تے فیر ملاں گے۔۔۔

زندگی رہی تے فیر ملاں گے پھواں ہیں

مجھے جوتا مارنے کو تیار کہ 32 چلی گئی

وہ جلدی سے نیچے جھکا اور سامنے سے آتا عشرت ناہید کا جوتا سر سے گزر گیا۔

"تھل ذرا تینوں میں دساں (تجھے میں بتاؤں)" عشرت ناہید صوفے کے پیچھے سے نکل کر آگے آئیں تو وہ جلدی سے دروازہ کھول کر لان میں بھاگ گیا۔ وہیں صوفے پر ابوبکر اور تفہیم قہقہے لگا رہے تھے تو سامنے والے صوفے پر ایک دوسرے سے چپکی بیٹھی ملیحہ، راہین اور عنیزہ کا لوٹ پوٹ کر برا حال ہو گیا۔

"جدوں دیکھو اس منڈے دے اے ہی ول نے (جب دیکھو اس لڑکے کے یہی طریقے ہیں) ئی میں اس نوں لال شربت نی بوتل لان آتے اکھیا سی تے ایں اتھے محفل جمالئی (ناہیں نے اسے لال شربت کی بوتل لانے کے لیے کہا تھا اور اس نے ادھر محفل جمالی۔)"

عشرت ناہید اپنا جوتا اٹھا کر پہنتے ہوئے وہیں ابوبکر کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"رہنے دیں پھوپھاں گری ہے ابھی۔۔۔ رات میں چلا جائے گا۔" عنیزہ نے ہمیشہ کی طرح بھائی کی طرفداری کی۔

"چھوڑیں پھوپھی اماں میں آپ سے ایک پہیلی پوچھتا ہوں آپ نے بوجھنی ہے۔" تفہیم نے عشرت ناہید کی ٹانگیں دباتے' لہجے میں شیرینی گھولی۔

"اے ہے۔۔۔ چھوڑ مینوں اتھے ساریاں دا دماغ ای کم نئی کروا۔ (ادھر ساروں کا دماغ ہی کام نہیں کرتا)" انہوں نے تفہیم کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے پرے ہٹائے۔

"پھوپھی اماں۔۔۔ تبھی تو آپ سے کہہ رہا ہوں بوجھنے کو کیونکہ آپ کا دماغ ہی کام کرتا ہے نا۔" وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے انہیں مکھن لگانے لگا اور ساتھ ساتھ ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ عشرت ناہید ذرا کی ذرا مسکرائیں اس گھر میں سب ہی نیارے "پیس" تھے اور عشرت ناہید کبھی زچ ہو جاتیں اور کبھی ان سب کی شرارتوں اور نادانیوں پر ہنس دیتیں۔

صرف ان کا بڑا بیٹا تھا جو باقی بچوں سے الگ مزاج اور طبیعت کا تھا جس میں زیادہ کردار ان حالات کا تھا جو اسے بچپن سے درپیش تھے۔ ان سب میں وہ الگ ہی نظر آتا تھا' خاموش طبع اور سنجیدہ سا۔ عشرت ناہید اور اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا۔۔۔ بن یامین۔

عشرت ناہید کے مسکرانے سے اسے ذرا سی چھوٹ ملی "اچھا سنیں۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ ہمارے کان پک نہیں بلکہ گل چکے ہیں تمہاری یہ بوگس پہیلیاں سن سن کر' پھپھو پلیز اسے چپ کرالیں ورنہ میں کسی روز اس کا سر پھاڑ دوں گی۔" راہین جو تفہیم سے تین برس چھوٹی تھی چیخ اٹھی۔

"تم سے کون پوچھ رہا ہے میں تو پھوپھی اماں سے کہہ رہا ہوں بوجھنے کو۔" تفہیم نے کلس کر اسے جواب دیتے پھر سے پھوپھی اماں کی جانب رخ کرلیا۔

"پھوپھو اگر آپ ہمارے مشاغل میں دلچسپی نہیں لیتیں تو اس کی پہیلیاں بھی نہیں بوجھیں گی۔ بس میں نے کہہ دیا۔"

راہین بھی محاذ کھول کر بیٹھ گئی تھی تفہیم کے خلاف۔ "اچھا ابھی جب طلحہ محفل سجائے بیٹھا تھا تو تب تم لوگ بور نہیں ہوئیں اور مجھ بے چارے کی پہیلیوں سے تم لوگ بور ہونے لگتی ہو پہیلیوں سے دماغ تیز ہوتا ہے' ذہن پر لگا زنگ ہٹتا ہے۔" وہ بڑی شان سے گویا ہوا۔

"بڑی مہربانی ہمارے دماغ پہلے ہی بہت تیز چلتے ہیں۔" راہین نے تڑخ کر جواب دیا۔

"دماغ نہیں تم لوگوں کی زبانیں تیز چلتی ہیں۔ پھوپھی اماں یہ کل کو سسرال جا کر بہت عزت کروائیں گی۔" تفہیم نے بھی اسے تپانے کی خاطر کہا تھا اور راہین واقعتاً" تپ گئی تھی۔ وہی کیا باقی دونوں بھی اب محاذ پر اتر آئی تھیں۔

"ہمیں کیوں لتاڑ رہے ہو۔ کام سے کام رکھو۔" نمیرہ نے آستین چڑھا کر ہاتھ نچایا۔

"خاموش۔۔۔ تو وی چپ کر جا۔" عشرت ناہید نے چاروں کو گھرکا۔

"کدی تے فسادنے بغیر وی رہیا کرو تسی۔" وہ چاروں خاموش ہوگئے تو ابوبکر جو کب سے خاموش بیٹھا موبائل پر گیم کھیل رہا تھا زور زور سے ہنسنے لگا۔

"چپ کر تو وی۔ دند اندر کر آپنے۔" ابوبکر کے نمائش کرتے دانتوں کو یکدم بریک لگا تو باقی چاروں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ عشرت ناہید سب کو گھورنے لگیں تو وہ پانچوں منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی ضبط کرنے لگے۔

"ساری دیہاڑ تسی مینوں پاگل کیتا ہوندا اے۔ وے تسی انسان دی بچے ہو یا حیواں دے۔ قسمے مت ماری گئی اے میری تے۔" وہ انہیں گھورتے ہوئے سخت لہجے میں بولیں تو سب نظریں جھکائے اب خاموش ہوگئے۔ کافی توقف کے بعد وہ پھر سے بولیں۔

"وے میرے بچو۔۔۔ آپس اچ پیار محبت نال رہی دا۔۔۔" اب کے بار ان کا لہجہ محبت بھرا تھا۔ وہ پانچوں

نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے کہ پھوپھو کا غصہ اتر گیا ہے۔ تبھی لائٹ آگئی تو سب نے زوردار نعرہ لگایا۔

"اوئے 32 آگئی جے۔" عشرت ناہید سرہلاتے ہوئے ہولے سے مسکرادیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے پچھلے سال کے کپڑے نکال نکال کر خود سے لگاتے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اب تک جتنے لباس بھی اس نے دیکھے تھے اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اب اسے پورا آسکتا تھا۔ بے حد اداسی سے اس نے سارے کپڑوں کو ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کی مانند جمع کرتے ہوئے راہین کو دے دیے۔

"ان میں سے کوئی بھی تمہیں پورا نہیں ہے؟" راہین نے تعجب سے اس کے ان کپڑوں کو دیکھا جو اس کی یادداشت کے مطابق اس نے پچھلے سال سلوائے تھے۔ ملیحہ نے دکھ سے نفی میں سرہلایا۔

"توبہ ہے ملیحہ کس قدر موٹی ہوگئی ہو تم' حد ہے یار۔" وہ بڑی دلجمعی سے اس کے نئے ڈیزائنر سوٹ دیکھ رہی تھی جبکہ ملیحہ صدمے سے نڈھال ہوتے حسرت سے اب ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی جو اس نے بڑی چاہ سے پچھلے سال سلوائے تھے اور اب اسے پورا ہونے سے انکاری تھے۔

"اپنا حدود اربعہ کم کیوں نہیں کرتیں باجی۔" نمیرہ جو ابھی ابھی باہر سے آئی تھی راہین کا جملہ سن چکی تھی اور اس نے بھی ملیحہ کو ٹوکا۔

"ہاں۔۔۔ کروں گی پھر سے ڈائٹنگ شروع۔" آہ بھرتے ملیحہ نے اپنے ارادے سے انہیں مطلع کیا۔

"تم ڈائٹنگ نہیں کرسکتیں یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے اس لیے رہنے دو۔" راہین نے اب ان کپڑوں کو ہینگ کرکے اپنی وارڈ روب میں رکھنا شروع کیا۔ "ڈائٹنگ کی بھی حد ہوتی ہے۔ جب بندہ مہینہ بھر ٹھیک ٹھیک ڈائٹ پلین فالو کرے اور انچ بھر فرق نہ پڑے بلکہ کمر' بڑھ کر' کمرہ بنتی جائے تو بندہ کیا کرے۔" وہ لہجے میں دکھ سمو کر بولی۔

"آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں ویٹ کم کرنے کے طریقے۔" راہین فوراً" اسے اپنے ٹوٹکے بتانے پر آمادہ نظر آئی۔

"ہاں ہاں پتا ہے۔۔۔ صبح صبح نہار منہ نیم گرم پانی میں لیموں اور شہد ملا کر پیوں۔" ملیحہ جانتی تھی اس کو اور اس کے سب ٹوٹکوں کو اس لیے فوراً" سے بول پڑی۔

"تو آزماؤ نا اسے۔" عنیزہ نے اے سی کی خنکی کو بڑھاتے ہوئے ساتھ ہی کمرے میں لگا ایل سی ڈی آن کیا اور چینل سرچنگ میں لگ گئی۔

"دو مہینہ کیا ہے' ایک پاؤنڈ کمی نہیں آئی۔" لٹھ مار انداز تھا۔

"اب کی بار تم یوں کرو کہ کھانے کے بعد ادرک کی چائے پینا شروع کرو اور ساتھ میں تین چائے کے چمچے لیموں کا رس' چوتھائی چمچہ پسی کالی مرچ' ایک چائے کا چمچہ شہد ایک پیالی پانی میں ملا کر دن میں ایک مرتبہ تین ماہ تک پیو۔ اس کے علاوہ ناشتے سے قبل ایک ٹماٹر کھاؤ۔ بس کم ہو جائے گا وزن۔" راہین نے اپنے نایاب ٹوٹکوں سے بڑی بہن کو نوازا تو ملیحہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے اپنی توجہ ٹی وی کی جانب مبذول کی۔

"بس محنت مت کرنا خود کو پتلا' کم کرنے کے لیے پھیلتی جانا بھینس کہیں کی۔" راہین نے غصے سے اس کی بے اعتنائی اور لاپروائی پر دو حرف بھیجے اور اپنی وارڈ روب میں کپڑوں کا جائزہ لینے لگی جبکہ ملیحہ بظاہر پرسکون سی بیٹھی اب اپنا من پسند کھانوں کا چینل دیکھ رہی تھی۔

اب تک وہ اتنے حربے آزما چکی تھی کہ اسے لگتا تھا کوئی ٹوٹکا' کوئی حربہ رہ نہیں گیا جو اس نے خود پر آزمایا نہ ہو۔ مگر اس کا جسم ہی شاید ایسا تھا کہ کسی ٹوٹکے' کسی حربے' کسی ورزش کا رتی بھر اثر نہ ہوتا تھا۔ ابھی دو ماہ قبل ہی وہ قریبی جم کی خدمات بھی حاصل کرچکی تھی۔ دو ماہ پورا گھنٹہ بھر وہ مختلف انواع و اقسام کی ورزشیں کر

کر کے ہلکان ہو چکی تھی۔ ساتھ میں اس نے ڈائٹ پلان پر بھی عمل کیا تھا ہر ہفتے وہ جب بھی باقاعدگی سے اپنا وزن چیک کرتی اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آتی تھی۔ تنگ آکر اس نے جم بھی چھوڑ دیا اور ڈائٹنگ بھی۔۔۔ کیا فائدہ تھا ایسی ڈائٹنگ اور ورزش کا جو جیسا بھی ٹوٹکا آزمانے کو کہتا وہ آزمانے بیٹھ جاتی مگر مجال تھا جو کسی طور وزن میں کمی آتی۔ الٹا وزن میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ وہ اب دلبرداشتہ ہو چلی تھی۔ اس کے رشتے کے سلسلے میں کوئی بھی گھر آتا عشرت ناہید راہین اور عنیزہ کو سختی سے منع کر دیتیں کہ ان دونوں میں سے ہرگز کوئی بھی سامنے نہیں آئے گی۔ وہ دونوں کم عمر تھیں، اسمارٹ اور تیکھے نقوش کی بدولت جاذب نظر تھیں اس لیے انہیں ڈر ہوتا کہ آنے والے ان دونوں میں سے کسی کو پسند نہ کر جائیں۔ دونوں کی عمروں میں محض دو برس کا فرق تھا مگر ملیحہ سے وہ لگ بھگ پانچ برس چھوٹی تھیں۔

سب سے بڑی ملیحہ جو ابوبکر کی ہم عمر تھی پھر تفہیم تھا جو ملیحہ سے سال بھر چھوٹا تھا۔ تفہیم سے دو برس چھوٹا طلحہ اور اس سے ڈیڑھ سال چھوٹی راہین تھی۔ نمیرہ سب سے چھوٹی تھی۔ کہنے کو ملیحہ ان چاروں سے بڑی تھی مگر وہ چاروں ہرگز اسے بڑی بہن والی عزت نہ دیتے تھے اور اس کے موٹاپے اور پھیلتے ہوئے وجود پر ناک باک کردار کرتے۔ مگر ملیحہ نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کبھی مڑ کر ان کے طعنوں تشنوں کا نہ جواب دے گی نہ ہی ان سب کو اس ضمن میں گھاس ڈالے گی۔ وہ بغیر کسی کی پروا کیے جو دل کرتا کھاتی اور اپنے انداز سے رہتی۔

"پھپھو آپ اسے کچھ کہتی کیوں نہیں ہیں؟ حال دیکھا ہے اس کا کس قدر موٹی ہو رہی ہے۔" راہین اس کے کھانے کی پلیٹ کو گھورتی جو اس حساب سے نہ بھری ہوتی جتنی کہ خود اس کی پلیٹ۔

"اسی لیے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ ظاہر ہے آج کل لوگوں کو دبلی پتلی لڑکیاں درکار ہوتی ہیں اپنے بیٹوں کے لیے۔۔۔ گئے بھینس نہیں۔" نمیرہ کیوں پیچھے رہتی۔

"اتنی بری لگتی ہے یہ کھا کھا کر حشر کر لیا ہے اس نے اپنا۔" ابوبکر بھی ان کی پارٹی میں شامل ہو کر ملیحہ کو ستاتا اور وہ ڈھیٹ بنی کھاتی رہتی۔ "تسی سارے اپنا کم کرو۔ اے بچپن سوں ہی ایہو جی سی۔" عشرت ناہید مداخلت کرتی انہیں چپ کرواتیں۔

"مگر بندہ خود کو کم کر سکتا ہے۔ کنٹرول کر سکتا ہے اماں۔" ابوبکر اعتراض کرتا۔

"تمہیں خود اپنا آپ عجیب نہیں لگتا ہے یار۔" راہین اسے احساس دلانے کو سوال کرتی۔

"نہیں۔" وہ ڈھیٹ بنی صاف سا جواب دے دیتی۔

"مگر ہمیں تو تمہیں دیکھ کر ہول اٹھتے ہیں۔" طلحہ بھی یونہی اسے چھیڑنے کو کہہ ڈالتا۔ "تو تم لوگ میری طرف دیکھا ہی مت کرو۔" وہ بھرے منہ سے مزید ڈھٹائی سے کہتی تو سب سے زیادہ راہین تپتی۔

"رہنے دو اسے یوں ہی موٹا۔ یہ اسی طرح خوش ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کچھ کہنے کی اسے۔ یہ سمجھتی ہے کہ ہم خوامخواہ اس پر بولتے ہیں۔ مزید موٹی ہو گئی تو شاید اسے عقل آجائے۔" سب پھر خاموشی سے کھانے میں مگن ہو جاتے۔

☼ ☼ ☼

"چلو بھئی بوجھو۔۔۔ کوئی نہ چھین سکے اک شے جس کی ہے بس اس کی ہے۔" تفہیم بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور ساتھ ہی ملیحہ کی نمکو کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"پھپھو سے بے عزتی۔" راہین نے ہاتھ بلند کر کے ایسے جواب دیا جیسے کلاس میں بیٹھی ہو۔

"غلط غلط۔۔۔ ابوبکر کی بدبودار جرابیں۔" طلحہ نے لیپ ٹاپ کے پیچھے سے منہ نکالا۔

"ویری فنی۔۔۔ قسمت اور علم ہے۔" تفہیم نے جلا بھنا سا جواب دیا تو لڑکیاں ہنس دیں۔

"اب اگلی بوجھو اور سیریس ہو کر۔۔۔ سونے کا بن کر آتا ہے۔" ابھی اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا کہ ابوبکر شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"میں۔"

"شکل دیکھو اپنی۔" ملیحہ نے تفہیم کے ہاتھ پر چپت رسید کی جو کب سے اس کی نمکو کھا رہا تھا اور ابوبکر کی جانب جملہ اچھالا۔

"سونے کا بن کر جاتا ہے۔" تفہیم بھی اپنے نام کا ایک تھا اگلا جملہ مکمل کر گیا۔

"ہائیں یہ تو بن یامن بھائی ہوں گے۔" نمیرہ نے بن یامن کے سوتے میں چلنے کی عادت پر چوٹ کی تو سب ہی ہی ہی کر کے دانت نکالنے لگے۔

"لیکن ہے یہ بات نرالی۔۔۔ ہر سو چاندی بکھراتا ہے۔" تفہیم نے پہیلی مکمل کر کے ہی دم لیا۔

"برابر والی۔۔۔ چاند۔۔۔ میرا مطلب عظمٰی۔" ابوبکر شرارت سے بولا تو سب لڑکیاں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگیں۔

"یہ عظمٰی چاند کب سے ہو گئی؟" راہین نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

"جب سے ابوبکر بھائی سونے کے بنے ہیں۔" طلحہ نے بھی لقمہ دیا۔

"ابوبکر صاف صاف بتاؤ کیا چکر ہے؟" ملیحہ نے اپنے سے بڑے ابوبکر کا کان پکڑ لیا تو وہ آئی اوئی کرنے لگا۔

"قسم سے مذاق کیا تھا یار۔ تمہاری قسم۔" ملیحہ نے مسکراتے ہوئے کان چھوڑ دیا۔

"منحوسو! میری پہیلی تو بیچ میں رہ گئی۔" تفہیم نے دانت کچکچائے۔ اس کی پہیلی اسی طرح بیچ میں ہی رہ جاتی تھی اور بات کہاں کی کہاں نکل جاتی تھی۔

"ویسے بن یامن بھائی کی اب شادی کر دینا چاہیے۔" راہین نے پرسوچ نگاہوں سے گال پر انگلی رکھے ہوئے کہا تو سب نے اسے گھورا۔

"میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ دوسری شادی۔" ابوبکر نے اسے اور بھی کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"لو بھئی کیسی بہنیں ہیں بجائے میرے سہرے کے پھول کھلانے کا سوچیں ان کا سوچ رہی ہیں جو ایک بار لڈو چکھ بھی چکے۔ ہاں ان کی دوسری تیسری چوتھی شادی کرا لو اور مجھ معصوم کی پہلی بھی نہ کروانا۔" وہ نادیدہ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے مصنوعی بے چارگی سے بولا۔

"جب تم BMW - M.5 لے لو گے تو تب تمہاری شادی کر دیں گے۔" تفہیم پھر سے ملیحہ کی نمکو کھانے لگا تو ابوبکر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"بڑی مہربانی صاف کہہ دو کہ بھائی کنوارہ ہی رہنا ہے تجھے۔" اس نے اتنے تپے ہوئے انداز میں جواب دیا کہ لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بھئی بگ بی کے لیے کیسی لڑکی درکار ہے۔۔۔ مطلب انہیں کیسی لڑکی درکار ہے؟" نمیرہ نے تفہیم کی طرف خصوصی طور سے دیکھا جو ان سب کی نسبت بن یامن کے قریب تھا۔

"لو بھلا وہ مجھے کہاں بتاتے ہیں۔" تفہیم نے اس کی نگاہوں کو خود پر محسوس کر کے فوراً جواب دیا۔

یوں دل کی بات کہنا تو مشکل ہے بن یامن
اس لیے سم لو اور سب کہہ دو

طلحہ نے حسب حال شعر پھینکا تو سب ہنس دیے۔

"ویسے بن یامن بھائی کے لیے عرض کیا ہے

لڑکی کہاں سے لاؤں میں شادی کے واسطے
شاید کہ اس میں میرے مقدر کا دوش ہے
عذرا، نسیم، کوثر و تسنیم بھی گئیں
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس کے شعر کے اختتام پر۔ "سبحان اللہ۔" سے کمرہ گونج اٹھا اور طلحہ شرماتے ہوئے داد وصول کرنے لگا۔

"اگر میرا رشتہ طے کر دیا ہو تو مہربانی کر کے تم میں سے کوئی مجھے ایک کپ چائے دے جائے گا۔" ان کے قہقہوں کو بریک لگا تھا۔ دروازے کے بیچوں بیچ بن یامن کھڑا تھا۔ سب کو یکدم سانپ سونگھ گیا۔ وہ کڑی

نظر سب پر ڈال کر واپس پلٹ گیا اور وہ کافی دیر سکتے سے ہی نہ نکل پائے۔

"جو ابھی ابھی ہم نے دیکھا وہ بن یامن بھائی ہی تھے؟" نمیرہ نے تھوک نگلتے پوچھا تو سب نے 'ہاں جی' کی مری مری آواز نکالی۔ "میں تو اب نہیں جاؤں گی انہیں چائے دینے کبھی نہیں۔" نمیرہ نے تکیے سے منہ چھپالیا۔

"شکر ہے، ہم تینوں کو چائے بنانا نہیں آتی۔" تفہیم نے دونوں ہاتھ دعا کے سے انداز میں شکر ادا کرتے منہ پر پھیرے۔

"ملیحہ تم جاؤ ویسے بھی وہ تمہارے ہاتھ کی چائے پسند کرتے ہیں۔ جاؤ میری بہن انہیں چائے دو اور خود بھی پیو۔" راہین لجاجت سے بولی۔ تو ملیحہ اسے گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان سب میں ایک ملیحہ ہی تو تھی جو بن یامن کا سامنا کرنے کی ہر گھڑی سکت رکھتی تھی۔ برے برے منہ بناتے وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساتھ میں ان سب سے وعدہ بھی لیا کہ وہ کل اسے بڑھیا سی نمکو اور چائے پلائیں گے۔

وہ چائے کا کپ اور ساتھ میں نمکو بسکٹ رکھے' ٹرے اٹھائے خراماں خراماں چلتی بن یامن کے کمرے تک آئی۔ باقی پانچوں دروازے تک ڈھارس بندھانے اس کے ساتھ آئے تھے۔ ملیحہ نے بے چارگی سے ان سب کی جانب دیکھا۔

"جاؤ بھی..... کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ کہا تو کھڑوس نے تو تم بھی سنا دینا۔ تم کون سا ڈرتی ہو؟" تفہیم نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے ہمت بندھائی۔

"ہاں ہاں جاؤ..... کچھ نہیں ہوگا مگر اب مزید کھڑی رہیں تو رات کی بجائے یہ صبح کی چائے ہو جائے گی اور پھر بہت کچھ ہو جائے گا۔ "جلاد" تمہیں چھوڑے گا نہیں پھر۔" راہین نے اسے جیسے مزید دیر کرنے پر ڈرایا تو وہ سرہلاتے دروازہ بجا کر سیدھی اندر چلی گئی۔ وہ اپنی آرام کرسی پر جھولتے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ذرا ذرا سا نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں چائے کے ساتھ بسکٹ اور نمکو بھی لے آئی ہوں۔ دل کرے تو کھا لیجیے گا۔" اپنے تئیں گویا وہ اس پر احسان کر رہی تھی۔ وہ خاموش رہا اور نظریں کتاب پر ہی جمائے بڑے انہماک سے مطالعے میں مصروف نظر آنے لگا۔

"اور کچھ چاہیے تو بتا دیں۔ یا چلیں بعد میں بتا دیجیے گا۔" وہ جانے کے لیے مڑی تھی۔ نجانے کیوں اسے باقیوں کی نسبت اس کے بولنے سے زیادہ اس کی خاموشی سے ڈر لگتا تھا۔

"سنو۔" ابھی دو قدم بمشکل اٹھائے تھے کہ اس نے پکارا۔ اس کے قدموں کو بریک لگا۔ وہ آنکھیں میچے دل ہی دل میں ورد کرنے لگی۔ چونکہ اس کا رخ دوسری جانب تھا اس لیے بن یامن اس کی اس حرکت کو دیکھ نہ سکا تھا۔

"تم سب کو مجھ سے کوئی مسئلہ ہے کیا؟" اس کے سوال سے وہ یکدم تلملا اٹھی۔

"ہمیں..... نہیں تو..... ہمیں بھلا آپ سے کیا مسئلہ ہوگا۔" رخ پھیرے ہی اس نے جواب دیا۔

"جب کسی کو مخاطب کیا جاتا ہے تو کم از کم رخ تو اس کی جانب کیا جاتا ہے' بھلے سے نگاہیں نہ ملائی جائیں مگر رخ پھیر کر اگلے کی توہین ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے شرمندگی سے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اس کی جانب رخ کرکے' نظریں جھکائے کھڑی ہوگئی۔

"میرا ہرگز ایسا مقصد نہیں تھا۔" اس نے سنجیدگی سے وضاحت دی۔

"میں نے کب کہا کہ تم نے قصداً ایسا کیا ہے۔ میں نے محض تمہاری غلطی کی اصلاح کی ہے۔" چائے کا کپ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز سے اٹھا لیا تھا' ساتھ میں بسکٹ بھی۔ وہ کرارہ سا جواب دینا ہی چاہتی تھی مگر پھر خاموش ہوگئی۔

"تم لوگوں کو میری شادی کی بلکہ دوسری شادی کی فکر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور جہاں تک بات ہے شادی کی تو اس گھر میں اب ابوبکر کی باری ہے اس کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھو۔ پلیز مجھے

آئندہ یوں ڈسکس مت کرنا۔ مجھے یہ ہرگز پسند نہیں ہے کہ لوگ اس طرح محفل جما کر مجھے زیر بحث لائیں۔ آئی ہوپ یو ول ناٹ مائنڈ اٹ۔" چائے کے کپ سے چسکی بھرتے اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ پہلے تو ملیحہ کو خود پر گھڑوں پانی پڑتا محسوس ہوا مگر اس کی بات کے اختتام تک اس کا دماغ الٹ گیا۔

"ہم ہرگز آپ کا مذاق نہیں اڑا رہے تھے" ہم تو اپنا مذاق اڑاتے ہیں چونکہ ہم آپ کو خود سے الگ نہیں سمجھتے اس لیے آپ کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ آپ کو برا لگا تو آئی ایم سوری مگر اسپیشلی آپ کو نشانہ بنایا جاتا ہے یہ آپ کی غلط فہمی ہے اسے دور کرلیں۔" اس نے اب کی بار قدرے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ بغیر کسی تاثر کے سکون سے چائے پیتا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے چہرے کو اس طرح بے تاثر ہی دیکھتی آئی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کسی بھی قسم کا تاثر پڑھنا ناممکن تھا۔ البتہ وہ اس کے لہجے کی کاٹ سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ کس قدر چبھتی ہوئی بات کہہ رہا ہے۔

"میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" وہ اب بھی حد درجے پرسکون دکھ رہا تھا اور اب کی بار اس کا لہجہ بھی اس کے تاثرات کا غماز تھا۔

"میں بھی مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔" اس نے دوبدو جواب دیا اور سر جھٹکتی باہر چل دی۔ خالی لاؤنج سائیں سائیں کررہا تھا۔ وہ غصے سے آکر صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔

"سمجھتے کیا ہیں خود کو بہت کوئی مہاراجہ لگے ہوئے ہیں نا۔ کبھی آئینے میں دیکھا نہیں ہوگا خود کو دیکھنے کے لائق بھی نہیں۔ ہمارا اتنا دماغ نہیں خراب کہ ہم بس انہیں ڈسکس کریں۔ ہمیں جیسے اور کوئی کام نہیں ہے نا۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ اپنا غصہ کشن اٹھا اٹھا کر پھینکتے ہوئے نکال رہی تھی۔

"نجانے وہ پانچوں کدھر مرگئے ہیں۔ ہر قسم کی باتیں سننے کو مجھے آگے کردیتے ہیں۔ کیا سمجھ رکھا ہے مجھے ان سب نے۔ میں کیا اتنی ڈھیٹ ہوں کہ مجھ پر کسی بات اثر نہ ہو۔"

وہ اب غصے سے جوتا پہنے دوپٹہ اوڑھ کر تیزی سے کمرے کی جانب چل دی۔ باقی غصہ یقیناً "اب اسے ان سب پر اتارنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بن یامن۔" وہ کچن میں صادقہ کے ساتھ سب کے لیے ناشتا بنا رہی تھیں جب انہوں نے اسے جاگنگ سے واپس لوٹ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ صبح صبح اٹھ کر جاگنگ پر جانے کا عادی تھا۔ رات میں حسب معمول وہ اتنی دیر سے آیا تھا کہ وہ انتظار کرکر کے سو چکی تھیں۔ صبح اکثر ناشتے پر بھی وہ انہیں ملے بغیر کب نکل جاتا تھا انہیں پتا ہی نہ چلتا۔ آج نجانے کیسے وہ اس وقت جاگنگ سے لوٹ رہا تھا حالانکہ اس وقت تو وہ آفس کے لیے تیار ہوکر نکل رہا ہوتا تھا۔ شاید آج اسے آفس دیر سے جانا تھا تبھی اس وقت وہ گھر پر موجود ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا۔

"پتر کل رات نوں فیر دیر ہوگئی سی؟" وہ اب وہیں لاؤنج میں چلی آئی تھیں۔

"جی اماں۔" لہجہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر مگر مودب تھا۔

"اتنی محنت نہ کریا کر، رنگ ویکھ اپنا کس طرح کملا گیا ہے۔" اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہوں نے محبت پاش نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ جواباً خاموش رہا تھا۔ وہ اکثر خاموشی سے ہی ان کی نصیحتیں سنا کرتا تھا۔ کوئی بھی جواب دینا یا انہیں جھٹلانا کبھی اس کا شیوہ نہ رہا تھا۔

"ناشتا کرلے بن، اتنی جان مارداایں تے کھان پین نا تینوں ہوش ای نہیں۔" وہ ہنوز خاموشی سے ڈائننگ ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا۔ صادقہ نے جلدی سے برتن لگا دیے اور عشرت ناہید گرما گرم پراٹھے اور آملیٹ ٹرے میں رکھے خود بھی وہیں چلی آئیں۔

"لے کھا۔ آج میں وی تیرے نال ہی کھاواں گی۔" وہ پراٹھوں سے بھری چنگیر اس کے سامنے رکھتے ہوئے خالی کپ میں چائے نکالنے لگیں۔ وہ خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ عشرت ناہید کچھ دیر اسے کھاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔۔۔ اس کا چہرہ اور تنے ہوئے نقوش۔

"بن یامن۔" ان کے پکارنے پر اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا جو نجانے کب سے اسے محو تکے چلے جا رہی تھیں۔ ابھی تک انہوں نے خود ناشتا شروع نہیں کیا تھا وہ اس کے ساتھ ناشتا کرنے کا قصد کرکے بیٹھی تھیں۔

"پتر تو ہن دوائیاں استعمال نئیں کردا ایں، تیرے داغ فیر سوں زیادہ لگ رہے نے (بیٹا تو اب دوائیاں استعمال نہیں کرتا ہے) تیرے داغ پھر سے زیادہ لگ رہے ہیں۔" ان کی بات پر وہ تلخی سے مسکرایا تھا اور سر جھٹک کر پھر سے ناشتا کرنے لگا۔

"دس نا مینوں ڈاکٹر نے نئیں جاندا ہن؟ (بتاؤ نا مجھے ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے اب)۔" وہ پھر سے زہر خند مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لانے سے خود کو باز نہ رکھ پایا تھا۔

"اماں دوائیاں اور ڈاکٹر میرے چہرے پر پڑے ان قسمت کے عطا کردہ تحفوں کو کم نہیں کرسکتے۔ آپ مان لیں کہ آپ کا بیٹا بدصورت ہے اور اتنا ہی بدصورت رہے گا۔" اب اس نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس کا دل یکدم ہر شے سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ کچھ دیر قبل وہ جتنی رغبت سے ناشتا کررہا تھا اب وہ چاہ کر بے رغبتی سے بھی حلق سے ایک نوالہ نہیں اتار سکتا تھا۔

"نہ پتر انج نہیں آکھی دا۔ میرا پتر سوہنا اے۔ انہاں داغاں نال تیری خوب صورتی تھوڑا ہی دبدی اے بھلا نہ ہووے تے، وہ بہت مشفق لہجے میں معصومیت سے گویا ہوئیں تو بن یامن پھر سے مسکرا دیا۔۔۔۔ وہی تلخ سی مسکراہٹ جو اس کی شخصیت کا خاصہ بن گئی تھی۔

"میری بھولی ماں۔ ماؤں کو تو ان کا چوڑا چمار پتر بھی شہزادہ لگتا ہے۔ میں کتنا بھی بدصورت ہوجاؤں آپ کو حسین ہی لگوں گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میں کس قدر بدصورت ہوں۔ کس قدر قابل نفرت ہوں۔ میں ۔۔۔ اماں خدارا مجھے بار بار احساس مت دلایا کریں کہ میں کتنا بدشکل ہوں۔ خدا کے لیے میری اذیت میں اضافہ مت کیا کریں۔" وہ تلخی سے کہتا کرسی گھسیٹ کر تیزی سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا اور عشرت ناہید اسے پکارتی ہی رہ گئیں۔ خود ان کا دل بھی یکدم بوجھل ہوگیا تھا۔ غلط کیا انہوں نے اس کے چہرے پر پڑے ان داغوں کا تذکرہ کرکے ۔۔۔ غلطی ان سے ہوئی تھی اور وہ جانتی تھیں سزا وہ خود کو دیتا رہے گا۔ انہیں شدت سے پچھتاوؤں نے آگھیرا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا انہیں خدشہ تھا ۔۔۔ اس روز وہ آفس نہیں گیا تھا اور اپنے کمرے میں ہی مقید رہا۔ کھانے کے لیے بھی باہر نہیں آیا تھا تاہم وہ خاموش رہی تھیں انہوں نے اس بات کا چرچا گھر میں نہیں کیا تھا۔ گھر میں ان کے سوا کوئی بھی نہ جانتا تھا صبح ناشتے کی میز پر کچھ ہوا تھا آج بن یامن صبح سے کمرے میں خود کو بند کیے بیٹھا تھا کیونکہ وہ صبح سب کے جاگنے سے قبل ہی آفس چلا جاتا اور رات گئے تک سب کے کمروں میں چلے جانے کے بعد آتا تھا۔ اس گھر کے مکینوں کا بہت کم ہی اس سے سامنا ہوتا تھا اس لیے کسی کو بھی اس کی گھر پر موجودگی کا علم نہیں تھا۔ وہ سب بھی ناشتا کرنے کے بعد اپنے اپنے دھندوں میں مصروف ہوگئے تھے۔ ابوبکر اور تفہیم آفس چلے گئے تھے جبکہ راہین، نمیرہ اور طلحہ یونیورسٹی تاہم ملیحہ گھر پر ہی سارا دن یا تو فون پر دوستوں سے گپیں ہانکتی رہتی یا پھر بستر توڑتی ٹی وی دیکھتی رہتی۔ اس نے ماسٹرز کے فائنل امتحانات دے رکھے تھے اور آج کل رزلٹ کے انتظار میں تھی۔

"پھوپھی ۔۔۔ آج دوپہر کو میرے لیے سلاد بنوا دیجیے میں ڈائٹنگ شروع کررہی ہوں۔" چائے میں دو چمچے چینی کی بجائے اس نے ایک چمچ چینی ڈالتے تساہلی سے صوفے پر بیٹھے ہوئے ہانک لگائی۔ "لے اج سوں فیر بھوک ہڑتال نے دساریاں دا آغاز اے۔" عشرت ناہید نے کچن سے ہی جھانکا تو ملیحہ نے بے چارگی سے افسردہ سا منہ بنایا۔

"کیا کروں پھوپھی اماں وزن دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ اب تو لگتا ہے ہوا اور پانی بھی میرے وزن میں من کے حساب سے اضافہ کرنے لگے ہیں۔" اس نے اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کو سانس کھینچتے ہوئے دیکھا جو دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔

"کنی واری کہیا اے کہ اے بازار دی شے نہ کھایا کر مگر سندی ای نئیں ایں میری گل تے شکر، تیل تے نشاستے آلی غذا بڑی بیماری اے۔" وہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے وہیں لاؤنج میں چلی آئی تھیں۔

"پھوپھی اماں میں کتنا پرہیز کروں..... تھوڑا سا بھی کھاؤں تو ڈبل لگتا ہے۔ دو مہینے جم جوائن کیے رکھا، مہینہ پوری ڈائٹنگ کی مگر مجال ہے کہ ایک پاؤنڈ وزن بھی کم ہوا ہو۔ میں کروں تو کیا کروں؟" وہ آزردگی سے منہ بنائے گھونٹ گھونٹ چائے اندر اتارنے لگی۔

"کسے کسے دا جسم ایہی جا ہوندا اے۔ بڑھ جاوے تے گھٹ ہی نہیں ہوندا۔" وہ آلو کے باریک چھلکے اتارتے ہوئے انہیں دوسری طرف تھال میں رکھ رہی تھیں۔ آج آلو انڈے بننے تھے جو ملیحہ کو بے حد پسند تھے مگر اس نے سوچ رکھا تھا کہ آج کچھ بھی ہو جائے، وہ دوپہر میں سلاد کھائے گی اور رات کو سوپ پیے گی۔

"پھوپھی اماں یہ دنیا موٹے لوگوں کی کیوں نہیں ہے؟ موٹے لوگوں کو دھتکارا کیوں جاتا ہے؟ مذاق کیوں بنایا جاتا ہے ان کا۔" عشرت ناہید چونکیں۔ ملیحہ نے جس انداز سے سوال کیا تھا وہ انہیں کسی اور کی یاد دلا گیا تھا۔ وہ بہت سال پیچھے چلی گئی تھیں۔

"اماں یہ دنیا کیا محض خوب صورت لوگوں کی ہے؟ کیا صرف حسین لوگوں، حسین چہروں کا ہی حق ہے اس دنیا پر؟ ہم جیسے بدصورت لوگ کہاں جائیں؟ ہمارا زندگی پر کوئی حق کیوں نہیں ہے؟"

وہ نڈھے پن سے ان کی گود میں سر رکھے پوچھ رہا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور عشرت ناہید اس کی ہمت بندھانے کو اپنی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو دل پر گرا رہی تھیں۔

"اس طرح نہیں آکھی دا۔" انہوں نے اس کے بال سہلائے تھے۔

"ایسا ہی ہے اماں، ایسا ہی ہے لوگ حسن کے پجاری ہوتے ہیں، پرستش کرتے ہیں حسین چہروں کی۔ دنیا ان کی ہوتی ہے، محفل پر وہ چھا جاتے ہیں سحر کر دیتے ہیں ذہنوں پر، آنکھوں پر، دلوں پر اور مجھ جیسے بدشکل کہیں نہیں ہوتے، کہیں exist نہیں کرتے۔ اللہ بدصورت لوگوں کو کیوں بناتا ہے؟ عبرت کے لیے؟ لوگوں کی تفریح کے سامان کے طور پر؟ محفلوں میں زیر بحث لانے کو؟ کیوں بناتا ہے اللہ ہم بدصورت لوگوں کو؟" وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ عشرت ناہید خاموشی سے اسے سن رہی تھیں وہ تو رو بھی نہیں سکتی تھیں۔

"اماں مجھے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ کا بس ایک بیٹا ہی ہوتا ابوبکر۔ مجھے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں آپ کے لیے بے عزتی کا باعث ہوں۔ آپ کے لیے کیا میں خود کے لیے بھی بے عزتی ہوں۔ اذیت ہوں اماں۔ ایسی اذیت جو مجھے صبح سے شام اور شام سے رات تک پہنچتی ہے اور رات جب میں سوجاتا ہوں تو اگلے روز پھر اسی اذیت کے ساتھ اٹھتا ہوں۔ میں عفریت ہوں۔ میں باعث عبرت ہوں اماں۔ لوگ میری طرف حقارت سے، نفرت سے دیکھتے ہیں۔ لوگ کیا میں تو خود بھی اپنی طرف نفرت سے دیکھتا ہوں میں آئینہ نہیں دیکھتا اماں۔ مجھے خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ گھن آتی ہے اپنے اس چہرے اس وجود کو دیکھ کر۔" عشرت ناہید تڑپ اٹھیں۔

"نہ پتر نہ۔ اللہ دی بنائی صورت سوں حقارتی کری دا۔ اللہ ناراض ہوندا۔" وہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولیں۔

"اللہ بھی میری صورت سے نفرت کرتا ہوگا ہے نا اماں۔" وہ معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔

"اللہ صورتاں نہیں ویکھدا اللہ تے دل ویکھدا اے۔ میرے پتر دا دل ہیرے ورگا جگر جگر کردا اے۔" انہوں نے آنکھوں میں آئی نمی کو جلدی سے چادر کے پلو سے پونچھ ڈالا۔

"اللہ بھی جمیل ہے نا اور وہ جمال کو ہی پسند کرتا ہے۔" وہ مایوسی کی انتہا پر تھا اور شاید جس دور سے وہ گزر رہا تھا اس کی حالت یہی ہونا تھی۔ ایسے میں عشرت ناہید کے لیے کس قدر آزمائش تھی کہ وہ پھر سے اپنے بیٹے کو زندگی کی طرف لائیں۔ سو اب اس کی زندگی میں سب کچھ پہلے جیسا نہیں کر سکتی تھیں مگر وہ مایوسی کی اس انتہا سے واپس ضرور لا سکتی تھیں۔

"نہ پتر۔۔۔ اس طرح دی گل نہیں کڈی دا۔ اللہ دل نے جمال نوں ویکھدا۔ ساڈے حضرت بلال رضی اللہ حبشی غلام سے۔ انہاں دے کول کیہڑا صورت دا جمال سی مگر انہاں دے اعمال تے دل ہی سے، جیہڑے اس مقام تک لے گئے کہ ساڈے سوہنے نبی آکھیا سی کہ میں بلال دے قدماں دی چاپ آپنے سے پہلاں سنداں واں جنت اچ۔"

وہ کوئی پڑھی لکھی خاتون نہ تھیں۔۔۔ کوری ان پڑھ اور گھریلو سادہ سی عورت مگر جاہل نہ تھیں بہت سے پڑھے لکھوں سے زیادہ پڑھی لکھی اور سمجھ دار۔

"وہ کہتی تھی اماں کہ میں اتنی بری شکل کا ہو گیا ہوں کہ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں سکتی، رہنا تو دور کی بات ہے۔" عشرت ناہید نے غصے سے لب بھینچ لیے۔ وہ، بالاخر انہی کی پسند ہی تو تھی جسے ان کے فرماں بردار بیٹے نے قبول کیا تھا۔

"اماں وہ کہتی تھی کہ مجھے خود جیسی کسی بدصورت سے شادی کرنا چاہیے جسے مجھ سے کراہیت محسوس نہ ہو۔" وہ رو رہا تھا اور ان کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔

"وہ کہتی تھی اماں کہ میں اس جیسی حسین لڑکی کے تو کیا میں کسی عام صورت والی کے بھی قابل نہیں۔ میں کچھ بھی کر لوں۔ میں ایسا ہی بدشکل رہوں گا۔" عشرت ناہید اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگیں۔

"مینوں معاف کر دے پتر۔ اے سب کج میری وجہ سوں ہویا اے۔ میری پسند سی او (مجھے معاف کر دو بیٹا یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری پسند تھی وہ۔) وہ روہانسی ہو گئی تھیں اور وہ اٹھ بیٹھا ماں کے ہاتھ تھام کر اس نے لبوں سے لگا لیے۔

"نہیں اماں۔۔۔ یہ میرا نصیب تھا۔ آپ خود کو الزام کیوں دیتی ہیں؟ آپ خود کو الزام دے کر میری تکلیف میں اضافہ مت کریں پلیز۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ ان کے گلے سے لگا سسکنے لگا تھا۔

"پھوپھی اماں کدھر کھو گئی ہیں یار آپ؟" ملیحہ نے ان کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تو وہ جیسے ماضی سے حال میں آئیں۔ گہری سانس خارج کرتے وہ اسے دیکھنے لگیں۔

"تو اے طرح پیاری لگدی ایں میری بچی۔ لوکاں دیاں گلاں نہ سنیا کر۔" وہ ہمیشہ اسی طرح اس کی ہمت بندھاتی تھیں۔ اپنے بھی اگر ہاتھوں میں برچھے اٹھا کر دلوں میں پیوست کرنے لگیں تو بندہ اپنے زخم اور دکھ کسے دکھائے۔ وہ کبھی اس کی دل آزاری نہیں کرتی تھیں۔ تبھی وہ ان سے وہ باتیں بھی کر لیتی تھی جو وہ اپنی بہنوں سے بھی نہ کہہ پاتی اور وہ خاموشی سے سن کر اسے پیار سے دلاسا دیتیں، اس کی ہمت بندھاتیں۔ ملیحہ اب خاموشی سے ٹی وی دیکھنے میں منہمک ہو گئی اور وہ کچھ سوچتی ہوئی سبزی بنانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

شام کو بادل گھر کر آئے تھے اور موسم خوشگوار ہوا تو سب ہی اوپر ٹیرس پر چلے آئے تھے۔

عرض تمنا پر میری ان ہونٹوں پر مسکان تو ہے
چاہے لاکھ نہ برسے بادل بارش کا امکان تو ہے

طلحہ نے موسم کے حسب حال شعر عرض کرتے ریلنگ سے نیچے جھانکا تو برابر والوں کی لڑکیاں بھی ٹیرس پر ہی کھڑی نظر آئیں۔

"اوہو بھئی آج تو بڑے بڑے لوگ دکھ رہے ہیں باہر۔" اس نے ابوبکر کو چھیڑنے کے لیے سیٹی بجاتے جملہ کسا تو ابوبکر بھی شرارت سے مسکرا دیا۔

"یہ تم دونوں میں کیا اشارے بازی چل رہی ہے۔" راہین نے دونوں کو کڑے ہاتھوں لیا تو دونوں سر

کھجانے لگے۔

"یار آج ہمیں اکیلے اوپر آنا چاہیے تھا یہ لڑکیوں کو ساتھ لانے والا آئیڈیا بڑا ہی بکواس تھا۔" ابوبکر نے طلحہ کے کان کی قریب ہوتے دانستہ اونچی آواز میں سرگوشی کی۔ مقصد ان تینوں کو چڑانا تھا۔ تینوں تو نہیں البتہ راہین ضرور چڑ گئی تھی۔

"ہاں تو ہم ابھی چلے جاتے ہیں۔" وہ منہ پھلا کر بولی تو دونوں کا زور دار قہقہہ پڑا۔ راہین نے تپ کر ان دونوں کی جانب سے رخ بدل لیا۔ طلحہ نے پھر سے برابر والوں کے ٹیرس پر دیکھا تو ان میں سے دو لڑکیاں اسے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کرتی مسکرا رہی تھیں۔

"ہائے۔۔۔

حیا سے سر جھکا لینا ' ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

اس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے لہجے میں شرارت سموتے ابوبکر کے کان کے قریب شعر پڑھا۔

"یہ تم دونوں میں آج چل کیا رہا ہے بھئی۔" تفہیم ان کی مسلسل سرگوشیوں سے اکتا کر بولا۔ وہ ملیحہ سے خوش گپیوں میں مصروف تھا اور نمیو بھی ان کے ساتھ ہی شامل گفتگو تھی۔ اب ان تینوں کا ہی دھیان ان دونوں کی جانب ہو گیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں ہم تو بس موسم کا لطف لے رہے ہیں۔ اس پر ایک شعر حاضر خدمت ہے کہ۔

چلو بھئی اب موسم کا مزا چکھیں
تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں

ابوبکر اور طلحہ دونوں اب ریلنگ سے دور ہٹ کر ان سب کی جانب چلے آئے تھے۔

"بھئی کوئی گرما گرم پکوڑے ' سموسے ہی کھلا دو ظالمو! کوئی کافی کوئی چائے کچھ تو پلا دو ظالمو!" تفہیم نے ان تینوں کی جانب دیکھا اور راہین ' نمیو نے ملیحہ کی جانب۔

"کیوں بھئی یہ سب میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں ہر گز اتنے اچھے موسم کو چھوڑ کر نیچے جا کر تم لوگوں کے پیٹوں کے لیے اجزاء تیار کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میرا بھی پورا حق ہے موسم انجوائے کرنے کا۔" اس نے ہری جھنڈی دکھائی تو سارے لجاجت بھرے لہجوں میں اس کے سر ہو گئے۔

"پلیز ملیحہ ہماری پیاری بہن نہیں ہو۔ پلیز بنا لاؤ نا۔"

"بالکل بھی پیاری نہیں ہوں اور بہن تو ہوں ہی نہیں میں کسی کی تھون ہو تم لوگ میں نہیں جانتی۔" وہ تو ناچشم بن کر مزے سے رخ پھیر گئی۔

"چلو بھئی راہین تم اٹھ جاؤ۔ مل جایا کرو کبھی تم بھی۔" ابوبکر نے حکم صادر کیا تو راہین کچھ دیر اسے گھورتی رہی جواباً" اس کے گھورنے پر تلملا کر اٹھی اور منہ کے زاویے بگاڑتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ جلدی جلدی چائے کا پانی چڑھایا اور کڑاہی میں پکوڑے بنا بنا کر تلنے لگی۔ سارا دھیان اوپر ٹیرس کی جانب ہی تھا۔ وہ سب اتنے اونچے قہقہے لگا رہے تھے کہ نیچے تک صاف سنائی دے رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر جزبز ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے وہ ڈھیروں پکوڑے تل رہی تھی۔ ایک آدھ پلیٹ سے ان سب کا کہاں گزارا تھا۔

"میرے لیے بھی ایک کپ چائے بنا دو گی۔" اس کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ اس وقت بن یامن کبھی گھر پر موجود نہ ہوتا تھا۔ اس نے حیرت سے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھے پانی پیتے ہوئے بن یامن کو دیکھا۔ ابھی وہ اس ادھیڑبن میں لگی تھی کہ اس کے ہنکارنے سے اس کی سوچ کا تسلسل ٹوٹا۔

"میں باہر لان میں ہوں ' چائے اور پکوڑے باہر دے جانا۔" انداز حد درجے سرسری سا تھا وہ اس فرمائش پر گرتے گرتے بچی تھی۔

"آج شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی ' عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ باہر لان میں موسم کا لطف اٹھانے جا رہے ہیں۔۔۔ واہ واہ۔ آج کہاں موسم کے بھاگ جاگے ہیں۔"

وہ دل ہی دل میں قیاس آرائی کرتی سنہری پکوڑوں کو بڑے اور گہرے کفگیر کی مدد سے تیل سے نکال کر بڑی پرات میں ڈالنے لگی۔ جھٹ پٹ۔ ایک پلیٹ تیار کر کے ایک طرف رکھی اور چائے کی پیالی ٹرے میں رکھے پکوڑوں اور کیچپ کے ہمراہ باہر لان میں آ گئی۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور وہ سیڑھیوں پر بیٹھا شیڈ کے نیچے ہاتھ پھیلائے بارش کو اپنی ہتھیلیوں پر گرتے محسوس کر رہا تھا۔ راہین کے لیے وہ منظر بالکل غیر متوقع اور حیران کن تھا۔ وہ ٹھٹکی اور کچھ دیر حیرت سے نظریں اس پر جمائے کھڑی رہی۔ بن یامین کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ جو یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی اس کے پلٹنے پر خجل سی ہو گئی۔

"یہ آپ کی چائے۔" اس نے نظریں چراتے ٹرے اس کی طرف بڑھا دی جسے جوں ہی بن یامین نے تھاما وہ جلدی سے پلٹ گئی۔ وہ اس کی پشت پر پڑی چوٹی کو دیکھتے ہوئے کہیں اور کھو گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے مجھے لمبے بال پسند ہیں۔"

"اچھا میرے بال بھی بہت لمبے ہیں۔" کسی کی کھنکتی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے سر جھٹکتے خود کو ماضی کی قید سے آزاد کرا لیا جتنی دیر وہ ماضی میں رہتا اتنی ہی تکلیف ہوتی اور وہ خود کو ہر گز تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے ٹپ ٹپ گرتی بوندوں کو محویت سے دیکھا۔

"مجھے بارش بے حد پسند ہے اور بارش میں بھیگنا اس سے بھی زیادہ۔" وہ چاہ کر بھی پیچھا نہیں چھڑا پایا تھا۔

"اور بارش میں گرما گرم چائے کافی اور پکوڑے کھانا میرا محبوب مشغلہ ہے۔" وہ اپنی پسند بتانے لگا تھا۔

"اوں ہوں۔۔۔ بارش میں تو ٹھنڈی یخ آئس کریم کھانے کا جو مزا ہے وہ کسی اور چیز میں کہاں؟" وہ شوخی سے بھرپور آواز کسی طور اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ گرم چائے اور پکوڑے یکدم بدمزا لگنے لگے تھے۔ وہ بے زار ہونے لگا تھا بالکل اسی طرح جس طرح وہ اپنی ذات سے بے زار تھا۔ راہین پرات اور چائے کی ٹرے دونوں ہاتھوں میں تھامے اوپر چلی آئی۔

"لو۔۔۔ ٹھونسو سب اور مجھے دعائیں دو۔" اس نے سینٹرل ٹیبل پر تمام لوازمات دھرے اور پھولی ہوئی سانس بحال کرنے لگی۔

"تم کیا بازار سے دوڑ کر یہ سب لے کر آ رہی ہو۔" نمیو نے بھرے منہ سے استفسار کیا۔

"مت پوچھو۔۔۔ نیچے بن یامن بھائی نے مجھ پر حیرتوں کے وہ وہ پہاڑ توڑے ہیں کہ میری دھڑکن کے نارمل ہونے میں صدیاں لگ جائیں گی۔"

"ہائیں۔۔۔ وہ آج کدھر؟" سب ہی کھاتے کھاتے چونکے تھے۔

"جی وہ نا صرف آج گھر پر ہیں بلکہ پکوڑوں اور چائے کی فرمائش بھی داغی اور موسم کا لطف بھی اٹھا رہے ہیں وہ بھی نیچے لان میں بیٹھے۔" اس کی اس قدر معلومات بہم پہنچانے پر وہ سب ہی کچھ دیر کو حیران ہوئے اور پھر سے کھانے میں جت گئے۔

"آج بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں۔" راہین نے چائے کی چسکی بھری۔

"تم ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی ہو۔۔۔ پکوڑے ختم ہو جائیں گے۔" ابوبکر نے اسے ٹوکا تو وہ اسے بس گھور کر رہ گئی۔

"کتنا فرق ہے دونوں بھائیوں میں۔" اس نے دونوں کا موازنہ کیا۔ شاید وہ بھی کبھی ایسے تھے مگر حالات نے انہیں ایسا بنا دیا ہے۔ انسان کب بدلنا چاہتا ہے مگر حالات اسے تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس نے یاسیت سے سوچا اور پھر اپنی سوچ جھٹک کر ان سب کے ساتھ شامل ہو گئی جو اب کسی بات پر زندگی سے بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔ کوئی کتنی دیر دوسرے کے بارے میں غور کرتا اور سوچتا ہے وہ بھی اب لاتعلق سی بنی ہنس رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ایک بات کہوں یار ' کبھی کبھی مجھے بن یامن بھائی

پر بہت ترس آتا ہے۔ کیا زندگی ہے اس بے چارے کی۔" رات میں وہ اپنے بستر پر بیٹھی ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے آزردگی سے بولی۔

"چلو جی آج ایک کپ چائے اور چند پکوڑے کیا بنا دیے ہمدردی کا بخار ہی چڑھ گیا ہے اور پلیز اتنا لمبا نام مت بولا کرو۔۔۔ بن یامن بھائی۔ بندہ بیٹھا انتظار میں سوکھتا رہے کہ کب نام مکمل ہو اور کب بات آگے چلے بگ بی نہیں کہہ سکتیں؟ سہولت ہو جاتی ہے خود کو بولنے میں اور اگلے کو سننے میں۔" نمیو لیپ ٹاپ پر اسائنمنٹ بناتے ہوئے اکتاہٹ بھرے لہجے میں اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

"اچھا جی۔۔۔ بگ بی۔ مگر وہ بے چارے اچھے ہیں۔" وہ کچھ افسردہ سی تھی۔ نمیو نے اب کی بار کوئی تبصرہ کرنا گوارا نہ کیا تو وہ ملیحہ کی جانب متوجہ ہوئی۔

"آج پھوپھو بھی کچھ افسردہ سی تھیں۔ اینڈ بن یامن آئی مین "بگ بی" بھی شاید آفس نہیں گئے۔ بے بی کچھ ہوا ہے تمہیں نہیں لگتا؟" ملیحہ نے جو خاموش بیٹھی رسالہ پڑھتے ہوئے نمکو کھا رہی تھی، بے نیازی سے کندھے اچکا کر اسے دیکھا اور پھر سے رسالہ پڑھنے لگی۔

"تم کتنی بے حس ہو اور ڈھیٹ بھی۔ تمہیں کسی بات سے فرق نہیں پڑتا سیل فش۔" ملیحہ کے انداز نے اسے سلگا دیا تھا۔ وہ چیخ کر بولی تو ملیحہ اس کی شکل ہی دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس بات پر اتنی بے بھاؤ کی سنا رہی ہے۔ بغیر کوئی جواب دیے اس نے منہ بسورے پھر سے نمکو اور رسالے میں خود کو غرق کر لیا۔

"میرا نجانے کیوں دل کر رہا ہے کہ پھپھو سے ڈیٹیل میں پوچھوں ان کی زندگی کی بابت۔" ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے اس نے لوشن کی بوتل واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی۔

"کیسے ہوں گے وہ پہلے، پھپھو نے کوئی تصویر تو سنبھال کر رکھی ہو گی۔ مجھے تو بالکل بھی ان کی بارہ سال پہلے والی صورت یاد نہیں۔ ویسے اگر ان کے منہ پر سے دھبے ہٹا دیے جائیں تو کافی خوش شکل ہوں گے۔۔۔ کم از کم ابوبکر سے تو زیادہ ہی۔" وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ وہ دونوں سنی ان سنی کر گئیں۔

"بھلا ایک لڑکی کے لیے اپنی اچھی خاصی زندگی کیوں تباہ کر رہے ہیں؟ دو حرف بھیجیں اس پر اور گھر بسائیں۔" اپنے بستر میں کھیس اوڑھ کر وہ لیٹ گئی۔

"زندگی انسان کے اندر سے مکمل طور پر کبھی نہیں مرتی، کسی کمزور لمحے میں زندگی کی طرف لوٹتا ہی ہے۔" اس نے چھت کو گھورتے ہوئے سوچا۔ اس کے ذہن کے پردے پر لان میں بارش کے قطروں کو محسوس کرتے بن یامن کی شبیہ ابھری تھی۔

"حد ہے راہین بی بی۔۔۔ خوامخواہ خود کو ہلکان کیے جا رہی ہو۔ بس کر دو اب اس شخص کے بارے میں سوچنا۔ اتنا وہ خود اپنے متعلق فکرمند نہ ہو گا جتنا تم قنوطیت کا شکار ہو رہی ہو، چپ کر کے سو جاؤ اب۔" اس نے خود کو سرزنش کی اور آنکھیں سختی سے میچے، ذہن کو سوچوں سے آزاد کر کے سو گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ اتوار کو گھر پر ہی تھا اور کسی کام سے باہر جا رہا تھا جب لاؤنج کے دروازے سے عشرت ناہید نے اسے آواز دی۔

"بن یامن گل سن جا مینڈھی۔" وہ وہیں تھم گیا تھا۔ لاؤنج میں ان کے ساتھ ابوبکر بھی موجود تھا۔ وہ دونوں جیسے کسی گہری نوعیت کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے لاؤنج کے صوفے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں کج پچھنا چاہنی آں" (میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں) اس کا سر اثبات میں ہلا گو وہ اجازت دے رہا تھا کہ وہ جو کہنا چاہتی ہیں کہہ سکتی ہیں۔ "پتر۔۔۔ ناصر پائی نا فون آیا۔" ابوبکر گہری نظروں سے اس کے تاثرات کو جانچنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا چہرہ پہلے کی طرح پرسکون تھا حتیٰ کہ آنکھوں کے تاثرات تک نہ بدلے تھے۔ اسے بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی ان بارہ

سالوں میں تاثرات کو چھپانے اور خود کو نارمل رکھنے کی۔

"ماہ وش دا ایکسیڈنٹ ہویا سی دو دیہاڑے ہو گئے نے۔ اس اچ اسد اجنا اللہ نوں پیارا ہو گیا تے او آپ اپاہج ہو گئی اے۔ ریڑھ کی ہڈی ٹٹ گئی اے وچاری دی۔" ابوبکر جو ہنوز اس کے چہرے کو جانچ رہا تھا۔۔۔ لمحوں کے ایک پل میں بھی اس کے تاثرات کو بدلتے ہوئے نہ پایا تھا۔ تاہم اس کی آنکھوں کے تاثرات ضرور بدلے تھے۔

"میں جانا چاہتی آں۔۔۔ جے تینوں کوئی اعتراض نہ ہوئے تے۔" ابوبکر کو لگا تھا وہ صاف منع کر دے گا مگر وہ حیران رہ گیا جب اس نے اسے بولتا پایا۔

"جی ضرور جائیں اماں اس میں اجازت کی کیا بات ہے؟" اس کا لب و لہجہ حد درجے پرسکون تھا۔ ابوبکر کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی توقعات کے برعکس ہی نکلا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

"شکر اے۔۔۔ تینوں کوئی مسئلہ نئیں اے۔ اے ابوبکر ہی مینوں منع کر ریا سی۔ بندہ ہن رشتے تے نئیں چھڈ سکدا آپنے ہی اپنیاں دے کم آندے۔ ایویں دی دکھ دا ویلا ہے۔ فوتگی آلے ویلے تے پرائے وی ساتھ دیندے نے تے عشرت ناہید کس طرح آپنے بھرا دا ساتھ چھوڑ سکدی اے۔"

انہیں جیسے اس کے اعتراض نہ کرنے پر مان سا ہوا تھا اور وہ ابوبکر کو بھی سنا رہی تھیں۔ "اماں ان لوگوں نے بھائی کے ساتھ جو کیا وہ کیسے بھول سکتی ہیں آپ؟ کیسے زندگی تباہ کی ان کی آپ بھول گئی ہیں سب۔ اتنے آرام سے سب پس پشت ڈال کر آپ چل پڑی ہیں ان کی طرف۔" ابوبکر مزید خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سنانا ان دونوں کو ہی مقصود تھا۔

"ابوبکر۔۔۔ دلوں میں کینہ بھر کر رکھنا ہماری ماں نے ہمیں نہیں سکھایا۔ جو باتیں دکھ دیں انہیں بھولنا اچھا ہوتا ہے۔" بن یامن نے سنجیدگی سے اسے سمجھایا تو وہ استہزائیہ مسکرا دیا۔

"اگر بھولنا بہتر ہوتا ہے تو آپ بھول کیوں نہیں جاتے۔ بارہ سال سے کیوں اپنے آپ کو سزا دیے جا رہے ہیں۔ کس بات کا ماتم منا رہے ہیں۔ اس لڑکی کا جس کو کوئی پروا نہیں۔ جو اپنی زندگی میں خوش باش تھی اور ایک آپ ہیں کہ۔۔۔" بن یامن کی آنکھوں میں کرچیاں چبھ گئی تھیں جن کی تکلیف اسے محسوس ہو رہی تھی۔

"میں بھول چکا ہوں۔" اپنی آواز اسے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ ابوبکر عجیب۔۔۔ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میں کم از کم کسی کے لیے دل میں بغض یا کینہ نہیں رکھتا ہوں۔ میرا دل ہر قسم کے میل سے پاک ہے۔" اسے لگا کہ ابوبکر کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا تبھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور عشرت ناہید کی جانب دیکھا۔

"اماں ضرور جائیں آپ ابھی نکل جائیں بے شک اور چاہیں تو رک جائیے گا ایک دو دن۔ میں کسی کام سے نکل رہا ہوں اگر کہتی ہیں تو میں ویٹ کر لیتا ہوں۔ آپ آجائیں تیار ہو کر میں ہی آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔"

"جلے بڑے کم پے دی کم سانبھ لواں کڑیاں نوں وی ذرا عقل مت دے دیواں فیر ابوبکر ہی مینوں چھڈ دوے گا۔ تو چلا جا۔"

کچن میں جاتے ہوئے وہ ذرا کی ذرا رک کر بولیں تو وہ انہیں الوداع کہتا ہوا نکل گیا۔ ابوبکر کے چہرے پر چھائی طنزیہ مسکراہٹ ہوا ہو گئی تھی اور اس کی جگہ غصے و اشتعال نے لے لی تھی۔

"منافق کہیں کا۔ ایک طرف کہتا ہے دل میں میل نہیں۔۔۔ کینہ نہیں اور دوسری طرف مجسمہ ماتم بنا پھرتا ہے۔ دوغلی صورت والا۔ ڈبل اسٹینڈرڈ انسان۔ زیادہ مہان بنتا ہے اماں کے آگے۔"

اس نے صوفے کو ٹھوکر ماری اور اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ عشرت ناہید جلدی جلدی کام سمیٹتے، ملیحہ کو آواز دے کر اسے دیگر کام سمجھانے لگیں۔ ان کا ارادہ ایک رات وہیں ٹھہرنے کا تھا۔

☆ ☆ ☆

"پھپھو لائیں میں کاٹ دیتی ہوں۔" اس روز صائقہ نہیں آئی تھی اسی لیے وہ جب کچن میں پانی پینے آئی تو عشرت ناہید کو سبزی بناتے دیکھ کر ان کے آگے سے سبزی کی ٹوکری ہٹاتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔ عشرت ناہید اب جلدی جلدی بریانی کے لیے مسالا تیار کرنے لگیں۔

"پھپھو ایک بات کہوں؟" اس نے ذرا کی ذرا رک کر چکن دھوتی عشرت ناہید کی جانب دیکھا اور پھر مزید گویا ہوئی۔

"آپ بگ بی میرا مطلب بن یامن بھائی کی شادی کروا دیں۔" ان کے کام کرتے ہاتھ تھم گئے اور نا سمجھی کے عالم میں راہین کی جانب دیکھا۔

"کبھی نہ کبھی تو آپ کو ان کی دوسری شادی کروانا ہو گی نا وہ کب تک یونہی رہیں گے۔ اکیلے رہ رہ کر انہیں زیادہ ڈپریشن ہو گیا ہے۔ جب ان کی زندگی میں ایک لڑکی آجائے گی تو پھر سے سنبھل جائیں گے۔" عشرت ناہید بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں اس کی بات کے اختتام پر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئیں۔

"ارے دھیے میں تے سو بسم اللہ کراں جے او من جاوے۔ پر او مندا ای نئیں۔ میں کس منہ نال زور دیواں پہلے وی تے اس میری من کے نکاح کیتا سی کی لب گیا۔ ہن میتوں ڈر لگدا کیرٹی کڑی ہووے کی جیڈی اس نال دل دیکھ کر ویا کرے گی اس نی صورت تے نال جاوے گی۔"

"اوہو پھپھو کوئی نا کوئی مل جائے گی۔ یہ کوئی اتنی بڑی خرابی تو نہیں ہے۔ لڑکی والے تو شکر کرتے ہیں کہ برسرروزگار لڑکا ملے اور وہ بھی کھاتے پیتے گھرانے کا۔" اس نے حوصلہ و تشفی دی۔

"پھپھو آپ کیسے ان لوگوں سے ملنے چلی جاتی ہیں جن لوگوں نے بن یامن بھائی کی زندگی خراب کر دی۔"

"پتر رشتے توڑن نئیں جاندے۔ اللہ ناراض ہو

وے ندا میرے پتر دے نصیباں اچ انج ہی لکھیا رب نے تے نو کاں نال کی شکایت۔" بڑی عاجزی سے انہوں نے کہا۔ کہ راہین ان کی پر نور جھریوں بھری صورت دیکھ کر رہ گئی۔

"کدی میرا پتر وی ہنسدا سی بولدا سی۔ اس موئی بیماری اج پچھا پو ٹیا کہ برباد ہی کر کے رکھ چھوڑیا۔" حسرت سے آہ بھرتے انہوں نے آنکھوں میں در آنے والی نمی کو پونچھ ڈالا۔ وہ کہیں ماضی میں کھو گئی تھیں۔

"فرماں بردار پتر سی میرا۔ ابوبکر ور گا کھورے دل دا نئیں سی ہن دی بوہتا فرماں بردار اے۔ میں جیڈی گل آکھ دواں، نہ کدے وی نئیں کردا سی۔ ماں دی گل تے پتھر دی لکیر ہوندی سی اس آسدے۔" وہ بریانی کا مسالا بناتے بناتے دور کہیں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے بولیں۔

"بڑے سوہنے دل دا سی میرا بن یامن۔ روپ دی انج سی جیویں نور اتر آیا ہووے مکھڑے تے۔ ہنسدا سی تے ہنسادا سی بڑے دل آلا سی بوہتے محبت کرن آلا، خیال رکھن آلا۔" آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تو وہ ہنس دیں اور جیسے ماضی سے حال میں لوٹ آئی تھیں۔

"اس دی ماں نی نظر ہی لگ گئی انہوں۔" آنکھوں سے جھلکتے آنسو انگلی کی پوروں سے چن لیے۔

"کیہڑی ماں چاہندی کہ اس دا جواں پتر ایہو جا ہو جاوے۔ میں کی کراں ہن... میرا دل کڑھدا اے ویکھ ویکھ کے انوں میں کس طرح جیوندی آں میں ہی جاندی آں۔ میں ہن دل وڈا کر کے انہوں نئیں آکھ سکدی کہ ہن فیر دوجی وار سہرا سجا او وی میری پسند دا۔ ہن تاں ہی میں اس دا ویاں کراں گی جدوں او آپے راضی ہووے گا۔" وہ خاموشی سے سبزی کاٹتی انہیں سن رہی تھی۔ پہلے سے پیدا ہونے والی ہمدردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہوا ہے ماہ وش کے ساتھ۔ مکافات عمل ہے یہ دنیا۔ جیسا کیا ہے نا اس نے ویسا ہی ملا ہے اسے کسی کی زندگی برباد کی ہے نا اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر اس کی زندگی تباہ ہوئی ہے۔ گھر بھی برباد ہوا اور چلنے

پھرنے سے بھی گئی۔" اس نے تلخی سے کہتے ہوئے سبزیاں کاٹ کر شاپنگ بیگ پر ایک طرف رکھ دیں۔

"اس طرح دی گلاں نئیں کردی دا کسی مسلمان دی تکلیف اتے۔ ساڈی کی اوقات اے اللہ دے کماں اگے۔ اس طرح نہ کہیا کر پتر۔ اللہ نے قہر سوں ڈری دا۔ بندہ کی شے ہے اج کوئی ہور تکلیف اچ اے۔ کل ساڈی واری وی آسکدی اے۔" راہین نے حسب معمول ان کی نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا اس کی اپنی سوچ تھی اور وہ عشرت ناہید کی سوچ سے ہرگز مطابقت نہ رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پتر ہن تو لوٹ کے آجا۔ میں اپنی زندگی اچ ہی تیرا ویاہ کرنا چاہندی آں۔ واپس لوٹ آ پاکستان جے میں اس واری تیرے سر تے سہرا سجا سکاں۔" فون پر بات کرتے ہوئے ان کی آواز پر جوش بھی تھی اور لرزیدہ بھی۔ ان دنوں بن یامن اعلا تعلیم کے لیے ٹورنٹو میں مقیم تھا۔ اس کی اور ابوبکر کی عمر میں سات سال کا فرق تھا۔ ابھی ابوبکر آٹھ سال کا ہی ہوا تھا کہ عشرت ناہید کے شوہر شاہد خان چل بسے تھے۔ وہ بیوہ ہو کر اپنے چھوٹے بھائی سرفراز کے ہاں آگئی تھیں اور سرفراز امجد کے بن ماں کے بچوں کو ان کی صورت میں ماں مل گئی اور عشرت ناہید کے دونوں بچوں کو سائبان۔ یوں سارے بچے اکٹھے بڑے ہوئے تھے تاہم بن یامن میٹرک کے بعد سے ہی اسکالر شپ پر پڑھنے کی غرض سے باہر چلا گیا تھا۔

"اماں... میری پڑھائی ختم تو ہو جانے دیں۔" اس نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔

"تیری پڑھائی تے سالاں سوں چلی رہی اے۔ مکدی ہی نئیں۔ بس پتر میتوں بڑے ارمان نے جلدی سوں آجا۔ ویکھیں کن چن جا ٹوٹا اے میری ہوں آلی نو(کس طرح چاند کا ٹکڑا ہے میری ہونے والی بہو)" وہ اس کے کسی تردد اور انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولیں۔

"اماں چاند میں داغ بھی ہوتا ہے۔ دھیان رکھیے گا۔" اس نے یونہی ماں کو چھیڑا تھا۔

"اے چاند بے داغ ہے۔" وہ بڑے مان سے بولی تھیں۔

اگلے ماہ ہی وہ لوٹا تھا اور تیئس برس کی عمر میں اس کا نکاح عشرت ناہید کے خالہ زاد بھائی ناصر یعقوب کی بیٹی ماہ وش سے ہوا۔ جو واقعی ماہ وش ہی تھی۔ نکاح کے فوراً بعد وہ واپس لوٹ گیا تھا اور رخصتی اس کی اور ماہ وش کی تعلیم مکمل ہونے تک موخر کر دی گئی۔ ٹورنٹو آنے کے بعد اس نے خود سے فون پر ماہ وش سے رابطہ کیا تھا۔ وہ ایک آدھ دن چھوڑ کر اس سے مستقل رابطے میں رہنے لگا تھا۔ اس کی سادہ طبیعت کے برعکس ماہ وش بڑی شوخ طبیعت اور زندگی سے بھرپور لڑکی واقع ہوئی تھی خود بھی حسین تھی اور حسن کی دلدادہ بھی۔

"ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہے۔ میڈ فار ایچ اور۔" وہ بڑے فخر سے جتلاتی تو وہ ہنس دیتا۔ وہ پہروں بولتی رہتی اور اسے خاموشی سے سنتا اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔

"آئی ایم ویری لکی یو نو۔ لڑکیاں مجھ سے جلتی ہیں۔" وہ ایک ادا سے کہتی۔

"اچھا وہ کیوں؟" اس کی اس ادا پر وہ نثار ہوتا۔

"بھئی میرا ہزبینڈ باہر سے پڑھ کر آرہا ہے۔ اتنی زبردست جاب کرے گا۔ اتنی اچھی فیملی سے ہے اور سب سے بڑھ کر حسین اور ڈیشنگ۔" وہ اپنی خوش قسمتی کا سارا سہرا اس کے سر باندھتی تو وہ زندگی سے بھرپور قہقہہ لگاتا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟ سچ کہہ رہی ہوں میں سولہ آنے سچ۔"

"ہاں بابا بالکل سچ۔" وہ ہنستے ہوئے تائید کرتا۔

"اور اگر کبھی مجھ سے بھی ڈیشنگ، خوب صورت پڑھا لکھا اور زبردست جاب والا مل گیا تو۔" وہ چھیڑنے کے لیے سوال کرتا۔

"کوئی نہیں جی۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی

بھی نہیں۔" وہ منہ پھلا کر جواب دیتی تو اسے اور بھی پیار آنے لگتا۔

"اچھا۔۔۔ کیوں نہیں ہو سکتا ایسا؟ ایسا کیا ہے مجھ میں؟" وہ خاصا محظوظ ہو کر گویا ہوتا۔

"بس نا۔۔۔" وہ جھینپ سی جاتی۔ اس کی یہی باتیں، یہی ادائیں تو اسے بندہ بے دام بنائے رکھتیں۔ "بس کیا؟ بتاؤ نا ایسا کیا ہے؟" وہ شرارت سے دریافت کرتا تو وہ یک دم خاموش ہو جاتی اور وہ اس کی اس ادا پر فدا ہوتا ہنس دیتا۔

"آپ کو نہیں پتا، ہے نا؟" مصنوعی خفگی سے کہتی تو وہ شوخ ہوتا۔

"نہیں پتا۔ تم بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا۔"

"میں نہیں بتاؤں گی۔ میں کیوں بتاؤں؟ ہر بات بتانے والی تھوڑا ہوتی ہے۔ بندہ خود بھی تو سمجھتا ہے کہ ہر جذبے کے لیے الفاظ ضروری نہیں ہوتے۔"

"میری جان! ابھی تو کہہ دو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو یار۔ کتنی کنجوس ہو تم محبت کے معاملے میں۔" وہ وارفتگی سے کہتا اسے چھیڑتا۔

"کوئی محبت نہیں ہے۔ آپ بہت برے ہیں۔ میں فون بند کر دوں گی۔" وہ جانتا تھا وہ مسکراتے ہوئے ہی خفگی کا مصنوعی اظہار کر رہی ہوتی ہے اس لیے وہ کھل کر ہنس دیتا۔

"اف اس ادا پر ہم مر ہی نہ جائیں۔" دل پر ہاتھ رکھے وہ ٹھنڈی سانس بھرتا تو جواباً اس کی جلترنگ ہنسی سنائی دیتی اور وہ بغیر کچھ کہے فون رکھ دیتی۔ اس کی زندگی میں ماہ وش ایک خوشگوار جھونکے کی طرح آئی تھی۔ محبت کا جھونکا۔۔۔ جو سب کچھ ہلا کر رکھ دیتا ہے مگر اس کی خوشیوں کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اس کی زندگی میں پہلی دراڑ تب پڑی جب ایک روز شیونگ کے دوران اس نے اپنی گردن پر ایک بیضوی سفید اور بھورا سا دھبا دیکھا۔ اس نے انگلی سے اسے چھو کر دیکھا تھا وہ کوئی ایک سینٹی میٹر کا قطر لیے ہوئے بیضوی دھبا اس کی ٹھوڑی سے نیچے گردن کی طرف بنا تھا ان دنوں وہ آخری سمسٹر میں مصروف تھا اس لیے اس نے اس داغ کو قابل توجہ نہ سمجھا۔ اگلی بار اس نے جب شیونگ کی تو اس داغ کے برابر اس جیسا ایک اور داغ تھا اور پہلے والے داغ کا قطر ایک سینٹی میٹر سے بڑھ کر تھوڑا زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسا ہی دھبا اسے کان کی لو کے قریب بھی نظر آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر کو جا کر دکھائے گا مگر وہ اپنے تھیسس میں سے بالکل وقت نہ نکال پایا تھا۔ ان دونوں اس کی پاکستان عشرت ناہید اور ماہ وش سے بھی بات نہ ہوتی تھی۔ تھیسس کے دوران ہی اسے زبردست جاب کی آفر ہوئی تھی جو اس نے قبول کر لی تھی۔ پڑھائی اور جاب کو صحیح خطوط پر چلاتے ہوئے وہ اپنے لیے وقت نکالنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ جب بھی شیو بنانے کھڑا ہوتا اسے احساس ہوتا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جانا ہے مگر ہر بار وہ مصروفیت میں بھول جاتا۔ "یار بہت مصروف ہوں۔ بس تھیسس ختم ہو تو میں یہاں سے سب وائنڈ اپ کر کے ہی آؤں گا۔" وہ لیپ ٹاپ پر ایک ہاتھ سے کام کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے فون کان سے لگائے ماہ وش سے بات کر رہا تھا۔ ماہ وش نے اسے خود سے فون کیا تھا اور وہ اپنی مصروفیت کی توجیہہ پیش کر رہا تھا۔

"اتنا بھی کیا مصروف کہ بندہ ایک کال نہ کر سکے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"یار قسم خدا کی بے حد مصروف ہوں۔ مجھے تو۔۔۔" اسے یک دم پھر سے یاد آ گیا تھا۔ "او ہاں یار میں نے کسی اسکن اسپیشلسٹ کے پاس بھی جانا ہے۔ میرے فیس اور گردن پر عجیب سے داغ بن گئے ہیں اور مجھے اتنا بھی ٹائم نہیں ملا کہ چیک کرا سکوں۔" اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اسے آگاہ کیا۔

"کیسے داغ؟" فکر مندی اس کے لہجے سے ہویدا تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ بس عجیب سے داغ ہیں جو دن بہ دن بڑھتے جا رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔"

"تو آپ چیک کرائیں نا۔"

"ہاں کراؤں گا۔ بس وقت نکالنا ذرا مشکل ہو رہا

ہے۔" فون ایک کان سے دوسرے پر منتقل کرتے اس نے مصروفیت کا رونا رویا۔

اس نے ایک مشہور ماہر امراض جلد کو چیک کرایا تو اس نے عجیب انکشاف کیا۔ اس کے چہرے اور گردن پر بننے والے داغ مکمل ختم نہیں ہو سکتے تھے تاہم انھیں مزید پھیلنے سے روکا جا سکتا تھا۔ بہرحال اس نے علاج شروع کرا دیا تھا۔ تب ہی اسے پاکستان سے خبر ملی تھی کہ سرفراز امجد ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ وہ کام کاج اور مصروفیت چھوڑ کر پاکستان آیا تھا۔ جنازے پر تو نہ پہنچ سکا تھا مگر اس کا اپنی ماں کے پاس ہونا بھی انہیں حوصلہ دینے کو بہت تھا۔ اس کی ماں اس کا چہرہ دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔

"یا من۔۔۔ تیرے چن ورگے مکھڑے نوں کس دی کالی نظراں کھا گیاں نے۔" اس کے چہرے کے بدنما داغوں کو جو اب اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے تھے تاسف سے دیکھتے کہنے لگیں۔

"ٹھیک ہو جائیں گے اماں۔" وہ ان سے کہیں زیادہ خود کو دلاسا دے رہا تھا۔ تب ہی اس نے خاندان بھر کی نظروں میں اپنے لیے ترحم ابھرتے دیکھا اور اسے ان ترحم بھری نظروں سے شدید کوفت ہونے لگی۔

"میں نے امی سے سنا ہے کہ آپ کا فیس بہت خراب ہو گیا ہے۔" اس نے رات میں ماہ وش کی کال ریسیو کی تو اس کے انداز اور لب و لہجہ اسے چونکا گیا۔

"ہوں۔۔۔ ٹریٹمنٹ کروا رہا ہوں میں۔" اسے نجانے کیوں دکھ سا ہوا تھا۔ وہ ساری دنیا کا سامنا کر سکتا تھا۔ خوش دلی سے نہ سہی بددلی سے ہی سہی مگر وہ ماہ وش کے ان الفاظ کو برداشت نہ کر پا رہا تھا۔ بددلی سے بھی نہیں۔

"اور ٹھیک نہ ہوئے تو۔۔۔" اس کے سوال پر وہ سن ہو گیا تھا۔ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے داغوں میں کتنی بہتری آئے گی۔ شفا دینا، نہ دینا تو خدا کے ہاتھ تھا۔ انسان تو اس کے ہر امر کے آگے بے بس ہے۔

"ہو جائیں گے ٹھیک۔" اس نے کھوکھلے سے انداز میں گویا اسے تسلی دی۔

"ہو جائیں گے۔۔۔ امکان پر بات کر رہے ہیں آپ یقین تو نہیں ہے آپ کو۔" وہ چبا چبا کر بولی تو جواباً اس کا لہجہ بھی ترش ہو گیا۔

"یقین کسے ہوتا ہے ماہ وش؟ تمہیں اپنی زندگی کا یقین ہے؟ نہیں نا۔"

"زندگی اور موت کی بات نہیں کر رہی، آپ کی اس بیماری کی بات کر رہی ہوں میں۔" اس روز وہ پہلے جیسی ماہ وش لگ ہی نہیں رہی تھی۔

"تو کیا کروں اب میں اس بیماری کا۔ تم بتاؤ۔ جو چیز اللہ کی طرف سے ہے اس پر میرا کیا اختیار ہے۔ تکلیفیں تو زندگی میں آتی ہی رہتی ہیں اب بندہ۔۔۔"

"آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔۔۔ مگر آپ تو مستقل ان تکلیفوں کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔" اس نے یامن کی بات بیچ میں کاٹ کر درشتی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"کبھی کبھی تکلیفیں مستقل ساتھ رہ جاتی ہیں اور انسان کو خود کو ان کا عادی بنانا پڑتا ہے۔" اس نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ تلخی سے ہنس دی۔

"میں مستقل تکلیف کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے لیے مستقل تکلیف ہوں؟" اس نے دکھ اور بے یقینی سے سوال کیا۔

"اگر آپ کی یہ بیماری مستقل ہے تو۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اسے ایک فیصد بھی ماہ وش سے اس جواب کی امید نہیں تھی مگر اس نے بڑی بے رحمی سے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا تھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ یہ مستقل ہے تو؟" اس کا لہجہ شکستہ تھا۔

"تو میں کہوں گی کہ مجھے سوچنا پڑے گا۔" اس نے اسی انداز سے قدرے متامل ہو کر جواب دیا اور فون رکھ دیا۔ وہ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ لب بھینچے فون کا ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا۔ کچھ لوگوں کے منہ سے آپ کچھ باتیں کبھی سننے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ کچھ لوگ جب وہ تمام الفاظ ادا کر بھی دیں، جو آپ ان کے منہ سے کبھی سننے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، تو بھی آپ کو یقین نہیں آتا۔ اسے بھی یقین نہیں آرہا تھا اس کے اندر گویا دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ کتنا بھی خود کو یقین دلا دیتا کہ یہ سب اسے ماہ وش نے کہا ہے اس کا دل کسی صورت ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

سرفراز امجد کے قل والے روز اس نے زنان خانے میں کسی کام کی خاطر جاتے ہوئے ماہ وش کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ بن یامین کے اضطراب اور بے چینی میں یک بہ یک اضافہ ہوا۔ وہ جلد از جلد اس منظر سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ رات میں وہ اسے فون کرے گی، مگر اس رات اس نے کوئی فون نہیں کیا وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے اس کے فون کا انتظار کرتا رہا تھا مگر فون آنا تھا نہ آیا۔ اس کے دل و دماغ میں شور سا مچا ہوا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ بہت غلط ۔ مگر تین دن بہت خاموشی سے دبے پاؤں گزر گئے۔

پھر چوتھے روز آیا بھی تو کیا؟ اس کی موت کا پروانہ۔ عشرت ناہید خستہ اور تباہ حال سی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ "یامین۔۔ ناصر پائی آئے سی سویرے سویرے۔" اس کا دل زور کا دھڑکا تھا۔ "او کہندے ۔۔ او کہندے۔۔۔" ان کے الفاظ زبان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ دل ڈوب کر ابھرتا اور پھر ڈوب جاتا۔

"او کہندے کہ ماہ وش نوں طلاق چاہی دی۔" وہ دروازے کا سہارا لیے کھڑی بمشکل کہہ پائی تھیں۔ ان کے الفاظ اس کی روح کے اندر تک اتر گئے تھے اس کا وجود جیسے بے جان سا ہو کر بستر پر ڈھے گیا۔

"پتر۔" عشرت ناہید تیزی سے اس کی جانب لپکیں۔ "یامین پتر۔" اس کے چہرے کو ہاتھوں کا پیالہ بنائے تھامے ہوئے وہ بے اختیار چومنے لگیں۔

"اماں میں اکیلے رہنا چاہتا ہوں۔ پلیز۔" جلد ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ وہ وجہ نہیں جاننا چاہتا تھا۔ وجہ اسے پہلے سے معلوم تھی وہ یہ تمام الفاظ بس اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا تاکہ اسے یقین کرنے میں اتنا وقت نہ لگے۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ریسیور کان سے لگاتے اس کا نمبر ملایا۔ اگلی طرف کون تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے بلانے پر کچھ دیر بعد ماہ وش فون پر تھی۔

"میں تمہارا فیصلہ تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" اس کا چہرہ بے آواز آنسوؤں سے تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"میرا فیصلہ پہنچ چکا ہوگا۔ تمہاری طرف۔ اب میں تمہارے فیصلے کی منتظر ہوں۔" اس کا تلخ سا لہجہ اس کے کانوں میں گونجا۔

"میرا قصور کیا ہے ماہ وش؟ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی؟" اپنی آواز ہی اسے کسی کھائی سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تم بتاؤ بن یامین کہ میرا کیا قصور ہے میں کیوں ساری زندگی بے نام قید کاٹوں، ناکردہ گناہ کی سزا بھگتوں۔" اس کے رکھائی سے کیے گئے سوال پر وہ ٹوٹ سا گیا۔

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں ماہ وش۔ بہت محبت۔ میری زندگی میں پہلی آنے والی عورت، میری محبت صرف تم ہو۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔" اسے ابھی بھی امید تھی کہ وہ محبت کا واسطہ دے گا تو وہ جیسے اپنی ضد چھوڑ دے گی۔ لوٹ آئے گی۔

"محبت کے سہارے ایک بدصورت انسان کے ساتھ زندگی ضائع کر دوں۔" اس کے دل میں کانٹا چبھ گیا تھا۔

"تم اتنی بری شکل کے ہو چکے ہو کہ میں تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتی۔ زندگی کیسے گزاروں گی۔"

"تڑاخ۔" اس نے زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر مارا تھا جس کی گونج اب اسے تاعمر سنائی دیتا تھی۔

"تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ مجھ جیسی حسین لڑکی تم سے شادی کرے گی۔ تم تو کسی عام صورت لڑکی کے قابل بھی نہیں رہے۔ اب تم کچھ بھی کر لو تم اتنے اور اسی طرح بدصورت ہی رہو گے۔" دوسرا تھپڑ لگا۔

"تم تو کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا جو اتنی بدصورت ہو کہ تمہاری طرف دیکھ کر اسے تم سے کراہیت محسوس نہ ہو۔" بے حس کلمات، زہر میں بجھے اس کے وجود پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے وہ اس بات سے قطعی لاتعلق تھی۔

"مجھے جلد از جلد طلاق دے دو ورنہ میں خلع کے لیے اپلائی کر دوں گی۔ میں کسی صورت تمہارے ساتھ رہنا تو کیا رہنے کا تصور بھی گوارا نہیں کر سکتی۔"

اس کے جملے کہیں اندر بہت اندر ترازو ہوئے تھے۔

آگ لہجے کی دل جلاتی ہے
لفظ آتش فشاں نہیں ہوتے

وہ کہتی تھی ناکہ اسے کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ کہتی تھی ناکہ تم بہت برے ہو۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ وہ جو کہتی تھی کہ وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ اسے اس جیسا ڈیشنگ، پڑھا لکھا بندہ ملا ہے۔ وہ غلط کہتی تھی۔ وہ تو اس کی بدقسمتی تھا۔ وہ تو سراپا بدقسمتی تھی۔ جسم پر لگنے والے زخم بھر جایا کرتے ہیں، ان کا درد اور تکلیف بھی عارضی ہوتی ہے، وقت گزرنے پر ختم ہو جاتی ہے اور پھر کبھی یاد بھی نہیں آتی۔ روح میں اترنے والے الفاظ تو اس طرح سے زخمی کرتے ہیں کہ ان کی تکلیف پوری زندگی نہیں جاتی۔ پوری زندگی وقت بے وقت وہ زخم رستے رہتے ہیں، کبھی مندمل نہیں ہوتے کبھی دور نہیں ہوتے۔ اس کے زخم اب کبھی نہیں بھر سکتے تھے۔ اس کے چہرے کے دھبوں نے نہیں، اس کے دل نے اسے برباد کیا تھا۔ اس نے خاموشی سے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اب کوئی بھرم نہ بچا تھا، رکھنے کو۔ کوئی امید نہ رہی تھی، پنپنے کو۔ دل جب کسی سے بھر جائے تو پھر دوبارہ نہیں پلٹا کرتا۔۔۔ اس لیے اسے آزاد کرنا بہتر ہوتا ہے۔ اس نے بھی آزاد کر دیا تھا۔

وہ دو ہفتے رہ کر، عشرت ناہید کے بے حد اصرار پر بھی نہ رکا اور لوٹ گیا تھا۔ خالی دل، خالی ہاتھوں اور خالی زندگی کے ساتھ۔ تیئیس سال میں اس کا نکاح کیا گیا تھا اور چوبیس سال میں اپنی شادی شدہ زندگی کا باضابطہ طور پر آغاز کیے بغیر ہی اس کا گھر اجڑ گیا تھا۔ اب کبھی نہیں بستا تھا دل بھی۔۔۔ اور گھر بھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ماضی سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اندر آنے والا تفہیم تھا۔

"آؤ تفہیم اندر آجاؤ۔" وہ زبردستی مسکرایا تھا۔ بڑی دقت، بڑی تکلیف سے۔

"ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے؟" وہ مودب سے انداز میں اندر آکر کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ اچھا کیا کہ تم آگئے۔ جاب کیسی جا رہی ہے؟" متورم آنکھوں کو اس نے جھکائے جھکائے ہی پوچھا مبادا کہیں راز افشانہ ہو جائے۔

"سب ٹھیک جا رہا ہے۔ میں بھی اور جاب بھی۔ آپ ٹھیک ہیں؟" وہ تلخی سے مسکرا دیا۔

"مجھے کیا ہونا ہے بھلا؟ مجھے کچھ ہو سکتا ہے؟ بہت ڈھیٹ چیز ہوں میں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کچھ نہیں ہوتا اور نہ آگے ہوگا۔"

"ایسی باتیں مت کیا کریں۔ ایسا نیگٹو کیوں سوچتے ہیں۔۔ بی آپٹیمسٹک۔" وہ نظریں اٹھا کر گہری سانس لے کر بولا۔

"کوشش کرتا ہوں۔ ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ بس کبھی کبھی۔۔۔ اچھا جانے دو۔ یہ بتاؤ کوئی کام تھا کیا؟" وہ کم کم ہی اس کے کمرے میں آتا تھا وہ بھی تب جب کوئی کام ہوتا۔ تب ہی پوچھ بیٹھا۔

"کیوں میں کام کے بغیر نہیں آسکتا کیا؟" وہ خجالت سے سر کھجانے لگا تو بن یامین یک دم بولا۔

"ارے نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔" وہ اسے ہرگز شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"ویسے آیا کام سے ہی ہوں میں۔" وہ اب خجل سا دانت نکال رہا تھا۔ بن یامین ہولے سے مسکرا دیا۔

اس کا اندازہ بالآخر سو فیصد درست تھا۔

"وہ دراصل کل آفس میں پریزنٹیشن ہے تو مجھے کوئی نئی شرٹ چاہیے تھی۔ میں خرید نہیں سکا ذرا ہاتھ تنگ تھا اس مہینے اور آپ جانتے ہیں کہ طلحہ اور ابوبکر کی ہائٹ کم ہے تو مجھے ان کی شرٹس پوری نہیں آتیں ورنہ۔۔۔" وہ شرمندہ شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دے رہا تھا۔

"اٹس اوکے۔ الماری کی رائٹ سائیڈ کھولو۔ وہاں بہت سی نئی شرٹس ہیں جو پسند آئے نکال لو۔" رسان سے کہہ کر لیپ ٹاپ آن کر کے اپنی میل چیک کرنے لگا۔ "میں یہ لائٹ براؤن والی شرٹ لے جاؤں۔" کافی دیر تمام شرٹس دیکھ کر اس نے ان میں سے ایک سلیکٹ کی تھی۔

"جو مرضی لے جاؤ۔" اس نے ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔

"تھینکس آلاٹ۔" وہ شرٹ لے کر شکریہ ادا کرتا چلا گیا۔

اس نے لیپ ٹاپ وہیں اسٹینڈ بائی پر رکھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیے۔

"تو اس زندگی کے لیے تم نے مجھے چھوڑا تھا' ہے نا۔" اس نے چشم تصور میں ماہ وش کو مخاطب کیا۔ عشرت ناہید نے آکر سب کے درمیان بیٹھ کر اس کی حالت زار کا ذکر کیا تھا۔ وہ شوہر کی وفات اور اپنے اپاہج پن کے بعد سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ بولتی تھی نہ کسی سے مخاطب ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ اور جسم کے دوسرے حصے بھی بری طرح گھائل ہوئے تھے۔

"اس خوب صورتی کے لیے تم نے مجھے چھوڑا تھا جو آج اللہ نے تم سے بھی چھین لی ہے' مگر آج بھی تمہاری اس حالت کا سن کر دل اسی طرح دکھی ہے جیسے برسوں پہلے اپنے اجڑنے پر ہوا تھا۔ میں آج بھی اس تکلیف کو بہت شدت سے محسوس کر رہا ہوں ماہ وش۔۔۔ جتنا کہ۔۔۔"

آنکھوں میں در آتی نمی کو جلدی سے اس نے صاف کر ڈالا تھا۔ وہ اب کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ پچھلی کسی بات کو اب وہ مزید سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ جو ہوا وہ اس کا مقدر تھا اور جو اب ہوا وہ ماہ وش کا مقدر ہے۔ اس کے مقدر میں جو تھا' اس میں اس کی کسی قسم کی غلطی نہ تھی اور آج ماہ وش جس حال میں تھی اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔

"آپ پھر سے ماہ وش کے بارے میں سوچیں پھوپھاں۔" اس نے گزرتے گزرتے لاؤنج میں نمیرو کی آواز سنی تھی۔ آگے اماں نے کیا کہا تھا وہ سن نہ سکا تھا مگر اب وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا۔

"پھر سے۔۔۔ پھر سے اس کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے کیا؟" پھر سے اس بابت سوچنا اسے ازحد مشکل لگ رہا تھا' مگر وہ سوچ سکتا تھا۔

"چائے۔" ملیحہ دروازہ پر ہلکی سی دستک دے کر اندر آئی تو وہ پردوں کے سامنے کھڑا باہر لان میں اتری خزاں کو دیکھ رہا تھا جو سردیوں کے آغاز ہونے کا اعلان تھی۔ اسے خزاں کا موسم بہت برا لگتا تھا۔ اس کی پوری زندگی پر اسی موسم کا تو راج تھا۔ اس کے پکارنے پر وہ چونکا اور مڑ کر دیکھا۔ فربہی مائل جسم اور گوری رنگت والی ملیحہ اس کی چائے سامنے میز پر رکھ رہی تھی۔ اسٹیپس میں کٹے بالوں کو اس نے ربڑ بینڈ میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ عام سے نقوش کی مالک ہی سہی مگر چہرے پر بھولپن تھا۔

"چائے پی لیں اور میں بسکٹ بھی لائی ہوں ساتھ میں اور نمکو بھی۔" وہ کہہ کر جانے کے لیے مڑی ہی تھی جب اس نے پکارا۔

"رکو۔" ملیحہ نے پلٹ کر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"بسکٹ اور نمکو کیوں لاتی ہو ساتھ میں۔" وہ سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"کیونکہ میرا دل کرتا ہے۔ میں جو خود کے لیے پسند کرتی ہوں وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرتی ہوں اور بسکٹ نمکو مجھے بے حد پسند ہیں۔" وہ معصومیت سے ایسے بولی تھی کہ بن یامین کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ آرکی تھی۔

"انسان ہنستے ہوئے ہمیشہ اچھا ہی لگتا ہے۔ ہنستے رہنا چاہیے۔ کیا آپ کو کسی نے یہ کہا ہے کہ آپ ہنستے اچھے نہیں لگتے۔" اس کی بات پر اس کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ یک لخت غائب ہوگئی تھی۔

"میں نے مسکرانے کی بات کی تھی نہ مسکرانے کی نہیں۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ سب عشرت ناہید کو گھیرے بیٹھے تھے اور ابوبکر کی شادی کے لیے زور دیا جارہا تھا جبکہ عشرت ناہید مصر تھیں کہ جب تک گھر کی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے تب تک وہ کسی بھی لڑکے کی شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔

"او ہو پھوپھاں' ہمیں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے اگر ابوبکر کی شادی پہلے ہو جائے۔ یوں بھی ہم سب میں سب سے بڑا یہی ہے۔" عنیزہ نے کشن گود میں رکھتے ہوئے عشرت ناہید کے برابر صوفے پر جگہ بنائی اور پیار سے ان کے کندھے پر سر دھر دیا۔

"ہاں نا پھپھو کب سے منتظر ہیں ہم کہ اس گھر میں بھی شادیانے بجیں۔" راہین نے بھی عنیزہ کی تائید کی۔

"اب شادیانوں کا دور کہاں۔ اب بس تیار ہو کر ہوٹل جاؤ اور ڈسپلن کا مظاہرہ کر کے دلہن کو لے آؤ۔" تفہیم نے برا سا منہ بنایا۔

"ویسے ہم ابوبکر بھائی کی شادی ذرا اوکھری ٹائپ کی کریں گے۔ جیسے گھوڑے پہ بٹھا کر دولہا کو لے کر جائیں گے اور منہ پر وہ ست لڑی سہرا ہوگا۔ ہاتھ میں سرخ سا رومال جسے ناک پر رکھ کر ابوبکر بھائی شرمانے کی ایکٹنگ کریں گے۔" طلحہ نے عمل کر کے پورا نقشہ کھینچا تو سب کی ہنسی نکل گئی۔ عشرت ناہید بھی مسکرا رہی تھیں۔

"اور۔ وہاں جا کر ہم نے وہ لڈیاں ڈالنی ہیں۔ وہ لڈیاں کہ کبھی کسی نے کیا ڈالی ہوں گی۔" تفہیم بھی شوخ ہو رہا تھا۔

"او بس کر جاؤ شیخ چلی دی اولادو! پلے ابوبکر دا بیاہ ہو تیں دو را اے۔ پہلے میں کم از کم ملیحہ نے راہین دا بیاہ کراں گی۔ فیر اس بارے اچ سوچاں گی۔" عشرت ناہید اپنے اس نکتہ نظر پر جمی رہیں۔

"بس بھی کریں نا پھوپھاں۔ کتنا بڈھا کریں گی ابوبکر بھائی کو۔ تیس کے لگ بھگ ہیں۔ چاندنی بھی اتر گئی ہے اب سر پر۔ اس سے قبل کہ سر پورا ہی چودھویں کا چاند ہو جائے خدارا ان کے ماتھے پر سہرا سجادیں۔ ورنہ ابھی ماتھے اور سر میں بالوں کی بدولت جو بارڈر لائن ہے وہ بھی نہ رہے گی۔ پھر پورا سر ہی ماتھا ہو جائے گا۔" طلحہ نے آنکھ دبا کر ابوبکر کے گنجے پن پر چوٹ کی۔ تیزی سے بال گرنے کی وجہ سے سامنے پیشانی کا حصہ چوڑا ہوتا جارہا تھا اور اب وہ کچھ کچھ گنجا دکھنے لگا تھا۔

"ابے چل۔ مرد کی کمائی دیکھی جاتی ہے۔ گنج نہیں۔" ابوبکر نے نیچے بیٹھے طلحہ کے ایک لات رسید کی تو وہ بلبلا اٹھا۔

"ہائے صرف کمائی کا کوئی اچار ڈالے گا جب آدھے گنجے آدھے بالم "بالم" ملیں گے کسی کو۔"

"اچھا تم لوگ چپ کرو نا۔ بتائیں نا پھپھو آپ۔ کب چل رہے ہیں ہم اس مہم پر۔ مطلب لڑکی دیکھنے والی مہم پر' قسم سے بڑا مزا آئے گا۔ ہم سب پھپھو کے ساتھ تیار ہو کر فوج در فوج جایا کریں گے۔ خوب کھاپی کر' ناک بھوں چڑھا کر واپس۔ اور بعد میں کورا سا جواب' ہمیں لڑکی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ قد چھوٹا' ناک موٹی اور بھدی ہے۔" وہ محظوظ ہو کر بولی تو عشرت ناہید نے نیچے جھک کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔

"خدا دا خوف کر۔ اج آکھی دا؟ ای کڑیے تو کڑی ہو کے اس طرح دی گل کیج کر سکدی ایں۔"

"تو کیا ہوا پھپھو جب لوگ ملیحہ کو دیکھنے آتے ہیں تو یہی سب تو کرتے ہیں۔ کھایا' پیا اور منہ بنا کر یہ جا وہ جا۔ بعد میں ٹکا سا جواب "لڑکی بڑی موٹی ہے۔" اور وہ سب کہنے والیاں بھی لڑکیاں اور عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

ابھی ان کا وقت ہے کیونکہ ہم لڑکی والے ہیں۔ بے بس ہیں ان کے آگے۔ مگر کل ہمارا وقت ہوگا جب ہم لڑکے والے ہوں گے اور تب ہم ہرگز بے بس نہیں ہوں گے۔ ہم ڈنکے کی چوٹ پر جائیں گے اور اس طرح کھاپی کر جواب دے کر واپس۔"

عشرت ناہید نے دکھ اور صدمے کی ملی جلی کیفیت سے پہلے راہین کو اور پھر ملیحہ کو دیکھا جس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا اور ندامت سے سر جھکائے خاموش تھی۔ جیسے لڑکی ہونا گناہ کبیرہ ہو گیا ہو۔

"اللہ دا خوف کھائی کڑیے۔ اللہ دا خوف۔ جے لوکاں پتھر چالتے تے اس دا اے مطلب ہو گیا کہ اس دی چالواں۔ کی فرق رہ جاندا اس اچ تے لوکاں اچ۔ میں کسے دا دل نہ دکھا سکدی خاص کر کے دی دھی دا! کل نوں لوک میری دھیاں نوں درود ین میں اے نئیں ویکھ سکدی۔" ناصحانہ انداز میں انہوں نے سب کی طرف عموماً" اور راہین کی جانب خصوصاً" دیکھ کر بات کی۔

"لوگ آل ریڈی یہی سب کر رہے ہیں آپ کی بیٹیوں کے ساتھ۔ آئے دن ملیحہ کو اسی طرح ریجیکٹ کر کے جاتے ہیں۔" راہین بغیر کسی لحاظ کے ڈھٹائی سے بولی تو ملیحہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور عشرت ناہید تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"جیڑا جس طرح دی کردا' آپنے منہ تے اپنی چھوڑ دی کھالیندا۔ میں کسے دے نال ایہو جیا سلوک نئیں کر سکدی۔ میں رب دے اگے کی کیاں گی؟ اسدے بندیاں نوں وی دھیاں دا دل رول کے۔"

"پھپھو اماں پلیز آپ میری فکر مت کریں۔ آپ ابوبکر کی شادی کر دیں۔ جہاں بھی جس طرح بھی وہ اور باقی سب چاہتے ہیں۔" ملیحہ نے مداخلت کر کے راہین کو مزید بولنے کا موقع نہ دیا اور عشرت ناہید کو آہستگی سے مخاطب کر کے بغیر کسی کی جانب دیکھے اپنی بات مکمل کر کے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ "کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح دی گلاں کرن دی؟ اگر وہ کچھ کہتی نہیں تے اس دا اے مطلب نئیں کہ اس نوں لگدی نئیں۔ گلاں دے کوڑے بوں ڈاڈے لگدے (باتوں کے کوڑے بہت سخت لگتے ہیں)۔" عشرت ناہید نے اسے ٹھیک ٹھاک لتاڑا تھا۔

"تو غلط کیا کہا ہے میں نے؟" راہین ڈھٹائی سے کہہ کر ملیحہ کی چھوڑی ہوئی جگہ سنبھال کر بیٹھ گئی جو عشرت ناہید کی نشست سے قدرے دور تھی۔

" جیڑی گل (جو بات) دکھ دوے اوہ سچ دی ہووے تے نہیں آکھنی چاہی دی (نہیں کہنی چاہیے)۔ اس طرح دے سچ جیڑے دل دکھاوں (جو دل دکھائیں) انہاں نوں کول ہی رکھی دا (پاس ہی رکھتے ہیں)۔" ان کا انداز اب بھی ناصحانہ تھا۔

"تو اسے بھی تپنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب ہے وہ موٹی تو ہے نا خود کو کم کرنے کی بجائے مائنڈ کرنے بیٹھ جاتی ہے۔" بڑی رکھائی سے اس نے بات آگے بڑھائی جسے طلعہ نے بیچ سے اچک لیا۔

ایسے موقع کے لیے شعر عرض ہے جناب کہ

آہ بھرتی ہوئی آئی ہو "سلمنگ سنٹر"
آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
"ڈائیٹنگ" کھیل نہیں چند دنوں کا ملیحہ
ایک صدی چاہیے کمرے کو کمر ہونے تک

سب ہی کا زوردار قہقہہ پڑا۔

"شرم کر کج بے حیا۔ کج تے شرم کرو تسی سارے اس طرح مذاخ نی اڑائی دا۔ اللہ دی بنائی مخلوق اچ کیڑے نی کڈی دا۔ اللہ رس جاندا۔ جیڑی شے تے بندے دا اختیار نئیں اس دا کی مذاخ؟" شکستہ لہجے میں انہوں نے سب کی جانب دیکھا۔ اولاد جواں اور وہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ محض نصیحت ہی کر سکتی تھیں اور تو کوئی زور نہ تھا۔

"او کے ہم اس کے موٹاپے کو ٹارگٹ نہیں کرتے مگر آپ بھی یہ مان لیں نا اماں کہ اس کے اس موٹاپے کی وجہ سے ہی اسے ریجیکٹ کیا جاتا ہے اور کیا جاتا رہے گا ایسے میں اگر اگلے پانچ سال بھی اس کی شادی نہ ہوئی تو آپ اس کی وجہ سے مجھے بٹھائے رکھیں گی؟ بھئی ہمارا کیا قصور ہے اس میں ہم کیوں سفر کریں۔"

ابوبکر نے کٹھور پن کی انتہا کر دی تھی۔ اب وہ کچھ اور بھی کہنے لگا تھا کہ سب نے لاؤنج میں آتے دروازے پر لگے بڑے سے "ونڈ چیم" کی آواز سنی اور دروازے کے سرے پر انہیں ملیحہ کے دوپٹے کا آنچل بھی دکھا تھا۔ یقیناً" وہ سامنے پڑا اپنا موبائل اٹھانے آئی تھی اور وہیں دروازے میں شاید ان سب کی گفتگو سن کر ہی وہ پلٹی تھی۔ لاؤنج میں یک دم خاموشی چھا گئی۔

"اک گل میری یاد رکھیو۔ لفظ وی کدی کدی مار دیندے نے (لفظ بھی کبھی کبھی مار دیتے ہیں)۔" عشرت ناہید نے دکھ کی انتہا پر پہنچ کر ان سب کو دیکھا اور چادر کی بکل مارے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بغلیں جھانکنے لگے۔ اپنی رو میں وہ سب کچھ زیادہ ہی کہہ گئے تھے۔ اس کا اب انہیں احساس ہو رہا تھا۔

"یار الس ٹو روڈ۔ تم لوگوں کو ایسی باتیں نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ وہ ہماری بہن ہے۔ سگی بہن۔ مذاق کسی موقع پر اچھا لگتا ہے تم لوگوں نے ملیحہ کو بہت ہرٹ کیا ہے۔" تفہیم نے بولنے میں پہل کی۔

"یار جسٹ مذاق مذاق بات اسٹارٹ ہوئی تھی ہمیں کیا پتا تھا کہ بات اس رخ پر چلی جائے گی اور ایسا غلط بھی کیا کہا ہے ہم نے۔ سچی بات ہی کی ہے۔" راہین ہنوز ڈھیٹ بنی بڑے رسان سے بولی تو تفہیم نے سختی سے اسے گھورا۔

"مذاق کرنے اور کسی کی ذات کو مذاق بنا ڈالنے میں فرق ہے۔"

"تم کیوں اماں کی طرح زیادہ ایموشنل ہو رہے ہو۔ کول ڈاؤن۔ جسٹ چل۔ اسے حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔ ہم میں سے کسی نے کچھ غلط نہیں کہا۔ اینڈ پلیز چینج دا ٹاپک۔ کیوں ایک بات کی دم پکڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔" ابوبکر نے راہین کی معاونت کی تھی اور تب ہی وہ آسودہ سی مسکرا رہی تھی اور تفہیم اب وہاں مزید بیٹھنا ضروری نہ سمجھتا تھا۔ سو اسی لیے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

"حد ہے بھئی۔ ہمارا بھی اتنا ہی رشتہ ہے جتنا کہ اس کا۔ فضول میں اوور ری ایکٹ کر رہا ہے۔" راہین نے غصے سے ناک بھوں چڑھائی اور نمیرو طلعہ کی جانب دیکھا۔

"تم دونوں کیوں خاموش ہو؟" اس کے استفسار پر ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور خاموش ہی رہے۔ انہیں بھی کسی حد تک افسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ حسب معمول رات دیر سے لوٹا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے گاڑی لاک کی اور ہینڈ بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا وہ لان سے اوپر بنی سیڑھیوں سے ہوتا دروازے کی جانب بڑھا۔ یک دم اس کو جیسے سامنے لان میں کچھ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے قدم وہیں تھم گئے اور اس نے مڑ کر غور سے آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے کو گھورا دور کیاریوں کے پاس کچھ تھا تو مگر کیا اسے سمجھ نہ آ رہا تھا وہ ہینڈ بیگ وہیں دروازے پہ چھوڑ کر دھیرے دھیرے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا وہاں تک آیا جس آواز کو سن کر وہ ٹھٹکا تھا۔ وہ آواز کسی کے سسکنے کی تھی۔ اس نے لان میں لگے برقی قمقمے کی روشنی میں غور سے دیکھا تو وہاں کوئی موجود تھا مگر کون؟ مزید آگے بڑھتے وہ اب بالکل قریب آ گیا تھا۔ گھاس پر چلنے سے قدموں کی چاپ سنائی نہ دے رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ کر غور و غوص کرنے لگا اور تب اسے دھچکا لگا۔ وہ ملیحہ تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے اور سر گھٹنوں میں دیے سسکتی ہوئی بلاشبہ وہ ملیحہ ہی تھی۔ کتنی دیر وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔

نومبر کا آغاز تھا اور رات کے اس پہر تو باہر ٹھیک ٹھاک ٹھنڈ ہوتی تھی اور بغیر کسی سویٹر کے وہ ننگے پاؤں وہاں اس حال میں بیٹھی تھی۔ "ملیحہ" اس نے اسے مخاطب کر ہی لیا اس کی سسکیاں یک دم تھم گئی تھیں مگر اس کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ آئی تھی۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ کیا ہوا ہے؟" وہ خاموش اسی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔

"ملیحہ" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گھٹنے پر دھرے اس کے یخ بستہ ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

آنسوؤں میں ڈوبی سرخ متورم آنکھیں اور سرخ پڑتی بہتی ناک لیے وہ ملیحہ ہی تھی مگر لگ نہیں رہی تھی۔ اس نے کبھی اسے اس طرح سے نہیں دیکھا تھا وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا نرم گرم ہاتھ ہنوز اس کے سرد ہاتھوں پر موجود تھا۔ "کیا ہوا ہے؟ اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

"جب انسان کے اندر آگ ہو تو باہر موسم کتنا بھی ٹھنڈا ہو جائے اثر نہیں رکھتا۔" وہ بغیر کسی جنبش کے میکانکی انداز میں بولی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟ کسی کی کوئی بات بری لگی ہے؟" اس کا لہجہ بہت عام سا تھا۔ سرسری سا مگر انداز ضرور خاص اور تفکر آمیز تھا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے بن یامن بھائی۔۔۔ کہ جب ہم کسی چھوٹی چوٹ پر خاموش رہیں۔ کچھ نہ کہیں تو لوگ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے ہمیں چوٹ پہنچاتے ہیں لوگ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم محسوس نہیں کرتے ہم جذبات سے عاری ہیں' ہمیں چوٹ نہیں لگتی' ہمیں درد نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے بن یامن بھائی؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں بے جان سا پتلا سمجھنے لگتے ہیں انسان نہیں۔۔۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں بھی دل دیا ہے بالکل ان ہی کی طرح دھڑکتا' محسوس کرتا ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے بن یامن بھائی؟؟"

وہ ہنوز میکانکی انداز میں بول رہی تھی مگر آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھ سے پھسل رہے تھے صاف شفاف موتیوں کی مانند بکھرتے ہوئے اس کے دل اور روح کے غماز۔

بن یامن اب کی بار بغور اسے دیکھنے لگا۔ اس کا بکھرا بکھرا سا وجود اس کے اندر نئے سرے سے دکھ بھر گیا تھا۔ "اللہ سب کو یکساں کیوں تخلیق نہیں کرتا؟ اتنے حسین لوگوں میں' اتنے پرفیکٹ لوگوں میں ہم جیسے ان پرفیکٹ مجسمے تراش کر ہمیں دنیا کے لیے مضحکہ خیز ہستی کے طور پر کیوں پیش کرتا ہے؟ کیوں؟ اتنی خوب صورت' رنگ برنگی' حسین چہروں سے سجی دنیا میں ہم جیسوں کو کیوں بناتا ہے؟ تاکہ لوگ ہم پر ہنسیں' ہمارا مذاق بنا کر تسکین حاصل کریں۔ بس۔" وہ جس انداز سے پوچھ رہی تھی کبھی اس نے بھی اسی انداز سے پوچھا تھا۔۔۔ اپنی ماں سے' اپنے اللہ سے وہ اتنا ہی شاکی تھا۔ اتنا ہی ناراض جتنا کہ آج وہ تھی۔

"اگر اللہ ہمیں بنا ہی دیتا ہے تو لوگوں کے رحم و کرم پر اذیت سہنے کے لیے کیوں چھوڑ دیتا ہے؟ کیوں اللہ کچھ لوگوں کو اتنا با اختیار کر دیتا ہے کہ وہ خود کو دوسروں کی زندگیوں کے بھی مالک سمجھنے لگتے ہیں کہ جیسے چاہیں اگلے کو ٹریٹ کریں۔" اسے اللہ سے بہت شکوے تھے اتنا تو شاید اللہ کے بندوں سے بھی نہ ہوں گے۔ وہ بس خاموش بیٹھا اسے سنتا رہا۔

"اللہ کو رشتے نہیں بنانے چاہیے تھے۔ بالکل نہیں بنانے چاہیے تھے۔ ہمارے اپنے' ہمارے رشتے۔۔۔ سب سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں ہمیں۔ کیا ہو جاتا اگر اللہ ہمیں تنہا پیدا کرتا؟ اگر یہ بہن بھائی جیسے رشتے نہ ہوتے۔ جن رشتوں نے اپنا ہو کر ایک خون ہو کر یاں جایا ہو کر غیروں سے بھی بڑھ کر ہمیں تکلیف دینا ہوتی ہے جب اپنے ہی تکلیف دینے پر اتر آئیں تو بندہ اپنے زخم کسے دکھائے؟ کہاں جائے؟" وہ اب دوسرے ہاتھ کی پشت سے اپنے گالوں کو رگڑ کر آنسو صاف کر رہی تھی مگر آواز ہنوز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بولے۔۔۔ سب کہہ دے جو بھی دل میں تھا۔ اگر وہ اسے "اپنا" سمجھ کر سب کہہ رہی تھی تو وہ کیوں دامن جھٹکتا۔ وہ ایک اچھے سامع کی طرح بہت دھیان بہت توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

"میں موٹی ہوں' بھدی ہوں' کم صورت ہوں۔۔۔ میں جانتی ہوں یہ سب کیا یہ ضروری ہے کہ مجھے ہر ہر بار جتایا جائے۔ ہر بار مجھے یاد دلایا جائے۔ میں موٹی ہوں تو اپنی خوشی سے موٹی نہیں ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی محنت کی ہے اس موٹاپے کو کم کرنے کی مگر میری قسمت میں ہی نہیں ہے جب تو میں کیا کروں؟ اگر اللہ مجھے اختیار دیتا نا بن یامن بھائی تو میں کبھی خود کو ایسا نہ بناتی۔ کسی کی خوب صورتی میں اس کا کیا کمال ہوتا ہے اور کسی کی بدصورتی میں اس کا کیا گناہ ہوتا ہے' میں کبھی سمجھ نہیں پائی۔ لوگ کیوں دوسروں کے عیبوں کو' کمزوریوں کو وجہ بنا کر زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں کو جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا کیوں لوگوں کے دلوں میں اس قدر نفرت بھر جاتی ہے۔ کیوں اپنے اس قدر بے رحم ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے دل میں اللہ کا خوف کیوں نہیں ہوتا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بتائیں نا۔ میرے ہی بہن بھائی مجھ سے عاجز ہیں۔ میں ان کے راستے کا پتھر بن گئی ہوں۔۔۔ جسے وہ سب ٹھوکریں مار مار کر راستے سے ہٹانے کے درپے ہیں۔ میں کبھی شکوہ نہیں کرتی' شکایت نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب ہو گیا کہ مجھے تکلیف نہیں ہوتی ان کی باتوں سے۔ میں اگر ہنس دیتی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ڈھیٹ ہوں۔ میں اگر خاموش ہو جاتی ہوں تو مطلب میں بے حس ہوں۔ میرے پاس بھی دل ہے جو دکھتا ہے۔ مجھے بھی اتنی تکلیف ہوتی ہے جتنی انہیں۔ اللہ صورتیں مختلف بناتا ہوگا' جسم مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہوگا مگر اللہ دل ایک سے بناتا ہے حسین لوگوں کو جتنی تکلیف ہوتی ہے اتنی تکلیف بدصورت لوگوں کو بھی ہوتی ہے۔ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں۔" وہ سر جھکائے اب اسے سن رہا تھا۔ ان سب سوالوں کے جواب وہ پچھلے بارہ سالوں سے تلاش رہا تھا مگر اب تک نہ ڈھونڈ پایا تھا۔ اسے کیا کہتا؟ کیسے تسلی دیتا؟

"آپ کو تکلیف نہیں ہوتی؟ جب سب آپ کو مزاح کا نشانہ بناتے ہیں۔ سچ بتائیں آپ کو درد نہیں ہوا تھا جب آپ کا نکاح ختم ہوا۔" اسے لگا تھا اس سوال نے اس کا دل آری سے چیر ڈالا تھا۔ وہ پھر سے اس وقت کو سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"ہوا تھا بہت درد ہوا تھا۔ زندگی جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھی مگر وقت سب زخم بھر دیتا ہے۔ میرے بھی سارے زخم بھر ہی گئے۔" وہ آج اپنا خود ساختہ خول اتار کر بہت نرم لہجے میں بول رہا تھا۔۔۔ ہمیشہ سے قدرے مختلف۔

"زخم بھر گئے تو نشان کیوں موجود ہیں؟" اس کے سوال پر وہ دکھ سے مسکرا دیا۔

"نشان جانے میں وقت لگتا ہے۔۔۔ ڈھیر سارا وقت کبھی میں بھی اللہ سے اتنا ہی ناراض تھا جتنا کہ آج تم ہو مگر پھر اللہ ہی تھا جس نے مجھے سنبھالا بھی اور مضبوط بھی کیا۔ اس لیے اب کوئی شکوہ نہیں ہے اس سے۔"

"تو پھر آپ لوگوں میں گھلتے ملتے کیوں نہیں؟ الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں؟"

"کیوں کہ میں لوگوں کی نظروں میں ترحم' ہتک' استہزا نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ بے رحم نہیں ہوتا' لوگ بے رحم ہوتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے دور رہنا چاہتا ہوں جو بار بار مجھے میری بدصورتی کا احساس دلائیں۔" وہ اپنی بات کہہ کر اس کے چہرے کو کھوجنے لگا۔

"بدصورت ہونا برا نہیں بدسیرت ہونا برا ہے۔ ہم جیسے بھی ہیں ملیحہ ہم دوسروں کی زندگی کو اس کے لیے اجیرن نہیں کیے ہوئے۔ ہم دوسروں کو جملوں کی مار نہیں مارتے۔ ان کے دل کو' روح کو گھائل نہیں کرتے۔ ہمارے دلوں میں بغض نہیں ہے کینہ نہیں ہے دوسروں کے لیے۔ حسد نہیں ہے دوسروں کے لیے ہم لوگوں کو ان کے بدصورت رویوں کا احساس تک نہیں دلاتے اور خود کو سزا دیے جاتے ہیں۔ خود کو اکیلے ہی اکیلے اذیت دیتے ہیں تاکہ دوسرے اذیت سے بچ سکیں۔ ہم کم صورت سہی مگر دل کے بدصورت نہیں۔ ہم موٹے سہی مگر اتنے کم عقل' اتنے کم ظرف نہیں کہ اپنے بدصورت رویوں کی چھاپ دوسروں کی زندگیوں پر لگا دیں۔ ہم دوسروں سے بہت اچھے ہیں بہت اچھے۔ خود کو کم تر مت سمجھو ہر انسان خود کے لیے نایاب ہوتا ہے۔ تم نایاب ہو ملیحہ دوسروں کے لیے نہ سہی اپنے لیے ہی سہی۔ اپنے

آپ کو قیمتی سمجھو گی' اہمیت دو گی تو دوسرے تمہیں اہمیت دیں گے۔ تمہاری قدر کریں گے۔ تم اہم ہو اپنے لیے۔" اس نے کبھی اتنے سالوں میں بن یامن کا یہ روپ نہ دیکھا تھا۔ اتنی حوصلہ افزا باتیں نہ سنی تھیں۔

"آپ خود کو کیوں اہمیت نہیں دیتے۔ جو مجھے کہہ رہے ہیں وہ خود کیوں نہیں کرتے؟" وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

"میں خود کے لیے یہ سب کر سکا ہوں یا نہیں۔ وہ میں نہیں جانتا۔ مگر تم یہ سب کرو گی۔ تم نے اپنی ایک الگ شخصیت بنانی ہے اور یاد رکھنا تم جیسی ہو ویسی ہی رہنے کی کوشش کرو۔ خبردار جو آئندہ دوسروں کے لیے اپنے آپ کو اذیت دی۔ سمجھیں۔" وہ قدرے رعب سے بولا تو وہ جھلمل کرتی آنکھوں سے مسکرا دی۔ "جی سمجھ گئی۔"

"گڈ۔ دوسرے اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان کے لیے رویا جائے۔"

"وہ دوسرے میرے سب سے قریبی ہیں۔ جو درد دیتے ہیں اور آنسو بھی۔" وہ بے بسی سے بولتے اپنے یخ ہاتھوں کو اس کے نرم گرم ہاتھوں سے نکال کر سہلانے لگی۔ سردی کافی تھی اور اس کا جسم اب کپکپانے لگا تھا۔

"جب وہ بھول جاتے ہیں کہ تم ان کی قریبی ہو تو تم کیوں امید رکھتی ہو؟"

"تم بھی آپ نے ہی کہا نا کہ ہم بدصورت سہی مگر بدسیرت نہیں ہیں بس اسی لیے۔" وہ اس کے برجستہ جواب پر مسکرا دیا۔

"چلو اب اندر جاؤ اور جا کر پہلے سویٹر پہنو اور پھر لحاف اوڑھ لو بلکہ یوں کرو گرما گرم چائے بناؤ اور اس کے ساتھ نمکو اور بسکٹ بھی۔ اور ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں جو تم خود اپنے لیے پسند کرتی ہو وہ دوسروں کے لیے بھی۔ سو اس بندہ ناچیز کو یاد رکھنا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا آخر میں شوخ ہوا تھا اور ملیحہ بھی ہلکی پھلکی سی ہو کر اٹھ گئی۔ پاس رکھی چپل پہننے لگی اور دور جاتے بن یامن کو دیکھنے لگی۔

خوب صورت دل خوب صورت چہروں کی لوٹ
میں پوشیدہ ہوں ضروری نہیں۔
وہ ایسا ہی شخص تھا۔
نہیں ڈرتا میں کانٹوں سے
مگر پھولوں سے ڈرتا ہوں
چبھن دے جائیں جو دل کو
میں ان باتوں سے ڈرتا ہوں
مجھے تو نیند بھی اچھی نہیں لگتی حقیقت میں
دکھائیں خواب جو جھوٹے' میں ان نیندوں سے
ڈرتا ہوں
انا کا ہوں نہیں قائل
محبت ہے مجھے سب سے
جو دل میں بغض رکھتے ہوں
میں ان اپنوں سے ڈرتا ہوں
مجھے احساس ہے سب کا
میں سب کے کام آتا ہوں
مگر جو کینہ رکھتے ہوں
میں ان رشتوں سے ڈرتا ہوں
میں بندہ ہوں خدا کا
اور خدا کا خوف ہے مجھ کو
جو ڈرتا ہی نہیں رب سے
میں ان بندوں سے ڈرتا ہوں۔۔۔

آج بہت عرصے بعد اس نے کسی کے سامنے خود کو اس طرح سے کھولا تھا۔ خود اپنی وضاحت دی تھی۔ کسی کی ہمت بڑھائی تھی۔ کسی کی تکلیف کو کم کرنے کا باعث بنا تھا۔ وہ رات کتنی پرسکون تھی۔۔۔ آج اس نے گویا اتنے سالوں بعد خود کو بھی یقین کرایا تھا کہ وہ اہم ہے' قیمتی ہے۔۔۔ دوسروں کے لیے نہ سہی خود کے لیے ہی سہی۔ لوگ اسے بدصورت کہتے ہیں تو کہتے رہیں وہ خود کو کیوں بدصورت کہے۔ جب وہ خوب صورت دل کو اہم جانتا ہے تو محض صورت کی بدولت کیوں خود کو اذیت دے۔ اسے خود کو اس خود اذیتی سے نکالنا ہو گا۔ اسے لوگوں کی پروا نہیں کرنا۔۔۔ جب لوگ اس کی پروا نہیں کرتے تو وہ کیوں دوسروں کے لیے اپنے آپ کو تھکاتا ہے' ہلکان کرتا ہے جب کسی نے اسے اہم نہ جان کر اسے زندگی سے الگ کر دیا تو وہ کیوں اس لڑکی کو اتنا اہم بنا بیٹھا کہ بارہ سال خود اپنی ذات کو تکلیف دیتا رہا۔ ماہ وش نے نہیں اس نے خود اپنی زندگی کو برباد کیا تھا۔ اپنی شخصیت کو مسخ کیا تھا۔ اسے اب خود کو اس فیز سے ہر حال میں نکالنا تھا۔ کسی بھی قیمت پر۔۔۔ کسی بھی صورت میں دوسرے نہیں وہ خود اپنے پر اپنی خوشیاں حرام کیے بیٹھا تھا۔ اب نہیں۔۔۔ اور نہیں۔ وہ جیے گا سب کی طرح جیے گا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ صبح سب کے ساتھ ہی ناشتا کر رہا تھا۔ جہاں سب حیران تھے وہاں عشرت ناہید اور ملیحہ کے لیے یہ خوش گوار تبدیلی تھی۔ اس کے جانے کے بعد راہین نے تعجب سے سب سے استفسار کیا۔

"آج سورج مغرب سے طلوع تو نہیں ہوا؟" سب نے شانے اچکا دیے۔

"آپ مانیں نہ مانیں پھوماں۔۔۔ یہ تبدیلی ماہ وش کے حادثے کی بدولت آئی ہے۔ بگ بی کو پھر سے نئی امید پیدا ہو گئی ہے کہ وہ پھر سے ماہ وش سے شادی کر سکتے ہیں۔ آپ اس بارے میں سوچیں اب۔ وہ آج بھی ماہ وش کے لیے دل میں سوفٹ کارنر رکھتے ہیں اور وہ بخوشی اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں گے۔" نمیرہ نے اپنے قیاس کو صد فیصد قرار دیتے ہوئے عشرت ناہید کو اس پہلو پر سوچنے کے لیے اکسایا۔ سب سے زیادہ اعتراض راہین اور ابوبکر کو ہوا تھا۔

"ہرگز نہیں اماں۔ اب کے بار تو کبھی نہیں۔ بھائی پوری زندگی کنوارے گزار دیں وہ کہیں زیادہ بہتر ہے اس سے کہ اس ماہ وش کو آپ پھر سے بیاہ کر لائیں۔ میں کبھی یہ نہیں ہونے دوں گا۔"

"بالکل پھپھو۔ آپ کیسے بھول گئیں وہ سب۔ اس وقت وہ انہیں چھوڑ گئی اور آج جب وہ خود اپاہج ہو گئی ہے تو آپ پھر سے اسے اس گھر میں بہو بنا کر لے آئیں گی۔" راہین نے غصے سے نمیرہ کو گھورا جس نے اس پہلو پر سوچنے کا نادر مشورہ دیا تھا۔

"بھئی تم لوگوں کو کیا مسئلہ ہے یہ ان کی زندگی ہے وہ جسے چاہیں اپنی زندگی میں شامل کریں اور جسے چاہیں مسترد کریں۔ تم لوگوں کو پرابلم نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے کون سا تم لوگ بڑی محبت یا پروا کرتے ہو ان کی جو اس معاملے میں یہ یوں بڑھ چڑھ کر بول رہے ہو۔" تفہیم نے چائے کا کپ دوبارہ سے بھرتے ہوئے ان دونوں کو گھر کا۔

"ہم پروا کریں یا نہ کریں۔ انسان کی عزت نفس بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں' کیا اتنے گرے پڑے ہیں ہم لوگ کہ بھکاری بن کر پھر سے اس لڑکی کا رشتہ مانگنے چل پڑیں جس نے برسوں پہلے خود دھتکارا ہو۔ اتنا بھی نہیں گرنا چاہیے انسان کو۔"

"بس کرو تسی سارے۔ جس دا مسئلہ ہے او آپے دیکھ لوے گا۔ تسی ساریاں دا کی کم۔ اس گل اچ مینوں تے اے گل سمجھ نئیں آندی کہ جس بندے دا دور دور تک کسی گل نال تعلق نہ ہووے او نہو کی لوڑ اے اس اچ پین دی۔" عشرت ناہید نے غصے سے ان سب کی جانب دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ وہ ناشتا کر چکی تھیں جبکہ ملیحہ خاموش تماشائی بنی سب کے ناشتے کے برتن اٹھانے لگی۔

"اے جیڑی جیب ہوندی اے ناں اے بڑی بھیڑ شے اے۔ بندے نوں سوچ سمجھ کے اس نوں استعمال کرنا چاہی دا۔ ؟؟؟؟ سوہنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آکھدے سی کہ بندے دی خوبیاں اچ اک اے وی خوبی اے کہ جس شے نال اس دا مطلب نہ ہووے اس دی طرف توجہ نئیں دئی دا۔ تساں ساریاں دی اک عادت بڑی بھیڑی اے کہ تسی سارے آپنی جیب نوں سانبھ کے گل نئیں کردے۔" ان کا لہجہ ٹھوس تھا۔

وہ سختی سے کہتی اٹھ گئیں اور وہ سب حقیقت میں شرمسار تھے۔ انہیں عشرت ناہید سے اتنی کڑی باتوں

کی امید نہ تھی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ سب اٹھنے لگے تو پھوپھو کچن سے نکلیں۔

"تسی سارے بن یامن نوں بد صورت کہندے او نا۔۔۔ تسی سارے آپے بد صورت او۔ ویکھو آپنے دل دی طرف کنج کالا شاہ اے۔ نفرت نال بھرا ہویا۔ ویکھو تسی سارے کالے دلاں آلے او۔ آپنی طرف ویکھو سارے۔" اب کی بار سب نے ان کی آواز کو بھرایا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ سب نظریں چراتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر کمروں میں چلے گئے۔ اس روز گھر پر ہو کا عالم تھا۔ کوئی بھی دوپہر کے کھانے کے لیے باہر نہ آیا۔۔۔ نہ ہی ابوبکر آفس گیا اور نہ ہی وہ تینوں یونیورسٹی۔ صرف تفہیم اپنے آفس گیا تھا اور اس نے عام دنوں کی طرح ہی اپنا برتاؤ رکھا تھا۔ جبکہ عشرت ناہید کے ہونٹوں پر جامد خاموشی تھی۔ وہ کسی سے بھی مخاطب نہ تھیں۔ تفہیم اور ملیحہ کو ان کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔

پھوپھی اماں چلیں میری پہلی بوجھیں۔۔۔ ایک آدمی کی ساس' ایک عورت کی ساس کی ماں ہے۔ بتائیں آدمی اور عورت کا رشتہ کیا ہے؟" وہ عشرت ناہید کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہنوز خاموش تھیں۔

"چلیں کوئی اور پوچھتا ہوں۔" وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھے سوچتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔۔۔" یاد آنے پر اس نے پرجوش سا ہو کر چٹکی بجائی تو عشرت ناہید نے اسے گھورا جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ سو وہ خاموش ہو گیا۔

"پھوپھی اماں۔۔۔ آپ کیوں ٹینشن لے رہی ہیں۔ آج بن یامن بھائی آتے ہیں تو آپ انہیں بٹھا کر ان کا فیصلہ جانچ لیں جیسا وہ چاہیں گے وہی ہو گا۔ یہ ان کی زندگی ہے کسی دوسرے کا کیا حق کہ وہ دخل دے۔ آج فیصلہ کروا لیں ان سے۔۔۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مگر یوں پریشان مت ہوں نا۔ آپ ایسی ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔ میری پیاری پھوپھی اماں موڈ ٹھیک کر لیں نا۔ پلیز۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور لجاجت سے بولا تو وہ کچھ توقف سے گویا ہوئیں۔

"ہوں۔۔۔ اج آن دے یامن نوں میں تفصیل نال گل کراں گی۔" وہ سنجیدگی سے تفہیم کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ تفہیم کی بات ان کے دل کو لگی تھی۔ انہیں سارا معاملہ بن یامن کے سامنے رکھنا چاہیے تھا تاکہ وہ جان سکیں کہ وہ کیا سوچ بیٹھا ہے۔ آخر کب تک اسے یوں اکیلے زندگی بسر کرنا تھی۔ کبھی نہ کبھی تو اسے شادی کرنا ہی تھی۔ پہلے ہی وہ خاموش رہ کر بہت دیر کر چکی تھیں اب مزید دیر کرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ بس وہ اس نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہی تھیں کہ اگر وہ واقعی پھر سے ماہ وش سے شادی کا خواستگار ہوا تو خود ان کا کیا رد عمل ہو گا۔ کیا وہ بخوشی اس کے فیصلے کو قبول کر لیں گی اور پھر سے اسی لڑکی کو اپنے بیٹے کی بیوی اور اپنی بہو کے طور پر اس گھر میں بیاہ کر لے آئیں گی؟ وہ اتنا بڑا دل رکھتی بھی تھیں کہ نہیں وہ نہیں جان پا رہی تھیں۔ اب انہیں رات کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

"بن یامن۔۔۔ اج تو اک فیصلہ کرنا پیتر۔ پر سوچ سمجھ کے مینوں جواب چاہی دا۔" خلاف توقع وہ جلدی آگیا تھا اور رات بہت عرصے بعد ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ یہ اس کے معمولات سے قدرے ہٹ کر تھا مگر اس کی تبدیلی اس کی ماں کو اچھی لگ رہی تھی۔۔۔ خود اسے بھی۔ شاید اس نے جینے کا جو عزم کیا تھا وہ اب پورا کر رہا تھا۔

اس نے سامنے رکھی چاولوں کی پلیٹ ذرا پرے سرکا دی اور ہمہ تن گوش ہوا۔ وہ پوری طرح انہیں توجہ دیے ہوئے تھا جبکہ باقی کھانا کھانے میں مصروف نظر آنے کی ناکام کوشش کرتے پہلو پہ پہلو بدل رہے تھے۔

"ہن ویلا آگیا کہ تو فیصلہ کر دے۔ انج ساری حیاتی نئیں لنگ سکدی۔ اسی سارے ہن تیرا ویاہ رچانا چاہندے آں۔ جیڈی کڑی دی تو آکھیں گا سر اکھاں

تے بس فیصلہ سنا دے۔" وہ ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھ رہا تھا اور باقی سب کھانا چھوڑ کر اسے۔۔۔

"اماں میری شادی کا ذکر کہاں سے آنکلا ہے؟" اس کے تاثرات بڑے نارمل تھے۔ وہ اپنے اعصاب پر مکمل اختیار رکھے ہوئے تھا۔ بڑے عام سے انداز میں اس نے سوال کیا تھا۔ وہ عشرت ناہید کی بات پر چونکا تھا نہ اس نے کسی حیرت کا اظہار کیا تھا۔ بس جواباً "عام سا سوال کیا تھا۔

"کی مطلب؟ تینوں ہن ویاہ کر لینا چاہی دا۔ یا میرے مرن دے ویلے نوں اڈیک رہیاں ایں۔" (میرے مرنے کے وقت کا انتظار کر رہے ہو)۔" اس نے کن انکھیوں سے باقی سب کا جائزہ لیا ہر کوئی اس کی جانب متوجہ تھا۔ کچھ دیر کو وہ کنفیوژ ہوا تھا پھر اس نے سامنے رکھے چمچے سے میز پر ان دیکھے دائرے بنانے شروع کر دیے۔

"اماں میں شاید جس کا نام لوں وہ قابل قبول نہیں ہو گی۔"

قدرے توقف سے اس نے ماں کی جانب دیکھا اور اس کے الفاظ پر ان کا دل گواہی دینے لگا کہ وہ ماہ وش کے لیے اصرار کرے گا۔ اب وہ کیا کریں گی؟ وقت آن پہنچا تھا ان کے فیصلے کا۔ وہ لب بھینچے اسے خاموش نظروں سے دیکھنے لگیں تو وہ بھی خاموش ہو گیا۔ اب انتظار مشکل لگ رہا تھا۔

"ماہ وش ہی تیری چاہ ہے؟" وہ بمشکل تمام بولیں تو یک دم اس نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ تحیر اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی امڈ رہا تھا۔

"ماہ وش۔۔۔" اس کے حیرت سے کیے استفسار پر انہوں نے گہرا سانس بھرا۔

"آہو۔۔۔ ماہ وش جے تیری ایہو مرضی اے تے مینوں کوئی اعتراض نئیں اے۔ تو خوش رہے جندا رہووے میں ایہی چاہندی آں۔" وہ شکستہ لہجے میں تسلیم کر رہی تھیں کہ ان کے بیٹے کا فیصلہ ہی ہر چیز پر مقدم ہے۔ اس نے مزید حیرت سے لب بھینچے ان سب کے ستے ہوئے چہروں کی جانب دیکھا۔

"اماں آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں پھر سے اسے اپنا لوں گا۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی اور شاید اب بھی وہ میرا انتخاب نہیں کرے گی۔ اس کا چیپٹر کلوز ہو چکا ہے اماں۔ میں اب جینا چاہتا ہوں مگر میرے جینے کے لیے اب وہ ہرگز ضروری نہیں ہے۔ ہاں میں اب نئی زندگی بھی شروع کرنا چاہتا ہوں مگر اس نئی زندگی کے لیے بھی مجھے ماہ وش کا ساتھ نہیں چاہیے۔" عشرت ناہید کو دونوں انکشاف ہی زندہ کر گئے تھے۔ پہلا انکشاف کہ اب وہ ماہ وش کے لیے اپنی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رکھتا تھا اور دوسرا انکشاف کہ وہ نئے سرے سے زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ بارہ سال بعد ہی سہی مگر وہ اب زندگی کے بارے میں سنجیدہ تھا۔

"اماں آپ اس گھر کی بڑی ہیں۔ سرپرست ہیں کوئی فیصلہ بھی آپ کے حکم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ خاص کر میری زندگی کا۔" اس کے احترام دیتے انداز پر ان کا سر فخر سے بلند ہوا تھا۔

"میں ملیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے انکشاف نے سب کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ عشرت ناہید پہلے چونکیں اور حسرت سے اسے اور ملیحہ کو دیکھا اور پھر بھرپور انداز سے مسکرا دیں۔ وہ اپنا جملہ مکمل کر کے اب ملیحہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا جو اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی اور گنگ سی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں حیرت سے کہیں زیادہ الجھن تھی۔ وہ اس کی حیرت کو بھی سمجھتا تھا اور الجھن کو بھی تبھی نرمی سے مسکرا دیا۔ مگر ملیحہ اس کے باوجود مسکرا بھی نہ سکی۔

"اماں آپ میری ماں ہیں اور ملیحہ کی بھی بڑی ہیں۔ میں یہ رشتہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ بن یامن کی ماں نہیں بلکہ ملیحہ کی ماں بن کر سوچیں اور پھر فیصلہ کریں کہ آپ کو آپ کی اتنی اچھی اور سلجھی ہوئی بیٹی کے لیے میرے جیسا لڑکا قبول ہے کہ نہیں۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے ماں کو دیکھا تو وہ پرجوش سی بولیں۔

"ہیرے نال سونا جڑن لگا اے۔۔۔ اس سوں سوہنا

جوڑ رب کی بنا دے گا (ہیرے کے ساتھ سونا جڑنے لگا ہے۔۔۔ اس سے پیارا جوڑ رب کیا بنائے گا۔) وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

"مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ ملیحہ سے اس کی مرضی جان کر فیصلہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کوئی اعتراض ہو اور اگر اسے کوئی اعتراض ہے تو بات یہیں ختم ہے۔ آپ اسے کچھ وقت دیجیے گا۔" وہ سب کو حیران چھوڑ کر اسی متانت سے کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ چہرے حیران تھے، کچھ خفا اور کچھ پر جوش۔۔۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر کسی پریزنٹیشن کے لیے ڈیٹا اکٹھا کر رہا تھا جب بغیر دروازہ بجائے راہین سیدھا اندر داخل ہوئی۔ اس نے یکدم حیرت سے اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کی جانب دیکھا۔

"یہ کوئی طریقہ نہیں کسی کے پرسنل روم میں جانے کا۔" اس نے تھوڑے سخت لب و لہجہ میں بات کی تو راہین کو مزید پتنگے لگ گئے۔

"کیا آپ مجھے سکھائیں گے طریقے۔۔۔؟ آپ کسی کی پرسنل لائف میں انفارم کر کے جاتے ہیں جو کوئی آپ کے پرسنل روم میں اجازت لے کر آئے۔"

اس نے حیرت سے اس کے الفاظ اور دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھا اور سامنے بیڈ پر ہی کمبل پرے کرتے اس کے لیے جگہ بنائی۔

"بیٹھو اور آرام سے بات کرو راہین میں کسی کی پرسنل لائف میں انٹرفیئر نہیں کرتا۔ تم کس کی بات کر رہی ہو اور کیا کہہ رہی ہو آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ۔" اس کا لب و لہجہ اب شائستگی لیے ہوئے تھا۔

"میں بیٹھنے نہیں آئی صرف آپ سے چند سوالوں کے جواب طلب کرنے آئی ہوں۔ آخر کیا سوچ کر آپ نے ملیحہ کا انتخاب کیا ہے؟" وہ کھڑا سینے پر ہاتھ باندھے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس جیسا شخص اسے اپنی بہن کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا۔ آخر برائی ہی کیا تھی ملیحہ میں۔۔۔ محض موٹی اور عام سی صورت والی تھی تو کیوں اسے دوسری شادی والا بدصورت سا بن یامن ملتا۔۔۔ وہ پھر سے منفی انداز میں سوچنے لگا تھا۔

"اگر ملیحہ کو اعتراض ہے تو بات ختم سمجھو۔ میں بھول جاؤں گا کہ کبھی اس قسم کا کوئی ایشو کھڑا ہوا تھا۔" اس جملے کو ادا کرتے اسے تکلیف ہوئی تھی۔۔۔ نجانے کیوں مگر ہوئی تھی۔

"میں صرف یہ جاننے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آخر ملیحہ میں ہے ہی کیا جو آپ نے اس کا انتخاب کیا۔ کہاں سے وہ آپ جیسے کوالیفائیڈ اور اسٹیبلشڈ بندے کے قابل ہے۔ وائی ناٹ می؟ آپ کو میں کیوں نظر نہ آئی۔

ماہ وش جیسی خوب صورت لڑکی کے بعد ملیحہ جیسی کم صورت والی لڑکی کیوں؟" وہ ہذیانی انداز سے چلا رہی تھی اور وہ حق دق بیٹھا اس کی شکل تک رہا تھا۔ وہ جو الفاظ اپنے کانوں سے سن رہا تھا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی اس لڑکی کے منہ سے اپنی سگی بہن کے لیے وہ الفاظ سن رہا ہے۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ بہن کی محبت میں اس سے جرح کرنے آئی ہے مگر وہ تو۔۔۔

"ملیحہ میں ایسا کیا ہے۔ جو مجھ میں نہیں ہے؟ وہ آپ کو پسند نہیں کرتی میں کرتی ہوں۔۔۔ ہاں بن یامن میں آپ کو سہارا دینا چاہتی ہوں آپ کی زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کے بڑے خواب دیکھے تھے میں نے۔ آپ ان خوابوں کو ہرگز توڑ نہیں سکتے۔" وہ ہسٹریائی انداز سے بولتے اس تک آئی اور اس کا گریبان پکڑے کھڑی چلانے لگی۔

"مجھے آپ جیسے صاف دل شخص کا ساتھ چاہیے۔ میں جیسی قدر آپ کی کروں گی وہ نہیں کر سکتی۔" اس کا دماغ گھوم گیا اور اس نے درشتی سے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑاتے اسے پرے دھکیلا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ گیٹ آؤٹ۔" وہ دور جا گری تھی پھر سے کھڑی ہو کر اس کے مدمقابل آئی۔

"پلیز میری بات سنیں۔" اب وہ گڑگڑا رہی تھی۔

"شٹ اپ اور تم میری بات سنو۔" غصے کی شدت سے اس کے ماتھے کی رگیں پھڑک رہی تھیں۔

"تم میری قدر کرو گی میری؟ تم نے کبھی اپنی بہن کی قدر کی نہیں تم میری کیا قدر کرو گی۔ تمہیں جو یہ پسندیدگی لگ رہی ہے نا یہ محض ہمدردی ہے۔ مجھ سے اور مجھے ترس اور بھیک سے نفرت ہے۔ مجھے تمہارے سہارے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔" وہ غصے سے انگلی اٹھا کر آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ اس نے غصے کی شدت میں بھی آواز کو پست رکھا تھا تاہم لہجہ بے حد سخت تھا۔

"اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ ملیحہ میں کیا ہے؟ ملیحہ ہیرا ہے جو دل سے چمکتا ہے اور تم کالا پتھر ہو۔ ہیرے کو چھوڑ کر کوئلے سے ہاتھ کالے کر لوں۔ ہرگز نہیں۔۔۔ بارہ برس پہلے انجانے میں ہی سہی میں یہ غلطی کر چکا ہوں اور اب اسے ہرگز نہیں دہراؤں گا۔ یہ شادی، یہ ملاپ دو بدصورت لوگوں کا ہے۔ جو من کے کالے نہیں ہیں تم لوگوں کی طرح۔ ہم بہت خوش رہیں گے کیونکہ ہم نے دلوں کو چنا ہے جہاں رب بستا ہے۔" وہ پتھر سی بنی اس کی آنکھوں میں اترتی نفرت کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی دیر وہ بے یقینی سے کھڑی دیکھتی رہی اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ لب اور مٹھیاں بھینچے اس کے الفاظ کی بازگشت کو اپنے کانوں میں محسوس کر رہا تھا۔ حسین چہروں کے پیچھے پوشیدہ مکروہ چہرے۔۔۔

☆ ☆ ☆

اسے دکھ اور صدمے سے نکلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ وہ عام سی صورت والا شخص۔۔۔ جس کے چہرے پر ان گنت دھبے تھے۔ جس کے چہرے کی وجہ سے بارہ سال قبل اس کی بیوی اسے مسترد کر کے چلی گئی تھی۔ جس کے چہرے کی وجہ سے لوگ اس کا مذاق بناتے تھے۔ قابل نفرت سمجھتے تھے۔ جو شخص خود بھی اپنی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا۔۔۔ آج اس شخص نے اسی بدنما، داغدار صورت والے انسان نے اسے مسترد کیا تھا، ٹھکرایا تھا وہ بھی کس کے لیے ملیحہ سرفراز کے لیے۔۔۔ اس کی اپنی سگی بہن کے لیے جو گوشت کا ایک پہاڑ تھی، عام سی شکل و صورت والی بے حس سی ملیحہ سرفراز کے لیے۔ وہ کوئی بن یامن سے محبت نہیں کرتی تھی، محض ہمدردی کا بخار چڑھا تھا۔ معمولی نوعیت کی پسندیدگی تھی بس۔ مگر جب اس شخص نے خود اپنے منہ سے ملیحہ کے لیے کہا تھا تو جہاں سب حیران ہوئے تھے وہ بھی حیران ہوئی تھی اور بعد میں حیرت کی جگہ غصے نے لے ڈالی تھی۔ آخر کیا تھا اس معمولی صورت والی ملیحہ میں کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

اور جب وہ اس کے کمرے میں اپنی خواہش کا اظہار کرنے گئی تھی تو اس شخص نے کیسے اسے جھٹلا دیا تھا۔ ٹھکرا دیا تھا۔۔۔ وہ بھی کس کے لیے۔ اس ملیحہ کے لیے جو اس کی بہن تھی۔ کیوں آخر کیوں؟ کیا تھا اس ملیحہ میں جو وہ اس کا انتخاب ٹھہری تھی۔ اسے نجانے کیوں بری طرح حسد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ملیحہ ہیرا ہے اور وہ کالا پتھر۔۔۔ اس شخص نے اسے کالا پتھر کہا تھا اور وہ خود کیا تھا؟ کیا تھا وہ؟ وہ کہتا تھا وہ کوئلے سے ہاتھ کالے نہیں کرنا چاہتا تو کیا وہ کوئلہ تھی؟ اور پھپھو بھی تو کہتی تھیں کہ وہ بدصورت ہے۔۔۔ کالے دل کی۔ کالے دل کے لوگ کیا ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟ اس جیسے حسین لوگ کالے دل کے ہوتے ہیں کیا؟ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ جانچا تھا۔ لعنت تھی بن یامن پر بھی اور ملیحہ پر بھی۔۔۔ اس کے آگے بھلے وہ کیا تھے؟ کچھ نہیں۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔ مگر پھپھو کیوں کہتی تھیں کہ وہ کالے دل کی ہے۔ دل کالا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنی حسین صورت کا دل کالا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسی گوری رنگت، ملائم جلد اور تیکھے نقوش کا دل کالا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ رو رہی تھی۔۔۔ ہاں وہ رو ہی تو رہی تھی۔۔۔ گالوں پر بہنے والا گرم پانی۔۔۔ اس کے آنسو ہی تو تھے۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ بن یامن کے انتخاب پر۔۔۔ خود کے مسترد کیے جانے پر۔۔۔ اس کا اسے کالا پتھر کوئلہ کہہ کر مخاطب کرنے پر۔۔۔ پھپھو کا اسے کالا دل۔۔۔ بدصورت کہنے پر۔۔۔؟ وہ آخر کس وجہ سے رو رہی

تھی۔

پھپھو کہتی تھیں کہ اس کا دل ـــــ ان سب کا دل نفرت سے بھرا ہے۔ وہ ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ بد صورت تھی کیونکہ اس کا دل میل سے بھرا تھا۔ اس کا دل میلا تھا۔ وہ بد صورت تھی کیونکہ اس کی زبان گندی تھی۔ اس کی زبان آری تھی ـــــ دلوں کو چیر دینے والی آری ـــــ قاتل آری۔ ہاں وہ بد صورت تھی کیونکہ اس کی بہن کی خوشی اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایسی کب ہوئی کیسے ہوئی اسے پتا ہی نہ چل سکا۔ پتا تب چلا جب بن یامن جیسے داغدار چہرے والے شخص نے اس پر تھوک دیا تھا ـــــ اس کے بد صورت چہرے پر اس کے بد صورت وجود پر وہ کہتا تھا کہ دو بد صورت لوگوں کی شادی ہے وہ غلط تھا۔ وہ دو خوب صورت لوگوں کی شادی تھی۔

پھپھو نے اس کے لیے ابو بکر کا رشتہ سامنے رکھا تھا ـــــ ایک اور کالے دل 'کوئلے' کا رشتہ۔ ایک اور بد صورت شخص کا رشتہ۔ ان دونوں کی شادی بد صورت لوگوں کی شادی ہونا تھی اور وہ اس قابل تھی۔ ہاں اسی قابل ـــــ کالے دل والوں کا ملاپ ہی ہونا چاہیے تھا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو اتنی ٹھنڈ میں۔" وہ اس کے برابر آکر سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے اس نے رات کے گیارہ بجے باہر لان میں سیڑھیوں پر ملیحہ کو بیٹھا دیکھا تو چلا آیا تھا۔

"آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ مجھ پر ترس کھا کر یا ہمدردی میں۔" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ سامنے لان میں گھاس کو دیکھ کر بولی۔

"نہ ہمدردی میں اور نہ ہی ترس کھا کر۔ یہ میرے دل کا فیصلہ ہے ملیحہ۔" وہ جانتا تھا کہ وہ اسی الجھن میں ہوگی۔

"دل کا فیصلہ۔" اب کی بار اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں دل کا فیصلہ ـــــ اس دل کو اپنے جیسا ہی دل درکار تھا اور اس نے خود یہ فیصلہ کیا۔ اس میں میری کوئی خطا نہیں ہے۔" وہ معصومیت سے بولا تو وہ مزید الجھ گئی۔

"میں کیوں تم پر ترس کھاؤں گا ـــــ میں خود کیا ہوں بھلا؟ اور تم میں کمی ہی کیا ہے ملیحہ ـــــ؟ موٹا ہونا گناہ نہیں ہے۔ عام شکل و صورت کا انسان گالی نہیں ہوتا جو تم نے اپنی ذات کو اتنا گرا دیا ہے۔ ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم نے میرا ساتھ قبول کیا تو تمہارا احسان ہے مجھ پر۔" وہ ڈھارس دیتا ہوا لہجہ اس کی الجھن اور بہت سے سوالوں کا جواب تھا۔ "احسان کیسا؟ آپ میں کیا کمی ہے بھلا؟"

"کمی تو ہے مجھ میں مگر اب مجھے اس کمی کے ساتھ جینے کی عادت ہو گئی ہے۔ کیا تم خود کو عادی کر پاؤ گی؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے جذب سے بولا تو بلا ارادہ ہی وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"مطلب لڑکی مان گئی ہے۔" وہ تھوڑا سا شرارت پر آمادہ ہوا تو وہ سر جھکا گئی۔

"بس یونہی دل چاہا تھا کہ اب زندگی کھل کر جیوں تو تمہارا ساتھ چاہیے تھا۔ اکیلا اب رہنا مشکل ہے۔ تم ہی ہو جو شاید میرے لیے بنائی گئی ہو ملیحہ۔ کیا تمہیں نہیں لگتا؟" وہ سر جھکائے جھکائے ہی سر ہلا گئی تو وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔ "سنو میں موٹی بیوی برداشت کر لوں گا مگر گونگی نہیں۔"

"میں کوئی گونگی نہیں ہوں۔ میں بولتی ہوں اور بہت سارا بول سکتی ہوں۔" وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئی تو وہ اور بھی ہنسنے لگا۔

"ہاں ہاں بیویوں کو بولنا آتا ہے اور شوہروں کو سننا۔ شادی کے بعد یہی سب تو چلتا ہے بھئی۔" ملیحہ نے خفگی سے منہ پھلائے اس کی جانب دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ انہیں اب جینا تھا ـــــ ایک دوسرے کے ساتھ "ایک ہو کر۔"

"ویسے چائے بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" وہ اس کی ننھی سی ناک دبا کر شرارت سے بولا تو وہ مسکرا دی۔

"اور باتیں بنانا ـــــ" دونوں بے ساختہ ہنس دیے تھے۔ حسین زندگی ان دونوں کی منتظر تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ دن کے گیارہ بجے آن لائن ہوا۔ ماہرہ بے اختیار مسکرادی۔
"وعلیکم السلام کیسے ہو؟" ماہرہ کی انگلیاں کی بورڈ پر تھرکنے لگیں۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو۔" دوسری طرف سے سوال ہوا۔
"میں کیسی ہوسکتی ہوں؟" گفتگو کو طول دینے کی غرض سے ماہرہ نے سوال داغ دیا۔ "باتوں سے تو بالکل ٹھیک لگتی ہو؟" بلال نے جواب ٹائپ کرکے انٹر پریس کیا۔
"میں دیکھنے میں بھی بہت خوب صورت ہوں۔" ماہرہ نے دانا ڈال کر شکار پھانسنے کی کوشش کی۔
"کبھی دیکھا تو نہیں" بلال نے شرارت کی۔
"گویا دیکھنے کی خواہش ہے۔"
ماہرہ نے نچلے لب کے کنارے کو شرارتاً" دانتوں تلے دبایا۔
"کیوں نہیں؟ قدرت کی صناعی کو سراہنے کی کوشش کچھ ایسی غلط تو نہیں۔" اعتماد بھرا جواب موصول ہوا۔ "قدرت کی صناعی سے تو آپ پارک جاکر بھی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔" ماہرہ نے جواب بھیجا۔
"جی نہیں ہم دراصل خدا کی بنائی ہوئی سب سے خوب صورت چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے سنا نہیں۔ "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔"
"دیکھنا کوئی ضروری نہیں ہم روزانہ باتیں کرتے ہیں کافی نہیں۔" ماہرہ نے سنجیدگی سے ٹائپ کیا۔
"خالی باتوں سے بھلا کس کا پیٹ بھرتا ہے۔
میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" بلال بھنا اٹھا۔
"اب میں جارہی ہوں۔" ماہرہ نے اس ٹاپک سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کی۔
"ہم چھ ماہ سے بات کررہے ہیں۔ تم مجھ پر اب بھی اعتبار نہیں کرتیں۔"
بلال نے تیزی سے انگلیاں چلائیں۔
"اعتبار کی بات نہیں۔" ماہرہ ایک لمحہ کے لیے پشیمان ہوئی۔
"پھر کیا وجہ ہے۔" آج تو ایسا لگ رہا تھا کہ بلال اس سے حقیقت اگلوا کر ہی دم لے گا۔
"میں تم جیسے اچھے دوست کو کھونا نہیں چاہتی۔" یہ جملہ ٹائپ کرکے وہ کھٹ سے آف لائن چلی گئی اور بلال سر پیٹ کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

ماہرہ کی عمر اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بیس سال کی تھی۔ جب اس کے شوہر نے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وفات پائی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ انیس سال کی عمر میں وہ ایک بیٹی کی ماں بنی اور قسمت کی ستم ظریفی وہ بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی۔ اب اس کی بیٹی اٹھارہ سال کی تھی اور وہ خود اڑتیس سال کی تیوریوں پر کوئی بل ڈالے بغیر یہ حسن و خوبی اس نے اپنی اس ذمہ داری کو نبھایا۔ جو کہ قدرت کی طرف سے بطور آزمائش اس پر ڈالی گئی تھی۔ مرحوم شوہر کی وفات کے بعد اس نے ایک اسکول میں بطور استاد نوکری کرلی اور دو دکانیں جو مرحوم شوہر نے ترکہ میں چھوڑی تھیں ان کو کرایہ پر اٹھادیا۔
اب جبکہ اس کی بیٹی اٹھارویں سال میں قدم رکھ چکی تھی اور وہ خود اڑتیس سال کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دنیا سے اپنا حق مانگے اور وہ خوشیاں جو کہ بیٹی کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت کے نتیجے میں اس سے روٹھ چکی تھیں، ان کو حاصل کرے۔ ابتدا میں جبکہ بیس سال کی عمر میں وہ بیوہ ہوئی، تو کئی ہاتھوں نے اس کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ لیکن اس نے کسی کے لیے اپنے دل کے دروازے وا نہیں کیے۔ لیکن اب جبکہ وہ وقت قریب آچکا تھا کہ اس کی بیٹی کو کوئی ہم سفر مل جاتا اور وہ اپنی زندگی میں تنہا رہ جاتی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسا ساتھی مل جائے جو کہ اس کی اداس زندگی میں خوشیاں بکھیر دے۔ لیکن کیسے؟ یہ سوالیہ نشان اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں چکرانے لگتا۔
وہ لوگ جو اس کے ساتھ کے طلب گار تھے۔ اس کے ٹھکرانے کی وجہ سے دوسری راہیں تلاش کرچکے تھے۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ وقت اس پر اپنی نشانیاں چھوڑ چکا تھا۔ "میں کیوں نہ اپنا ساتھی خود ڈھونڈوں" اس نے دل میں سوچا "نیٹ کے ذریعے یہ کام بحسن و خوبی کیا جاسکتا ہے۔" گھر بیٹھے، اس کے دل نے راہ سجھائی۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

شعر پڑھ کر ماہرہ کو ہنسی آنے لگی۔ بلال کا میسج تھا۔ اب ماہرہ، بلال سے چیٹنگ کرنے سے ہچکچانے لگی تھی۔ کیونکہ یہ لڑکا سنجیدہ ہوچلا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ بلال سے گفتگو کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ پچیس سال کا نوجوان اور ماہرہ اڑتیس سال کی بیوہ وہ تو اپنے سے بڑی عمر کے آدمی کی تلاش میں تھی جو کہ معاشی طور پر آسودہ حال ہو۔ کیونکہ نوکری نے اس کو تھکا دیا تھا۔ اب وہ آرام کی خواہش مند تھی۔
ارم کی شادی پھر اپنا نکاح اور آرام دہ زندگی یہ اس کی منصوبہ بندی تھی۔ بلال سے تو اس نے جسٹ فار انجوائے منٹ گفتگو شروع کی تھی۔ اپنے آپ کو اٹھارہ سال کی ایک لڑکی ظاہر کیا تھا۔ لیکن اب وہ اس کے پیچھے پڑ گیا تھا اور اس سے جان چھڑانا محال نظر آتا تھا۔ لیکن جس طرح وہ ماہرہ سے محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے اظہار محبت نے ماہرہ کے دل میں جذبوں کی آگ دہکا دی تھی۔ اس کلوارفتہ انداز اسے بھانے لگا تھا۔ کوئی ہو جو مجھے چاہے۔ یہ خواہش سر چڑھ کر بولنے لگی تھی۔ اسی لیے وہ اس سے رابطہ منقطع کرنے میں ہچکچا رہی تھی۔ بس چند دن اور وہ اپنے آپ کو سمجھاتی۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا بھی آسان نہیں ——— بلال کی ملنے کی خواہش نے اس کو سخت خوف زدہ کردیا تھا۔ اب اس معاملے کو ختم کرنا ہی مناسب ہوگا۔
اس دن ماہرہ فارغ بیٹھی تھی۔ اس کی بیٹی ارم اپنی دوست کی طرف گئی ہوئی تھی۔ تقریباً" بلال سے بات کیے ہوئے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ آخر کار ماہرہ نے نیٹ فرینڈز سے گفتگو ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ آج اس نے سوچا چلو ان بکس کھول کر دیکھوں تو شعر اور I miss you اور I Love You کے کارڈز کی بھرمار تھی۔ وہ جو پکا ارادہ کیے بیٹھی تھی اب اور نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈانوا ڈول ہونے لگا آخر اس میں حرج ہی کیا ہے او نلی جسٹ فار انجوائے منٹ یہ بھی ضروری نہیں کہ بلال اپنی باتوں میں سچا ہو۔ اس کے دل میں "آنا" فاناً" یہ خیال ابھرا۔ آخر کار وہ آن لائن ہوگئی۔ "ہیلو" دوسری طرف بلال بے تاب سا تھا "کیا ہوا کس بات پر اتنی خفا ہوگئیں۔"
"میں ناراض تو نہیں بس تمہاری ملنے کی رٹ نے مجھے پریشان کردیا۔"
"اچھا بابا سوری۔" بلال نے دوسری طرف سے کان پکڑتے ہوئے کہا "میں کان پکڑ کر اور ناک رگڑ کر معافی کا خواستگار ہوں۔ ملکہ عالیہ مجھ ناچیز کی خطا در گزر فرمایئے۔"
"معافی قبول کی جاتی ہے۔" دوسری طرف سے ماہرہ نے ہنس کر جواب ٹائپ کیا۔
"آئندہ کبھی ناراض نہ ہونا۔ میں پاگل سا ہوجاتا ہوں اگر تم سے رابطہ نہ ہو میں تم سے بات کیے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔" بلال جذباتی ہوگیا۔
"اوکے" ماہرہ کا جواب چیٹ ونڈو پر ظاہر ہوا۔ "ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے جب مناسب وقت ہوگا مل لیں گے اور ضروری بھی نہیں ہے ملنا۔"
"کیوں ضروری نہیں خالی خولی باتوں سے خود کو کب تک بہلایا جاسکتا ہے۔ تم وائس چیٹنگ پر بھی راضی نہیں۔ کم از کم اپنی تصویر ہی دے دو۔ اس سے ہی اپنا دل بہلا لیا کروں گا۔"
"تصاویر؟" ماہرہ سوچ میں پڑ گئی۔ "اچھا میں سوچوں گی۔"
"اچھا چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ کیسی ہو؟ کیا کرتی رہیں ایک ہفتے تک جو کہ کمپیوٹر پر آن لائن ہونے کا بھی ٹائم نہ تھا۔" بلال نے سوال کیا۔
"بس میرے پاپا انگلینڈ سے آگئے ہیں ناں، تو فیملی

میں گیدر نگز تھیں اسی میں مصروف تھی۔" ماہرہ نے روانی سے جھوٹ بولا۔

"اچھا ویسے یار تم اپنے پاپا کا نام ہی بتا دو۔ اسی طرح سے میں تم کو ڈھونڈ لوں گا۔"

"بے ایمانی؟" ماہرہ نے ٹھینگا دکھایا۔

"اگر تم مجھ تک پہنچ گئے تو میرے پاپا تمہارے ساتھ مجھے بھی گولی مار دیں گے۔" ماہرہ نے سنجیدگی سے ٹائپ کیا۔

"کوئی بات نہیں تمہارے ساتھ مرنا بھی قبول ہے کہو اب کیا خیال ہے۔" بلال کا جواب موصول ہوا۔

"اچھا زیادہ فضول گوئی کی ضرورت نہیں اب میں جا رہی ہوں۔" "پھر کب آؤ گی جان من؟"

"پھر بکواس؟" وہ نہ جانے کیوں خفا ہونے کے بجائے مسکرا رہی تھی۔ "اچھا تصویر کا خیال رکھنا یار کچھ تو ہونا چاہیے اپنے پاس تمہیں یاد کرنے کے لیے۔"

"میں کل بتاؤں گی۔" ماہرہ نے جواب لکھا اور آف لائن ہو گئی۔

آخر کار تصویروں کا تبادلہ ہو گیا' ماہرہ نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنا 18 سال کی عمر کا فوٹو جو کہ اس کی شادی سے پہلے کا تھا سینڈ کر دیا تھا لیکن بلال کی تصویر دیکھ کر ماہرہ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کی باتوں سے ماہرہ نے اپنے دل میں اس کی جو تصویر بنا ڈالی تھی۔ وہ اس کی توقعات کے بالکل خلاف تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں' کانوں میں بالی اور سر میں بنی ہوئی چھوٹی سی پونی' وہ اس کو بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔

لاحول ولا قوۃ تصویر دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ماہرہ نے یہ باب بند کرنے میں ہی عافیت جانی۔

☆ ☆ ☆

آج ماہرہ بہت خوش تھی۔ بات ہی خوشی کی تھی۔ آج سعید بھائی نے ارم کے لیے اپنے بیٹے عامر کا رشتہ دیا تھا۔ سعید ماہرہ کے اکلوتے بھائی تھے۔ جنہوں نے اس کی بیوگی کا طویل عرصہ گزارنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا اور ہر طرح کی اخلاقی مدد کی تھی۔ سعید بھائی کا گھرانہ ارم کے رشتے کے لیے ایک آئیڈیل گھرانہ تھا۔ عامر ابھی حال ہی میں انجینئرنگ پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ اور اس کو ایک بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ عامر کی تین بہنیں تھیں۔ جن کی شادی ہو چکی تھی۔ عامر اکلوتا بیٹا تھا۔ ارم بھی کسی سے کم نہ تھی' پڑھائی میں تو وہ اچھی تھی ہی' شکل و صورت اخلاق اور سلیقہ عادت میں بھی بے مثال تھی جو بھی اس سے ملتا۔ اس کی اچھی عادتوں' اور من موہنی صورت کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ ماہرہ کا ارادہ ہاں کرنے کا ہی تھا۔ انکار کی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ شادی ارم کی بی ایس سی مکمل کرنے پر ہو جاتی بظاہر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا ایک دن ارم کالج سے گھر آئی تو بہت پریشان تھی۔ سانس پھول رہا تھا چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"امی میں بس سے اتری تو ایک عجیب سا آدمی میرے پیچھے آنے لگا۔" ارم نے لرزتی ہوئی آواز میں ماہرہ کو بتایا۔

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا۔" ماہرہ نے ارم کو دلاسا دیا "تم پانی پیو اور پریشان نہ ہو کل سے میں تم کو خود لینے کے لیے آجاؤں گی یا پھر وین لگوا لیتے ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"وہ عجیب باتیں کر رہا تھا' کبھی ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا۔" ارم نے بے حد ڈری ہوئی تھی ماہرہ بے حد پریشان ہو گئی۔ پہلے اس نے سوچا کہ سعید بھائی سے بات کرے۔ لیکن پھر اس کو خیال آیا کہ پرانا رشتہ نئے رشتہ میں بدلنے والا ہے اسی بنا پر وہ محتاط ہو گئی۔

"کسی سے کچھ تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے بیٹی کو سمجھایا "بس میں کل اسکول سے تمہارے کالج آجاؤں گی پھر ایک دو دن میں وین لگوا لیں گے۔" ماہرہ نے ارم سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن ماہرہ اسکول سے ارم کے کالج گئی۔ اس کے لیے اس کو دو بسیں بدلنی پڑیں۔ "واپسی میں رکشا کر لوں گی" ماہرہ نے دل میں سوچا بس میں چڑھنے اور اترنے سے بھی تھکان ہو جاتی ہے۔

"امی وہ دیکھیں۔" ارم کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی' ماہرہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے ہی رہ گیا اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر آسمان گر پڑا ہو۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ماتھے پر پسینے کی قطرے چمکنے لگے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ ابھی گر پڑے گی اس کے پاؤں نے اس کے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ سامنے وہ نوجوان کھڑا دونوں ماں بیٹی کو گھورنے میں مصروف تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سالم نگلنے کی خواہش رکھتا ہو۔ کان میں بالی' بڑی بڑی مونچھیں اور سر کے بالوں کو پونی کی شکل میں جکڑے' ماہرہ کو ایسا لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے انہوں نے رکشا لیا۔ تھوڑی دور جا کر اندازہ ہوا کہ وہ ان دونوں کا پیچھا کر رہا تھا۔ بات کافی بگڑ گئی۔ گھر سے باہر نکلنا اور آنا جانا بھی دو بھر ہو گیا' اہل محلہ بھی انگلیاں اٹھانے لگے۔ آخر کار بھائی سعید کو بلا کر سارا مسئلہ بتایا گیا۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس کو پکڑوا دیا۔

ماہرہ نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن یہ اطمینان عارضی تھا۔ دوسرے ہی دن وہ غصے میں بھرے ہوئے آئے۔

"اس لڑکے بلال کے پاس سے تمہاری بیٹی کی تصاویر برآمد ہوئی ہیں' اس کے بقول وہ چھ ماہ سے اس سے نیٹ پر گفتگو کرتی رہی ہے۔" وہ ماہرہ سے جواب طلب کر رہے تھے اور ماہرہ سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ اس نے یہ کب سوچا تھا کہ اس کی چال الٹ کر اس کے منہ پر آپڑے گی۔ اس کی بھولی بھالی باحیا بیٹی کا کردار مشکوک ہو چکا تھا۔ یہ تو وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کی بیٹی اس سے بے حد مشابہت رکھتی ہے اب اس کی غلطیوں کا تاوان اس کی بیٹی کو تاعمر بھگتنا تھا۔

☆ ☆

نگہت سیما

عینا نے ٹیرس پر کھڑے کھڑے چاروں طرف دیکھا یہاں سے پچھلا لان اور حمیدہ کا کوارٹر نظر آتا تھا۔ اس کی نظر حمیدہ کے کوارٹر سے ہوتی ہوئی اس وسیع و عریض لان کے دائیں طرف انیکسی پر پڑی تھی۔ انیکسی میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ یک دم چونکی۔

اس وقت بھلا کس نے انیکسی میں لائٹ جلائی ہے۔ انیکسی تو ہمیشہ بند رہتی تھی اور دو ماہ میں اس نے کسی کو اس کی صفائی کرتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار اس نے حمیدہ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا انیکسی کی صفائی نہیں کی جاتی تو حمیدہ نے بتایا تھا کہ چھوٹے صاحب کا آرڈر نہیں ہے۔ پھر اس نے مزید تفصیل نہیں پوچھی تھی۔

اس وقت وہاں لائٹ جل رہی تھی۔ حالانکہ مغرب کے بعد جب سلاد کے لیے لیموں توڑنے باہر نکلی تھی تو انیکسی میں اندھیرا تھا۔ پھر اس وقت۔ کہیں کوئی چور تو نہیں گھس آیا۔ اس طرف تو چوکیدار بھی نہیں ہے کوئی باؤنڈری وال کود کر تو اندر نہیں آگیا اور اب مزے سے روشنی جلائے انیکسی کی تلاشی لے رہا ہے۔ اور کیا خبر وہاں کوئی قیمتی چیز ہو اس لیے تو حمیدہ کہہ رہی تھی کہ صاحب کا آرڈر نہیں ہے انیکسی میں جانے کا۔ وہ ہمیشہ جانے سے پہلے لاک کر جاتے ہیں۔

تو۔

اس نے ایک بار پھر انیکسی سے آتی روشنی کو دیکھا اور پھر گھر پر نظر ڈالی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ حمیدہ اور رفیق اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے۔ بیگم فراز کسی ڈنر پر انوائیٹڈ تھیں اور ان کی واپسی رات بارہ بجے کے بعد ہی ہونا تھی۔ کیونکہ ڈنر کے بعد موسیقی کا پروگرام بھی تھا اور انکل فراز یورپ کے ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ بیگم فراز جو ہر بزنس ٹور پر ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس بار محض عینا کی وجہ سے نہیں گئی تھیں۔

"عینا ابھی یہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی ہے وہ اکیلی نہیں رہ سکتی۔"

"اکیلی کہاں۔ اتنے سارے نوکر چاکر ہیں آخر سحر بھی تو ہمارے جانے کے بعد اکیلی ہوتی تھی۔"

انکل فراز انہیں ساتھ ہی لے جانا چاہتے تھے۔

"سحر کی اور بات تھی فراز وہ بہت بولڈ تھی یہ ایسی نہیں ہے۔"

"میں اماں کے پاس گاؤں چلی جاؤں گی۔" عینا خوش ہو گئی تھی۔

"آپ انکل کے ساتھ چلی جائیں۔"

لیکن بیگم فراز نہیں گئی تھیں۔ اب پتا نہیں وجہ عینا تھی یا کچھ اور۔ لیکن انہوں نے انکل فراز سے کہا تھا کہ وہ عینا کو گاؤں ہرگز بھیجنا نہیں چاہتیں مونا بھابھی نے سختی سے منع کیا ہے۔

پتا نہیں اماں نے راحت پھپھو کو کیوں اسے گاؤں واپس بھیجنے سے منع کیا تھا۔ کیا انس چوہدری کی وجہ سے یا پھر ظفر بھائی کی وجہ سے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ پھپھو نے اسے گاؤں نہیں بھیجا تھا اور وہ بے حد اداس ہو گئی تھی۔ اماں سے ملنے کا خیال کتنا خوش کن تھا لیکن۔۔۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔

پھپھو جب بھی کہیں کسی پارٹی یا ڈنر میں جاتیں تو اسے بہت ساری تاکید کر کے جاتی تھیں۔ کہ وہ اندرونی گیٹ بند رکھے۔ گیٹ کھولنے سے پہلے انٹرکام پر پوچھ لیا کرے۔ نوکروں پر بھی زیادہ بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا پتا کب کسی کی نیت بدل جائے اگرچہ سب پرانے ہی ہیں۔ پھر بھی احتیاط اچھی ہوتی ہے۔

اور اب۔

اس نے پھر انیکسی کی طرف دیکھا جس کے شیشوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

کیا خدا بخش چاچا کو بھی پتا نہیں چلا کہ انیکسی میں روشنی ہو رہی ہے۔ اللہ کرے خدا بخش چاچا کو پیچھے کسی کام سے جانا پڑے تو وہ دیکھ لے۔

لگتا ہے چور بڑے اطمینان سے گھر کا صفایا کر رہا ہے۔ اور کیا میں یونہی خاموشی سے دیکھتی رہوں گی۔

حمیدہ نے بتایا تھا کہ ارحم صاحب نہ ہوں تو انیکسی بند ہی رہتی ہے اور ان دو ماہ میں اس نے ارحم بھائی کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اس کے پوچھنے پر حمیدہ نے بتایا تھا کہ ارحم

صاحب تو سالوں بعد چکر لگاتے ہیں اور اب بھی دو سال تو ہونے والے ہیں انہیں آئے۔ بڑے صاحب سے ان کی بات ہوتی رہتی ہے۔ تو پھر ضرور یہ کوئی چور ہوگا۔ اسے یقین ہونے لگا۔

ارحم بھائی نے آنا ہوتا تو پھپھو ضرور ذکر کرتیں ان کے آنے کا اور پھر وہ یوں سیدھے انیکسی میں نہ جاتے اندر آتے۔ اوپر بھی تو ان کا کمرہ تھا نا۔ حمیدہ نے اسے بتایا تھا سیڑھیوں کے ساتھ والا پہلا بیڈ روم ارحم صاحب کا ہے۔

"مجھے خدا بخش چاچا کو بتانا چاہیے۔" اس نے سوچا اور ٹیرس سے ہٹ کر لاؤنج میں آئی۔

ٹیرس کا دروازہ بند کیا اور پھر لاؤنج سے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی سیڑھیاں نیچے ٹی۔ وی لاؤنج میں آتی تھیں۔ وہ لاؤنج سے گزر کر سن روم میں آئی اور اندرونی گیٹ کو کھولنے کے لیے ہاتھ ناب پر رکھا اور ایک بار پھر سوچا رات کے گیارہ بجے کیا مجھے اندرونی گیٹ کھول کر باہر گیٹ تک جانا چاہیے۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ باہر ادھر ادھر درختوں کے پیچھے چور چھپے ہوں اور۔

اس نے ایک جھرجھری ـــــ لے کر دروازہ ذرا سا کھولا اور گیٹ کے پاس کرسی پر بیٹھے خدا بخش چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ بیگم فراز کے آنے تک جاگتا رہتا تھے اور ان کے آنے کے بعد وہاں ہی پورچ میں ایک سائیڈ پر کھڑی چارپائی بچھا کر لیٹ جاتا ـــــ اس وقت وہ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

"خدا بخش چاچا" اس نے وہاں سے ہی آواز دی خدا بخش نے مڑ کر دیکھا۔

"جی بی بی۔"

"وہ چاچا ادھر آئیں بات سنیں۔" خدا بخش اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چاچا کے آنے سے پہلے ہی وہ دروازہ بند کر چکی تھی۔ خدا بخش سیڑھیاں چڑھ کر گیٹ کے پاس آیا۔

"وہ خدا بخش چاچا انیکسی کی لائٹ جل رہی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ارحم صاحب آئے ہیں۔"

"کب؟" اس نے دروازہ کھول کر حیرت سے پوچھا۔

"بس کوئی دو گھنٹے پہلے آئے ہیں۔"

"لیکن ڈرائیور تو پھپھو کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ انہیں لینے کون گیا تھا۔"

"کوئی نہیں جی وہ ہمیشہ خود ہی ایئرپورٹ سے ٹیکسی کرکے آجاتے ہیں۔" خدا بخش چاچا نے بتایا۔

"اچھا۔" وہ حیران سی دروازہ بند کرنے لگی تب ہی اس کی نظر پورچ کی طرف پڑی۔ پچھلے لان سے غالباً ارحم ہی آرہا تھا۔ وہ پورچ میں سے گزر کر گیٹ کی طرف جا رہا تھا اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اور سن روم کی ونڈو سے ذرا سا پردہ ہٹا کر جھانکا۔ ارحم گیٹ کے پاس کھڑا خدا بخش سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے اس کی پشت نظر آرہی تھی پھر وہ خدا بخش سے کچھ کہہ کر باہر چلا گیا۔ وہ یونہی کھڑکی سے پردہ ہٹائے شیشے سے باہر دیکھتی رہی اور اسے اماں کا خیال آگیا۔

اماں ضرور اسے یاد کرکے روتی ہوں گی۔ وہ اماں کو چھوڑ کر آنا نہیں چاہتی تھی۔ خواہ حالات کیسے بھی ہوتے لیکن اماں کی وہ التجا کرتی آنکھیں کپکپاتے لب جڑے ہاتھ۔

"میری بات مان لے عینا۔"

"لیکن اماں آپ یہاں اکیلی کیسے رہیں گی ان دنوں آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی اور اگر جو کبھی رات میں اچانک طبیعت خراب ہوگئی تو آپ کو کچھ ہوگیا تو۔"

"مجھے تمہارے یہاں رہنے سے کچھ ہوجائے گا عینا۔ تم چلی جاؤ گی اپنی پھپھو کے ساتھ تو میں ٹھیک ہوجاؤں گی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو اگر بھرجائی نے زبردستی تیرا نکاح ظفر سے پڑھا دیا تو میں کیا کرسکوں گی تجھے اللہ کا واسطہ اپنی پھوپھی کے ساتھ چلی جا۔ میرا نہ سوچ۔ چار دن زندگی کے ہیں گزر جائیں گے لیکن تیرے ساتھ اگر کچھ غلط ہوگیا نا تو میں سکون سے مر بھی نہیں سکوں گی۔"

اور وہ دل پر پتھر رکھ کر یہاں چلی آئی تھی۔ پھپھو کے ساتھ۔ اس نے آتے سے مڑ کر اماں کی طرف

نہیں دیکھا تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ اماں کھلے دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی ہوں گی لیکن شدید خواہش کے باوجود وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سر جھکائے چلتی ہوئی پیپل تلے کھڑی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ پھپھو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہوجائے گی۔ پھر لاکھ اماں منتیں کرتیں وہ پھپھو کے ساتھ جا نہ پاتی۔

اسے لگا جیسے اس کے رخسار گیلے ہو رہے ہوں۔ اس نے ہاتھوں کی پشت سے گیلے رخساروں کو صاف کیا اور کھڑکی کے شیشے سے ناک ٹکائے باہر دیکھا۔ خدا بخش چھوٹا گیٹ کھول رہا تھا اور پھر گیٹ سے ارحم اندر داخل ہوا اتنی دور سے وہ اس کی شکل واضح طور پر دیکھ نہیں پا رہی تھی ہاں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں غالباً "ڈبل روٹی اور دودھ کا پیکٹ تھا۔ وہ ذرا قریب آیا تو اس نے دیکھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی اور پردہ آگے کر دیا۔ وہ اتنی دور سے آیا ہے لمبا سفر کرکے۔ اس نے کھانا بھی کھانا ہوگا اور چائے بھی پینی ہوگی۔ اور پھپھو گھر نہیں ہیں۔

میں کیا کروں۔ کیا خدا بخش چاچا سے کہوں حمیدہ کو جگا دے وہ ارحم صاحب کو کھانا کھلا دے لیکن نہیں حمیدہ بے چاری بھی تھکی ہاری ـ ہوگی پھر۔

وہ سن روم میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

ارحم راحت پھپھو کا سوتیلا بیٹا تھا۔ فراز صاحب نے پہلی بیوی کی وفات کے بعد ان سے شادی کی تھی۔ اماں نے ایک بار اسے بتایا تھا۔ راحت تمہارے ابا کی بہت لاڈلی تھی۔ اگرچہ عمر میں اس سے تین چار سال ہی چھوٹی ہوگی لیکن تمہارے ابا بچوں کی طرح ہی اس کے لاڈ اٹھاتے تھے۔ اس نے جتنا چاہا اسے پڑھایا پھر اس نے جاب کرنا چاہی تو جاب کی بھی اجازت دے دی۔ حالانکہ تمہارے سوتیلے تایا نے بہت باتیں کیں۔ لیکن تمہارے ابا پروا نہیں کرتے تھے کسی کی اور پھر فراز بھائی سے شادی بھی انہوں نے راحت کی پسند پر کی۔ راحت فراز بھائی کے آفس میں ہی کام کرتی

تھی۔ ارحم کی ممی جب فوت ہوئیں تو وہ چھ سات سال کا تھا اور جب فراز بھائی نے تمہاری پھپھو سے شادی کی تو وہ پندرہ چودہ سال کا ہوگا۔

"پتا نہیں پھپھو ارحم کی اچھی ماں ثابت ہوئی تھیں یا۔۔۔" اس نے سوچا اور پھر ہولے سے سر جھٹکا۔

"پھپھو اتنی اچھی ہیں۔ اتنا خیال رکھنے والی۔ وہ بھلا اچھی ماں کیوں ثابت نہیں ہوئی ہوں گی۔" اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ حمیدہ سونے جا چکی تھی۔ اس نے فریج سے سالن نکال کر مائیکرو ویو میں گرم کیا۔ پھلکے تو ہاٹ پاٹ میں ہی پڑے تھے۔ کھانا ٹرے میں لگا کر اس نے دروازہ کھول کر خدا بخش کو آواز دی۔

"خدا بخش چاچا یہ کھانا ارحم صاحب کو دے آئیے۔ رفیق اور حمیدہ تو سو گئے ہیں۔" خدا بخش نے حیرت سے اسے دیکھا اور ٹرے لے لی۔

"میں نے چائے کا پانی رکھ دیا ہے تھوڑی دیر بعد چائے بھی لے جائیے گا۔" اور چائے کا پانی رکھ کر وہ لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔ ارحم کو اس نے صرف دو بار دیکھا تھا۔ ایک بار جب وہ اماں کے ساتھ سحر سے ملنے کے لیے آئی تھی۔ تب ارحم نے اسے خوب گھمایا تھا۔ اور دوسری بار جب وہ سحر کو گاؤں لے کر آیا تھا اماں سے ملانے۔ وہ وہاں رکا نہیں تھا بس سحر کو چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن ارحم اسے اچھا لگا تھا۔ ہاں اس نے سحر سے اس کا بہت ذکر سنا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتی اماں سے اور اس سے ملنے تو اس کے پاس سوائے ارحم کے متعلق بات کرنے کے اور کوئی بات ہی نہ ہوتی۔

جب ابا کا انتقال ہوا تھا تو سحر گیارہ سال کی اور وہ چھ سال کی تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد تایا اور ان کے بیٹوں نے زمین پر قبضہ کرکے انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ ابا کی چھوٹی موٹی زمینداری تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ وہ اور سحر قریبی قصبے کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ لیکن تایا کے گھر سے نکال دینے کے بعد پڑھائی چھوٹ گئی اماں انہیں لے کر میکے آگئی تھیں۔ نانا ابا نے تینوں کو گلے سے لگالیا تھا۔ راحت

پھپھو کو پتا چلا تو وہ آگئیں۔ تایا سے جھگڑا کیا۔ لیکن بے کار' ابا کی زندگی میں بھی تایا کی راحت پھپھو سے نہیں بنتی تھی۔ وہ انہیں سوتیلا ہی سمجھتے تھے حالانکہ راحت پھپھو اور ابا نے انہیں ہمیشہ بڑے بھائی کا مان دیا تھا۔ تایا کا کہنا تھا زمین ان کی والدہ کی تھی والد کی نہیں اس لیے ابا کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ تب راحت پھپھو نے اماں سے آکر کہا کہ وہ سحر اور عینا کو ان کے ساتھ بھیج دیں۔ وہاں ان کے پاس رہ کر وہ اچھی تعلیم حاصل کر سکیں گی جبکہ یہاں ایسا ممکن نہیں ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر اماں انہیں جدا کرنے کو تیار ہو گئی تھیں۔ لیکن نانا نہیں مانے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی نواسیوں کو کھلا سکتے ہیں۔ تب راحت پھپھو چپ کر گئی تھیں۔ لیکن وہ کبھی کبھی سال چھ مہینے بعد ملنے آتی تھیں تو ان کے لیے ڈھیروں کپڑے اور کھلونے لے کر آتی تھیں اماں نے انہیں گاؤں کے اسکول میں ہی داخل کروا دیا تھا۔

نانا جب تک زندہ رہے ماموں ممانی کا سلوک اچھا رہا' لیکن دو سال بعد نانا کا انتقال ہو گیا اور مامی کا سلوک بہت برا ہو گیا۔ اماں اور سحر سارا سارا دن کام کرتیں پھر بھی مامی کا موڈ خراب رہتا تھا۔ راحت پھپھو ملنے آئیں تو سحر کو ملگجے کپڑوں میں ڈھیروں کپڑے دھوتے دیکھ کر تڑپ اٹھیں اس روز اماں کی طبیعت خراب تھی انہیں بخار تھا اس لیے سحر اکیلے کپڑے دھو رہی تھی اور وہ برتن دھو رہی تھی۔

"یہ کیا ہے بھابھی۔ عینا کی عمر ہے کوئی برتن دھونے والی۔"

"مجھے بخار تھا" اماں شرمندہ ہو گئیں۔ تب اس روز راحت پھپھو اور اماں میں چپکے چپکے جانے کیا بات ہوئی تھی کہ اماں نے سحر اور اس سے کہا کہ وہ پھپھو کے ساتھ چلی جائیں لیکن وہ مچل اٹھی تھی۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔" وہ اماں سے لپٹ گئی تھی۔ تب اس کی عمر نو سال اور سحر کی عمر چودہ سال تھی۔ رو رو کر اس نے برا حال کر لیا تھا مامی اپنے بچوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ آئیں تو راحت پھپھو سحر کو ساتھ لے کر جانے کے لیے تیار تھیں مامی کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"یہ سحر کہاں جا رہی ہے اور کیوں؟"

انہوں نے اماں سے پوچھا تھا اور جواب پھپھو نے دیا تھا۔

"میرے ساتھ۔۔۔ میرا خون ہے میرے بھائی کی اولاد ہے۔ میں اسے رلتے نہیں دیکھ سکتی۔"

اور ان کے جانے کے بعد بھی مامی دیر تک بولتی رہی تھیں اور اماں سر جھکائے آنسو بہاتی رہی تھیں پتا نہیں وہ مامی کے اس طرح بولنے پر آنسو بہا رہی تھیں یا سحر کی جدائی پر لیکن اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ شکر ہے وہ پھپھو کے ساتھ نہیں گئی ورنہ اماں تو بالکل اکیلی ہو جاتیں اور تب ہی اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اماں کو کبھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جائے گی' لیکن وہ اماں کو اکیلا چھوڑ کر آگئی تھی۔

اس نے گہری سانس لی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے کا پانی ابل رہا تھا۔ چائے دم کر کے اس نے خدا بخش کو آواز دے کر چائے لے جانے کو کہا۔ خدا بخش نے چائے لے کر تایا۔

"ارحم صاحب آپ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔"

"اچھا۔" اسے حیرت ہوئی۔

بھلا اس میں شکریہ ادا کرنے والی کون سی بات ہے ان کا گھر ہے پھپھو ہوتیں تو وہ ہی کھانا بھجواتیں۔

وہ کچن کی لائٹ آف کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ساڑھے بارہ ہو رہے تھے اس نے سرہانے رکھی کتاب اٹھائی اور پھر پڑھتے پڑھتے ہی سو گئی۔

صبح ناشتے پر اسے ارحم کا خیال آیا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بڑی سی ٹیبل کے گرد صرف وہ اور پھپھو بیٹھی تھیں۔

"ناشتا کرو بیٹا۔ کیا سوچ رہی ہو۔" ہمیشہ کی طرح انہوں نے بے حد نرمی سے کہا تھا۔

"جی پھپھو" اس نے چونک کر سلائس اٹھایا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ارحم بھائی نہیں آئیں گے ناشتا کرنے۔"

"ارحم" بیگم راحت فراز کا سلائس پر مکھن لگاتا ہاتھ رک گیا اور چھری انہوں نے پلیٹ میں رکھ دی۔

"جی پھپھو خدا بخش چاچا نے بتایا تھا رات وہ آئے ہیں۔" گھبرا کر اس نے ساری تفصیل بتا دی۔ پوری بات سن کر انہوں نے اطمینان سے پھر مکھن لگانے والی چھری اٹھائی اور سلائس پر مکھن لگانے لگیں۔ پھر انہوں نے عینا کی طرف دیکھا جو انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"وہ اندر نہیں آتا ہے۔ ہاں فراز ہو گھر پر تو کبھی کبھار آجاتا ہے اس کی اپنی زندگی ہے کب آتا ہے کب چلا جاتا ہے مجھے علم نہیں ہے۔" انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"تم ناشتا کرو۔ یہ حمیدہ نے آج تمہارے لیے پراٹھا بنایا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی تمہیں بریڈ پسند نہیں ہے۔"

"جی۔" اس نے سلائس رکھ کر ہاٹ پاٹ سے پراٹھا نکال کر پلیٹ میں رکھا اور تھوڑا سا آملیٹ لے لیا اور سوچا۔

"پتا نہیں ارحم بھائی کیوں اندر نہیں آتے۔ کیا پھپھو ان کے لیے روایتی سوتیلی ماں کی طرح ہیں' لیکن جب سحر یہاں رہتی تھی تب تو وہ اور ارحم بھائی تو ادھر ہی ہوتے تھے اور سحر کی کتنی دوستی تھی ارحم بھائی سے اور سحر نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ پھپھو کا سلوک ارحم بھائی سے اچھا نہیں ہے پھر اب۔۔۔"

چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ اسے تو پورا یقین تھا کہ سحر آپی کی شادی ارحم بھائی سے ہی ہو گی اور اسے بھی ارحم بھائی بہت اچھے لگے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ سحر آپی ارحم بھائی سے بہت شدید محبت کرتی ہیں۔ ان دنوں اسے کچھ ایسا ہی لگا تھا لیکن پھر سحر آپی کی شادی ارحم کے بجائے خرم شہزاد سے ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا شاید انکل فراز نہیں مانے ہوں گے وہ اتنے امیر اور سحر ایک یتیم لڑکی ان کے گھر میں ہی پلنے والی' جب اماں نے اسے بتایا تھا کہ راحت کا فون آیا ہے انہوں نے سحر کا رشتہ طے کر دیا ہے خرم شہزاد سے' بہت تعریف کر رہی تھیں وہ خرم کی تو وہ حیرت سے اماں کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ آپی تو مر جائیں گی۔۔۔ وہ تو بقول ان کے ارحم بھائی سے محبت نہیں عشق کرتی تھیں۔

اماں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میرا تو خیال تھا شاید ارحم۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"یا اللہ سحر آپی کیا کریں گی۔ کیسے جئیں گی۔" وہ کئی دن پریشان رہی تھی اور جب سحر کچھ دنوں بعد راحت بیگم کے ساتھ گاؤں آئی تھی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی دائیں ہاتھ کی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنے اور بائیں ہاتھ میں ڈائمنڈ جڑا کنگن پہنے وہ بے حد مطمئن بے حد خوش لگ رہی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ خوب صورت تو خیر وہ ہمیشہ سے تھی۔ راحت پھپھو کی طرح۔ بلکہ وہ ساری کی ساری راحت پھپھو پر گئی تھی۔ ویسی ہی سرخ و سپید رنگت' گلابی ہونٹ بڑی بڑی لانبی پلکوں والی غزالی آنکھیں مناسب قد۔۔۔ جبکہ سحر کے برعکس اس کا رنگ گندمی تھا اور وہ بے حد دبلی پتلی سی تھی۔ نقوش اٹریکٹو تھے خاص طور پر آنکھیں بے حد پیاری تھیں' لیکن سحر تو سحر تھی نانا ابا نے اس کا نام نجم السحر رکھا تھا۔ صبح کا ستارہ اور اماں نے اس کا نام عینار رکھا تھا۔ اماں کہتی تھیں جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اتنی کمزور تھی کہ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔

"ارے کیا دیکھ رہی ہو کیا نظر لگاؤ گی؟" سحر نے اس کے سامنے ہاتھ ہلائے تھے تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ سحر بہت افسردہ اور دکھی ہو گی بلکہ اس کا برا حال ہو گا۔

"سحر آپی آپ خوش ہیں۔"

"ہاں۔"

"تم خوش ہونے والی کون سی بات ہے خرم بہت

اچھا ہے۔" وہ بائیں ہاتھ سے اپنی رنگ گھما رہی تھی۔

"اور۔۔۔ وہ۔۔۔ ارحم بھائی۔" وہ ہکلائی تھی۔

"آپ تو ارحم بھائی سے محبت کرتی تھیں نا۔"

"ہاں ارحم اچھا ہے۔ اب بھی اس سے محبت کرتی ہوں ایک دوست کی طرح لیکن جہاں تک شادی کی بات ہے تو شادی کا فیصلہ تو پھپھو نے کرنا تھا اور بزرگ جو بھی کرتے ہیں اچھا کرتے ہیں۔ اگر پھپھو ارحم سے شادی کر دیتیں تب بھی ٹھیک تھا اور اب خرم کو انہوں نے میرے لیے چنا ہے تو یقیناً "بہتر ہی سوچا ہو گا۔" وہ آرام سے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن سحر کے اتنی تفصیل سے بات کرنے کے باوجود وہ اپ سیٹ سی تھی۔

"اور ارحم بھائی وہ تو آپ سے بہت محبت کرتے تھے نا۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

"چھوڑو یار۔" سحر نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"تم بتاؤ تم کب آؤ گی میری شادی پر۔ تین چار تو فنکشن ہیں۔ کپڑوں کی تم فکر مت کرنا۔ چاروں فنکشنز کے لیے کپڑے پھپھو تمہارے لیے وہاں سے ہی بنوا دیں گی۔" اس نے صرف سر ہلا دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ سحر کی طرح خوش نہیں ہو سکی تھی۔ اسے رہ رہ کر ارحم کا خیال آ رہا تھا۔

سحر تو خوش ہے کیا ارحم بھائی بھی خوش ہوں گے۔ وہ چودہ سال کی تھی تب اور سحر انیس سال کی۔ وہ بی اے کا امتحان دے چکی تھی اور پھپھو نے اس کی شادی طے کر دی تھی۔ دو ماہ بعد رخصتی تھی اور وہ اماں سے اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے آئی تھیں اماں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا انہوں نے تو سارے اختیار انہیں ہی سونپ دیے تھے۔ پھر بھی انہوں نے ارحم کا پوچھا ضرور تھا۔

"ارحم کے پاپا کا خیال نہیں تھا سحر کے لیے۔" راحت پھپھو نے بتایا تھا۔

"اور میں کیوں مجبور کرتی ہماری سحر کے لیے کوئی رشتوں کی کمی تو نہیں ہے نا۔ کئی لوگ خواہش مند تھے مجھے خرم اچھا لگا اور دیکھو تم لوگ دس بارہ دن پہلے ہی آ جانا۔ چند دن بھابھی کی چاکری نہ کی تو کچھ نہیں ہونے والا۔"

اماں نے سر ہلا دیا تھا۔

راحت بیگم اور سحر شام کو واپس چلی گئی تھیں۔ اور ان کے جانے کے بعد اس روز ماں بہت ہی لڑی تھیں اماں سے بلاوجہ ہی۔ اماں پوری رات روتی رہی تھیں اور وہ اماں کے بیڈ پر بیٹھی خود بھی بار بار رو پڑتی تھی۔

"اماں چلیں ہم بھی پھپھو کے گھر چل کر رہتے ہیں۔" اور انہوں نے آنسو پونچھ کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں تم چلی جاؤ تمہاری پھپھو ہیں۔"

"اور آپ۔۔۔ آپ کی بھی تو نند ہیں۔"

"ہاں ہیں۔۔۔ میں نہیں جا سکتی۔ میرا جانا مناسب نہیں ہے عہنا۔۔۔ فراز بھائی غیر ہی تو ہیں نا کیا کہیں گے وہ۔۔۔ میری غیرت گوارہ نہیں کرتی۔ یہاں بھائی کا گھر ہے جیسا بھی سلوک کریں کوئی طعنہ تو نہیں ہے نا کسی کا۔"

"میں آپ کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی اماں۔" وہ اٹھ کر اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی تھی۔

اور پھر یوں ہوا تھا کہ راحت پھپھو کے بار بار بلانے کے باوجود وہ اور اماں عین بارات والے دن ہی پہنچی تھیں کیونکہ پہلے تو اماں بیمار ہو گئیں اور پھر مامی بستر پر پڑ گئیں۔ ماموں نے کہا۔

"ثریا بیمار ہے اور تم چلی جاؤ گی۔" اماں چپ کر گئی تھیں اور وہ کلس کر رہ گئی تھی۔ مہندی مایوں وہ کسی فنکشنز میں شریک نہ ہو سکی تھی اور بارات کے دن وہ ماموں اور مامی کے ساتھ ہی لاہور آئے تھے ایک دن پہلے تو مامی بیڈ پر لیٹی ہائے ہائے کر رہی تھیں اور اب سارا راستہ بس میں بیٹھی چہکتی رہی تھیں اور مسلسل کچھ نہ کچھ کھاتی رہی تھیں پھپھو کا شاندار گھر دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔

"راحت اتنے شاندار گھر میں رہتی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا بالکل۔"

اور پھر شادی ہال میں وہ جس طرح اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی سحر کو دیکھ رہی تھیں اسے لگتا تھا جیسے ان کی آنکھیں پھٹ ہی جائیں گی۔

اس نے ارحم کو دیکھنے کی کوشش کی تھی اور جب صبر نہ ہوا تو سحر کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"ارحم بھائی کہاں ہیں۔۔۔ کہیں نظر نہیں آ رہے۔"

سحر نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ بس گھور کر رہ گئی تھی اور ارحم بھائی اسے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اس سے اگلے دن ولیمے میں بھی نہیں۔

"عہنا یہ اتنا کم ناشتا کیا ہے تم نے۔ جوس بھی یوں ہی پڑا ہے۔"

"بس پھپھو جی نہیں چاہ رہا۔" اس نے چونک کر ٹشو نکال کر ہاتھ صاف کیے تھے۔

"یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہونے والے ہیں۔ میرا خیال ہے تم ایڈمیشن لے لو۔ کیا سبجیکٹ تھے بی اے میں تمہارے۔" تین سال پہلے اس نے پرائیویٹ بی اے کیا تھا۔

"تین سال ہو گئے مجھے بی اے کیے ہوئے۔ پتا نہیں ایڈمیشن ملے گا بھی یا نہیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو بھابھی نے بتایا تھا تمہارے نمبر اچھے تھے۔"

"جی اے گریڈ تھا۔" اس نے سر جھکائے جھکائے بتایا۔

"اور سبجیکٹ تھے اردو، اسلامیات، ہسٹری حالانکہ میں انگلش لٹریچر اور اکنامکس لینا چاہتی تھی، لیکن پرائیویٹ بغیر کسی ہیلپ کے مشکل تھا۔"

"ٹھیک ہے اردو یا ہسٹری میں ایم اے کر لو۔ ماسٹر ڈگری تو ہو گی نا تم اپنے پیپر آج مجھے دے دینا۔"

"جی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ حمیدہ آ کر ٹیبل سمیٹنے لگی تو وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ نو دس بجے تک بیگم راحت آفس چلی جاتی تھیں انکل فراز کی عدم موجودگی میں سارا کام وہی دیکھتی تھیں اور ان کی موجودگی میں بھی ان کے ساتھ اکثر چلی جاتی تھیں۔

کمرے میں آ کر اس نے ٹی وی لگا لیا پروگرام اچھا تھا وہ دھیان سے دیکھنے لگی۔ پروگرام ختم ہوا تو وہ اٹھ کر نیچے لاؤنج میں آئی۔ حمیدہ کچن صاف کر رہی تھی۔ اس نے کچن میں آ کر اسے کچھ ہدایات دیں اور باہر آ گئی۔

بیگم راحت آفس جا چکی تھیں۔ انہوں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا تھا، لیکن وہ خود ہی اپنی نگرانی میں صفائی وغیرہ کروانے لگی تھی۔ کبھی کبھار حمیدہ کے ساتھ مل کر کوکنگ بھی کر لیتی تھی۔

کچھ دیر وہ لاؤنج میں بیٹھی رہی۔ یہاں کرنے کو کوئی کام ہی نہیں تھا جبکہ وہاں گاؤں میں اسے فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور جب بھی ذرا فارغ ہوتی تو مامی کوئی نہ کوئی کام نکال لیتی تھیں۔

ان کا موڈ ہمیشہ خراب رہتا تھا، لیکن سحر کی شادی سے واپس آ کر تو اور بھی خراب ہو گیا تھا۔ وہ اکثر بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ ایک راحت ہے جسے بھتیجی کا اتنا خیال ہے اتنے امیر کبیر لوگوں میں اس کی شادی کروائی ایک یہ موٹا بیگم ہیں۔ بھائی کا کھاتی پہنتی ہیں۔ تین تین بھتیجیاں جوان ہیں اتنا نہیں کر سکتیں کہ نند سے کہہ کر انہیں بھی کسی اچھے گھر میں پار لگوا دیں۔

"عہنا بی بی دوپہر میں کیا پکے گا۔"

"پھپھو نے نہیں بتایا۔" اس نے چونک کر حمیدہ سے پوچھا۔

"نہیں انہوں نے کہا تھا آپ سے پوچھ لوں۔"

"اچھا۔ چکن پلاؤ اور کڑاہی بنا لو اور میٹھے میں بھی کچھ بنا لینا۔۔۔ ساتھ میں بروسٹ بنا لینا۔" اس نے سوچا ارحم آیا ہوا ہے تو کچھ اہتمام کروا لے۔ وہ اندر نہیں آتا پھپھو نے بتایا تھا لیکن اس کا کھانا تو اندر سے ہی جاتا ہو گا نا۔

"کباب تو فریزر میں ہوں گے نا وہ بھی تل لینا اور۔۔۔" وہ سوچنے لگی۔ "جو تمہارا دل چاہے بنا لینا۔ وہ ارحم بھائی آئے ہیں نا رات کو خدا بخش چاچا بتا رہے تھے دو سال بعد آئے ہیں۔"

حمیدہ نے بھی ایک حیرت بھری نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر سر ہلا کر کچن میں واپس چلی گئی تھی۔ وہ غیر ارادی طور پر اٹھی اور لاؤنج کا پچھلے لان کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ کچھ دیر وہ یونہی لان میں کھڑی رہی اور پھر وہ انیکسی کی طرف بڑھ گئی۔ انیکسی کا دروازہ لاک نہیں تھا اس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ

کھلتا چلا گیا۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے وہ برآمدے میں آئی۔ اور ایک دروازے کو جو تھوڑا سا کھلا تھا ذرا سا دھکیلا اور اندر جھانکا۔ غالباً" یہ بیڈ روم تھا۔ اندر کمرے میں قدم رکھتے ہوئے وہ تھوڑا سا جھجکی تھی، لیکن پھر اس نے اندر قدم رکھ دیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کچھ بے ترتیبی سی تھی بیڈ کی چادر تڑی مڑی تھی اور بیڈ پر کچھ کتابیں اور ایک بیگ پڑا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک اٹیچی کیس پڑا تھا۔ شیلف پر ادھر ادھر ہر جگہ دھول نظر آرہی تھی۔ زیادہ نہیں لیکن تھی۔

"پتا نہیں ارحم بھائی کہاں ہیں۔" اس نے سوچا تب ہی واش روم کا دروازہ کھلا اور تولیے سے بال خشک کرتے ارحم نے باہر قدم رکھا اور پھر اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں عینا کی طرف اٹھی تھیں۔

"السلام علیکم ارحم بھائی۔" اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے فوراً" سلام کیا تھا۔ اور بے حد اشتیاق سے اسے دیکھا یہ اس ارحم سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے اس نے سحر کے ساتھ گاؤں میں دیکھا تھا۔ اس کی رنگت سانولی ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سا حزن تھا اور چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ ارحم تو بہت شوخ و شنگ تھا اور اس کی آنکھیں تو جیسے ہر دم ہنستی رہتی تھیں۔

"آپ۔" ارحم کے لبوں سے نکلا۔

"سوری ارحم بھائی میں بغیر اجازت کمرے میں آگئی۔ آپ کمرے میں نہیں تھے۔ میں پوچھنے آئی تھی ناشتے میں آپ کیا لیں گے۔"

"اوہ" اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"تو آپ نے رات کھانا بھجوایا تھا۔ اچھی لڑکی آپ کی اس مہمانی کا شکریہ، لیکن میں اس طرح کی عنایات کا عادی نہیں ہوں پلیز آئندہ تکلیف مت کیجیے گا۔" عینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بالکل اجنبیت تھی۔ شاید اس نے اسے پہچانا نہیں تھا۔ بارہ سال بھی تو ہو گئے تھے نا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ تیرہ چودہ سال کی دبلی پتلی سانولی اور کمزور سی عینا۔ بارہ سال بعد اب بہت اٹریکٹو ہو گئی تھی۔ سانچے میں ڈھلا جسم لمبے گھنے بال کمر کو چھوتے اور رنگت بھی گندمی گندمی سی۔

"میں عینا ہوں ارحم بھائی آپ نے پہچانا نہیں۔"

"عینا۔" لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری تھی، لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی تھی۔ ہونٹ بھینچ گئے تھے اور اس نے یک دم رخ موڑ لیا تھا۔

"عینا بی بی پلیز آپ جائیں۔ میں کسی عینا کو نہیں جانتا۔ اور آئندہ کسی میزبانی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کھانا ناشتا سب خود بنا تا ہوں۔"

وہ حیران سی کھڑی تھی۔ اسے ارحم کے کہے لفظوں پر یقین نہیں آرہا تھا یا اسے ارحم سے اس رویے اور ان الفاظ کی امید نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا ارحم اسے دیکھ کر اس سے مل کر خوش ہو گا۔ اسے وہ دن یاد آگئے تھے جب ارحم گاؤں گیا تھا اور جب وہ یہاں آئی تھی اماں کے ساتھ۔

"ارحم بھائی۔" اس نے بے حد آہستگی سے کہا تھا، لیکن ارحم نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"سوری میرا آپ سے ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جو آپ یہاں اس رشتے کے حوالے سے کھڑی ہیں۔ پلیز جائیے۔"

اس کے سخت لہجے نے عینا کی پلکیں نم کر دیں۔ وہ یک دم تیزی سے پلٹی اور کمرے کے وسط میں پڑے اٹیچی کیس سے ٹکرا گئی۔ چوٹ زور سے لگی تھی لبوں سے اف نکل گیا وہ جھک کر پاؤں دیکھ رہی تھی جب ارحم نے مڑ کر اسے دیکھا اور بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ ایک لمحہ کو اس کی نظریں پشت پر بکھرے اس کے بالوں پر پڑی تھیں وہ ٹھٹک کر رک گیا، لیکن پھر سر جھٹک کر وہ آگے بڑھا تھا۔

"سوری رات بہت تھکا ہوا تھا اس لیے سامان یونہی پھینک دیا تھا۔"

وہ جھک کر اٹیچی کیس اٹھانے لگا تو اس کی نظر عینا پر پڑی تھی جس کے رخساروں پر آنسو لڑھک رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے اور پھر بنا کچھ کہے اٹیچی کیس اٹھا لیا۔ عینا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

پچھلے لان سے ہوتی ہوئی وہ لاؤنج میں آئی اور پھر تیز تیز سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ آنسو اب بھی اس کے رخساروں پر بہتے جا رہے تھے۔ ارحم بھائی ایسے نہیں تھے وہ کبھی بھی ایسے نہیں تھے پھر۔

اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے آنسو پونچھے اور گہری سوچ میں کھو گئی۔ جب وہ پہلی بار اماں کے ساتھ راحت پھپھو کے گھر آئی تھی تو سحر کو یہاں آئے چھ ماہ ہو چکے تھے اور اماں اس کے لیے بے حد اداس تھیں۔ وہ ان کی پہلوٹھی کی اولاد تھی اور اماں ابا نے اس کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ لاڈلی تو وہ بھی تھی۔ اماں ابا نے کبھی دونوں میں فرق نہیں کیا تھا، لیکن وہ اماں کے پاس تھی اور سحر دور تھی۔ اس نے سحر کے جانے کے بعد کئی بار اماں کو چھپ چھپ کے روتے دیکھا تھا اور اماں سے کہا تھا۔

"اماں چلیں سحر آپی کو لے آتے ہیں۔" لیکن اماں نفی میں سر ہلا دیتیں۔ اور تب پھپھو کا فون آیا تھا ماں گھر پر نہ تھیں اور اماں کچن میں تھیں۔

"پھپھو۔" اس نے ان کی آواز پہچانتے ہی کہا تھا۔

"اماں بہت روتی ہیں سحر آپی کو یاد کر کے۔ آپ انہیں لے کر آئیں نا ملانے۔"

"لیکن جانو اس کے تو پیپر ہو رہے ہیں۔ وہ کیسے آسکتی ہے۔ اچھا چلو ٹھیک ہے میں کل گاڑی بھجوا دیتی ہوں تم اور بھابھی جان آجاؤ۔" وہ حیران رہ گئی تھی۔

"عینا بیٹا اماں کہاں ہیں تمہاری انہیں فون دو نا۔"

"اماں جی۔ اماں جی۔" اس نے وہیں سے آواز دی تھی۔

"پھپھو کا فون ہے۔" اور پھر پھپھو نے پتا نہیں کیا کہا تھا اماں سے کہ وہ تیار ہو گئی تھیں لاہور جانے کو۔ ماں کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"سحر کے لیے دل اداس ہو رہا ہے۔ مل کر آجاؤں گی۔" اماں کے اندر ابا کے بعد کتنی عاجزی اور انکساری آگئی تھی۔ وہ ماں سے ہمیشہ یوں ہی عاجزی سے بات کرتی تھیں۔ ڈرائیور انہیں لینے آگیا تھا۔ اور پھر اس نے پہلی بار اپنے ہوش میں پھپھو کا گھر دیکھا تھا۔ اتنا شاندار اتنا بڑا۔ اور اس گھر میں سحر آپی رہتی ہیں اور پھر سحر آپی کا کمرہ دیکھ کر تو وہ اور بھی حیران رہ گئی تھی۔ خوب صورت سا بیڈ اور دیواروں کے ہم رنگ پردے۔ خوب صورت بیڈ کور، وہ جوتے اتار کر کارپٹ پر چلتی رہی اسے بہت مزا آرہا تھا۔ اماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ چھوٹی سی تھی۔ ان کی گود میں دو سال کی تھی جب وہ سب صائم کے عقیقے پر آئے تھے۔ صائم راحت پھپھو کا بیٹا تھا اس سے دو سال چھوٹا۔ صائم کے علاوہ پھپھو کی اور کوئی اولاد نہیں تھی۔

"صائم کہاں ہے؟" اس نے سحر سے پوچھا تھا۔

"اپنے کمرے میں ہو گا۔" سحر نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔ وہ پڑھ رہی تھی۔

"کہاں ہے اس کا کمرہ؟"

"پھپھو کے بیڈ روم کے ساتھ والا۔"

سحر جواب دے کر پھر کتاب میں گم ہو گئی تھی اور اسے صائم کو دیکھنے کا بہت اشتیاق ہو رہا تھا۔ اماں نے بتایا تھا صائم بالکل پھپھو کی طرح ہے بہت خوب صورت اور کیوٹ سا۔ اور وہ سحر کے کمرے سے نکل کر صائم کے کمرے میں آئی تھی۔ صائم کا کمرہ بھی بہت شاندار تھا اور وہ ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا۔

"صائم" اس نے آہستہ سے آواز دی تھی۔

" Hay who are you"

"عینا۔" وہ مسکرائی تھی۔

"تمہاری کزن۔"

"اچھا۔" وہ دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سحر آپی کی بہن۔" اس نے مزید تعارف کروایا۔

"او کے۔" وہ پھر کارٹون دیکھنے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی تھی اور پھر پھپھو اور اماں کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس ساڑھے سات سالہ لڑکے سے

بے حد مرعوب ہو گئی تھی جو فر فر انگریزی بول رہا تھا اور جو بہت پیارا تھا، لیکن اس ساڑھے سات سالہ لڑکے نے اسے بالکل ہی لفٹ نہیں کروائی تھی۔ وہ بے حد مصروف رہتا تھا۔ لیکن ارحم نے ایسا نہیں کیا تھا ارحم سے سحر نے تعارف کروایا تھا۔

"ارحم یہ عینا ہے میری چھوٹی بہن۔"

"ارے یہ تو بہت کیوٹ ہے۔"

ارحم نے جھک کر دائیں ہاتھ کی انگلی سے اس کا رخسار چھوا تھا۔ ارحم دبلا پتلا اور کافی لمبا سا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا، لیکن وہ ایک پر کشش لڑکا تھا خوب صورت آنکھوں والا اور وہ باتیں بھی بہت خوب صورت کرتا تھا۔ وہ تین دن وہاں رہے تھے اور ان تین دنوں میں ارحم نے اسے بہت ہنسایا تھا اور خوب گھمایا بھی۔ ڈھیروں چاکلیٹ اور کئی طرح کے کھلونے خرید کر دیے تھے اور گھر آ کر بھی وہ کتنے ہی دن تک ارحم کو یاد کرتی رہی تھی اور جب ارحم گاؤں آیا تھا تب بھی اس کے لیے ڈھیروں چاکلیٹس ٹافیاں اور البم غلم لے کر آیا تھا۔ ان دنوں وہ یو ای ٹی میں پڑھ رہا تھا اور اس کا فائنل ایر تھا۔

"مما اس سے پہلے مجھے کبھی گاؤں لے کر نہیں آئیں۔"

اس کی انگلی پکڑے گاؤں کی اونچی نیچی گلیوں میں گھومتے ہوئے اسے ارحم نے بتایا تھا اور اسے ابھی تک یاد تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔

"کیوں۔"

"مجھے کبھی کسی نے کہا ہی نہیں گاؤں آنے کا۔"

"آپ شرارتیں کرتے ہوں گے نا۔ اماں کہتی ہیں پھپھو کو شرارتی بچے پسند نہیں ہیں۔"

"اچھا کیا تم شرارتی ہو سوئیٹ گرل۔"

"تھوڑی سی۔"

"میں جب تمہاری عمر کا تھا تو میں بھی تھوڑا تھوڑا شرارتی تھا۔" وہ کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا اور اسے بھی بٹھالیا تھا۔

"اور پھر پھپھو آپ کو شرارتوں پر ڈانٹتی تھیں۔"

"نہیں میری مما مجھے نہیں ڈانٹتی تھیں کیونکہ میں نے کبھی ایسی شرارت نہیں کی تھی جو کسی کے لیے باعث تکلیف ہو۔ چھوٹی چھوٹی بے ضرر شرارتیں جن پر مما مسکرا دیتی تھیں۔"

اور تب اس وقت اسے پتا نہیں تھا کہ پھپھو اس کی مما نہیں ہیں اور اس روز اس نے ارحم سے کتنی ہی باتیں کی تھیں ۔۔۔ ابا کی اماں کی ۔۔۔ سحر آپی کی اور اپنی شرارتوں کی۔ چھوٹی چھوٹی بے ضرر شرارتیں۔

"لیکن اب میں شرارتیں نہیں کرتی۔" اس نے ارحم کو بتایا تھا۔

ارحم نے بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنی تھیں۔

"کیونکہ اماں کہتی ہیں جن بچوں کے "ابا" نہیں ہوتے انہیں چھوٹی سی شرارت بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جن کے "ابا" نہیں ہوتے وہ بچے تنہا ہوتے ہیں بالکل اکیلے اور وہ اگر شرارت کریں تو ان کے ابا انہیں بچانے کے لیے نہیں آسکتے۔"

"اور جن بچوں کی اماں نہیں ہوتیں وہ بھی بالکل تنہا اور اکیلے ہو جاتے ہیں گڑیا۔" اس نے کہا تھا اور آج اتنے سال گزرنے کے بعد اس جملے میں چھپے درد کو اس نے دل کی پوری گہرائیوں کے ساتھ محسوس کیا تھا، لیکن تب اس روز اس نے ارحم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں اکیلے تو ہو جاتے ہیں، لیکن ابا ماں کی مار سے بچا سکتے ہیں۔ اماں تو نہیں بچا سکتیں نا جب ماں مارتی ہیں وہ تو خود ڈر جاتی ہیں ان سے۔"

"کیا ماں تمہیں مارتی ہیں گڑیا۔"

"ہاں کبھی کبھی۔" اس نے سر ہلایا تھا اور ارحم نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"اور کیا سحر کو بھی۔"

"ہاں جب سحر آپی ادھر تھیں تو ماں انہیں بہت ڈانٹتی تھیں اور کبھی کسی غلطی پر مار بھی دیتی تھیں تو پھپھو اس لیے تو انہیں ساتھ لے گئی ہیں۔"

"اچھا تو تم بھی چلو نا ہمارے ساتھ۔"

"نہیں میں اماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اکیلی ہوں گی تو زیادہ روئیں گی۔ ابھی تو صرف سحر آپی کو یاد کر کے روتی ہیں اور پھر مجھے بھی یاد کریں گی۔" اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تھا۔

"اور پھر ماں بھی زیادہ لڑیں گی ان سے۔" اور ارحم نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھنے کے بعد اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔

"چلو گڑیا گھر چلتے ہیں۔"

اور اس رات ارحم نے اماں سے کتنی بحث کی تھی۔

"آنٹی آپ کو اعتراض کیا ہے آخر، عینا وہاں بہت خوش رہے گی۔ مما اس سے سحر سے بھی زیادہ پیار کرتی ہیں۔"

"جانتی ہوں بیٹا، لیکن عینا خود نہیں جانا چاہتی۔"

"یہ اتنی چھوٹی سی نو سال کی تو ہے آپ کہیں گی تو آپ کی بات مان لے گی۔"

"نہیں بیٹا یہ نہیں جائے گی، میں جانتی ہوں بھلے اسے روز ہی کیوں نہ مار کھانی پڑے یہ سحر سے بہت مختلف ہے۔"

اماں کو کتنا یقین تھا اس پر، لیکن اب وہ انہیں اکیلی چھوڑ کر آ گئی تھی۔۔۔ کاش اماں اسے اپنی قسم نہ دیتیں تو کچھ بھی ہوتا وہ اماں کو یوں ماں کے طعنے کھانے کے لیے اکیلا نہ چھوڑتی۔۔۔ ماں لڑتی تھیں۔۔۔ برا بھلا کہتی تھیں تو وہ کم از کم اماں کے آنسو تو پونچھتی تھی۔ انہیں کتنا آسرا تھا اس کا۔۔۔ ایک گہری سانس لے کر وہ بیڈ سے اٹھی اور کچن میں حمیدہ کے پاس آ گئی۔

"حمیدہ ارحم بھائی کھانا نہیں کھائیں گے آپ جو چاہے پکا لیں۔"

"ہاں وہ اندر نہیں آتے۔ جب بھی آئیں باہر ہی کھانا کھاتے ہیں۔"

"کیا پھپھو نہیں کہتیں ان سے۔"

"شروع شروع میں تو کہتی تھیں لیکن اب نہیں کہتیں کچھ بھی۔ اور ارحم صاحب تو دو تین سال بعد ہی آتے ہیں بڑے صاحب سے ملنے اور بھی چند دن رہ کر چلے جاتے ہیں کبھی زیادہ دن۔" وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آخر ایسا کیا ہے۔ کیا پھپھو اور ارحم بھائی کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا جب سحر یہاں آ رہی تھی۔ لیکن پھر اسے حمیدہ سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں لگا اس نے سوچا ہو سکتا ہے کبھی پھپھو خود ہی بتا دیں۔ پھپھو کبھی بھی روایتی سوتیلی ماں نہیں ہو سکتیں۔ اس کا اسے یقین تھا۔ کتنا خیال رکھ رہی تھیں وہ اس کا۔ سحر آپی اماں اور اس سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ وہ اگر روایتی نند نہیں تھیں تو پھر روایتی سوتیلی ماں کیسے ہو سکتی ہیں۔ ضرور ارحم خود ہی۔ کتنا تلخ لہجہ تھا اس کا۔ اور آنکھوں سے کیسی آگ سی نکل رہی تھی۔

"خیر مجھے کیا۔" اس نے ہولے سے کندھے جھٹکے ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔۔۔ یہاں کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ اللہ کرے پھپھو جلد ہی اس کا ایڈمیشن کروا دیں۔۔۔ اس طرح فارغ رہنے سے تو بہتر ہے کہ کچھ پڑھ ہی لوں۔ اور پڑھ کر کہیں کسی کالج یا اسکول میں جاب کر لوں۔ کوئی چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لوں اور اماں کو اپنے ساتھ لے آؤں، اماں کو یہاں پھپھو کے گھر رہنے پر اعتراض ہے نا۔ وہ گھر تو اپنا ہو گا نا۔۔۔ وہ خواب دیکھنے لگی تھی کمال ہے اسے پہلے اس طرح کا کوئی خیال کبھی کیوں نہیں آیا۔ جب تین سال پہلے اس نے پرائیویٹ بی۔ اے کیا تھا اور اس کے نمبر ثنا سے بہت زیادہ آئے تھے۔ ثنا جو اس کے ماموں کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھی اور شہر کے کالج میں پڑھتی تھی۔ گاؤں سے شہر زیادہ دور نہیں تھا۔ گاؤں کی اکثر لڑکیاں وین یا سوزوکی پر روزانہ شہر پڑھنے جاتی تھیں۔ لیکن وہ خواہش کے باوجود کالج میں ایڈمیشن نہیں لے سکتی تھی۔۔۔ ماں دن میں دس بار تو سناتی تھیں کہ اس کے پرائیویٹ پڑھنے کی وجہ سے بھی ان کے خرچ میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے اور اس روز جب اس کا رزلٹ آیا تھا تو تب بھی ماں نے کتنی باتیں سنائی تھیں۔

"لڑکا ہوتا تو آج چودہ پڑھ کر کسی نوکری سے لگ

جاتا۔ خوامخواہ کا خرچا کیا۔" اور اماں کے ساتھ وہ بھی اس افسوس میں بیٹھ گئی تھی کہ کاش ایک بھائی ہوتا جو ... اور اپنے متعلق تو ایک لمحہ کے لیے بھی اسے جاب کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

"کمال ہے۔" اس نے ایک بار پھر زیر لب کہا اور پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔ اور بہت انہماک سے ٹی وی دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا۔ یونہی آنکھیں موندے موندے اس نے تکیے کے پاس پڑا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک اور سگریٹ لینا چاہا لیکن ڈبا خالی ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور خالی ڈبا سائیڈ ٹیبل پر پڑی ٹرے میں پھینک دیا۔ اس ٹرے میں رات والے خالی برتن پڑے تھے اور وہ جانتا تھا کہ کوئی ٹرے لینے نہیں آئے گا جب تک وہ خود کسی کو بلاتا نہیں اس کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے ٹرے سے نظریں ہٹائیں جو سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھر چکا تھا۔

"تو یہ عینا بی بی تھیں۔ سحر جلال کی بہن اور بیگم راحت فراز کی بھتیجی ... سحر جلال ..." اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا اور جیسے اندر کئی زخموں کے ٹانکے کھل گئے۔

"تم کتنی بڑی اداکارہ تھیں سحر جلال لیکن میں تمہیں نہ جان سکا۔ شاید میں بہت بے وقوف تھا یا تم زیادہ بڑی اداکارہ" اس نے بیڈ سے پاؤں نیچے لٹکائے۔

وہ جو سمجھتا تھا کہ وہ سب کچھ بھول چکا ہے تو آج عینا کو دیکھ کر جس طرح زخموں کے ٹانکے کھلے تھے تو اس نے جانا تھا کہ وہ بھولا تو کچھ بھی نہیں تھا بس بھولنے کی سعی کرتا رہا تھا۔

اس نے بیڈ کے پاس پڑے سلیپر پہنے اور کھڑا ہو گیا جھک کر تکیے کے پاس پڑا والٹ اٹھایا اور جینز کی پاکٹ میں ٹھونس کر اس نے اپنے ماتھے پر بکھرے سلکی بالوں کو بائیں ہاتھ سے پیچھے کیا۔ قریب ہی جیسے کوئی ہولے سے ہنسا تھا۔

"تمہیں جب پتا ہے ارحم کہ یہ ابھی پھر تمہارے ماتھے پر بکھرے ہوں گے تو پھر خوامخواہ کیوں ہاتھوں کو تکلیف دیتے ہو۔"

"اوہ یہ آوازیں جانے کب میرا پیچھا چھوڑیں گی اف" اس نے غیر ارادی طور پر کانوں پر ہاتھ رکھے جیسے اپنی سماعتوں کو ان آوازوں سے بچانا چاہتا ہو لیکن وہ تو جیسے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی،

"ادھر میری طرف کیوں نہیں دیکھتے کیا دیکھنے کی تاب نہیں ہے" اور پھر نقرئی ہنسی جیسے دور کہیں کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

"ہاں نہیں تھی تاب۔ بالکل نہیں تھی تمہیں دیکھنے کی حالانکہ تمہاری طرف دیکھنا میرے لیے کسی عبادت سے کم نہ تھا" اس نے جھنجلا کر ہاتھ کانوں سے ہٹائے اور اپنے پیچھے زور سے انیکسی کا دروازہ بند کرتا ہوا تیز تیز چلتا گیٹ کی طرف بڑھا۔

"سلام چھوٹے صاحب۔" خدا بخش کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو بے اختیار اس نے رک کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"بیٹھیں بیٹھیں چاچا۔ کتنی بار کہا ہے آپ بزرگ ہیں ... مجھ سے بڑے ہیں میرے لیے مت کھڑا ہوا کریں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔"

خدا بخش نے ایک ممنونیت بھری نظر اس پر ڈالی۔

"خوش رہو۔ اللہ اتنی خوشیاں دے کر دامن تنگ ہو جائے۔"

ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"خوامخواہ اپنی دعائیں ضائع نہ کیا کریں۔ خوشیاں تو ارحم فراز سے اس طرح دور بھاگتی ہیں جیسے چوہا بلی کو دیکھ کر بھاگتا ہے"۔ اس نے سوچا اور اس تشبیہ پر خود ہی ہنس پڑا۔ خدا بخش نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ارحم کو اس طرح ہنستے ہوئے اس نے سالوں بعد دیکھا

تھا۔

"ارحم بیٹا اس بار واپس مت جانا۔ تمہارے ڈیڈی تمہیں بہت یاد کرتے ہیں ... انہیں تمہاری بہت ضرورت ہے بیٹا۔"

"اچھا" اس کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔

"آپ شاید بھول گئے ہیں چاچا انہوں نے آپ کے سامنے ہی کہا تھا۔ کہ ان کا صرف ایک بیٹا ہے صائم"۔ کسی تلخ یاد نے اندر کہیں ڈنک مارا تھا اور خدا بخش کو افسوس سا ہونے لگا تھا کہ اس نے ایسی بات کی ہی کیوں پھر بھی نرمی سے بولا۔

"غصے میں آگئے تھے باپ ہیں۔ تمہیں بھلانا اور یاد کرنا ان کے اختیار میں کب ہے۔ یہ جذبے تو فطری ہوتے ہیں"۔

"چاچا میں ذرا سگریٹ لینے جا رہا ہوں ... کمرے میں رات کے برتن پڑے ہیں اندر بھجوا دیجیے گا۔ اور آئندہ کوئی کھانا وانا اندر سے مت لائیے گا۔" خدا بخش کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہو بیٹا میں لے آتا ہوں۔"

"نہیں چاچا کہیں مسز راحت کو برا نہ لگ جائے"۔ اور وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ خدا بخش نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"پتا نہیں اس بچے کا دکھ کب کم ہو گا اتنے سال گزر گئے۔ آنکھوں سے اب بھی درد چھلکتا ہے"۔

خدا بخش کو ارحم سے بہت محبت تھی۔ وہ جب اس گھر میں آیا تھا تو ارحم صرف سات سال کا تھا اور ماں کی موت سے ڈرا ہوا اور دکھی۔ ہر وقت آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں۔ اکثر خدا بخش کے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اور وہ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہتا تھے ... اور محبت کا وہ تعلق جو تب ان کے درمیان بنا تھا اب بھی ویسا ہی مضبوط تھا خدا بخش کے لبوں سے ہمیشہ ارحم کے لیے دعائیں نکلتی تھیں چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتا۔

وہ بیٹھتے بیٹھتے رک گیا اور انیکسی کی طرف بڑھا۔ سائیڈ ٹیبل سے ٹرے اٹھاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

"پتا نہیں رات بھر میں کتنے سگریٹ پھونک ڈالے ہیں اور اب پھر لینے چل پڑے۔ یا اللہ اس بچے کی مسکراہٹیں اسے لوٹا دے۔" دل ہی دل میں دعا مانگتا وہ اندرونی گیٹ تک آیا اور دستک دے کر حمیدہ کو ٹرے پکڑایا۔

"دوپہر میں کھانا بھیج دوں چاچا"۔ حمیدہ نے یونہی پوچھ لیا حالانکہ عینا اسے بتا چکی تھی۔

"نہیں ارحم صاحب نے منع کیا ہے"۔

"ارے باپ کا گھر ہے کون سا بیگم صاحبہ سب میکے سے لائی ہیں۔ حق ہے ارحم صاحب کا۔ میں ہوتی صاحب کی جگہ تو دھڑلے سے آتی رہتی کھاتی پیتی۔"

حمیدہ نے اپنی طرف سے بہت آہستگی سے بات کی تھی لیکن اس کی یہ آہستہ آواز بھی لاؤنج میں بیٹھی عینا نے بہت صاف سنی تھی۔ اور سوچا تھا کہ پھپھو بے شک بہت اچھی ہیں لیکن کہیں نہ کہیں انہوں نے ارحم بھائی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے یعنی وہ اچھی اسٹیپ مدر ہرگز نہیں ہیں ... ورنہ ارحم بھائی ایسے تو نہیں تھے۔

یوں اتنے تلخ اور سخت تو کیا سحر آپی ... اس کی وجہ سحر آپی ہیں۔ اور وہ سحر آپی سے محبت بھی تو بہت کرتے تھے۔ اور سحر آپی وہ تو جیسے ان کے عشق میں مبتلا تھیں۔ یکے بعد دیگرے کئی مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئے۔ جب وہ یہاں آئی تھی اور ارحم نے اسے بہت گھمایا تھا۔ ہر جگہ وہ سحر کے ساتھ اسے لے کر گیا تھا۔ اور اس سے باتیں کرتے اسے گھماتے پھراتے ہوئے بھی اس کی نظریں صرف سحر کو دیکھتی تھیں۔ اور سحر وہ تو جیسے ارحم کے سنگ چلتے ہوئے ہواؤں میں اڑتی تھی۔

کتنی ہی بار اس نے عینا سے پوچھا تھا

"عینا تمہیں ارحم کیسا لگتا ہے۔"

"ارحم بھائی بہت اچھے ہیں"۔ وہ تو صرف دو بار ملنے کے بعد ہی اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔

"مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ عینا تو میرے لیے دعا کیا کر۔"

"کیا دعا آپی کہ تم ارحم بھائی کی دلہن بن جاؤ"۔

"ہاں" سحر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیتی۔

اور اس نے ان دونوں کتنی دعائیں کی تھیں ارحم اور سحر کے لیے لیکن اس کی دعائیں قبول نہیں ہوئی تھیں اور یہ خرم شہزادو نہ جانے کہاں سے آکر انہیں دلہن بنا کر لے گیا تھا اور وہاں اس بڑے ہال میں ارحم کہیں نہیں تھا۔ کتنا ڈھونڈا تھا اس نے اسے۔ اور راحت پھپھو سے بھی پوچھا تھا۔

"پتا نہیں" راحمت پھپھو بے حد مصروف تھیں۔ تب اس نے صائم کو تلاش کیا تھا۔ "صائم ارحم بھائی کہاں ہیں"۔ صائم نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں کیا کام ہے ارحم بھائی سے" "بس ایسے ہی پوچھا تھا۔" "پتا نہیں کیوں اپنے سے دو سال چھوٹے صائم سے آج دوسری بار ملتے ہوئے بھی وہ مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے کیمرے سے اس کی تصویر بنائی تھی۔

"میری تصویر کیوں بنائی ہے تم نے" وہ ارحم بھائی کو بھول کر صائم سے پوچھ رہی تھی۔

"میری مرضی؟" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

وہ ساڑھے سات سال کی عمر میں جتنا بااعتماد اور بے نیاز لگا تھا اسے، آج بھی ایسا ہی تھا۔ بارہ سال کی عمر میں۔

"میں اپنے ماموں کی بیٹی کی تصویر بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ کیا اس میں کوئی حرج ہے۔" اور وہ سٹپٹا کر بغیر جواب دیئے مڑ کر اماں کو ڈھونڈنے لگی تھی۔

"ویسے وہ آئے نہیں گھر پر ہی ہیں شاید اپنے کمرے میں۔" اس نے اسے وہاں ہی سے آواز دے کر بتایا تھا۔ شاید ان کی طبیعت خراب ہو۔ اس وقت وہ یہ نہیں جان سکی تھی کہ ارحم اپنی محبت کے بچھڑ جانے کے دکھ سے گزر رہا ہو گا۔ اس نے سحر کو خوش دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ ارحم بھی خوش ہو گا لیکن ارحم خوش نہیں تھا۔ وہ جب سحر کی رخصتی کے بعد گھر آئے تھے تو اس نے ارحم کو دیکھا تھا لان میں دسمبر کی اس سرد رات میں صرف پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ سردی کے احساس سے بے نیاز بیٹھا تھا۔ اس کے بال اس کی پیشانی پر بکھرے تھے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"ارحم بھائی" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی ارحم نے نظریں اٹھائی تھیں۔ وحشت بھری نظریں۔ اور لحہ بھر وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا پھر یکدم اٹھا تھا اور تیز تیز چلتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ وہ حیران سی وہاں ہی کھڑی رہ گئی تھی۔

یہ ارحم بھائی کو کیا ہوا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ ارحم بھائی سے اپنی وہ پہلی ملاقاتیں یاد آئی تھیں۔ وہ شفقت، محبت۔ پھر اس کے بعد اس نے ارحم کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دیکھتی بھی کیسے وہ کبھی پھر پھپھو کے گھر آئی ہی نہیں تھی۔ اس روز صبح سویرے ہی وہ ماموں مامی اور اماں کے ساتھ گاؤں چلی آئی تھی۔ پھپھو اب بھی پہلے کی طرح دو تین ماہ بعد گاؤں کا چکر لگاتی تھیں۔ انہیں اماں کا اور اس کا بہت خیال رہتا تھا۔ اور وہ جب بھی گاؤں آتیں اسے ایک بار تو ضرور ساتھ چلنے کو کہتی تھیں۔ سحر بھی شادی کے بعد دو تین بار اماں سے ملنے آئی تھی اور ہر بار ہی اس نے ان کے چہرے پر کسی دکھ کو کھوجنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ان کے چہرے پر کسی دکھ کی پرچھائیں نظر نہ آئی تھی۔

"کیا آپ کو ارحم بھائی یاد نہیں آتے۔ کیا آپ خوش ہیں۔"

"ہاں نا خوشی والی کیا بات ہے اور ارحم مجھے کیوں یاد نہیں آئے گا بھلا۔ اتنا عرصہ ایک ہی گھر میں رہے ہیں۔ صائم پھپھو تم اور اماں سب ہی یاد آتے ہیں مجھے۔"

اور جب تک وہ فرانس نہیں گئی۔ ہر بار جب وہ ملی وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی تھی لیکن سحر اسے ہمیشہ ہی بہت خوش اور مطمئن لگی تھی۔ لیکن یہ ارحم، پھپھو نے کبھی ارحم کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ بس ایک بار بتایا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہوتا ہے۔ اور

ایک بار جب ماں نے پوچھا تھا کہ وہ ارحم کی شادی کہاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اور ماں کو تو اس روز سے ہی کرید لگی تھی جب سے انہوں نے سحر کی شادی میں ان کا شاندار گھر دیکھا تھا۔

اور تب راحت پھپھو نے بتایا تھا کہ ارحم نے تو شاید وہاں ہی امریکہ میں شادی کرلی ہے کسی میم سے۔ تب ماں کے چہرے پر چھائی مایوسی دیکھ کر اسے بے حد کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔ کب سے وہ اماں کے پیچھے پڑی تھیں کہ ان کی کسی بیٹی سے وہ ارحم کی شادی کروادیں۔ اور پھر اتنے سالوں میں کبھی اس نے ارحم کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ہولے ہولے وہ خود بھی بھول گئی تھی۔ اور اگر آج ارحم کو وہ نہ دیکھتی تو اسے ارحم کے متعلق کچھ بھی یاد نہ آتا۔ اس نے بہت بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اور اٹھ کر کچن میں آگئی۔ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی حمیدہ کو کچن میں کام کرتے دیکھتی رہی۔ حمیدہ نے کاؤنٹر صاف کرتے ہوئے اسے مڑ کر دیکھا۔

"کچھ چاہیے تھا بی بی؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا اور واپسی کے لیے مڑی لیکن پھر مڑ کر حمیدہ کی طرف دیکھا۔

"حمیدہ یہ ارحم بھائی کی بیوی نہیں آئیں پاکستان۔"

"ارحم صاحب کی بیوی؟" حمیدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں ان کی بیوی وہ اکیلے آئے ہیں نا۔ کیا پہلے بھی اکیلے آتے ہیں اور ان کے بچے۔"

"انہوں نے تو شادی ہی نہیں کی" حمیدہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"لیکن میں نے سنا تھا کسی میم سے"۔ عینا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ایک بار ایک میم آئی تھیں یہاں بڑی خوبصورت تھیں۔ یہ نیلی نیلی آنکھیں سونے جیسے بال۔۔۔ ہر وقت ارحم صاحب کے آگے پیچھے ہوتی رہتی تھیں۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی ان کی نظریں صاحب پر ہوتی تھیں کھاتی کم ارحم صاحب کو زیادہ دیکھتی تھیں۔" وہ ہنسی۔

"بڑے صاحب نے پوچھا تھا۔ شادی کا لیکن ارحم صاحب نے کہا یہ صرف میری دوست ہے اور پاکستان دیکھنے آئی ہے۔ صاحب نے تو زور بھی دیا تھا لیکن ارحم صاحب نہیں مانے"۔

"کیوں"۔ بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"میں تو تب ادھر کام نہیں کرتی تھی عینا بی بی۔۔۔" حمیدہ نے بات ادھوری چھوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"پر کیا؟" عینا نے بے چینی سے پوچھا۔

وہ میری بھرجائی کام کرتی تھی ادھر اس نے بتایا تھا مجھے ارحم صاحب کا چکر تھا کسی کے ساتھ ادھر شادی نہیں ہو سکی تھی ان کی۔ مرتے مرتے بچے تھے بڑی حالت خراب ہو گئی تھی۔ مہینوں ہسپتال میں رہے تھے۔ سنا ہے بڑی لڑائی ہوئی تھی تب بڑے صاحب اور بیگم صاحب کی۔ صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا تھا کہ انہیں پتا تھا اس عشق و معشوق کا تو۔ انہوں نے بتایا کیوں نہیں"۔

عینا نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا لیکن ظاہر ہے وہ اس کا انداز گفتگو بدل نہیں سکتی تھی۔ سو اپنی ناگواری کا اظہار کیے بغیر اس نے پوچھا۔

"کون تھی وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ لڑکی جس سے ارحم بھائی شادی کرنا چاہتے تھے۔" اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"پتا نہیں جی، مجھے نہیں پتا کون تھی وہ لیکن جی کوئی بھی تھی اس نے ارحم صاحب کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ بھرجائی کہتی تھی ارحم صاحب ہسپتال سے آکر ملک سے ہی باہر چلے گئے تھے اور چار سال بعد آئے تھے جب بڑے صاحب کا دل کا آپریشن ہوا تھا۔"

حمیدہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ جانتی تھی وہ لڑکی سحر آپی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سحر آپی وہ ۔۔۔وہ۔

وہ یکدم ہی کچن کے پاس سے ہٹ کر لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اور وہاں کھڑے کھڑے ہی اس نے چھوٹا گیٹ کھلتے اور پھر ارحم کو اندر آتے دیکھا۔ اس نے رک کر خدابخش سے کوئی بات کی تھی۔ اور پھر سر جھکائے پچھلے لان کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ وہ اندرونی گیٹ کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ یہ برآمدہ تھا۔ برآمدے کی چار سیڑھیاں پورچ کی طرف اور چار سیڑھیاں لان کی طرف تھیں۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑے کھڑے بھی نظر اٹھاتا تو اس کی نظر عینا پر ضرور پڑتی لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے بائیں طرف پورچ میں سر جھکائے گزرتا چلا گیا تھا۔ اس وقت پورچ میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے جان بوجھ کر نظر نہیں اٹھائی تھی۔ اسے گیٹ میں داخل ہوتے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ وہاں کھڑی ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ اسے یقیناً "دیکھنا اور اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ کیونکہ سحر آپی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا اور وہ سحر آپی کی بہن تھی۔ اس نے پتا نہیں کیوں خود ہی سوچ لیا تھا کہ بے وفائی سحر آپی نے کی ہوگی۔ اس کا کتنا دل چاہ رہا تھا ارحم سے بات کرنے کا۔۔۔ لیکن وہ بے حد افسردہ سی ہو کر سیڑھیاں اتر کر لان میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

انیکسی کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ رکا۔

اور پھر یکدم واپس مڑا اسے یاد آیا تھا کہ اس نے خدابخش سے ڈیڈی کے متعلق تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کب تک واپس آرہے ہیں۔۔۔ وہ یہاں صرف ڈیڈی کی خاطر آتا تھا۔ جب وہ چار سال بعد ان کی بیماری کا سن کر آیا تھا تو اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ان سے رابطے میں رہے گا اور چکر لگاتا رہے گا۔ آئی۔ سی۔ یو میں ڈیڈی کے پاس بیٹھے بیٹھے اس کا دل گداز ہوتا رہا تھا۔ اور وہ وعدہ کرتے ہوئے نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وعدے پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ مہینوں گزر جاتے وہ فون نہ کرپاتا۔ پھر فراز خان کا خود ہی فون آجاتا وہ گلہ کرتے فون نہ کرنے کی شکایت کرتے اور جواب میں وہ یہ بھی نہ کہہ پاتا کہ ان گزرے مہینوں میں انہوں نے خود کتنی بار اسے فون کیا تھا۔ معذرت اور مصروفیت چند جملوں کا تبادلہ اور بس۔ اور اب بھی ان گزرے دو سالوں میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار بار اس کی بات ہوئی تھی اور اب اچانک ہی اس کا دل گھبرایا تھا۔۔۔ ان دنوں وہ یو۔اے۔ای میں تھا۔ گورنمنٹ کنسلٹنٹ انجینئر۔

آخری بار جب اس کی فراز خان سے بات ہوئی تھی تو وہ نیویارک میں تھا۔ اور اس بات کو سال ہونے والا تھا۔ پتا نہیں ڈیڈی کیسے ہوں گے کہیں بیمار نہ ہوں۔ ہارٹ پیشنٹ تو ہیں ہی۔۔۔ اور اس نے پاکستان آنے کا ارادہ کیا اور پھر بغیر اطلاع کے آپہنچا۔ کم از کم وہ آنے سے پہلے فون کرلیتا تو اسے پتا تو چل جاتا کہ ڈیڈی گھر پر نہیں ہیں تو وہ کچھ دنوں بعد آجاتا۔۔۔ خوامخواہ میں چھٹی لیتے ہوئے باس سے بھی جھگڑ بیٹھا تھا۔ باس چاہتا تھا کہ وہ دو ہفتے بعد چھٹی پر چلا جائے بے شک اس کی چھٹی ڈیو ہے لیکن فی الحال کچھ کام ہے۔۔۔ لیکن وہ تو یوں ہی اس برطانوی باس سے خار کھاتا تھا سو بھڑک اٹھا تھا۔۔۔ خیر۔۔۔

خدابخش کے قریب پہنچتے ہوئے اس نے کندھے اچکائے۔ خدابخش سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ڈیڈی کے پروگرام کا آپ کو کچھ پتا ہے چاچا کب تک آئیں گے۔"

"مجھے تو نہیں پتا لیکن پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔ کیونکہ میں نے سنا تھا بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ اتنے دنوں وہ عینا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتیں۔"

"اچھا" اس نے مڑتے ہوئے نظریں اٹھائیں وہ لان میں کرسی پر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے افسوس ہوا اس نے سوچا وہ اس سے اپنے رویے کے لیے معذرت کرلے۔ یہ اتنی افسردہ لگ رہی ہے یقیناً "میں نے اسے ہرٹ کیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ چھوٹی سی بچی آگئی تھی جو بہت اشتیاق سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی تھی اور کوئی نئی بات جان کر اس کی آنکھیں چمک اٹھتی

تھیں۔ جوانی ماں سے ڈرتی تھی اور جسے اپنی اماں سے بہت محبت تھی اور وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر شہر نہیں آنا چاہتی تھی۔ کبھی بھی نہیں لیکن اب آگئی تھی اس کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"محبتوں کے سارے دعوے دھرے رہ جاتے ہیں جب سامنے یہ شاندار گھر سہولتیں اور عیاشیاں ہوں۔"

وہ عینا کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ دھوپ اس کے کندھوں اور بازوؤں پر اور دائیں رخسار پر پڑ رہی تھی لیکن وہ بے نیاز سی بیٹھی تھی۔

"یہ لڑکیاں ہوتی ہی اس قابل ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہیے ورنہ سر پر چڑھ جاتی ہیں۔"

وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا انیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے لیے کافی بنا کر جب وہ بیڈ پر بیٹھا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں بہت سال پہلے جب وہ نو سال کا تھا تو یونہی عینا کی طرح دھوپ سے بے نیاز کرسی پر بیٹھا تھا جب ڈیڈی چپکے سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔

"روی بیٹا میری جان یہاں کیوں بیٹھے ہو دھوپ میں۔"

اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہوا میری جان تم روئے تھے۔ کسی نے کچھ کہا" وہ تڑپ اٹھے تھے۔ اس نے نفی میں سرہلایا تھا۔

"نہیں"

"پھر کیا ہوا ماما یاد آرہی ہیں"

اس نے سرہلا دیا تھا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتا تھا وہ ماما کو بھولتا ہی کب تھا۔ وہ تو اسے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے چلتے پھرتے ہر وقت یاد آتی تھیں۔ کتنی اچھی تھیں کتنی محبت کرتی تھیں وہ۔

"ادھر آؤ بیٹا میرے پاس" وہ اٹھ کر ان کے پاس آکھڑا ہوا تھا اور ان سے لپٹ کر وہ بری طرح رو پڑا تھا۔

"ڈیڈی آپ شادی کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی اور ماما نہیں چاہیے۔۔۔ میری ماما تو بس وہی تھیں" اور وہ بھونچکے سے رہ گئے تھے۔

"تمہیں کس نے بتایا"

"سب کہہ رہے ہیں آپ میری خاطر شادی کر رہے ہیں۔۔۔ اور جو نئی ماما ہوں گی وہ اچھی نہیں ہوں گی۔۔۔ وہ مجھے میری ماما کی طرح پیار بھی نہیں کریں گی اور ماریں گی بھی"۔ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"دوسروں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے میری جان میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا"۔

"تو آپ شادی نہیں کریں گے نا"۔

"نہیں" وہ مسکرائے تھے۔

"کبھی بھی نہیں"۔ اس نے یقین دہانی چاہی تھی۔

"ہاں کبھی بھی نہیں"۔

"پرامس"۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"پرامس ہم دونوں باپ بیٹوں کو کسی کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ہم دونوں تاعمر اکیلے رہ سکتے ہیں۔"

انہوں نے وعدہ کیا تھا لیکن وعدوں کا کیا ہے وہ تو یوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ جیسے پانی کے بلبلے بنے اور ختم۔

وعدے تو اس نے بھی کیے تھے بہت سارے عمر بھر ساتھ چلنے کے ایک ساتھ جینے مرنے کے لیکن کیا ہوا سارے وعدے بھلا کر چل دی اور کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ خالی جھولی پھیلائے آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ ڈیڈی بھی وعدے بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا وہ دونوں عمر بھر اکیلے رہ سکتے ہیں لیکن وہ نہیں رہ سکتے تھے اور راحت آنٹی سے شادی کرلی تھی۔ وہ ابھی آٹھویں کلاس میں تھا۔ اسے برا تو لگا تھا کہ راحت آنٹی اس کی ممی کے بیڈ روم میں رہیں۔ اور اس کے پاپا کو شیئر کریں۔ لیکن بہرحال راحت اسے اتنی بری بھی نہیں لگی تھیں کہ وہ ڈیڈی سے ناراض ہوتا اور احتجاج کرتا۔ راحت کا رویہ اس کے ساتھ کافی اچھا تھا۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ شروع شروع میں ان کا اس طرح خیال رکھنا اور اتنا مہربان ہونا عجیب لگتا تھا لیکن پھر وہ ہولے ہولے ان کا عادی ہو گیا تھا۔ اور اس نے انہیں ممی کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور جب صائم پیدا ہوا تھا تو وہ صائم کے ساتھ کافی الجھ

ہو گیا تھا۔ لیکن یہ عورتیں اف کس قدر دوغلی ہوتی ہیں۔ کیسے ہزار چہرے ہوتے ہیں ان کے۔ اور اصل چہرہ ہزاروں چہروں کے پیچھے چھپا۔ اس نے اپنے اندر تلخی پھیلتی محسوس کی اور ٹھنڈی کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

☆ ☆ ☆

"پھپھو" عینا نے اپنی پلیٹ میں چکن پیس رکھتے ہوئے بیگم راحت فراز خان کی طرف دیکھا۔ آج ڈنر پر وہ اس کے ساتھ تھیں۔ اور حسب معمول اتنی لمبی چوڑی ڈنر ٹیبل پر وہ دونوں تھیں۔

"ارحم بھائی بھی یہاں نہیں ہوتے اور صائم بھی آپ کا دل نہیں گھبراتا۔"

"صائم کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے گڑیا لیکن اس کے فیوچر کے لیے یہ جدائی تو برداشت کرنی پڑے گی۔ ویسے ہم ہر سال اس سے ملنے جاتے ہیں۔۔۔ کبھی وہ بھی آجاتا ہے۔ تین سال سے کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ اے لیول کے بعد چلا گیا تھا۔"

"کیا وہ اب بھی ایسا ہی ہے پڑھاکو سا۔"

اس کے ذہن میں صائم اب بھی ویسا ہی تھا بے نیاز سا یا تو کمرے میں گھسا پڑھتا رہتا یا کمپیوٹر پر گیمز کھیلتا رہتا تھا۔

بیگم راحت مسکرادیں۔ صائم کا ذکر کرتے ہوئے ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہاں وہ بچپن سے ہی اپنی پڑھائی کے متعلق بہت سیریس تھا۔

"اور ارحم بھائی۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا بیگم راحت نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سلاد اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے لاپروائی سے بولیں۔

"اسے کبھی بھی پڑھائی سے لگاؤ نہیں رہا۔ اسکول میں ہی اس کی صحبت برے لڑکوں کے ساتھ تھی۔۔۔ سگریٹ پینا اور رات گئے تک آوارہ گردی کرنا۔۔۔ فراز تو بہت پریشان رہتے تھے اس۔ کے لیے اتنا سمجھاتے تھے لیکن۔۔۔"

اور عینا کو بے حد حیرت ہوئی جب وہ اس کے گاؤں آیا تو اس نے یا شاید سحر نے بتایا تھا کہ وہ انجینئر بن رہا ہے یا بن چکا ہے۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ پھر۔۔۔

بیگم راحت نے بغور اسے دیکھا اور چکن کا ایک اور چھوٹا پیس اس کی پلیٹ میں رکھا۔

"باپ بیٹے میں ہمیشہ پڑھائی کے لیے ہی تو جھگڑا رہتا تھا۔ بلکہ اب بھی فراز کو افسوس ہوتا ہے۔"

"پھپھو پلیز" وہ چونکی۔

"اور نہیں میں نے چکن لے لیا تھا پہلے ہی"

"یہ بہت زبردست ہے یار کھاؤ"

وہ ہمیشہ ایسی ہی بے تکلفی سے بات کرتی تھیں۔

"تو کیا ارحم بھائی اس لیے گھر میں نہیں آتے کہ انکل سے ناراض ہیں۔" وہ بہت متجسس ہو رہی تھی اور پتا نہیں کیوں ارحم کے متعلق ہر بات جاننا چاہتی تھی۔ اس روز کے بعد سے اس نے ارحم کو نہیں دیکھا تھا پتا نہیں وہ کب باہر نکلتا تھا۔ ہاں رات میں انیکسی کی لائیٹ جلتی وہ اپنے کمرے کی گیلری سے دیکھتی تھی۔

بیگم راحت نے اس کی آنکھوں سے جھانکتے تجسس کو واضح طور پر محسوس کیا۔

"فراز اس کے لیے دکھی ہوتے ہیں اس کی حرکتوں پر لیکن بیٹا ہے ناراض تو نہیں رہ سکتے اس سے۔۔۔ وہ خود ہی نہیں آتا موڈی ہے۔"

انہوں نے کانٹے کی مدد سے تھوڑا سا مزید سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ وہ بہت ڈائیٹ کونشس تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے چکن کے ایک چھوٹے پیس اور سلاد کے سوا کچھ نہیں لیا تھا۔

"بلاوجہ ہی خفا ہو گیا ہے ہم سے۔ کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا فراز نے اجازت نہیں دی۔"

"کون تھی وہ پھپھو اور انکل نے اجازت کیوں نہیں دی۔"

"تھی کسی گھٹیا خاندان کی۔ پتا نہیں کہاں ملا تھا اسے۔ پھر بھی تمہارے انکل اس کی بات ماننے کو تیار تھے لیکن وہ تو کوئی بہت ہی لالچی لوگ تھے۔ کروڑوں کا

مطالبہ کردیا۔ کوٹھی فیکٹری سب نام کروانا چاہتے تھے۔"

اور عینا نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ کتنا بوجھ تھا اس کے دل پر۔ جب سے اس نے ارحم کو دیکھا تھا بار بار اسے خیال آتا تھا۔ ارحم کی اس حالت کی ذمہ دار سحر ہی ہے۔

تو وہ جو سحر ارحم سے شادی کی اور محبت کی باتیں کرتی تھی تو وہ شاید سب یک طرفہ تھا۔ سحر کی اپنی سوچ اور خواہش۔ اور وہ جو سمجھتی تھی کہ سحر اور ارحم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے غلط تھا۔ اور سحر تو اپنی شادی سے بہت خوش تھی یعنی وہ اور اس کی باتیں محض وقتی تاثر تھا۔ اب وہ بے حد رغبت سے چکن کھارہی تھی۔

"تو تمہارے انکل یہ سب نہیں کرسکتے تھے بس اسی بات پر لڑائی رہتی تھی اس کی اپنے باپ سے۔ اور پھر۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑدی۔

"پھر کیا؟" کھاتے کھاتے اس نے بیگم راحت کی طرف دیکھا۔ "ڈرنک کرنے لگا تھا۔ خود فراز نے اس کے کمرے میں شراب کی بوتلیں دیکھی تھیں۔"

"کیا۔؟" نوالہ عینا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا

"کیا ارحم بھائی شراب پیتے ہیں"۔

اسے شراب پینے والوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ راحت بیگم نے اس کی آنکھوں سے جھلکتے خوف کو صاف محسوس کیا اور ایک مبہم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آکر معدوم ہوگئی۔

"محتاط ہی رہنا اگر کبھی گھر کے اندر آئے بھی تو زیادہ بات چیت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کی کوئی اخلاقی اقدار تو ہوتی نہیں ہیں بارہ سالوں سے یورپ امریکہ میں رہ رہا ہے جانے کیا کیا برائیاں پیدا ہوگئی ہوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تو کے جاؤ میں اب آرام کروں گی تھک گئی ہوں"۔ عینا نے سرہلادیا۔ وہ ساکت بیٹھی تھی ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ وہ کسی گہرے دکھ کے حصار میں گھری بیٹھی تھی۔

ارحم شراب پیتا ہے۔ وہ اچھا نہیں ہے۔ اس میں اخلاقی برائیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں بہت تکلیف دہ تھیں اور وہ ان پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بھلا پھپھو جھوٹ کیوں بولیں گی۔ جہاں یہ جان کر دل پر دھرا بوجھ کم ہوا تھا کہ وہ لڑکی جس سے ارحم نے محبت کی سحر نہیں تھی۔ وہاں دل میں دکھ کا ایک کانٹا سا گڑ گیا تھا جو مسلسل چبھ رہا تھا اور تکلیف دے رہا تھا۔ کاش ارحم بھائی ایسے نہ ہوتے وہ جو بہت رغبت سے کھارہی تھی بچا ہوا چکن پلیٹ میں ہی چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی اور حمیدہ کو ٹیبل سمیٹنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

☆ ☆ ☆

کس سے کہوں کہ آج میرے ساتھ آکے پی۔
اتریں گے کس حلق سے یہ دلخراش گھونٹ

کس سے کہوں کہ آج میرے ساتھ آکے پی۔

آواز بھاری تھی اور اس میں سوز تھا۔ باہر سے گزرتی عینا نے سنا تو ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ پچھلے لان کی طرف لیموں توڑنے آئی تھی۔ لیموں توڑنے کا تو بہانہ تھا اندر کمروں میں اس کا دل گھبراتا تھا۔ نہ آسمان نظر آتا نہ سورج اور چاند دکھائی دیتا دن کے وقت بھی کمروں میں لائٹیں جلتی رہتی تھیں کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے رہتے تھے ہاں سن روم کی کھڑکیوں سے صبح صبح پردے ہٹادیے جاتے تھے تو روشنی اندر آجاتی تھی کبھی کبھی حمیدہ شیشے والی کھڑکی کھول دیتی تھی تو گرل میں سے ہوا کا جھونکا بھی آجاتا تھا۔ وہ کھلے کمروں میں رہنے کی عادی تھی اس لیے بہانے بہانے آسمان دیکھنے اور دھوپ کو محسوس کرنے کے لیے باہر آجاتی تھی۔ اب بھی حمیدہ نے رفیق سے کہا تھا کہ وہ لیموں توڑلائے سلاد کے لیے اور وہ رفیق کو منع کرکے خود باہر آگئی تھی۔

کس سے کہوں کہ آج میرے ساتھ آکے پی

آواز پھر عینا کے کانوں میں آئی تو اسے لگا جیسے یہ آواز کھڑکی سے آرہی تھی۔ یہ کھڑکی انیکسی کے لاؤنج یا

بیڈ روم کی طرف تھی۔ اور کھلی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی کے قریب آکر اندر جھانکا بالکل سامنے صوفے پر ارحم آنکھیں موندے صوفے کی پشت پر سر رکھے گنگنا رہا تھا۔

کس سے کہوں کہ آج

گنگناتے ہوئے وہ سیدھا ہوا اور اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر ٹیبل سے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔ ارحم ڈرنک کررہا تھا۔ اس نے کبھی شراب نہیں دیکھی تھی لیکن یہ ضرور شراب ہوگی اس نے سوچا۔ اسے ٹیبل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ضرور ٹیبل پر شراب کی بوتل بھی ہوگی۔ اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر دیکھنے کی کوشش کی۔ عین اسی لمحے ارحم نے کھڑکی کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بے حد سرخ ہورہی تھیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا اور وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ پیچھے کوئی پتھر پڑا تھا شاید جس سے ٹھوکر لگی تو وہ سی کرکے ایک دم زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھوں سے بے اختیار پاؤں کو دبایا تو پھپھو صحیح کہتی تھیں۔

اس نے سوچا اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ارحم کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ پاؤں کی تکلیف بھلا کر تیزی سے اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی اندرونی گیٹ تک آئی اور پھولے سانسوں کے ساتھ جب وہ اندر آئی تو سن روم میں صوفے پر ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے آواز دے کر حمیدہ کو بتایا کہ وہ رفیق کو لیموں توڑنے کے لیے بھیج دے۔

کیسا عجیب سا چہرہ ہورہا تھا ارحم بھائی کا۔ سوجا ہوا ستا سا اور آنکھیں کتنی سرخ ہورہی تھیں لگتا ہے پوری رات ڈرنک کرتے رہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے انہیں سمجھایا نہیں۔ منع نہیں کیا۔ جب انہوں نے پہلی بار شراب پی تھی تو اس وقت اگر انکل فراز اور پھپھو انہیں پیار سے محبت سے سمجھاتے تو وہ ضرور ان کی بات مان لیتے یقیناً" باہر کسی دوست نے انہیں یہ لت لگادی ہوگی لیکن انکل فراز نے پیار سے سمجھانے کے بجائے ڈانٹا ہوگا اور پھپھو ان کے پاس کہاں اتنا وقت ہوگا ہاں ان کی اپنی مما ہوتیں تو ضرور سمجھاتیں نو سال کی عمر میں ذہن میں بننے والا ارحم کا نقش اتنا مضبوط تھا کہ اسے ارحم کا یہ روپ پسند نہیں آرہا تھا۔ نو سال کی عمر میں پہلی بار اماں اور سحر کے علاوہ کسی نے اس سے اتنی شفقت اور محبت سے بات کی تھی۔ اور وہ ان سترہ سالوں میں کبھی بھی ارحم کو بھول نہیں سکی تھی۔

"عینا بی بی وہ بیگم صاحبہ کا فون آیا ہے آپ لنچ پر ان کا انتظار نہ کریں۔ ڈنر پر ہی آئیں گی۔" حمیدہ نے آکر کہا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" اور اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔

جب سے وہ آئی تھی راحت بیگم لنچ پر کم ہی آتی تھیں۔ بیگم راحت گھر پر نہیں تھیں اگر وہ ارحم کے لیے کھانا بھجوادے یا پھر ان سے کہے وہ کھانا اندر آکر ہی کھالیں تو یوں بھی اکیلے اسے اپنے لیے ٹیبل لگوانا عجیب سا لگتا تھا سو اکثر ہی لنچ گول کرجاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا انکار کردیں گے تو کردیں۔

"جب انہوں نے کھانا کھانے سے منع کیا ہوگا تو یہاں سے کس نے اصرار ہی نہیں کیا ہوگا۔" دل میں پختہ ارادہ کرکے وہ اٹھی اور کچن میں آکر رفیق سے کہا۔

"رفیق ارحم صاحب سے جاکر پوچھو وہ لنچ ہمارے ساتھ کریں گے یا انیکسی میں بھجوادوں۔" سلاد بناتے رفیق نے اور برتن سمیٹتی حمیدہ نے بیک وقت حیرت سے اسے دیکھا۔

"بڑے صاحب یہاں نہ ہوں تو ارحم صاحب اندر نہیں آتے۔"

"اگر ایک دوبارہ وہ نہیں آئے تو آپ لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ کبھی نہیں آئیں گے۔"

"جی ٹھیک ہے' میں پوچھتا ہوں۔" رفیق چھری رکھ کر صافی سے ہاتھ پونچھتا ہوا باہر چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ منہ لٹکائے واپس آگیا۔

"جی ارحم صاحب نے کہا ہے شکریہ مجھے اپنی عادتیں خراب نہیں کرنی۔ تمہاری عینا بی بی نے ہمیشہ

یہاں نہیں رہنا۔" عینا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ رفیق کندھے اچکاتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر ٹی وی دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کچن میں آئی حمیدہ فارغ ہو چکی تھی۔

"بی بی کھانا کب لگاؤں۔"

"میں ہاتھ لے کر آتی ہوں' تم پہلے کھانا ارحم صاحب کو بھجوا دو۔۔ ویسے کیا پکا ہے۔"

"بھنا ہوا گوشت ہے اور شوربے والا چکن ہے۔ ارحم صاحب کو یہ دونوں بہت پسند ہیں۔" رفیق کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ "جب وہ باہر نہیں گئے تھے تو فرمائش کرکے گوبھی گوشت پکوایا کرتے تھے۔"

"پر وہ تو اب اپنا ہی پکاتے ہیں انگریزی کھانے ڈبوں میں بند کے پکائے اور وہ نوڈلز اور اسپیگھٹی وغیرہ۔" حمیدہ نے بھی رائے دینا ضروری سمجھا تھا۔

"ٹھیک ہے نہ کھانا ہوا تو واپس کردیں گے۔ تم بھجوا دو۔" عینا کہہ کر کمرے میں آگئی تھی اور جب وہ لنچ کے لیے آئی تو حمیدہ نے بتایا کہ ارحم صاحب نے کھانا رکھ لیا تھا اور ساتھ ہی دوبارہ بھجوانے سے منع کیا تھا۔ عینا کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"ویسے بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی۔" حمیدہ نے پانی کی بوتل ٹیبل پر رکھتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

"تو۔" عینا نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ضروری ہے کہ تم ساری رپورٹ دو۔ جب تم انہیں یہ نہیں بتاتی ہو کہ تم نے اور رفیق نے دودھ اور جوس کے کتنے گلاس پیے ہیں۔ گیارہ بجے نگٹس تمپورا اور ٹینڈر پیس اکثر فرائی کرکے کھاتی ہو۔ فروٹ جو آتا ہے اس میں سے آدھا تمہارے کوارٹر میں چلا جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ بتانا بھی ضروری نہیں' یوں بھی ارحم بھائی کا اس گھر پر اتنا ہی حق ہے جتنا پھپھو کا۔" حمیدہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"وہ جی۔۔ عینا بی بی۔ وہ تو آج میرا دل گھٹ گیا تھا تو میں نے تمپورا فرائی کیا تھا اور ایک سیب کھا لیا تھا اور دودھ تو جی رفیق پیتا ہے روزانہ۔" عینا نے جواب دیے بغیر اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا حمیدہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر شرمندہ شرمندہ سی وہاں سے چلی گئی۔

"ہاں جی صحیح کہتی ہیں آپ' نوکر عیش کررہے ہیں اور جو گھر کا مالک ہے وہ ابلے ہوئے کھانے کھائے یہ کہاں کا انصاف ہے جی۔" رفیق کا انداز سراسر خوشامدی تھا۔ اس نے توجہ نہ دی۔ وہ یہاں ہمیشہ کے لیے تو نہیں آئی تھی نا۔۔ اماں نے بے شک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اسے جلد بلالیں گی' لیکن بہرحال اس نے اپنے دل میں عہد کررکھا تھا کہ اسے واپس جانا ہے۔

کھانا کھا کر وہ کمرے میں آئی تو اس کا موڈ بہت اچھا تھا۔ گاؤں سے آنے کے بعد پہلی بار وہ خوشگوار موڈ میں تھی۔ ارحم نے کھانا واپس نہیں کیا تھا۔ ارحم نے کھانا کھالیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اچھے موڈ کی وجہ یہ تھی یا کچھ اور لیکن وہ خوش تھی۔ کچھ دیر گانے سننے کے بعد اس نے ایک ناول پڑھنے کے لیے اٹھا لیا۔ پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی تھی۔ خواب میں اس نے اماں کو دیکھا۔ وہ چارپائی پر لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ انہیں بے تابی سے پکار رہی تھی وہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتی تھیں پھر بند کرلیتی تھیں۔ "اماں" اس نے بلند آواز میں پکارا اور ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ شام ہوگئی تھی شاید' پتا نہیں وہ کتنی دیر سوئی تھی۔ اس نے سامنے کلاک کی طرف دیکھا جس کی ریڈیم کی سوئیاں چمک رہی تھیں۔ عصر مغرب دونوں ہی نمازیں قضا ہوگئی تھیں۔ پھر اسے اپنا خواب یاد آیا۔۔ خواب میں اس نے اماں کو بیمار دیکھا تھا۔۔ وہ پریشان ہوکر کمرے سے باہر نکلی اور لاؤنج میں آکر حمیدہ سے پوچھا۔

"پھپھو آگئی ہیں۔"

"نہیں جی فون آگیا تھا ان کا ڈنر باہر ہی کریں گی۔"

وہ سر ہلا کر فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی وہ اماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔ کتنی ہی دیر تک بیل ہوتی رہی کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ تھک کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر فون کررہی تھی۔ اب کے ثنا نے فون اٹھایا تھا۔

"ثنا اماں سے بات کرواؤ پلیز۔" ثنا دوسری طرف خاموش ہی رہی تو اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"اماں ٹھیک تو ہیں نا ثنا۔"

"کیا ہونا ہے انہیں۔ ہٹی کٹی تو ہیں۔" ثنا کی تیز آواز اسے بہت ناگوار لگی تھی۔ لیکن اس نے عاجزی سے کہا۔

"ثنا پلیز اماں سے بات کروا دو۔"

"وہ تو ادھر احاطے میں دودھ دوہ رہی ہیں۔"

"اچھا تو میں تھوڑی دیر بعد پھر کروں گی پلیز اماں سے کہنا وہ فون کے پاس ہی رہیں' میں نے خواب میں انہیں بیمار دیکھا ہے آج دوپہر۔"

"بھرے پیٹ کے خواب سچے نہیں ہوتے عینا بی بی مرغ پلاؤ ٹھونس کے سوئی ہوگی۔" ماں نے شاید ثنا سے فون لے لیا تھا۔

"تمہاری ماں فارغ نہیں بیٹھی ہوئی کہ سارا وقت فون کے پاس بیٹھی رہے۔ بہت درد اور فکر ہورہی ہے تو گھر آجاؤ مڑ کر۔" انہوں نے زور سے ریسیور کریڈل پر رکھا تھا۔

اگرچہ یہ تسلی ہوگئی تھی کہ اماں بیمار نہیں ہیں' لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں وہ کچھ دیر تو یونہی ریسیور ہاتھ میں پکڑے کھڑی رہی پھر یک دم ہی تیز تیز چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر لان میں آگئی تھی۔ اماں سے بات نہیں ہوسکی تھی اور دل بھر آیا تھا۔ آنسو آنکھوں کی حدیں توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ وہ رونا چاہتی تھی بہت سارا کھل کر' وہ سر جھکائے لان میں بنی ہوئی مصنوعی پہاڑی کی طرف جارہی تھی اور ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی پونچھتی جارہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے روتے ہوئے دیکھے حمیدہ اور شازیہ اسے روتے ہوئے دیکھتیں تو ضرور بیگم راحت کو بتاتیں اور پھر ان کا لیکچر۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ سحر آپی کی طرح بن جائے بہادر اور بولڈ۔

وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر پہاڑی کے پیچھے پڑے پتھر پر جاکر بیٹھ گئی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھ لیا تھا۔ فوارے کی منڈیر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ارحم نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ سر جھکائے اس وقت کہاں جارہی تھی۔ وہ اندھیرے میں تھا جب کہ پورچ کی لائٹ کی روشنی لان میں جارہی تھی۔ جب وہ پہاڑی کی طرف مڑی تو اس نے دیکھا وہ رو رہی تھی اور ہاتھوں کی پشت سے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔

"یہ اسے کیا ہوا۔" ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا اور پھر سر جھٹک کر اپنے موبائل کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ دسمبر کے ان اولین دنوں میں اس وقت خاصی خنکی تھی۔ دن چھوٹے تھے اس لیے ابھی سات بھی نہیں بجے تھے' لیکن آسمان تاریک تھا اور اکادکا ستارے بھی چمک اٹھے تھے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے گرم علاقے میں رہنے کی وجہ سے یہ خنکی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ نیٹ پر مصروف رہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ فون جیب میں ڈال کر اس نے مصنوعی پہاڑی کی طرف دیکھا کیا وہ ابھی تک وہاں ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر پہاڑی کی طرف بڑھا وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی ساکت کھڑا اس کی سسکیاں سنتا رہا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے لیکن وہ اس کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔ ماضی کا ہر رشتہ اور حوالہ وہ بھلا چکا تھا۔

"سنیں۔" اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔ عینا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے اور پلکوں پر اب بھی آنسو اٹکے ہوئے تھے۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں اس طرح۔" اس نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور زمین پر پڑے پتھر کے چھوٹے سے ٹکڑے کو اپنے بوٹ کی نوک سے ادھر ادھر کررہا تھا۔

"ایسے ہی۔" اس نے جلدی جلدی دونوں ہاتھوں

سے چہرہ صاف کیا اور کھڑی ہو گئی۔ اور دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھنے لگی۔

"ایسے ہی بلاوجہ تو کوئی نہیں روتا۔" اس کے لبوں سے نکلا۔

"وہ دراصل اماں بہت یاد آرہی تھیں۔" اس نے کپڑے جھاڑے۔ ارحم نے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکل گیا۔

"آپ تو کبھی اماں کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہتی تھیں پھر کیوں چھوڑ کر آگئیں شاید۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور عینا کو حیرت ہوئی تو اسے سترہ سال پہلے کی کہی ہوئی — بات یاد تھی۔ جب اس نے کہا تھا وہ اماں کو کبھی بھی اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔

"میں اب بھی اماں کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن اماں نے خود۔ خود مجھے زبردستی بھیج دیا اور ماموں میری ان سے بات بھی نہیں کرواتیں۔" اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"کیوں تاکہ آپ کی پھپھو صاحبہ آپ کی بھی کسی امیر زادے سے شادی کروادیں۔" اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"نہیں — نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"اماں نے ایسی کوئی بات بالکل بھی پھپھو سے نہیں کی۔ وہ تو اور ہی مسئلہ تھا کچھ اور ہی۔ اماں مجھے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھر رونے لگی تھی۔

"خیر جو بھی مسئلہ تھا۔ اب آپ اندر جائیں۔ یہاں اس وقت گھاس پر بیٹھ کر رونے کے بجائے اپنے کمرے میں جاکر روئیں۔ گھاس میں زہریلے کیڑے مکوڑے بھی ہوسکتے ہیں۔" وہ ایک دم واپس مڑا تھا۔

"ارحم بھائی پلیز۔ ایک منٹ۔ ایک منٹ میری بات سن لیں۔" جلدی جلدی دوپٹے سے چہرہ پونچھتی ہوئی وہ اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"یہاں آپ کی پھپھو محترمہ نے مجھے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تو آپ کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن میری فرد جرم میں ضرور اضافہ ہو جائے گا۔" ارحم کو اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ اس نیم تاریکی میں اسے عینا کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر بیگم راحت کا ردعمل کیا ہوسکتا ہے۔ عینا وہیں ٹھہر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"غیر ممالک میں انسان مشین بن جاتا ہے۔ کام کرنے کی مشین۔ بس آنکھیں انسانوں کی سی ہوتی ہیں کیونکہ انہیں انتظار ہوتا ہے بہت سارا اپنے پیاروں سے ملنے کا۔ اچھے دنوں کا اور سال کے طویل لمبے اور بے تکان دنوں کے گزر جانے کا، لیکن میری آنکھوں میں تو انتظار کے دیپ بھی نہیں جلتے چاچا۔ مجھے سال کے طویل دنوں کے گزر جانے کا انتظار بھی نہیں ہوتا۔ میرے دن تو یونہی گزرتے ہیں بے مقصد ایک روبوٹ کی طرح۔" اس نے نگاہیں اٹھا کر خدا بخش کی طرف دیکھا تو خدا بخش جیسے تڑپ گیا۔

"آپ یہاں کیوں نہیں آجاتے ارحم بیٹا۔ ہمیشہ کے لیے۔ کیوں دوسروں کی غلامی کرتے ہیں۔"

"یہ سب کارخانے فیکٹریاں کس کی ہیں۔ پھر اپنا ملک اپنے لوگ۔"

"کون اپنے لوگ۔" اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ میرا باپ فراز خان میرا بھائی صائم خان اور میری سوتیلی ماں بیگم راحت فراز خان۔ یہ سب میرے اپنے لوگ، کیا کیا انہوں نے میرے ساتھ آپ نہیں جانتے کیا۔ بیگم راحت خان تو خیر غیر تھیں سوتیلی تھیں، لیکن فراز خان کیا انہوں نے میری بات کا یقین کیا بھروسہ کیا مجھ پر — جنہوں نے مجھے کبھی اکیلا نہ چھوڑنے کا عہد کیا تھا۔ مجھے نہ صرف اکیلا چھوڑ دیا بلکہ مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے ہی انکار کردیا یہ کہہ کر کہ ان کا صرف ایک بیٹا ہے۔ اور وہ صائم جو میری محبت کا دم بھرتا تھا اور جو کہتا تھا میں سگے سوتیلے کو نہیں جانتا مجھے صرف یہ پتا ہے کہ میرا ایک بھائی ہے ارحم خان

اس نے بھی میری گواہی نہیں دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ کہے گا ارحم میرا بھائی ہے وہ ایسا نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں، لیکن اس نے نظریں چرالی تھیں چاچا اس نے میری طرف نہیں دیکھا جب مجھے اس کی ضرورت تھی تب اس نے نظریں پھیر لی تھیں اور اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس نے اپنی آواز کی بھراہٹ پر بمشکل قابو پایا تھا۔

"معاف کردو بیٹا انہیں اپنے باپ کو اپنے بھائی کو ناراضی ختم کردو اب۔"

"میں کبھی ان سے ناراض تھا ہی نہیں چاچا تو معافی کیسی۔ بس دکھ ہے مجھے جو یہاں گڑا ہے اندر میرے سینے میں۔" اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ "اور یہ دکھ کم ہونے میں نہیں آتا۔

ہر روز جب صبح میں اٹھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ آج اس دکھ کی شدت کم ہوگی، لیکن اسے پہلے سے بھی سوا پاتا ہوں۔ یہ غم مجھے اندر ہی اندر کھاتا جارہا ہے کہ انہوں نے میرا یقین نہیں کیا میرا اعتبار نہیں کیا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"چاچا پلیز اب جائیں آپ پھر اگر صائم کا فون آئے تو کہہ دیجیے گا کہ میں اس کے آنے تک نہیں رک سکتا مجھے واپس جانا ہے چند دنوں تک ہوسکتا ہے میں ڈیڈی کا بھی انتظار نہ کروں۔" اور خدا بخش سر جھکائے باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کیوں بار بار زخموں کے ٹانکے ادھڑ جاتے تھے۔ وہ تو خدا بخش کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ جو اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اداس تھا جو سالوں بعد پردیس سے آتا تھا۔ اور بات کہاں سے کہاں نکل آئی تھی۔ وہ اسے پردیس میں رہنے والوں کا احوال بتاتے بتاتے اپنے ہی زخموں کو کھرچ بیٹھا تھا۔ خدا بخش نے اسے صائم کے فون کا بھی بتایا تھا کہ اس کی چھٹیاں ہونے والی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ ارحم اس کے آنے تک وہاں ضرور رکے۔ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے بارہ سالوں سے وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ چھ سال پہلے جب وہ یہاں آیا تھا تو صائم یو کے جاچکا تھا اور دو سال پہلے بھی جب وہ یہاں ایک ماہ رہ کر گیا تھا تو صائم یورپ کہیں اپنی چھٹیاں گزار رہا تھا۔

ان ہواؤں میں یہ کیسی تاثیر ہے کہ جب بھی آؤں یہ قدم باندھ لیتی ہیں۔

کیا کر رہا ہوں میں یہاں۔ اور کیوں؟ اس نے خود سے پوچھا اور اٹھ کر فریج سے ایک ٹن نکال کر کھولا اور گلاس میں ڈال کر ہاتھ میں پکڑے گلاس میں موجود مشروب کو دیکھتا رہا۔ پھر فریزر کھول کر برف کی کچھ کیوبز گلاس میں ڈال کر گلاس ہاتھ میں پکڑے پکڑے باہر لان میں آگیا۔ اور سنگی بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے گیٹ سے اندر آتی بیگم راحت کی گاڑی کو دیکھا اور پھر گاڑی سے اترتی عینا اور بیگم راحت پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر گھونٹ گھونٹ کرکے ٹھنڈا مشروب پینے لگا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگا تھا جیسے گاڑی سے اتر کر اندر جاتے ہوئے عینا نے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

اور یہ عینا جلال تھی۔ وہ معصوم سی کیوٹ سی بچی جو کہتی تھی اسے اگر کسی جنگل میں کسی جھونپڑی میں بھی رہنا پڑے تو وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا پسند کرے گی اور اپنی پھپھو کے اس اتنے بڑے آسائشوں سے بھرے گھر میں رہنا نہیں چاہے گی لیکن اب وہ یہاں رہ بھی رہی تھی اور روتی بھی تھی۔

ایک طنزیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور ٹھنڈا یخ مشروب اس نے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتارا۔

تو مجھے صبح یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

چھٹیوں کے سات ہفتے باقی تھے اور یہ سات ہفتے پچھلے کئی سالوں کی طرح اب آوارگی میں ہی گزرنے تھے۔ کہاں جائے۔ فرانس نیو یارک، آئرلینڈ کہیں بھی آوارگی کی تو کوئی منزل نہیں ہوتی۔

یہ گھر میرا ہے جہاں میں نے جنم لیا اور جہاں میری زندگی کے بہت سے سال گزرے۔

اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ خدا بخش نے گیٹ کی لائٹس

جلادی تھیں۔

"لیکن یہاں اس گھر میں بھی میرا جی نہیں لگتا۔ جیسے یہاں اس بھری دنیا میں کوئی بھی میرا اپنا نہ ہو ابھی شاید کوچہ گری اور دربدری باقی ہے۔"

اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ کاش وہ بہت زیادہ رولیتا۔ اتنا کہ اندر باہر جلتی آگ کی تپش کم ہو جاتی۔ لیکن آنسو تو بارہ سال پہلے اس سے ایسے روٹھے تھے کہ تب سے آنکھیں خشک صحرا بنی ہوئی تھیں۔ بارہ سال پہلے شاید وہ آخری بار رویا تھا — پوری رات وہ روتا رہا تھا۔ اکیلا تنہا اور کسی نے اس کے آنسو نہیں پونچھے تھے۔ اس سے پہلے وہ جب جب رویا۔ ممی کی ڈیتھ پر ان کے بعد جب بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ڈیڈی اس کے پاس تھے اس کے آنسو پونچھنے کے لیے لیکن اس رات ڈیڈی اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ تڑپ تڑپ کر رویا تھا لیکن کسی نے اس کے آنسو نہیں پونچھے تھے۔ کوئی ہاتھ آگے نہیں بڑھا تھا اسے گلے لگانے اور پیار کرنے کو۔

ایک دم ہی ہوا میں موجود خنکی بڑھ گئی تھی۔ وہ بلو جینز اور سفید کاٹن کی شرٹ پہنے ہوئے تھا جس کی آستینیں اس نے پیچھے رول کر رکھی تھیں لیکن اسے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہوا کی خنکی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ گیارہ سال یورپ کے ٹھنڈے موسموں میں گزار کر اب ایک سال سے وہ یو۔ اے۔ ای کے تپتے صحراؤں کی خاک چھان رہا تھا۔ اور اب وسط دسمبر کی اس رات کی خنکی اور ٹھنڈک اسے بے حد سکون دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں موند کر سر بینچ کے ساتھ ٹکالیا اور بہت سارے مناظر اس کی بند آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔

وہ اس کی اولین محبت تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی۔ سفید کاٹن کے سوٹ میں ملبوس جس پر نقرئی ستاروں اور روپہلے دھاگوں سے خوب صورت کڑھائی کی ہوئی تھی اور وہ یہاں ہی لان میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کے دوپٹے پر دور دور موجود — ستارے لمحہ بھر بعد دمکتے تھے۔

"چاندنی۔" اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا تھا۔ اور وہ بنا کچھ کہے یوں ہی مسکراتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ منظر پھر بدلا تھا۔

وہ اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پہ نکلا تھا وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ کبھی کبھی چور نظروں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔

"کاش زندگی بھر میں یونہی تمہارے سنگ رہوں۔" وہ کہہ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

"ایسا ہی ہوگا ہم ہمیشہ ساتھ ہی رہیں گے چاندنی عمر بھر۔ آخری سانس تک۔" وہ اسے چاندنی ہی کہتا تھا۔ محبتوں کے اظہار میں وہ اس کے مقابلے میں زیادہ بے باک تھی۔

پہلی بار محبت کا اظہار بھی اس نے کیا تھا وہ تو سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ کیسے کس طرح اس سے کہے کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کی صبحیں اور شامیں اس کے دن اور راتیں سب اس کے تصور میں گزرتے ہیں۔ وہ تو سوچتا ہی رہا تھا لیکن اس نے اسے I Love You کا خوبصورت کارڈ گفٹ کر دیا تھا۔ وہ جذبوں کے اظہار میں بخل نہیں کرتی تھی۔ اس کے پاس اپنے جذبوں کے اظہار کے لیے خوبصورت لفظ تھے۔

"ارحم مجھے لگتا ہے جیسے میں ازل سے تمہاری تھی۔ اللہ نے مجھے تمہارے لیے ہی پیدا کیا ہے۔" کبھی وہ کہتی "ارحم مجھے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی تم اجنبی نہیں لگے۔ جیسے میں جنم جنم سے تمہیں جانتی ہوں۔

مجھے کبھی مت چھوڑنا ارحم میں مر جاؤں گی۔ میں تمہارے بغیر ایک لمحہ بھی سانس نہیں لے پاؤں گی۔" اور وہ سانس لے رہی تھی زندہ تھی اور خوش تھی۔

منظر پھر بدلا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شالامار باغ میں گھوم رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"شہزادیاں اور ملکائیں مجھ سے زیادہ خوش قسمت تو نہیں ہوں گی ارحم۔ میرے ساتھ تم ہو۔ تمہاری محبت ہے۔"

"اور شہزادے اور بادشاہ بھی مجھ سے زیادہ خوش قسمت نہیں ہوں گے چاندنی کہ میرے ساتھ تم ہو اور ہمیں ہمیشہ ساتھ رہنا ہے اور زندگی کا سفر اکٹھے طے کرنا ہے۔" پھر ایک اور منظر۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی سر جھکائے

"میں بہت مجبور ہوں ارحم۔ میری زندگی کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتی ارحم۔"

"تم کچھ بھی مت کرو چاندنی جو کچھ کرنا ہے میں کروں گا۔ میں خود بات کروں گا ڈیڈی سے مما سے۔ اور مجھے یقین ہے وہ میری بات رد نہیں کریں گے۔ کم از کم ڈیڈی کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتے۔" اس کا یقین تو صحیح تھا لیکن وہ جس زمین کے لیے جنگ کرنا چاہتا تھا وہ زمین تو اس کی تھی ہی نہیں۔ کس قدر بے وقوف تھا وہ جسے اپنا سمجھتا تھا وہ بھی اس کی اپنی تھی ہی نہیں۔ ایک اور منظر بند آنکھوں کے سامنے آیا۔

وہ رو رہا تھا اتنا لمبا چوڑا چھ فٹ کا مرد آنسوؤں سے رو رہا تھا اور وہ رخ موڑے کھڑی تھی۔

"میرا یقین کرو چاندنی یہ سب۔ جھوٹ ہے غلط ہے میرے تین سال کا ہر لمحہ تمہارے سامنے ہے میں نہیں جانتا یہ سب کس نے کیا۔ کس نے میرے کمرے میں یہ بوتلیں رکھیں۔ کون ہے اس گھر میں میرا دشمن۔"

"کون ہو سکتا ہے؟" اس نے رخ اس کی طرف کیا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمہارے ڈیڈی۔ تمہارا بھائی، ممی آخر ان تینوں میں کون تمہارا دشمن ہو سکتا ہے۔ ایم سوری ارحم میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے ڈرنک کرنے سے نفرت ہے۔ میں کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کر سکتی جس کے کمرے میں شراب کی بوتلیں ہوں اور جو گھر والوں کو دھوکا دے کر شراب پیتا ہو۔ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ بلکہ عشق تھا مجھے تم سے۔ اور میں آخری حد تک تمہارا ساتھ دینے کو تیار تھی۔ لیکن اب نہیں۔ اب نہیں ارحم۔"

"کیا محبت صرف اتنی سی بات پر ختم ہو سکتی ہے؟" اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"غلطی میری نہیں تمہاری ہے ارحم۔ اب اگر میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں تو مجھے الزام مت دینا۔ تمہارے جیسے کمزور اخلاق کے شخص کے ساتھ اماں ماموں کوئی بھی شادی پر رضامند نہ ہوں گے۔"

وہ چلی گئی تھی۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی سماعتوں اور اپنی بصارتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

نہیں یہ چاندنی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو اس کی محبت میں پاگل تھی اور اسے بھی پاگل کر رکھا تھا۔ اور محبت تو اعتماد کا بھروسے کا یقین کا نام ہے۔ اور پھر محبت میں تو محبوب کا غلط بھی صحیح لگتا ہے پھر۔

"ارحم صاحب آپ اتنی سردی میں باہر بیٹھے ہیں اور پھر آپ نے کوئی جرسی وغیرہ بھی نہیں پہنی ہوئی۔" اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا خدا بخش مدھم روشنی میں کچھ فاصلے پر کھڑا پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جا رہا ہوں چاچا پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔" موٹی گرم چادر لپیٹے ہوئے بھی خدا بخش ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"میں گرم دودھ میں شہد ڈال کر لا دیتا ہوں۔"

"نہیں چاچا میں ابھی جا کر کافی پی لوں گا۔"

اور خدا بخش ایک بار پھر اسے باہر نہ بیٹھنے کی تاکید کرتا ہوا اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

اس کی اولین محبت نے اسے مار ڈالا تھا کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ کسی ایک جگہ کسی ایک چھاؤں میں بیٹھنے نہ دیا۔ اس کے پاؤں کے تلووں میں ابھی تک اس کے غم کے دیئے ہوئے کانٹے چبھے تھے کاش وہ اسے اپنے

دل و دماغ سے نکال کر دوبارہ اپنی تاریخ مرتب کر سکتا۔ کیسے لے آؤں وہ دن جو گزر گئے واپس اپنے محور پر۔ کاش میں وقت کو پلٹنے پر قادر ہوتا۔

وہ بینچ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک بار پھر گہری سوچوں میں کھو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم بہت اداس ہو۔ کیا بات ہے۔" عینا کے گلاس میں جوس ڈالتے ہوئے بیگم راحت نے بغور اسے دیکھا تو عینا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"جی۔ بس۔۔۔ وہ" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "اماں یاد آرہی ہیں۔"

اس نے سر ہلا دیا لیکن نہ جانے کب کے رکے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

"زندگی ایسے نہیں گزر سکتی میری جان یوں رو دھو کر۔ سحر بھی تو تھی نا کیسے خوش رہتی تھی یہاں اور زندگی کو انجوائے کرتی تھی۔ اور اب دیکھو ایک بہترین زندگی گزار رہی ہے۔"

"جی۔ لیکن میں اس سے پہلے کبھی اماں سے الگ نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک ہے لیکن ایک نہ ایک دن تو لڑکیوں کو گھر چھوڑنا ہی ہوتا ہے۔ تم یہاں نہ آتیں تو شادی تو ہونا تھی تمہاری۔"

بیگم راحت کا انداز سمجھانے والا تھا۔ وہ سر جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی۔

"میں نے کہا تھا تمہیں روز فون کر لیا کرو۔"

"کرتی ہوں پھپھو لیکن ماں روز بات نہیں کرواتیں۔"

"ایک تو یہ تمہاری ماں کی انا کی مجھے سمجھ نہیں آتی وہاں بھابھی کے جوتے کھالے گی لیکن یہاں نہیں آئے گی۔" بیگم راحت کو غصہ آگیا تھا۔

"جلال بھائی کے بعد کتنی منتیں کی تھیں کہ میرے ساتھ چلیں۔ اس اتنے بڑے گھر میں کیا تین بندوں کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن۔۔۔"

بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے عینا کی طرف دیکھا جس کے آنسو ایک بار پھر رخساروں پر بہہ گئے تھے۔

"دیکھو میری جان تم کوئی چھوٹی بچی نہیں ہو، چھبیس سال کی ہو رہی ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم جانتی ہو۔ وہاں تمہاری عزت محفوظ نہ تھی۔ مونا بھابھی نے اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔ خیر۔۔۔"

انہوں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔

"دو چار دن میں تمہاری یونیورسٹی اسٹارٹ ہو جائے گی۔ ماسٹر کر لوگی تو رشتہ بھی اچھا مل جائے گا۔ آج کل ہر کوئی ایجوکیٹڈ لڑکیاں مانگتا ہے۔ ماسٹر ہو کسی بھی مضمون میں ہو۔ خیر بیگم راحت فراز خان کی بھتیجی کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم ماسٹر کر لو فارغ نہ بیٹھو۔"

"جی" اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"چلو اب اپنا ناشتا ختم کرو عینا۔ اور یہ چھوٹے بچوں کی طرح ہر وقت اماں کو یاد کر کے رونا بند کرو۔"

انہوں نے اپنے لیے بنائی چائے کا کپ اپنی طرف کھسکایا۔ اور دو تین گھونٹ بھر کے کھڑی ہو گئیں۔

انہوں نے دو انگلیوں سے اس کے رخسار سہلائے۔

"تم مجھے بہت پیاری ہو عینا۔ اس لیے کہ تم جلال بھائی اور مونا بھابھی کی بیٹی ہو۔ تم جانتی ہو نا۔ اماں اور ابا کی وفات کے بعد گھر کا کنٹرول بڑی اماں اور بڑے بھائی کے ہاتھ میں تھا اور وہ سوتیلے تھے۔ اور ان کا سلوک ہم دونوں کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ ہم دونوں بہن بھائیوں نے بہت سارے مشکل دن کاٹے پھر جلال بھائی نے تعلیم ختم ہوتے ہی سب سنبھال لیا۔ بڑے بھائی بھی ان سے ڈرتے تھے۔ پھر تمہاری اماں تھیں جو مجھ سے صرف چند سال بڑی تھیں لیکن انہوں نے ماں کی طرح میرا خیال رکھا جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی تب بھی جب بڑی اماں بڑی بھابھی یا بلال بھائی کچھ

کہتے تو میں اس کے پاس جاتی تھی۔ تو میری جان بہت قرض ہیں مجھ پر تمہاری ماں اور جلال بھائی کے۔"

"جی۔" وہ ان کی محبتوں کی معترف تھی۔

"او کے پھر چلتی ہوں۔" وہ ایک بار پھر اس کا رخسار تھپتھپا کر چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے فوراً بعد ہی وہ صرف گلاس میں بچا جوس پی کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ باہر لان میں آگئی۔ ہلکے ہلکے بادل تھے اور دھوپ بے حد مدھم تھی۔ اس نے ہلکی سی شال لے رکھی تھی۔ اسے کھلے لان میں کچھ وقت گزارنا پسند تھا ورنہ اندر بند کمروں میں بیٹھے بیٹھے اوب جاتی تھی۔ وہ لان میں ٹہلنے لگی۔

"کیا پتا اس وقت اماں سے بات ہو جائے۔" وہ واپسی کے لیے مڑی تب ہی اس کی نظر بینچ کے پیچھے پڑی تھی کوئی نیچے لیٹا ہوا تھا۔

"چاچا۔ چاچا۔"

اس نے مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں پکارا۔ خدا بخش گیٹ پر نہیں تھا۔ لیٹے ہوئے شخص نے ذرا سا سر اٹھایا تھا اور کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی تھی۔

"ارحم بھائی۔ ارحم بھائی کیا ہوا آپ اس طرح یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہیں۔" وہ راحت بیگم کی ہر بات بھول کر زمین پر اس کے قریب بیٹھی اسے بلا رہی تھی۔ اس نے پریشانی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اور ہلایا۔ اسے لگا جیسے اس نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ ہٹا لیا اور لحہ بھر یونہی وحشت بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی شرٹ بھیگی ہوئی تھی۔ غالباً" رات میں تھوڑی بہت بارش بھی ہوئی تھی۔ لان کی گھاس بھیگی ہوئی تھی اور وہ بخار میں مدہوش یہاں پڑا تھا۔ پتا نہیں کب وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا اور کب یہاں آکر لیٹ گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔ پیشانی بھی آگ کی طرح تپ رہی تھی۔

اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بے ہوش تھا یا گہری نیند میں تھا۔ اس کے لبوں سے ایک کراہ نکلی تھی اور پھر خاموشی۔ وہ ایک قدم کھڑی ہوگئی اور تقریباً" بھاگتی ہوئی خدا بخش کے کوارٹر میں آئی۔

خدا بخش سامنے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ پاس ہی ناشتے کے برتن پڑے تھے۔

"چاچا۔ چاچا پلیز جلدی آئیں وہ ارحم بھائی لان میں بے ہوش پڑے ہیں۔"

اور پھر رکے بغیر اسی طرح بھاگتی ہوئی واپس ارحم کے پاس آئی تھی اور اس کے پاس زمین پر بیٹھتے ہوئے اسے بے تابی سے پکارنے لگی تھی۔ خدا بخش بھی تقریباً" دوڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

"او میرے خدا لگتا ہے ارحم صاحب ساری رات باہر ہی بیٹھے رہے ہیں۔"

خدا بخش ارحم کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔

"چاچا انہیں بہت تیز بخار ہے اور یہ بے ہوش ہیں۔ اللہ کے لیے انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ یا ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ لیکن پہلے انہیں انیکسی میں لے چلیں۔ یہاں کتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔" عینا نے گھبراہٹ میں خدا بخش کا بازو جھنجھوڑ ڈالا تو خدا بخش چونک کر کھڑا ہو گیا۔

ارحم کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور اس کا جسم وقفے وقفے سے کانپ رہا تھا۔

پھر خدا بخش تقریباً" بھاگتا ہوا گیٹ تک گیا تھا اور چیخ کر کسی نوردین کو آواز دی تھی۔ تب ہی نوردین آگیا تھا اور نوردین کی مدد سے خدا بخش نے پہلے تو ارحم کو انیکسی میں پہنچایا تھا اور پھر خود ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا تھا۔

عینا بے بسی سے اس کے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت بھی ہلکی نیلی ہو رہی تھی۔ وہ بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت سنولا گئی تھی پیشانی پر لکیریں پڑی تھیں۔ پتا نہیں کتنا دکھ اور مشکل وقت گزارا ہے انہوں نے گھر سے ۔۔۔۔ دور۔ وہ بے حد دکھ سے اسے دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

یہاں آنے کے بعد کل پہلی بار اس کی صائم سے بات ہوئی تھی۔ اس نے اس کے یہاں آکر رہنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اچھا ہے تمہارے آنے سے مما کو بھی کمپنی مل جائے گی۔" وہ ایک لمحہ کو چونکی تھی وہ اس سے دو سال چھوٹا تھا لیکن اسے تم کہہ کر بلا رہا تھا۔ لیکن شاید وہ جس ماحول میں رہ رہا تھا وہاں ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

"اور تم اتنے سالوں سے باہر کیا کر رہے ہو۔ پھپھو تمہیں بہت مس کرتی ہیں آجاؤ۔"

"یار میں اپنی خوشی سے تھوڑی رہ رہا ہوں۔ بس ایک سال کی بات ہے پھر تعلیم مکمل کرکے واپس۔ ویسے مما جب مجھے مس کرتی ہے تو ٹکٹ کٹا کر پہنچ جاتی ہیں یہاں۔"

وہ ہنستا تھا۔ وہ اتنی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اس سے بات کرتا رہا ہو۔

"اف" ارحم سینے پر ہاتھ رکھ کر کراہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

ارحم نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں لیکن اس کے ہونٹ ہل رہے تھے شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے دھیان سے سننے کی کوشش کی۔ اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا چاندنی۔ میری زندگی میں خزائیں بکھیر دیں۔" وہ بے ہوشی میں بڑبڑا رہا تھا۔ کوئی کوئی لفظ عینا کو سمجھ آتا اور کوئی باوجود کوشش کے بن نہیں پاتی تھی۔

"میں۔ تمہیں پانے کی چاہ میں راکھ ہو گیا ہوں چاندنی میں نے پھر بھی تمہیں ہی چاہا۔"

تو حمیدہ نے صحیح کہا تھا اس لڑکی کا نام چاندنی تھا جس سے ارحم بھائی نے محبت کی تھی اور سحر آئی۔

ایک بار اسے پھر سحر کا خیال آیا تھا لیکن اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اور ارحم پر نظر ڈالی جو ہوش و خرد سے بیگانہ پڑا تھا۔ تب ہی خدا بخش چاچا کسی ڈاکٹر کے ساتھ آیا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد فوراً" اسپتال لے جانے کے لیے کہا۔

"نمونیے کا شدید اٹیک ہوا ہے۔ ان کو اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

اس نے پریشانی سے خدا بخش کی طرف دیکھا۔

"بیگم صاحبہ تو گھر نہیں ہیں۔ صاحب بھی ملک سے باہر ہیں۔" خدا بخش ڈاکٹر کو بتا رہا تھا۔ "ڈرائیور بیگم صاحبہ کے ساتھ گیا ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں چاچا میں اسپتال سے ایمبولینس بھجواتا ہوں۔" ڈاکٹر غالباً" ان کا جاننے والا تھا۔ اس نے وہاں سے فون کرکے ایمبولینس بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ اور خود ارحم کو کوئی انجکشن لگانے لگا تھا۔

وہ جو ڈاکٹر کے آنے پر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ ابھی تک کھڑی تھی۔ ڈاکٹر جو اس کا ٹمپریچر چیک کر رہا تھا اس نے مڑ کر عینا کی طرف دیکھا۔

"آپ بیٹھیں بھابھی پلیز اور پریشان نہ ہوں۔"

"جی یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا۔" اس نے اس کے جملے پر غور نہیں کیا تھا وہ ارحم کو دیکھ رہی تھی جو بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

"انشاء اللہ!" ڈاکٹر مسکرایا۔

"لیکن یہ۔ یہ ان کا سانس اکھڑ رہا ہے۔" وہ گھبرا گئی۔ اسے یاد تھا جب ابا بیمار تھے تو ایسے ہی اکھڑے اکھڑے سانس لیتے تھے۔

"ٹھنڈ سے پھیپھڑے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔" اسے تسلی دے کر ڈاکٹر پھر ارحم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایمبولینس آگئی تھی لیکن ارحم بدستور بے ہوش تھا اور اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔

"عینا بی بی وہ میں۔" خدا بخش نے بے بسی سے عینا کی طرف دیکھا۔ "میں اگر ارحم صاحب کے ساتھ چلا گیا تو ادھر گیٹ پر کون ہوگا۔ آپ۔"

"ہاں میں چلی جاتی ہوں۔" عینا بنا سوچے سمجھے ایمبولینس کی طرف بڑھ گئی۔

"رفیق سبزی لے کر آتا ہے تو میں آجاؤں گا یا اسے بھیج دوں گا۔" خدا بخش نے اسے کہا تو اس نے صرف

سر ہلا دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں چاچا میں ہوں نا۔" ڈاکٹر خالد نے خدا بخش کو تسلی دی۔

نم آنکھوں کے ساتھ وہ ایمبولینس میں بیٹھ گئی تھی۔ ڈاکٹر خالد کی نظریں اس کے پاؤں پر پڑی تھیں جن میں گھر پہننے والے چپل تھے۔ اور کپڑے بھی یقیناً" گھر میں پہننے والے ہی تھے۔ اس نے صرف ایک ہلکی سی شال لے رکھی تھی۔

"اپنا یار لکی ہے۔" ڈاکٹر خالد کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

عینا بیڈ سے کچھ فاصلے پر پڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک طرف اسٹول پر رفیق بیٹھا ہوا تھا۔ ارحم آنکھیں بند کیے لیٹا تھا اور اس کی سانس بھی پہلے سے کافی بہتر تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اسے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک ارحم کی زندگی کے لیے مسلسل دعائیں کرتے کرتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر خالد جتنی بار بھی اس کے پاس آئے تھے اس کے ہونٹوں کو مسلسل ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے یہاں تھی اور پتا نہیں اس نے کچھ کھایا بھی تھا نہیں۔ ملازم لڑکا رفیق آتو گیا تھا شاید کچھ کھانے کو لایا ہو۔ ڈاکٹر خالد کینٹین میں چائے کے لیے فون کرکے کمرے میں آئے تو وہ صوفے پر اس طرح بیٹھی تھی اور زیر لب دعا مانگ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ نے صبح سے کچھ کھایا نہیں۔"

وہ یکدم ہوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"جی۔ وہ۔ بس۔ یہ ٹھیک ہیں نا اب۔"

"اللہ کا شکر ہے کافی بہتر ہے۔" ڈاکٹر خالد نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"لیکن یہ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں۔ انہیں کب ہوش آئے گا۔ پلیز مجھے صحیح بتائیں ٹھیک تو ہو جائیں گے۔"

"یہ بے ہوش نہیں ہے۔ نیند آور دواؤں کے زیر اثر سو رہا ہے۔ اور انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر خالد نے مسکرا کر کہا۔

"آپ بیٹھیں پلیز؟"

"نہیں میں اب گھر جاؤں گی؟"

"آپ گھر ضرور جائیں ریلیکس ہو کر آجائیے گا پھر لیکن ابھی ایک کپ چائے پی لیں۔"

"نہیں شکریہ میں بس اب گھر جاؤں گی۔" وہ بے حد گھبرائی سی کھڑی تھی صبح سے اب تک اسے بیگم راحت کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اب وہ ڈر رہی تھی۔ پھپھو آنے والی ہوں گی۔ کبھی کبھار وہ لیٹ بھی ہو جاتی تھیں لیکن زیادہ تر وہ مغرب سے پہلے لوٹ آتی تھیں۔ اور مغرب ہونے والی تھی۔ پھپھو ضرور اسے ڈانٹیں گی کتنی سختی سے انہوں نے منع کیا تھا ارحم سے بات کرنے کو اور وہ صبح سے اب تک ارحم کے ساتھ تھی یہاں اسپتال میں اور اس نے پھپھو کو بتایا بھی نہیں تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے رفیق کی طرف دیکھا۔

"رفیق مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

رفیق کھڑا ہو گیا۔

"آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ اس گدھے نے آپ کو بتایا نہیں کہ یہ میرا یار غار ہے۔ یہ ذرا حواس میں آجائے تو اس کی خبر تو میں لیتا ہوں۔ نہ آنے کی اطلاع دی اور نہ۔"

اس نے ڈاکٹر خالد کی پوری بات دھیان سے سنی ہی نہیں اور رفیق کے ساتھ باہر آگئی۔ اس وقت وہ صرف راحت بیگم کے متعلق سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے خفا ہوں گی۔ کیا پتا حمیدہ نے بتا دیا ہو انہیں۔ انہوں نے فون تو ضرور کیا ہوگا۔ ان کی عادت تھی وہ آفس سے ایک دو بار فون ضرور کرتی تھیں۔ پھر اگر حمیدہ نے انہیں بتا دیا تھا تو انہیں اسپتال میں آنا چاہیے تھا ارحم بھائی کو دیکھنے۔ وہ سوچوں میں اتنی گم تھی کہ پتا ہی نہیں چلا کہ رکشا گھر کے دروازے کے پاس رک گیا تھا اور

رفیق اسے اترنے کو کہہ رہا تھا۔وہ چونک کر اتری۔
"تمہارے پاس پیسے ہیں نا۔"
"جی خدا بخش چاچا نے دیے تھے۔"
رفیق جیب سے پیسے نکال رہا تھا وہ چھوٹا گیٹ کھول کر اندر آ گئی۔خدا بخش اکرم سے بات کر رہا تھا۔
"تو پھپھو آ گئیں۔" اس نے دوسری گاڑی بھی دیکھ لی تھی۔ خدا بخش اور اکرم دونوں ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔
"ارحم صاحب کیسے ہیں اب۔" دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا۔
"ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔" ان کی بات کا جواب دے کر وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی تھی۔ چھوٹی لڑکی شازیہ نے دروازہ کھولا تھا۔لاؤنج میں ٹی۔وی چل رہا تھا اور حمیدہ نیچے فرش پر بیٹھی ٹی۔وی دیکھ رہی تھی۔شازیہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی تھی'اور ٹی۔وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ حمیدہ اس کی طرف مڑ کر دیکھ رہی تھی۔وہ گرنے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔
"پھپھو کہاں ہیں۔ کیا آرام کر رہی ہیں۔" اس نے بے چینی سے پوچھا۔
"جی وہ بیگم صاحبہ تو نہیں آئیں۔"
"لیکن گاڑی تو باہر کھڑی ہے۔ اور ڈرائیور اکرم بھی چاچا سے باتیں کر رہا تھا۔" اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"ہاں جی وہ تو اسلام آباد چلی گئی ہیں۔فون آیا تھا ان کا ضروری کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔ انہوں نے ڈرائیور بھیج کر اپنے کپڑے منگوائے تھے۔ اکرم تو بس ابھی انہیں ایئرپورٹ چھوڑ کر آیا ہے۔"
"انہوں نے میرا نہیں پوچھا تھا۔" اب وہ قدرے ریلیکس ہو کر حمیدہ سے سوال کر رہی تھی۔
"نہیں جی بس کہا تھا آپ کو بتا دوں رات کو وہ آپ کو فون کریں گی۔"
"تم نے ارحم بھائی کا بتایا تھا انہیں۔"
"نہیں جی میں بس بتانے ہی لگی تھی لیکن انہوں نے فون بند کر دیا۔"
"اچھا" وہ مطمئن سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔
"میں باتھ لینے جا رہی ہوں تم اچھی سی چائے دم کرو۔" یکدم اسے احساس ہوا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ صبح بھی اس نے ناشتا نہیں کیا تھا صرف جوس کا ایک گلاس پیا تھا۔
"سنو میں کھانا بھی کھاؤں گی۔" حمیدہ کو بتا کر وہ باتھ لینے چلی گئی تھی۔
کھانا کھا کر اس نے گاؤں فون کیا تھا۔ فون اماں نے ہی اٹھایا تھا۔وہ خوش ہو گئی۔
"مامی کہاں ہیں اور باقی سب۔"
"تمہاری مامی کے بھانجے کی شادی ہے وہ سب تو کل سے گئے ہوئے ہیں۔ کل واپس آئیں گے۔ ناصر بھائی آج صبح گئے ہیں۔"
"تو آپ مجھے فون کر لیتیں ہم دیر تک بات کرتے۔"
"فون کو تو تالا لگا گئی ہیں وہ'بس سن سکتی ہوں شکر ہے اس بار الماری میں بند نہیں کیا۔"
اس نے دیر تک اماں سے بات کی اور ارحم کے متعلق بھی بتایا۔
"ارحم کا خیال رکھنا بیٹا بہت اچھا بچہ ہے۔ تمہاری پھپھو جب تک نہیں آتیں۔ تمہیں ہی دھیان رکھنا ہو گا خود یخنی وغیرہ بنوا کر ہسپتال بھجوا دینا۔"
"جی" اور وہ اماں کو بتا نہ سکی کہ پھپھو تو ارحم کے متعلق بالکل بھی اچھی رائے نہیں رکھتیں۔ اسے وہ سب باتیں یاد آئیں جو پھپھو نے بتائی تھیں اور کل شام ہی تو جب وہ ان کے ساتھ شاپنگ کر کے واپس آئی تھی اس نے ارحم کو بینچ پر بیٹھے کچھ پیتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور اس میں جو بھی مشروب تھا بیگم راحت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ فراز گھر میں نہیں تو اب باہر لان میں بیٹھ کر پینے لگا ہے حالانکہ پہلے کمرے میں پیتا تھا۔ اور وہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ کوئی جوس پی رہا ہے۔ اس نے چونک کر بیگم راحت کی طرف دیکھا تھا۔ اور شاید رات کو نشے میں

وہاں ہی سو گئے ہوں گے ارحم بھائی اور انہیں ٹھنڈ لگ گئی ہو گی۔ اس نے سوچا'لیکن اس نے اپنے دل میں ارحم کے لیے نفرت کے بجائے ہمدردی محسوس کی اگر پھپھو نے محبت اور پیار سے انہیں سمجھایا ہوتا تو شاید وہ ڈرنک کرنا چھوڑ دیتے۔ اور شاید انہوں نے چاندنی سے شادی نہ ہو سکنے کے غم میں شراب پینی شروع کر دی ہو گی ورنہ ارحم بھائی ہرگز ایسے نہ تھے وہ تو بہت اچھے تھے۔ انہوں نے تو کبھی سگریٹ تک نہیں پی تھی ایک بار سحر نے اسے بتایا تھا۔ اور کیا تھا اگر پھپھو اور انکل فراز ان کی شادی چاندنی سے کر دیتے غریب ہونا کوئی جرم تو نہیں ہے نا۔ پھپھو کہہ رہی تھیں وہ کسی گھٹیا خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ کیا کسی گھٹیا خاندان میں کوئی اچھا بندہ پیدا نہیں ہو سکتا۔
"بیگم صاحبہ کا فون ہے جی" شازیہ نے کارڈلیس اسے پکڑاتے ہوئے کہا تو چونک کر اس نے فون پکڑ لیا۔ اماں کو فون کرنے کے بعد ابھی تک وہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔
"جی پھپھو۔"
"کیسی ہو میری جان۔"
"ٹھیک ہوں آپ۔"
"سوری گڑیا" انہوں نے اس کی بات کاٹی۔
"اچانک آنا پڑ گیا۔ بہت ضروری کام ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے ایک دن سے زیادہ رہنا پڑ جائے۔ گھبرانا نہیں شازیہ کو اندر ہی سلا لینا اپنے کمرے یا لاؤنج میں۔ کمرے لاک کر کے چابیاں اپنے کمرے میں ہی رکھنا۔"
"پھپھو وہ۔" وہ بتانا چاہتی تھی ارحم کے متعلق لیکن انہوں نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔
"تم بچی نہیں ہو اب ڈرنے والی کوئی بات نہیں ہے سب پرانے ملازم ہیں۔ بھروسے اور اعتماد والے۔"
"جی"
"او کے جانو میرا ویٹ ہو رہا ہے" انہوں نے فون بند کر دیا اور وہ ارحم کے متعلق بتا ہی نہیں سکی۔ فون بند کر کے وہ اٹھی۔
"رفیق چلا گیا کیا۔" اس نے حمیدہ سے پوچھا۔ جو برتن دھو رہی تھی۔
"پتا نہیں جی۔ کہہ رہا تھا کھانا کھا کر جاؤں گا۔"
"آٹھ تو بج گئے ہیں تم اسے کھانا دے دو وہاں بے چارے ارحم بھائی اکیلے ہوں گے۔ ڈاکٹر خالد نے بھی تو گھر جانا ہو گا"۔ حمیدہ کو ہدایت دے کر وہ باہر آئی تو خدا بخش نے اسے بتایا کہ اس نے اکرم کو بھیج دیا ہے۔ رفیق جائے گا تو وہ آ جائے گا۔ بڑے صاحب کو پتا چلا تو وہ ناراض ہوں گے کہ لاوارثوں کی طرح اکیلا ہے اسپتال میں۔
اور وہ بے حد مطمئن سی ہو کر واپس آ گئی تھی صبح رفیق آیا تو اس نے بتایا کہ رات بھر ان کی طبیعت کافی خراب رہی۔ چیسٹ میں بہت درد تھا اور سانس بھی بار بار اکھڑ جاتا تھا بخار بھی بہت تیز تھا۔ لیکن اب کچھ بہتر ہیں سو رہے ہیں۔
"اچھا اور ڈاکٹر خالد؟" اس نے پوچھا"وہ رات بارہ بجے کے بعد ہی گھر گئے تھے لیکن وہ ڈیوٹی والے ڈاکٹرز کو ہدایت کر گئے تھے۔ ڈاکٹر خالد آئے ہیں تو میں گھر آیا ہوں"۔
"ٹھیک ہے تم ناشتا کر کے سو جاؤ۔ اور اکرم کو کہو کہ وہ ارحم بھائی کے لیے ناشتا اور سوپ وغیرہ لے کر چلا جائے"۔
"نہیں جی ڈاکٹر خالد نے منع کیا ہے کچھ لانے کو وہ گھر سے ان کا ناشتا لے آئے تھے۔ اور سوپ وغیرہ بھی لائے ہیں جی"۔
اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی اکرم کے ساتھ ہسپتال چلی جائے۔ لیکن سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ جائے یا نہ جائے۔ پتا نہیں پھپھو کو اس کا جانا پسند نہ آئے۔ پھپھو فون بند نہ کرتیں تو وہ ان سے پوچھ لیتی۔ ایک بار اس نے سوچا خود سے کر لے لیکن پھر اس خیال سے نہ کیا۔ کیا پتا وہ اس وقت سو رہی ہوں۔ وہ بہت بے چین تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

گھر کا ایک فرد ہسپتال میں تھا اور اس کے پاس اس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ اسی وقت صائم کا فون آگیا۔

"ابھی سو کر اٹھا ہوں سوچا فون کرلوں کیونکہ اگلے دو ہفتے میں بہت مصروف ہوں پھر ایک ماہ کی چھٹیاں ہیں۔۔ اور میں نے پاکستان آنے کا پروگرام بنالیا ہے۔۔ مما کہاں ہیں؟"

"وہ تو نہیں ہیں۔" عینا نے اسے ساری تفصیل بتائی ارحم کی بیماری کی۔

"او مائی گاڈ ارحم بھائی بیمار ہیں۔ وہ تو بیماری میں بڑے چڑچڑے ہوجاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں انہیں ذرا سا بخار بھی ہوتا تھا تو کسی کو اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ ڈیڈی تو ان کے روم میں رہتے تھے جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوجاتے تھے۔ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تب بھی ان کی خواہش ہوتی تھی کہ میں ڈیڈی مما سب ان کے پاس ہی رہیں۔ مما بہت چڑتی تھیں ان کی اس عادت سے۔۔ تم ان کا بہت خیال رکھنا۔۔ سالوں بعد تو وہ گھر آتے ہیں اور یہاں بھی بیماری میں اکیلے ہیں ہسپتال میں۔"

"تو کیا میں جاؤں ہسپتال؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں مہربانی ہوگی تمہاری۔۔" وہ اسی بے تکلفی سے بول رہا تھا۔

"مما ہوتیں یہاں، تو وہ انہیں ہسپتال میں اکیلا نہ چھوڑتیں۔ اور ڈیڈی تو خیر ارحم بھائی کے لیے ہمیشہ سے بہت کونشیس ہیں۔"

پتا نہیں وہ خوش گمان تھا یا واقعی پھپھو ان کا ایسے ہی خیال رکھتیں۔ جبکہ پھپھو نے ارحم کے حوالے سے جو مختصر گفتگو کی تھی۔ اس سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں ارحم کا کوئی خیال نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی۔"

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر ہسپتال جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ ٹھیک ہے پھپھو نے کچھ کہا تو میں کہہ دوں گی صائم نے کہا تھا۔۔۔ جانے کو۔۔" اس نے اندرونی گیٹ کھول کر خدا بخش کو آواز دی۔

"خدا بخش چاچا آپ کے پاس اکرم بھائی کا نمبر ہے۔"

"ہاں جی ہے۔"

"تو چاچا پھر انہیں فون کریں کہ وہ آجائیں اور مجھے ہسپتال لے جائیں اور اگر ارحم بھائی جاگے ہوئے ہوں تو پوچھ لیں گھر سے کچھ لانا تو نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے جی کردیتا ہوں"۔

کچھ ہی دیر بعد اکرم آگیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ارحم کا ٹمپریچر کم نہیں ہورہا۔ کافی دیر پہلے ہی انہیں ایمرجنسی میں لے گئے تھے۔ ابھی کمرے میں لے آئے تھے۔ ڈاکٹر خالد ان کے پاس ہی ہیں۔ "ٹھیک ہے آپ مجھے ہسپتال چھوڑ کر آجائیں پھر شام کو لینے آجایئے گا۔۔"

اس نے گاڑی کی چابی اکرم کو دی۔

"شام کو میں آجاؤں گا اکرم کے ساتھ اور رات وہاں ہی رہوں گا۔۔ ادھر گھر میں اکرم ہوگا نا"۔

خدا بخش نے کہا تو اس نے سرہلادیا۔

اس نے محسوس کیا تھا۔ سب ملازم ارحم کا بہت احترام کرتے تھے اور اس سے محبت کرتے تھے۔

ڈاکٹر خالد ارحم کے قریب کرسی بچھائے بیٹھا تھا اور اس کی فائل دیکھ رہا تھا۔ جب عینا دستک دے کر اندر آئی ڈاکٹر خالد نے مڑ کر اسے دیکھا اور احتراماً کھڑا ہوگیا۔ عینا نے سلام کرکے ارحم کا حال پوچھا۔

"پہلے سے کافی بہتر ہیں لیکن ابھی بالکل ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔"

"کتنا وقت۔" عینا نے بیڈ کے قریب آکر جھک کر دیکھا ارحم کا چہرا اسے زرد زرد سا لگا۔

"شاید ایک ہفتہ لیکن ہسپتال سے دو دن تک فارغ کردیں گے انشاءاللہ۔"

"ابھی سو رہے ہیں کیا؟"

"زبردستی سلایا ہے۔ میڈیسن دے کر ورنہ بہت واویلا مچا رہا تھا" ڈاکٹر خالد مسکرایا۔

"میں نے بتایا تو تھا رفیق کو میرا آج آف ہے میں سارا دن اسی کے پاس رہوں گا آپ بے فکر رہیں۔"

"وہ بس میں۔" عینا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا

کہے۔

"آپ کو چین نہیں آرہا ہوگا"۔ ڈاکٹر خالد کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"خیر آپ بیٹھیں میں چلتا ہوں۔ ڈاکٹر غزنوی ڈیوٹی پر ہیں۔ ان سے میں کہہ جاتا ہوں وہ پتا کرتے رہیں گے اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو غزنوی کو کہیے گا مجھے فون کرلیں گے۔"

"جی۔ شکریہ" وہ اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ ڈاکٹر خالد چلا گیا تو وہ ڈاکٹر خالد والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ شام تک دو تین بار ڈاکٹر غزنوی نے چکر لگایا۔ نرسیں بھی آتی جاتی رہیں۔ کوئی بی پی چیک کرتی کوئی انجکشن اور دوا آکر دیتی۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی رہی۔ ارحم دو تین بار اٹھ کر بیٹھا۔ اس نے ایک طرف بیٹھی عینا کو دیکھا بھی لیکن کچھ کہا نہیں۔ اور پھر خاموشی سے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر غزنوی نے اس کے لیے چائے بھجوادی تھی۔ غالباً" ڈاکٹر خالد نے کہا تھا ۔ ساتھ سینڈوچ تھے۔ اس نے چائے بنائی اور کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ ارحم اس کی طرف سے کروٹ کیے لیٹا تھا کچھ دیر پہلے ہی نرس انجکشن لگا کر گئی تھی۔

"ارحم بھائی" وہ اٹھ کر اس کے بیڈ کے قریب آئی۔

"چائے پئیں گے آپ۔" ارحم نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے پائنتی کی طرف سے ذرا چہرہ آگے کر کے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں غالباً" سو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی خدا بخش آگیا تھا۔ وہ حمیدہ سے سوپ بنوا کر لایا تھا۔ تھرموس میں چائے بھی تھی اور ساتھ میں ڈبل روٹی تھی۔

"ارحم بیٹا" سامان کی باسکٹ ایک طرف رکھ کر وہ تیزی سے اس کے بیڈ کے قریب آیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ارحم نے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے ارے بیٹا لیٹے رہو۔ تمہارا جسم تو ابھی بھی دہک رہا ہے۔ لگتا ہے بخار نہیں اترا"۔ ارحم نے خدا بخش کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ عینا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو ہاتھ میں چائے کا کپ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"چاچا آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی۔"

"نہیں۔ نہیں ارحم بھائی میں تو خود آئی ہوں۔ آپ کی اتنی طبیعت خراب تھی۔ اب آپ کیسے ہیں۔" بنا پیے اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"چاچا پلیز انہیں گھر چھوڑ آئیں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اور اس نے عینا کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ عینا کا رنگ یکدم سرخ ہوا تھا اور وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"اکرم آیا ہے میرے ساتھ۔ وہ بی بی کو لے کر ہی جائے گا"۔

خدا بخش نے بتایا تو اس نے دروازہ کھولتے کھولتے سنا۔

"چاچا آپ انہیں پارکنگ تک چھوڑ کر آئیں۔ یہ کہاں اکرم کو ڈھونڈتی رہیں گی۔"

"جی" خدا بخش اس کے پیچھے ہی باہر آیا۔

"رات میں ادھر ہی رہوں گا ارحم صاحب کے پاس۔ عینا بی بی آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ اکرم اور رفیق گھر پر ہوں گے۔"

اس نے بنا کچھ کہے سر ہلایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا تھا اگر ارحم بھائی میری بات کا جواب دے دیتے۔ یقیناً" وہ پھپھو سے ناراض ہیں لیکن میں نے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اور میں کل سے اب تک خوامخواہ پریشان ہو رہی تھی۔ ٹھیک ہے اب رہیں اکیلے ہسپتال میں ملازموں کے ساتھ میں بھی نہیں جاؤں گی اب۔

رفیق نے گیٹ کھولا تھا اور وہ گاڑی سے اترتے ہی تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی' شازیہ نے اندرونی گیٹ کھول دیا تو وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور حمیدہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حمیدہ اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔

"وہ ارحم صاحب کی طبیعت کیسی ہے"

"ٹھیک ہیں" اس نے رکھائی سے کہا۔

"وہ پلیز میرے لیے چائے کمرے میں ہی بھجوا دو سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے حمیدہ کی طرف دیکھا۔

"وہ جی بڑے صاحب کا فون آیا تھا وہ ارحم صاحب کا پوچھ رہے تھے میں نے بتا دیا آپ بہت خیال رکھ رہی ہیں ان کا اور اسپتال بھی گئی ہوئی ہیں بہت شکریہ ادا کر رہے تھے آپ کا۔"

"بتانے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ سیدھی ہوئی۔ "پھپھو نہیں تھیں تو مجھے ہی خیال رکھنا تھا۔"

"نہیں کہاں پروا ہے ارحم صاحب کی۔" اسے حمیدہ کا لہجہ عجیب سا لگا۔ اور اس کا تبصرہ بھی برا لگا لیکن وہ خاموش رہی۔

"آپ بہت اچھی ہیں جی اور بہت نرم دل کی بھی۔" حمیدہ نے اس کی ناگواری محسوس کرلی تھی۔

"حمیدہ پلیز میرے سر میں بہت درد ہے چائے بھجوا دو۔ اور ہاں پھپھو کا فون آیا تھا۔"

"نہیں" حمیدہ چلی گئی تو اس نے دونوں پاؤں بیڈ پر رکھے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

رات وہ جلدی سو گئی تھی پھر بھی صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ فجر قضا ہوگئی تھی۔ قضا نماز پڑھ کر وہ باہر نکلی تو شازیہ اور حمیدہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی۔وی دیکھ رہی تھیں۔ بیگم راحت کی موجودگی میں وہ اس طرح لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی۔وی دیکھنے کی جرات نہیں کرسکتی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ دونوں ہی یکدم کھڑی ہوگئی تھیں۔

"فارغ بیٹھنے کے بجائے ڈسٹنگ کرلیتیں۔ کتنی دھول پڑ رہی ہے ہر چیز پر۔ پھپھو آئیں گی تو ڈانٹیں گی۔" شازیہ سر ہلا کر چلی گئی وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اخبار اٹھا لیا۔ ایک اور بور دن کا آغاز ہوگیا تھا۔

سارا دن وہ ٹی۔وی دیکھتی یا میگزین پڑھتی رہی۔ رفیق سے اسے پتا چل گیا تھا کہ خدا بخش آگیا ہے۔ اور اکرم اسپتال چلا گیا۔ لیکن وہ اٹھ کر باہر نہیں گئی اور نہ ہی خدا بخش چاچا سے جا کر ارحم کی طبیعت کا حال پوچھا۔ رات کو جب وہ بیڈ پر لیٹی تو تب بھی اس پر قنوطیت اور بے زاری طاری تھی۔

اگلی صبح جب وہ اٹھی تو ارحم کو مارجن دے چکی تھی۔ ارحم نے مجھے پہلے روز کی طرح کچھ کہا تو نہیں تھا۔ بس میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اسے خیال تو تھا تب ہی تو اس نے چاچا خدا بخش سے کہا تھا کہ وہ مجھے خود چھوڑیں۔ میں بھی خوامخواہ ہی موڈ خراب کر کے بیٹھ گئی۔ کم از کم مجھے خدا بخش چاچا سے تو احوال پوچھنا چاہیے تھا ارحم بھائی کا پتا نہیں کیا حال ہے۔ کہیں طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ دوپہر تک اس نے ادھر ادھر کے کاموں میں خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ عصر تک وہ اسپتال جانے کا فیصلہ کر کے باتھ لینے چلی گئی۔

تیار ہو کر باہر آئی تو حمیدہ نے اسے بیگم راحت کے فون کا بتایا کہ وہ اسلام آباد سے ہی دو دن کے لیے کراچی چلی گئی ہیں اور یہ کہ اس نے انہیں عینا کی آج کی کارکردگی کی پوری رپورٹ دی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ خوامخواہ خود کو مت تھکائے اور پیار کیا ہے۔ عینا نے سر ہلا دیا اور اندرونی گیٹ کھول کر باہر آئی خدا بخش اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

"چاچا اکرم بھائی کو کہیں مجھے اسپتال لے جائیں کہاں ہیں وہ"۔

"اکرم تو اپنے کوارٹر میں ہے عینا بی بی لیکن آپ اگر ارحم صاحب کو دیکھنے کے لیے ہسپتال جا رہی ہیں تو صاحب تو آگئے ہیں جی ابھی کچھ دیر پہلے ہی"۔

"اوہ کیا ٹھیک ہیں بالکل۔"

"بالکل ٹھیک تو نہیں ہیں جی لیکن ڈاکٹر خالد کہہ رہے تھے ضد کر کے آگئے ہیں"۔

"اچھا" وہ انیکسی کی طرف بڑھ گئی۔ انیکسی کا

دروازہ کھلا تھا اندر روم کی لائیٹ جل رہی تھی۔ وہ صحن عبور کر کے کمرے کے دروازے تک آئی۔ اور دروازے کے پاس رک گئی۔ پتا نہیں وہ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں پھر اسے پہلے دن کا ارحم کا ردعمل یاد آیا تو دستک دیتے دیتے جھجک گئی۔ تب ہی اندر سے ڈاکٹر خالد کی آواز آئی۔

"کمال ہے یار یعنی وہ تمہاری کچھ نہیں لگتی"۔

"ہاں بتایا تو ہے وہ بیگم راحت کی بھتیجی ہے۔ میری کچھ نہیں ہے"۔ یہ ارحم کی آواز تھی جھنجلائی ہوئی سی۔

"کاش وہ تمہاری کچھ ہوتی تو مجھے خوشی ہوتی بہت" ڈاکٹر خالد کی آواز میں شرارت تھی۔

"بکو مت"

"مجھے یقین نہیں آرہا ارحم جس طرح وہ تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی اور..." عینا کا ہاتھ دروازے کی ناب پر تھا۔

"بند کرو یہ قصیدہ خالد۔ مجھے خواتین اور ان کے مکر سے نفرت ہے... تم ایسے ڈراموں سے متاثر ہو سکتے ہو میں نہیں"۔ عینا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ تیزی سے واپس مڑی' لیکن غیر ارادی طور پر دروازے پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھا اور دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور اس کھلے دروازے سے ڈاکٹر خالد نے عینا کو واپس پلٹتے دیکھا۔

"اوہ میرے خدا۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"مس پلیز ایک منٹ رکیں۔" لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیز تیز چلتی ہوئی داخلی دروازے تک پہنچ چکی تھی جب ڈاکٹر خالد نے اس کے دائیں طرف سے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

"مس پلیز ایک منٹ میری بات سن لیں۔ اگر آپ میری وجہ سے جارہی ہیں تو میں جانے ہی والا تھا"۔

"آپ کی وجہ سے۔" اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"نہیں۔" اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔

"احمق... الو..." اس نے با آواز بلند کہہ کر باقی بات دل میں سوچی اتنی اچھی لڑکی کو ناراض کر دیا' عینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"وہ... میرا مطلب ہے وہ ارحم ایک دم الو ہے" وہ سٹپٹایا۔

"جو کچھ منہ میں آئے بک دیتا ہے۔ آپ ضرور اس کی بات سے ہرٹ ہوئی ہیں۔ دراصل اس نے جو کہا اس کا وہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا اب میں جاؤں۔"

"اوہ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ تھینک یو"۔ "وہ دروازے سے ہاتھ ہٹا کر واپس مڑا۔ چند قدم بڑھائے پھر مڑ کر دیکھا وہ جا چکی تھی۔ ارحم بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جب ڈاکٹر خالد نے اندر قدم رکھا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑے تاسف سے سر ہلایا۔

"اتنی اچھی لڑکی کو ناراض کر دیا۔ کیا ضروری تھا کہ تم اپنے گولڈن خیالات کا اظہار اسی وقت کرتے۔ اب نہیں کرے گی وہ تمہاری خدمت۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے خدمتیں کروانے کا۔" وہ جھنجلایا۔

"مجھے تو تھا نا کہ وہ تمہاری خدمت کرے۔ تمہارا خیال رکھے اور ایک دن تم اس کی خدمت سے متاثر ہو کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاؤ اور پھر... ہیپی اینڈ"۔

"اب میں پہلے جیسا احمق نہیں رہا خالد حیات اور ہر محبت کا اینڈ ہیپی نہیں ہوتا۔ بہت سی محبتوں کا انجام بہت المناک ہوتا ہے۔"

"ویسے ایک بات کہوں یہ لڑکی بھلے بیگم راحت کی بھتیجی ہو لیکن مجھے اس کی آنکھوں میں اخلاص نظر آیا۔ کوئی دھوکا یا فریب نہیں دکھا مجھے۔"

وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"بہت رو رہی تھی وہ' تمہارے الفاظ نے ہرٹ کیا اسے ہو سکے تو سوری کر لینا"۔

"تم نے سوری کر لیا نا' کافی ہے"۔

"اوکے میں اب چلتا ہوں" ڈاکٹر خالد کھڑا ہو گیا۔

"کل چکر لگاؤں گا۔ دوائی یاد سے ٹائم پر لے لینا۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو فون کر لینا۔ اب اگر غیروں جیسا سلوک کیا نا تو گردن توڑ دوں گا آگر تمہاری۔" ارحم کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمہیں کیا پتا ڈاکٹر خالد حیات' اپنائیت اور اپنوں نے کتنا زخم زخم کیا ہے مجھے۔" ڈاکٹر خالد کے جانے کے بعد اس نے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ اور ہمیشہ کی طرح بند آنکھوں کے سامنے چھم کر کے وہ آگئی۔

"میں تمہیں بھول کیوں نہیں جاتا چاندنی۔ یہ کیسی محبت ہے میری' جو تمہاری بے وفائی کے باوجود دل سے نہیں نکلتی۔" اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور بند آنکھوں کے پیچھے آنسو مچلنے لگے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے ان آنسوؤں کو بہنے نہ دیا اور بر قاب کر کے اپنے اندر اتار لیا۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں...

تپتے صحراؤں کی طرح جہاں برسوں سے پانی کی بوند تک نہ گری ہو۔

زندگی مما کے بعد بہت خاموش اور چپ چپ گزرنے لگی تھی۔ لیکن ایک لگی بندھی روٹین لائف۔ گھر' کالج' یونیورسٹی' ڈیڈی سے دو چار باتیں اور پھر اپنا کمرہ' کتابیں' کمپیوٹر اور بس۔

اتنی ہی سی تھی زندگی اس کے لیے محدود سی پھر وہ آگئی اس کی زندگی میں۔

اور دنوں میں اسے اپنا اسیر کر لیا۔ وہ صرف اس کے دل پر ہی نہیں ہر چیز پر ہی حکومت کرنے لگی۔

وہ کھل کر ہنستا۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ڈیڈی سے گپ لگاتا' گھومنا' کالج اور یونیورسٹی کے ساتھیوں سے ملنا' لمبی ڈرائیو پر جانا' شاپنگ کرنا' سب نیا نیا لگتا جیسے مما کے بعد وہ ہنسنا بھول گیا تھا۔ بلکہ کسی بھی چیز پر خوش ہونا بھول گیا تھا۔ سب کچھ نارمل سا لگتا۔ لیکن اب ہر بات اسے خوش کرتی وہ ہر شے انجوائے کرتا۔ سب بہت خوب صورت تھا۔ لیکن پھر سب کچھ ختم ہو گیا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا جو اچانک آنکھ کھلنے سے ختم ہو گیا۔ کوئی بہت خوب صورت منظر تھا۔ جس کا وہ خود بھی حصہ تھا اور پھر یہ خوبصورت منظر غائب ہو گیا۔ اور وہ تپتے صحرا میں کھڑا رہ گیا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ باہر شام اتر آئی تھی... اور ملگجا اندھیرا ہولے ہولے گہرا ہو رہا تھا وہ بہت دیر تک یونہی باہر دیکھتا رہا۔ کھڑکی کے سامنے کینو کے درخت تھے اور ایک غالباً" لیموں کا پیڑ بھی تھا۔ ہمیشہ کی طرح شام کی اداسی اس کے دل میں اترنے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پتا نہیں شامیں اتنی اداس کیوں ہوتی ہیں۔ گہری اداسی میں لپٹی دن کے ہنگاموں سے الگ اور مختلف۔

وہ یکدم دروازہ کھول کر باہر نکلا اور انیکسی کا چھوٹا سا صحن عبور کر کے دروازہ کھول کر لان میں آگیا۔ باہر اچھی خاصی خنکی تھی۔ اسے ابھی ٹمپریچر تھا اور سینے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ ایک لحہ کے لیے وہ ٹھٹکا اس نے سوچا وہ واپس اپنے کمرے میں چلا جائے... اسے یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا تھا... اور جتنی جلدی اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی اتنی جلدی وہ واپس جا سکتا تھا۔ لیکن اس گہری ہوتی اداس شام میں کمرے میں خاموش بیٹھ کر ماضی کو یاد کرنا اور اس کو سوچنا بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا لان چیئرز تک آیا اور بیٹھ گیا۔ خدا بخش گیٹ پر نہیں تھا ورنہ اس نے سوچا تھا کہ وہ کچھ دیر خدا بخش سے باتیں کرے گا تو دل پر دھرا بوجھ کچھ کم ہو گا۔

وہ اپنے دھیان میں ادھر ادھر دیکھے بغیر بیٹھ گیا تھا اور اس نے ذرا فاصلے پر موجود سنگی بینچ پر بیٹھی عینا کو نہیں دیکھا تھا۔ جو جانے کب سے وہاں بیٹھی تھی۔ اور اسے بیٹھتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ تھی یا ویسے ہی اسے وہاں کسی کے موجود ہونے کا احساس ہوا تھا کہ اس نے سر اٹھا کر اس

کی طرف دیکھا۔ گیٹ پر جلنے والے لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ایک لمحہ کو اسے لگا جیسے اس کی پلکیں اب بھی بھیگی بھیگی ہوں۔۔۔ اس کے کانوں میں خالد کی آواز آئی۔۔۔ بہت رو رہی تھی وہ۔۔۔ تو کیا وہ اس وقت سے اب تک رو رہی ہے۔۔۔ اسے افسوس ہوا وہ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چاہے وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اندر سے اتنا ہی نرم دل تھا۔ اس نے پھر اسے دیکھنا چاہا لیکن اس نے قدم بڑھا دیا تھا اور اب اس کا چہرہ روشنی کی زد میں نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور رخساروں پر بھی سرخی تھی جیسے اس نے رگڑ کر آنسو پونچھے ہوں۔

"عینا!"

وہ بے اختیار کھڑا ہو کر دو قدم بڑھا کر اس کے قریب آیا جو اس کے بلانے پر رک گئی تھی۔

"سوری عینا۔۔۔ میرے کسی جملے سے آپ کو تکلیف ہوئی ہو تو میں معذرت خواہ ہوں۔۔۔ خاص طور پر میں نے آپ کے لیے وہ جملہ نہیں کہا تھا ایک نارمل بات کی تھی۔۔۔ میں شاید ایسا ہی سمجھتا ہوں یا مجھے ایسا ہی باور کرایا گیا۔ نارملی میرا یہ رویہ خواتین کے ساتھ کچھ درشت اور باغیانہ ہو جاتا ہے جسے میں خود بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن حالات نے مجھے ایسا ہی کر دیا ہے۔"

"لیکن ارحم بھائی مجھے آپ کے رویے سے دکھ ہوا۔

میں نہیں جانتی آپ ایسے کیوں ہو گئے ہیں۔ آپ ایسے تو بالکل بھی نہیں تھے۔" کسی یاد نے اس کے دل میں چٹکی لی۔

"وقت کے ساتھ آدمی بدل جاتا ہے عینا۔۔۔ میں بھی بدل گیا ہوں۔۔۔ مجھے پچھلا کچھ یاد نہیں کہ میں کیسا تھا۔ مجھے لگتا ہے میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا منہ پھٹ اور بدتمیز، لیکن میں جان بوجھ کر کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ مجھے دوسروں کا خود سے زیادہ خیال رہتا ہے۔ آپ کو بھی انجانے میں تکلیف پہنچا بیٹھا اس کے لیے سوری۔"

"ارحم بھائی پلیز آپ اس طرح سوری مت کریں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میں جانتی تو نہیں ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوا شاید پھپھو نے آپ کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کیا ہو۔ اس لیے آپ مجھے ان کے حوالے سے دیکھتے ہیں"۔

"سوتیلی ماں کا سا برتاؤ"۔ ارحم نے تلخی سے سوچا۔

"تم کیا جانو تمہاری پھپھو نے تو میرا دل چیر کر میرے زخموں پر مرچیں اور نمک چھڑک دیا اور میں اذیت سے تڑپتا ہوں آج تک۔۔۔"

اندر سے شاید حمیدہ نے پورچ کی لائیٹ جلائی تھی۔ دونوں نے ہی بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عینا کی بھیگی پلکیں اور آنکھوں سے نیچے موجود سرخی اس کے رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ ارحم نے ایک گہری سانس لے کر اس اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو یکایک ہی پورے وجود میں اتر آئی تھی اور آہستگی سے کہا۔

"آپ پلیز اب روئیے گا مت۔۔۔ آپ کے آنسو میرے جرم کی گواہی ہیں اور میں اس پر شرمندہ ہو چکا۔" وہ یکدم مڑا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ عینا وہاں ہی کھڑی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور آہستہ سے پکارا۔

"ارحم بھائی۔۔۔ یہاں کافی ٹھنڈ ہے اور آپ بیمار ہیں۔۔۔ پلیز اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ آپ کی طبیعت کہیں پھر خراب نہ ہو جائے"۔

"چلا جاؤں گا پلیز عینا آپ جائیں"۔ وہ اسے پھر ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ عینا چند لمحے وہاں مزید کھڑی رہی۔

"آپ ضرور جلدی چلے جائیے گا۔ یہ ٹھنڈ آپ کے لیے بہت نقصان دہ ہے"۔

اس بار اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ عینا بھی لمحہ بھر رک کر اندر چلی گئی۔ عینا چلی گئی تھی لیکن وہ بہت دیر تک وہاں ہی بیٹھا رہا۔

بڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔۔۔ اور یہ درد لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر گر گیا۔

کچھ دیر وہ یونہی پڑا درد برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر مشکل سے اٹھ کر اس نے میڈیسن لیں۔

یہ میڈیسن اسے تین گھنٹے پہلے لینی تھیں۔ دوا کھا کر وہ بستر تک آیا تو اس پر باقاعدہ کپکپی ۔ طاری ہو چکی تھی کمبل کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے شدت سے خواہش کی کہ کاش خدا بخش آ جائے یا اکرم کوئی بھی اور کہیں سے الیکٹرک ہیٹر ہی آ کر لگا دے یہاں انیکسی میں گیس ہیٹر نہیں تھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنے موبائل کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اٹھایا ہی تھا کہ وہ بج اٹھا۔ دوسری طرف خالد تھا۔

"ہے کیسے ہو۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"شدید سردی اور درد سے بے حال ہو رہا ہوں۔"

"او کے میں آ رہا ہوں۔" اس نے آنکھیں موند کر سر تکیے پر رکھ دیا۔ وہ آ رہا تھا تو ضرور ہیٹر بھی لگا دے گا اور درد کم کرنے کی کوئی دوا بھی دے گا۔ یہ آخری خیال تھا جو اس کے ذہن میں آیا تھا۔ پھر اسے یاد نہیں تھا کہ کب خالد آیا تھا اور اس نے کیا کہا تھا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے خالد کو دیکھا تھا جو قریب ہی آرام کرسی پر سر رکھے اور ٹانگیں پھیلائے سو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے اپنی طبیعت کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ خالد غالباً" رات بھر یہاں ہی رہا ہے۔

وہ بیڈ سے نیچے اترا۔ آہٹ پر خالد نے آنکھیں کھولیں۔

"کیسی طبیعت ہے۔"

"اب تو کافی بہتر لگ رہی ہے۔" وہ واش روم جاتے جاتے رک گیا۔

"ہاں بس آج بھی تین چار گھنٹے باہر بیٹھ جانا رات کو مزید بہتر ہو جائے گی۔" خالد رات بہت دیر تک جاگا تھا اور چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا۔"

"موکلوں نے بتایا ہے۔" اس نے اٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے باہر دھوپ کی روشنی تھی۔

"تمہارا ناشتا آ رہا ہے۔ تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ تاکہ میں تمہیں تمہاری دوا کھلا کر گھر جاؤں۔"

بائے داوے یہ ناشتا کون لا رہا ہے کیا خود چل کر آ رہا ہے۔"

"نہیں بے۔۔۔ وہ تمہاری کزن۔۔۔ میرا مطلب ہے بیگم راحت کی بھتیجی لا رہی ہیں رفیق کے ساتھ۔"

"کیا مطلب۔"

"اب تیوریاں مت چڑھاؤ۔ رات بارہ بجے تک وہ یہاں ہی بیٹھ کر تمہارے سر پر پٹیاں رکھتی رہی میرے آنے کے کچھ ہی دیر بعد رفیق تمہارے لیے یخنی اور ڈبل روٹی لایا تھا۔ اس نے ہی جا کر بتایا تو وہ آ گئی۔" وہ بغیر کچھ کہے مڑا۔

"یار ہر ایک کو ایک ہی عینک لگا کر مت دیکھو وہ ایک مخلص سی معصوم سی لڑکی ہے اور دیکھو پلیز اب اس کے ساتھ مس بی ہیو مت کرنا۔"

وہ سر ہلا کر واش روم میں گھس گیا۔ تب ہی عینا اندر آئی۔ اس کے پیچھے رفیق تھا جس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔

"ارحم بھائی کیسے ہیں اب۔۔۔"

"بہتر ہیں۔" ڈاکٹر خالد مسکرایا۔ رفیق ٹرے ٹیبل پر رکھ کر جا چکا تھا۔

"اور آپ کیسی ہیں۔"

"جی میں ٹھیک ہوں۔"

"تو عینا بی بی آپ اب اپنے مریض کو سنبھالیں اور مجھے دیں اجازت۔"

"میں کیسے۔۔۔" وہ گھبرائی۔

"اور آپ ناشتا کر لیں۔ میں آپ کا ناشتا بھی لائی تھی۔" وہ جلدی سے ٹیبل کی طرف بڑھی۔

"چلیں آپ اتنے خلوص سے کہہ رہی ہیں تو ناشتا کرلیتا ہوں یوں بھی ہم خلوص کی قدر کرنے والے لوگ ہیں آپ کے ارحم بھائی کی طرح بے قدرے نہیں ہیں۔" اس نے واش روم سے باہر آتے ارحم کو دیکھ کر بائیں آنکھ کا کونا دبایا۔

"خبیث۔" ارحم نے دل ہی دل میں کہا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کیسے ہیں اب ارحم بھائی رات تو آپ نے پھر پریشان کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ شاید پھر ہاسپٹلائز کرنا پڑے۔"

وہ سادگی سے کہہ رہی تھی اور ڈاکٹر خالد ارحم کی طرف دیکھتے ہوئے ہولے ہولے مسکرا رہا تھا۔

"سوری عینا آپ کو میری وجہ سے رات پریشانی ہوئی۔" ارحم بے حد سنجیدہ تھا اسے خالد کا مسکرانا بہت کھل رہا تھا۔

"نہیں نہیں ارحم بھائی اس میں سوری کی کیا بات ہے۔"

عینا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں رکے یا چلی جائے کہ ارحم نے اس کی مشکل آسان کردی۔

"عینا آپ تھکی ہوئی لگ رہی ہیں جاکر آرام کریں بلکہ سو جائیں۔ رات دیر تک آپ کو جاگنا پڑا۔"

"جی۔" عینا تیزی سے مڑی لیکن پھر دروازے کے پاس رک کر ڈاکٹر خالد کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب دوپہر میں میرا مطلب ہے کھانے میں کیا بناؤں۔"

"میرا خیال ہے آج یخنی اور پھلکا یا سلاد ٹس ہی بہتر رہیں گے۔"

"نہیں عینا پلیز میرے لیے تکلیف مت کیجیے گا میں خود کچھ کرلوں گا۔"

"ارحم بھائی جب تک آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوجاتی آپ کا کھانا وغیرہ اندر سے آئے گا بعد میں خود پکانے کا شوق پورا کرتے رہیے گا۔"

"واؤ۔" خالد نے آملیٹ سلائس پر رکھ کر اس کا رول بناتے ہوئے ارحم کی طرف دیکھا جو اسے ہی گھور رہا تھا۔

"یہ تمہارے دانت کس خوشی میں نکل رہے تھے؟"

"تمہاری خوشی میں جو تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔"

"بکو مت اور الٹے سیدھے اندازے مت لگاؤ۔"

"چلو نہیں لگاتے اندازے۔" اس نے شرافت سے کہا اور کھڑا ہوگیا۔

"ارے کہاں جارہے ہو ناشتا تو کرلو مکمل۔"

"لو ایک اور آگئی۔" وہ اپنے فون کی طرف دیکھ رہا تھا جو بلنک کر رہا تھا۔

"کیا؟" ارحم نے حیرت سے پوچھا۔

"میری بیوی کی مس کال۔ رات سے سائلنس پر ہے ورنہ تم سونہ پاتے۔ تو میری جان میں چلا تم ناشتے کے بعد دوائیاں سب یاد سے لے لینا۔ میری بیوی پہلے ہی ان دو تین دنوں میں خاصی مشکوک ہوچکی ہے۔ آج رات ہرگز نہیں آنے دے گی خبردار آج بیمار ہونے کی کوشش مت کرنا اور اگر تمہارا رات باہر گزارنے کا پروگرام ہے تو مجھ غریب کی خاطر اسے کینسل کردو۔ ورنہ تمہاری بھابھی۔ ہائے۔ تم جانتے ہونا۔" اس نے چائے کا ایک بڑا گھونٹ بھرا اور باہر کی طرف لپکا۔

ارحم کا ناشتے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے ایک کپ دودھ پی کر دوا لے لی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات بھر سوتا رہا تھا پھر بھی آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سوگیا تھا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو عینا رفیق کو ناشتے کے برتن اٹھانے کا کہہ رہی تھی۔ شاید اس کی آنکھ اس کی آواز سے کھلی تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے تکیے کے پاس پڑی ریسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔

"اوہ میں اتنی دیر سویا۔" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اس کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور درد بھی نہیں ہورہا تھا۔ عینا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"کافی بہتر لگ رہی ہے۔"

"آپ ناشتا کیے بغیر ہی سوگئے تھے۔ میں کھانا لائی ہوں آپ کے لیے۔"

"شکریہ مجھے اس وقت بھوک محسوس ہورہی تھی۔" اس نے پاؤں بیڈ سے نیچے رکھے۔

"ارے آپ تو پسینے میں بھیگے ہوئے ہیں۔ میں باہر جارہی ہوں آپ اچھی طرح پسینہ صاف کرکے چینج کرلیں۔ اماں کہتی ہیں پسینے میں ہوا لگ جائے تو درد جوڑوں میں بیٹھ جاتے ہیں۔" اس نے سرہلا دیا۔

"میں نے دیسی چوزے کی یخنی کے ساتھ مونگ کی پتلی تڑکے والی دال بنوائی ہے معمولی نمک مرچ ڈال کر ساتھ پھلکے ہیں۔"

ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔

"تو یہ اس کی خوشبو تھی جس نے مجھے بھوک کا احساس دلایا۔"

"اکرم پھپھو کو ایئرپورٹ پر لینے گیا ہوا ہے آپ کھانے کے بعد دوا ضرور کھا لیجیے گا پلیز۔" یکدم ہی اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

"ٹھیک ہے لیکن عینا پلیز۔ آپ اب مت آیئے گا اور مزید تکلیف مت کیجیے گا۔ بیگم راحت کو پسند نہیں آئے گا اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں مزید کوئی کہانی کری ایٹ (تخلیق) کرنا پڑے۔" عینا نے ایک نظر اسے دیکھا اور بنا کچھ کہے باہر نکل گئی بہرحال ابھی وہ بیگم راحت کے ردعمل کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی لیکن اتنا بہرحال اسے اندازہ تھا کہ وہ پسند نہیں کریں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ انہوں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہی سب سے پہلی بات یہی کہی تھی۔

"سنا ہے بڑی خدمتیں ہورہی ہیں ارحم کی۔ سمجھایا تھا تمہیں کہ اس سے دور رہو۔"

"جی پھپھو وہ میں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں آپ بھی گھر پر نہیں تھیں تو میں ساتھ اسپتال چلی گئی تھی تھوڑی دیر کے لیے بہت طبیعت خراب تھی۔ کوئی ڈاکٹر خالد تھے وہ ہی لے کر گئے تھے ساتھ انہیں۔"

وہ تیز تیز بولتی جارہی تھی کہ بیگم راحت نے اسے ٹوک دیا۔

"اور تم مجھے فون پر نہیں بتاسکتی تھیں۔ جانتی ہو فراز کتنے ناراض ہوئے میری بے خبری پر۔"

"میں آپ کو بتانے ہی لگی تھی کہ آپ نے فون بند کردیا اور اس کے بعد دونوں بار آپ کی بات حمیدہ سے ہوئی اور حمیدہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ وہ آپ کو نہیں بتاسکی۔"

"خیر مجھے تو فراز نے ساری تفصیل بتائی اور میں ایک ضروری میٹنگ چھوڑ کر آئی ہوں کہ فراز کا اصرار تھا۔ ورنہ وہ خود آجاتے جبکہ وہاں کا مسئلہ ابھی الجھا ہوا ہے۔" وہ بات کررہی تھیں کہ ان کا سیل بجنے لگا۔

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا حمیدہ نے ڈائننگ پر پڑا فون اٹھا کر انہیں دیا۔

"وہاں ٹھیک ہے بالکل آپ کو پتا تو ہے فراز اسے بچپن سے ہی ڈراما کرنے کی عادت ہے۔" وہ بات کرتے کرتے اپنے بیڈ روم کی طرف جارہی تھیں۔ "ابھی میں شام کو باہر سے آئی تو خالد کے ساتھ باہر جارہا تھا۔ سلام کرنے کی توفیق تک نہ ہوئی۔ آپ یوں ہی پریشان ہورہے تھے۔"

"ڈراما۔ وہ ڈراما تو ہرگز نہیں تھا ارحم کی حالت کتنی خراب تھی ڈاکٹر خالد بھی کتنے پریشان تھے۔ اتنا شدید اٹیک ہوا تھا نمونیے کا۔"

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے سوچا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں فراز۔ ڈیل مکمل کرکے ہی آیئے گا۔ میں آتو گئی ہوں نا۔"

"نہیں۔ نہیں ابھی تو ہفتہ بھر یہاں ہی ہوں سعید صاحب دوبارہ میٹنگ کی ڈیٹ بتائیں گے تو ہی جاؤں گی فکر نہ کریں بچہ نہیں ہے وہ اپنا خیال رکھ سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں عینا نے بہت خیال رکھا۔ بہت اچھی بچی ہے۔" وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھیں۔ عینا کچھ دیر کھڑی رہی اس کا جی چاہ رہا تھا وہ جاکر ارحم کا حال پوچھے لیکن۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جانتی تھی کہ وہ اس طرح بیگم راحت کی موجودگی میں ارحم کی انیکسی میں نہیں جاسکتی تھی۔ پھر ارحم کا بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ کب کس وقت اس کا کیا موڈ ہو۔ اگر دو چار بار اس نے اس سے بات کرلی تھی تو ضروری نہیں تھا کہ وہ پھر بھی بات کرلیتا یوں بھی اس نے خود بھی تو منع کیا تھا وہاں آنے سے اس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر اگلے کئی دن تک وہ بے حد مصروف رہی تھی۔

یونیورسٹی اور اس کا ماحول اس کے لیے بالکل نیا تھا پھر روحی جیسی دوست مل گئی تو اس کا اعتماد ذرا سا بحال ہوا وہ سارا وقت روحی کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ان سارے مصروف دنوں میں اس نے ارحم کو نہیں دیکھا تھا، لیکن کئی بار ارحم کا خیال ضرور آیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیسا ہوگا۔ اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی یا نہیں۔ پتا نہیں وہ یہاں ہے چلا گیا ہے۔ اس رات پڑھتے پڑھتے اسے خیال آیا تو وہ اٹھ کر بالکونی میں آئی انیکسی کی لائٹ جل رہی تھی۔

"تو ارحم بھائی ابھی یہاں ہی ہیں۔" اس نے سوچا کل یونیورسٹی سے آکر وہ صرف خدا بخش سے ان کی طبیعت کا پوچھے گی۔ صبح تو بیگم راحت اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ واپسی پر ڈرائیور اسے لے کر آتا تھا۔ تب ہی اس نے انیکسی سے بیگم راحت کو نکلتے دیکھا تو پریشان ہوگئی۔ کیا ارحم بھائی کی طبیعت خراب ہے۔ اتنے دنوں میں پہلی بار اس نے بیگم راحت کو ارحم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ ڈنر کے بعد باہر لان میں کچھ دیر واک کرتی تھیں یہ ان کا معمول تھا۔ کبھی تو وہ بھی ان کے ساتھ چلی جاتی اور کبھی اپنا پسندیدہ ڈراما دیکھنے کے لیے بیٹھ جاتی تھی۔ آج وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ لیکن اب اس کا پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا اس لیے لائٹ آف کرکے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر بیگم راحت نے اسے بتایا کہ آج دس بجے کی فلائٹ سے وہ کراچی جارہی ہیں۔ دس بارہ دن لگ جائیں گے۔ وہ صائم اور انکل فراز کے آنے سے پہلے یقیناً" واپس آجائیں گی۔ اسے صائم کے آنے کا سن کر خوشی ہوئی تھی۔ فون پر دو تین بار اس کی بات صائم سے ہوئی تھی تو اس نے بہت بے تکلفی سے بات کی تھی اور کیا پتا وہ یہاں آئے تو ارحم بھی انیکسی سے اندر گھر میں آجائے۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے ارحم صائم کے آنے سے پہلے ہی واپس چلا جائے اس روز وہ ڈاکٹر خالد سے کہہ تو رہا تھا کہ جیسے ہی اس کی طبیعت ٹھیک ہوتی ہے وہ چلا جائے گا وہ اپنی باقی چھٹیاں شاید امریکہ میں گزارے۔

یونیورسٹی سے واپس آکر وہ اندر جانے کے بجائے انیکسی کی طرف آگئی تھی۔ لیکن انیکسی کے دروازے پر وہ جھجک کر رک گئی۔

کہیں ارحم بھائی میرے آنے پر ناراض نہ ہوجائیں وہ مجھے بالکل اچھا نہیں سمجھتے۔ مجھے خدا بخش چاچا سے ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔

اس نے اپنے شولڈر بیگ کو دائیں کندھے سے بائیں پر منتقل کیا۔ تب ہی دھوپ میں آرام کرسی پر نیم دراز ارحم نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ انیکسی کے باہر دائیں طرف آرام کرسی بچھائے۔ کافی دیر سے دھوپ میں نیم دراز تھا۔ وہ رخ موڑے عینا کو دیکھ رہا تھا جب عینا واپس پلٹنے کا ارادہ کرتے ہوئے مڑی تو اس کی نظر اپنی طرف تکتے ارحم پر پڑی۔

"ارے ارحم بھائی آپ یہاں ہیں۔؟" وہ سب کچھ بھول کر اس کی طرف بڑھی۔ ارحم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔"

"ٹھیک ہوں۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"وہ دراصل رات میں نے پھپھو کو انیکسی سے باہر آتے دیکھا تھا تو پریشان ہوگئی تھی کہ کہیں آپ کی طبیعت پھر زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی۔ آپ کو برا لگا ہو تو سوری۔"

وہ جلدی جلدی وضاحت دینے لگی تو ارحم نے بغور اسے دیکھا۔

"آپ کی پھپھو یعنی بیگم راحت آپ کے خیال میں میری طبیعت کی خرابی کا جان کر میری مزاج پرسی یا تیمارداری کے لیے آئی تھیں۔ واؤ۔ اس سے بڑا لطیفہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"وہ تو شاید میری موت کی خبر سن کر بھی نہ آئیں بلکہ شکرانے کے نفل پڑھنے لگیں گی۔" اس کے لبوں پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

"نہیں پھپھو ایسی نہیں ہیں۔" اس نے کہا نہیں تھا لیکن سوچا ضرور تھا اور اس سوچ کو جیسے ارحم نے پڑھ لیا تھا۔

"آپ کی پھپھو ایسی ہی ہیں عینا بی بی۔" اس کے لب بھنچ گئے تھے۔

"وہ یہاں صرف اس لیے آئی تھیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں وہ مجھے سمجھا رہی تھیں کہ میرا یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ ڈیڈی دو تین ماہ تک واپس نہیں آسکتے۔"

"لیکن انکل اور صائم تو پندرہ دنوں تک آرہے ہیں۔" عینا کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"لیکن بیگم راحت نے مجھے باور کرایا تھا کہ مجھے اب خوامخواہ ان کے انتظار میں نہیں رکنا چاہیے۔"

"تو۔ تو آپ چلے جائیں گے۔ انتظار نہیں کریں گے انکل کا۔"

"ارادہ تو یہی تھا کہ کل تک نکل جاؤں گا لیکن۔۔۔" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

"آپ کو نہیں جانا چاہیے ارحم بھائی۔ صائم تو صرف آپ کی وجہ سے آرہا ہے ورنہ اس کا ارادہ ان چھٹیوں میں فرانس جانے کا تھا اور انکل بھی۔ پتا نہیں پھپھو نے رات کو جب آپ کو بتایا ہوگا تو انہیں علم نہیں ہوگا لیکن صبح انہوں نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ انکل اور صائم کے آنے سے پہلے واپس آجائیں گی۔"

"کیا بیگم راحت کہیں گئی ہوئی ہیں۔"

"ہاں وہ دس بارہ دن کے لیے کراچی گئی ہیں۔"

"اوہ۔" ارحم نے ہونٹ سکیڑے۔

"تب ہی آپ یہاں اتنی دیر سے۔" عینا جھینپ گئی۔

"وہ آپ نے خود ہی تو منع کیا تھا۔" ارحم خاموش رہا تو عینا نے اس کی طرف دیکھا۔

"تو آپ کل چلے جائیں گے۔"

"نہیں۔ میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔" عینا ایک دم خوش نظر آنے لگی۔

"یہ آپ نے اچھا کیا۔ تب تک آپ کی طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ کتنے کمزور ہوگئے ہیں آپ۔" ارحم نے کسی قدر حیرت سے عینا کی طرف دیکھا۔ یہ سحر کی بہن تھی۔ لیکن اس سے کس قدر مختلف سادہ اور بے ریا سی۔

"اچھا ارحم بھائی میں چلتی ہوں۔" وہ جانے کے لیے مڑی۔ اور پھر رخ موڑ کر اسے دیکھا اور جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ارحم بھائی آپ کے لیے یخنی یا سوپ بنوا دوں۔ دیسی چکن یا پھر میٹ گردن کے گوشت کی یخنی اچھی ہوتی ہے۔"

ارحم نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت آس سے دیکھ رہی تھی۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سر ہلا دیا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ بیگم راحت کی بھتیجی اور سحر جلال کی بہن تھی۔ عینا کے چہرے پر یکدم خوشی کے رنگ بکھر گئے تھے۔

"تھینک یو ارحم بھائی۔ اور کچھ کھانے کو جی چاہتا ہو تو بتا دیں۔"

"نہیں تھینک یو۔"

"عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔" ارحم نے اس کے جانے کے بعد پھر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے سر کرسی کی پشت پر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اسے یہاں نہیں رہنا تھا۔ وہ ڈیڈی سے ملے بغیر جانا چاہتا تھا لیکن جس طرح بیگم راحت نے اسے فورس کیا تھا کہ وہ چلا جائے اس نے اسے چڑا دیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اب وہ یہاں ہی رہے گی چاہے اسے ایک ماہ کی مزید چھٹی بھی لینی پڑے۔ وہ ان کی چڑچڑاہٹ سے محظوظ

ہوا تھا۔

"میں اگر نہ جانا چاہوں تو کیا آپ مجھے یہاں سے دھکے دے کر نکال دیں گی یا پھر کوئی ڈراما کریں گی پہلے کی طرح۔" وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بڑے سکون سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جو نہ جانے کیسے خود پر قابو پائے وہاں کھڑی تھیں۔ اس نے انہیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا اور نہ ہی ان کے احترام میں اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اسے اب ان ساری باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہاں وہ انہیں اندر آتے دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا۔

وہ جز بز ہوئی تھیں۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں نکالنے کی۔ میں نے تو اس لیے پوچھا تھا جانے کا کہ اگر تم اپنے ڈیڈی کا انتظار کر رہے ہو تو فراز حسین کام میں پھنس گئے ہیں تین چار ماہ سے پہلے نہیں آسکتے۔ سو تمہارا چند دن مزید رکنا بے کار ہے۔ ہاں اگر تین چار ماہ تک رہ سکتے ہو تو۔۔۔"

"تھینک یو بیگم راحت اطلاع دینے کا شکریہ۔ اور مجھے اپنا وقت ضائع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے جب اس نے نگاہ اٹھا کر بیگم راحت کی طرف دیکھا تھا تو ان کے چہرے پر پھیلنے والی بے ساختہ خوشی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی اور اس کے اندر کوئی شعلہ سا بھڑکا تھا۔ "ہرگز نہیں" دل نے کہا تھا۔

"تم بیگم راحت کی خواہش پوری نہ کرو اور یہاں ہی رہو ڈیڈی کے آنے تک۔"

بیگم راحت مطمئن سی چلی گئی تھیں اور اس نے اٹھ کر پیک کیے ہوئے کپڑے اٹیچی سے نکال کر پھر وارڈروب میں لٹکا دیے تھے۔ کبھی کبھی یوں ہی اس کا دماغ خراب ہو جاتا تھا۔ اور اب نہ صرف یہ کہ اپنا جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا بلکہ راحت بیگم کی بھتیجی کی دعوت بھی قبول کر لی تھی۔ اور سوچ لیا تھا کہ جتنے دن وہ یہاں ہے کھانا اندر سے ہی منگوائے گا۔ اور بیگم راحت کو جب پتا چلے گا تو خوب تلملائیں گی۔ اور کیا اس گھر پر میرا حق نہیں ہے۔ لیکن یہ حق میں نے خود ہی چھوڑ دیا تھا۔

جب ڈیڈی کی بیماری پر وہ آیا تھا تو اس نے خود ہی اپنے لیے انیکسی منتخب کی تھی۔ ڈیڈی ناراض بھی ہوئے تھے اور انہیں اس کا انیکسی میں رہنا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ اس عورت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جسے اس نے ماں کا ہی درجہ دیا تھا لیکن جو ماں نہیں تھی۔ "تمہارا کمرہ ایسے ہی ہے جیسا تم چھوڑ کر گئے تھے۔

ارحم۔ تم اپنے کمرے میں کیوں نہیں رہتے۔"

"ڈیڈی پلیز میں آگیا ہوں آپ کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے۔ میں ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔"

"ایسا مت کرو ارحم۔ یہ گھر تمہارا ہے اس پر صرف تمہارا حق ہے۔ کیونکہ یہ تمہاری ماں کے نام ہے۔"

"میں نے اپنے سب حقوق چھوڑ دیے تھے ڈیڈی اس رات جب آپ نے کہا تھا آپ کا صرف ایک بیٹا ہے اس رات میں آپ کا بیٹا نہیں رہا تھا۔"

"میں اس رات کے لیے۔۔۔"

"پلیز ڈیڈی آپ نے کہا تھا کہ آپ ماضی کی کوئی بات نہیں کریں گے۔"

اس روز ہی ڈیڈی اسپتال سے گھر آئے تھے اور وہ اسے بہت کمزور لگ رہے تھے۔ اور اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ان سے رابطہ رکھے گا اور آتا رہے گا۔ صرف ان کے لیے۔ ورنہ ان کے کاروبار، دولت اور جائیداد سے اسے کوئی واسطہ نہیں وہ بیگم راحت اور صائم کو مبارک ہو۔

وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور تیز تیز چلتا ہوا انیکسی کے دروازے کو دھکیلتا اندر چلا گیا۔

☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عرفان کے آنے کا وقت تھا' میں جلدی جلدی اپنے کام نبٹانے میں مصروف تھی۔ سنک پر موجود آخری برتن دھونے کے بعد میں اپنا ہاتھ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کچن سے باہر نکلی۔ پسینے سے شرابور اور تھکن سے چور بجسم ہونے کے باوجود اب میں اپنے دونوں بچوں کی طرف متوجہ تھی۔

"چلو شاباش۔ اب ٹی وی بند کرو' دس بج گئے ہیں' صبح اسکول کے لیے جلدی اٹھنا ہے۔" میری کسی بات کا اثر لیے بغیر حرا اور حنان کی نظریں بدستور کارٹون فلم پر مرکوز تھیں۔

"چلو اب اٹھ بھی جاؤ پاپا۔ تم دونوں کو اس وقت ٹی وی میں مگن دیکھ کر خفا ہو جائیں گے۔" میں نے انہیں باپ کی دھمکی دی' لیکن دونوں کی توجہ ہنوز برقرار تھی۔ عرفان بھی گھڑی کی سوئیوں پر چلنے والے آدمی تھے۔ بچوں کے کھانے پینے' سونے جاگنے کے اوقات طے کر رکھے تھے۔ اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہ تھی۔ دو منٹ آگے پیچھے ہو جانے پر ان کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوتا۔ اس وقت آفس کی اہم میٹنگ کی وجہ سے وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ دونوں بچوں نے اس بات کا خوب فائدہ اٹھایا۔ ورنہ دس بجتے ہی بستر پر موجود ہونا ان کی روزمرہ کی روٹین کا حصہ تھی۔ پاپا کی غیر موجودگی نے دونوں بچوں کو کچھ دیر کی آزادی عطا کردی تھی اور وہ اپنی روزمرہ کی روٹین سے غافل ہو گئے تھے۔ اتنے میں ڈور بیل بجی۔

"پاپا آگئے۔ پاپا۔" دونوں کی حلق سے چیخ نکلی اور وہ ٹی وی بند کرکے غڑاپ سے اپنے کمرے میں گھس گئے۔ دونوں کو ہڑبڑا کر جاتا دیکھ کر میں نے مسکرا کر آہستگی سے باہر کا دروازہ کھولا اور سلام کیا۔

"بچے سو گئے۔" سلام کا جواب دیے بغیر سوال کیا گیا۔

"جی۔"

"کب سوئے؟"

"دس بجے۔" میں اس تفتیشی انداز کی عادی تھی' سو برا منائے بغیر بولی۔ یہ جملے بھی میری روٹین کی لائف کا ایک حصہ تھے۔ جسے میں نے اب قبول کرلیا تھا۔ میں کچھ سوچ کر کچن میں دوبارہ گھس گئی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر واش روم چلے گئے تھے۔

میں نے جلدی جلدی گرم گرم کھانا میز پر چن دیا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک نظر بچوں کے کمرے میں جھانکنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔

"حسن کراچی شفٹ ہو رہا ہے۔" انہوں نے اطلاع دی۔

"اچھا کیوں؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"کہہ رہا تھا اسلام آباد سے اس کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا ہے۔ اب وہ یہیں فیملی کے ساتھ رہے گا۔ اسلام آباد کی طرح یہاں پر اسے گھر اور گاڑی کمپنی ہی دے گی۔" وہ اپنی گھڑی اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولے۔

"واہ بھئی حسن بھائی کے تو مزے ہی مزے ہیں۔ اسلام آباد کی اچھی جگہوں پر دو پلاٹ بھی لے رکھے ہیں۔ وہاں کی طرح یہاں بھی عیش ہی عیش ہوں گے۔" میرے دل کی بات ہونٹوں سے بے اختیار نکل گئی۔

"ایسے تو نہیں مفت میں پلاٹ لے لیے۔ بقول حسن کے اس کی بیوی کا سلیقہ ہے جو وہ آج ان پلاٹوں کا مالک ہے۔" عرفان کا رٹا رٹایا جملہ سن کر میں تپ گئی۔

"گھر' گاڑی' پٹرول اور موبائل کے اخراجات جب کمپنی نے اٹھا رکھے ہیں تو اتنی بچت ہو جاتی ہوگی کہ انہوں نے جلد جائیداد بھی بنا ڈالی۔ محض گھر کے کھانے پینے پر کتنے اخراجات ہو جاتے ہوں گے۔ اب اس میں بھلا بیوی کے سلیقے کا کیا سوال؟" عرفان کے لہجے میں چھپے طنز پر میں بھڑک اٹھی۔

"سلیقہ مند تو وہ ہے' اب یہ بات چھوڑو' یہ بتاؤ کل شام کی اس کی فلائٹ ہے۔ چلو گی ایئرپورٹ۔" گھڑی کی سوئیاں بارہ بجا رہی تھیں۔ وہ اس پر نظر ڈال کر ایک لمبی جمائی لیتے ہوئے بولے۔ نیند کی خماری سے بوجھل ہوتی آنکھوں نے اس لمبی ہونے والی بحث کو یہیں ملتوی کر دیا تھا۔

"آپ ہی چلے جائیے گا میرے پاس وقت نہیں گھر کے سو کام پڑے ہوتے ہیں۔ میرے گھر میں حسن بھائی کی طرح نوکر چاکر نہیں۔" میں نے اکتاہٹ سے جواب دے کر کہا۔ پھر اپنے سر تک چادر اوڑھ لی۔ کیونکہ میں جانتی تھی۔ مزید کچھ بولنے کا مطلب ایک لمبی چوڑی بحث کو دعوت دینا ہے اور میں ہر مباحثے کے لیے تیار تھی۔ لیکن "حسن نامہ" سننے کے لیے قطعی نہیں۔

☼ ☼ ☼

عرفان اور حسن ایک ہی گھر میں پلے بڑھے۔ حسن ان کا چچازاد اور کزن تھا۔ حسن کی نفاست پسندی' ذہانت اور خودداری سے وہ شروع سے ہی مرعوب تھے۔ عرفان کا حسن کے علاوہ کسی سے دوستانہ نہ تھا۔ حسن کے والدین کا انتقال بہت بچپن میں ہی ایک حادثے میں ہو گیا تھا۔ عرفان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اس لیے حسن کو انہوں نے اپنا بیٹا سمجھ کر عرفان کے ساتھ پالا۔ حسن عرفان سے تین برس چھوٹا تھا۔ لیکن اپنی عقل مندی کے گھوڑے پر سوار وہ اس سے تین برس آگے چلتا تھا۔ حسن انٹر کامرس کرتے ہی اسلام آباد چلا گیا۔ وہاں پڑھائی کے ساتھ جاب کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کیا کرتا ہے کیسے رہتا ہے کسی نے اس کے معاملے میں دخل اندازی کرنے کی کوشش نہ کی۔ البتہ دونوں کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رہتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جگہ ای میلز اور موبائل فون نے لے لی۔ چار سال پہلے حسن کی شادی ہو گئی۔ یہ اس کی پسند کی شادی تھی۔ عرفان آفس کی مجبوری کے باعث نہ جا سکے۔ حسن شادی کے بعد اپنی بیوی کی سلیقہ مندی کے لیے چوڑے قصے سناتا اور عرفان مرعوب ہونے کے ساتھ اس کی قسمت پر رشک کرتے۔ اس نے کم عمری میں ترقی کرلی تھی۔ پھر شادی کے بعد ایک بیٹے کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔

وہ حسن جو کبھی چند روپوں کے لیے ترستا' آج لاکھوں جیب میں لیے گھومتا ہے۔

حسن سے ملے عرفان کو کئی برس بیت گئے۔ لیکن دونوں کے درمیان برقی رابطہ ہونے کے باعث ایک دوسرے سے گہری وابستگی تھی۔ عرفان کو اس کی بیوی سے لے کر اس کے گھر کا پورا نقشہ ازبر تھا۔ عرفان مجھے اکثر حسن کی بیوی کے سلیقے' ذوق مزاح اور لذیذ کھانوں کے قصے سناتے تو میں چڑ سی جاتی ہمارے درمیان حسن ضرور آجاتا۔

"آج کیا بنا ہے؟"

"آلو بینگن۔"

"تمہیں آلو بینگن' آلو گوشت' آلو کریلے' آلو کی ترکاری کے علاوہ کچھ اور بنانا نہیں آتا۔ آج حسن بتا رہا تھا اس کی بیگم نے ایسا لذیذ چائنیز۔۔۔"

"حسن کی بیگم نے کیا بنایا تھا کیا نہیں' مجھے سنانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ شادی کے ان پانچ سالوں میں دو بچوں اور لمبے چوڑے اخراجات کے ساتھ یہی کچھ بنا کرتا ہے۔ اس تنخواہ میں یہ بھی مل رہا ہے شکر کیا کریں۔" میں نے عرفان کی بات کاٹ کر تنک کر کہا۔

"جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔ اب یہ تمہارا سلیقہ ہے کہ اسی میں گھر چلاؤ۔" دوٹوک انداز میں کہہ کر اپنے آگے رکھی پلیٹ زور سے کھسکا کر وہ کھانا کھائے بغیر اٹھ کر چلے گئے اور میں کلس کر رہ گئی۔

حسن دور تھا تو ہمارے درمیان بحث و تکرار ہوتی اور کبھی لڑائی کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ اب تو وہ اسی شہر میں آکر رہنے والا تھا۔ تو مزید عرفان کے حواسوں پر چھایا رہے گا۔ یہی سوچ کر مجھے ہول آنے لگے۔ نہ جانے یہ حسن نامہ میری زندگی میں اب کون سا نیا رنگ لانے والا ہے۔ کئی منظر آنکھوں کے آگے لہرا گئے۔

"یا اللہ مدد۔" میں نے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگی اور پھر نہ جانے کب نیند مجھ پر مہربان ہو کر اپنے آغوش میں بھرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

حسن کراچی پہنچنے کے بعد دوسرے دن ہی بیوی اور

بیٹے کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ عرفان نے حسن کا پرجوش استقبال کیا۔ دونوں گرمجوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ گئے۔ حسن، عرفان کے گلے لگ کر ایر پورٹ نہ آنے کا شکوہ کرنے لگا۔ عرفان نے آفس کی مجبوری ظاہر کی۔ حسن کی آنکھوں میں پھوٹتی شوخیاں اور لبوں پر دھیمی مسکان تھی۔ وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ عرفان کے مقابلے میں حسن کا قد کاٹھ، رنگت سب ہی کچھ نمایاں تھا۔ عرفان کی شخصیت اس کے آگے دب سی گئی۔

حسن کی بیوی اس کی طرح ہی شوخ مزاج، خوب صورت اور پروقار شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے لائٹ پنک کلر کا جدید تراش خراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے آگے اپنا پرنٹڈ لان کا سوٹ بھدا لگا۔ مجھے عجیب سی احساس کمتری ـــــــ نے آگھیرا۔ میں ان دونوں کو رشک و حسد بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ عرفان نے جو نقشہ حسن اور اس کی بیوی کا میرے سامنے کھینچا تھا وہ دونوں بلاشبہ اس پر پورا اترتے تھے۔ دونوں میاں، بیوی کے قہقہے ڈرائنگ روم میں گونج رہے تھے۔ ان کی خود اعتمادی کے آگے ہم دونوں ہی گنگ بنے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیوں میری زبان، نہ میرا ساتھ دے رہی تھی، نہ چل رہی تھی، میں جی۔۔۔ اچھا۔۔۔ کہتی کچن میں آگئی اور کچھ دیر سکون کا گہرا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد لوازمات سے سجی ٹرالی لے کر میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"ارے ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی بھابھی۔" حسن خوش دلی سے بولا، پھر اپنے ہمراہ لائے بڑے بڑے شاپر سے ہمارے لیے لائے ہوئے گفٹ نکالنے لگا۔ بچے ڈھیروں چاکلیٹ دیکھ کر خوشی سے چہکنے لگے۔ پھر خوش گوار ماحول میں چائے پی گئی۔ وہ دونوں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد ایسا لگا جیسے کسی سحر سے آزاد ہوگئی ہوں۔

"ویسے حسن بھائی اور ان کی بیوی دونوں کی شخصیت کے ساتھ مزاج بھی ان کے شاندار ہیں۔" میں ڈرائنگ روم سے چائے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ دونوں سے میں کافی مرعوب ہو چکی تھی۔

"ہاں تمہاری طرح اس کی بیوی کی باتیں آلو پیاز سے شروع ہو کر اخراجات پر ختم نہیں ہوتیں۔" عرفان نے کھلا طنز کیا۔

"آپ کو تو مجھ میں صرف کیڑے ہی نظر آتے ہیں۔ حسن بھائی کو دیکھا تھا۔ کیسے ہر بات میں اپنی بیوی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔" میری آواز اونچی ہوگئی۔

"وہ ہے ہی تعریف کے قابل۔۔۔ تمہاری طرح کم از کم پھوہڑ اور بد مزاج نہیں۔۔۔ تم نے تو زندگی اجیرن کردی ہے۔" عرفان ہاتھ میں پکڑا اخبار پٹخ کر ڈرائنگ روم سے بھڑکتے ہوئے نکل گئے اور میں اپنا سر تھام کر وہیں صوفہ پر دھنس گئی۔ جو لڑائیاں "حسن نامہ" سن کر ہفتہ میں ایک بار ہوا کرتی تھیں، اب روز ہوا کریں گی، میرے دماغ میں خطرے کے سائرن بجے۔

☼ ☼ ☼

عرفان اور میرے درمیان کئی دنوں سے بات چیت بند تھی۔ اس دوران حسن اور عرفان کے رابطے میں فرق نہ آیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں نے عرفان سے معافی تلافی کرکے منا لینے کا فیصلہ کیا اور پھر ایک دن مجھے موقع مل گیا۔

"عرفان جب میاں، بیوی کے درمیان کسی تیسرے شخص کی وجہ سے لڑائی ہونے لگے تو نقصان تیسرے کا نہیں۔ میاں، بیوی کا ہوتا ہے۔ میاں، بیوی کا ایک دوسرے سے تعلق مضبوط یوں ہی ہو سکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی خوبیوں کے ساتھ خامیوں کو بھی قبول کریں۔ میں مانتی ہوں حسن بھائی کے ساتھ آپ کا قلبی رشتہ ہے۔ لیکن اسے حد سے تجاوز نہ ہونے دیں۔ میں کوشش کروں گی آپ کو آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔" عرفان کا ۔۔۔ اچھا موڈ دیکھ کر میں نے اپنے دل کی وہ ساری باتیں کہہ دیں، جو کئی دنوں سے میں اپنے دل میں ترتیب دیے بیٹھی تھی۔ میری

مسکان کے ساتھ وہ بھی مسکرا دیے۔ پھر میرے ذہن نے ایک اور ترکیب پیش کی۔

"عرفان کیوں نہ ہم حسن بھائی کے گھر جا کر سرپرائز دیں، ایک اچھا سا ان کے لیے گفٹ بھی لے جائیں گے۔" عرفان میری ترکیب سن کر خوش ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی دیکھ کر میں مطمئن ہوگئی۔ اگلے روز میں اور عرفان ایک اچھا سا گفٹ لے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ بچوں کو نانی کے گھر چھوڑ کر ہم سیدھا حسن کے گھر پہنچے تھے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا تو عرفان نے اندر اطلاع پہنچانے سے منع کر دیا۔ چوکیدار عرفان سے واقف تھا۔ ہم دونوں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے پورچ عبور کرکے اندرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔

لاؤنج عبور کرتے ہی ایک کمرے سے زور، زور سے چیخنے چلانے اور چیزیں پٹخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں تیز اور واضح ہوتی جارہی تھیں۔ ہم دونوں کے قدم وہیں جم گئے۔

"میرے ڈیڈی کے پیسوں پر عیش کرنے والے کو مجھ پر رعب جھاڑنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ بنگلہ میری پسند کی وجہ سے ڈیڈی نے تمہیں یہاں لے کر دیا ہے تو اس کی ڈیکوریشن بھی میری پسند سے ہوگی۔ تمہیں دخل اندازی میرے معاملات میں کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ہوتے کون ہو مجھ پر حکم چلانے والے۔۔۔ مجھ سے آئندہ بحث کی تو جن دوستوں کے آگے اپنی شیخیوں کی جو عمارت کھڑی کر رکھی ہے اسی کے نیچے تلے دفن کردوں گی۔ سمجھے بے کار اور نکمے انسان۔"

"ڈارلنگ! کیا ہو جاتا ہے تمہیں ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔ کہا تو ہے جیسا کہہ رہی ہو ویسا ہی ہوگا۔ اب جان لو گی کیا۔۔۔ چلو موڈ درست کرو اپنا۔۔۔ کہیں چل کر ڈنر کرتے ہیں، تمہارا موڈ بھی فریش ہو جائے گا۔ اب مان بھی جاؤ۔" اندر سے منمنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں مدھم پڑتی جارہی تھیں۔

عرفان اور میں نے بیک وقت ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ عرفان کے چہرے پر خجالت تھی اور میرے چہرے پر فتح کے عکس لہرا رہے تھے۔ ہم دونوں کا رخ باہر کی جانب تھا۔ عرفان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا اور میں نے نم آنکھوں سے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ "حسن نامہ" میری زندگی سے خارج ہو چکا تھا۔

☼ ☼

نازیہ جمال

محبت یوں نہیں اچھی

ناولٹ

"رات میں نے نا بڑا ہی سہانا خواب دیکھا' میں نے دیکھا کہ ساتھ والے کمرے میں میری بہن نگی دلہن بنی بیٹھی ہے۔ خوب سجی سنوری اور میرے ویر فیاض کی توبہ دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ سنہری شیروانی' کلاہ میں کیا خوب صورت شہزادہ دکھ رہا تھا۔" فاخرہ کا انداز کھویا کھویا اور لہجہ خواب آگیں تھا۔

"تماں تیری بہن دلہن بنی میرے ویر کے کمرے میں کیا کر رہی تھی؟؟" چارپائی سے بندھی سوتی کپڑے کی جھولڑی میں سوئے دو سال کے بیٹے کو زور زور سے جھونٹے دیتی فیروزہ نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"اب اتنی بھولی نہ بن کہ تجھے سمجھ نہیں آتی۔ یہ میرا ہی نہیں تیرے بھائی کا بھی یہی خواب ہے۔ جاگتی آنکھوں کا خواب۔" فاخرہ معنی خیزی سے آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ چہرے پہ مسرور کن مسکراہٹ پھیلی تھی اور اس کی اسی مسکراہٹ نے فیروزہ کو طیش و غضب کی بھٹی میں دھکیل دیا تھا۔

"ہاں خواب ہے اور صرف خواب ہی رہے گا۔ میں اسے کبھی حقیقت کا چولا نہیں پہننے دوں گی۔" فیروزہ کا لفظ لفظ طنز ٹپکا رہا تھا۔

"کیوں حقیقت نہیں بن سکتا۔ میری بہن میں کیا کمی ہے۔ خوب صورت' پورے تین دفعہ ملانی جی کو ناظرہ قرآن سنا چکی ہے۔ آخری پارے کی کتنی سورتیں اسے زبانی آتی ہیں۔ گھر کے ہر کام میں طاق۔" فاخرہ نے اب کے بے حد جذباتی انداز میں بہن کی خوبیاں گنوائیں۔

"ہاں اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔ تو تو اپنی بہن کی صفت بیان کرے گی ہی نا' لیکن بھرجائی! تو ایک بات لکھ کر اپنے گلے میں یاددہانی کے لیے ڈال لے کہ میں کسی صورت نگین کو بھابھی بنا کر اس گھر میں نہیں لاؤں گی۔ دس سال پہلے ایک غلطی کی تھی جس کا خمیازہ ابھی تک بھگت رہے ہیں۔" فیروزہ خاصے تاسف سے بولی۔

"تو اپنی غلطی کی تلافی کر کیوں نہیں لیتی۔ جا' جا کر بھائی کے مکھڑے پہ دوجی واری سہرہ ڈال کے بھابھی لے آ۔" فاخرہ زچ کر دینے والی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے مطمئن انداز میں بولی۔

"ہاں ہاں لے آؤں گی۔ کوئی گھریلو' سگھڑ لڑکی' چاہے شکل صورت کی ماٹھی ہو پر میرے بھائی کو اولاد کی خوشی ضرور دے۔ میرے میکے کے آنگن میں بچوں کی قلقاریاں بکھیرے۔ بھائی کی بے اولادی کا غم مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ تیری سوہنی صورت کا خاک فائدہ' نرا کیکر جنڈ' نہ پھل نہ پھول سرے سے بے فیض۔" فیروزہ کے منہ سے نکلے طنز کے بھالے سیدھے جا کر فاخرہ کے دل میں ترازو ہوئے تھے اس کا چہرہ ایک دم سے سفید پڑ گیا تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی۔ بلکہ فیروزہ کا برسوں سے معمول چلا آ رہا تھا۔ جب بھی میکے آتی تو فاخرہ کو بے اولادی کے طعنے دے دے کر خوب اس کا سینہ چھلنی کرتی۔ جی جلاتی' آٹھ آٹھ آنسو رلاتی۔ فاخرہ بھی ڈٹ کر مقابلہ کرتی' زبانی تلخ کلامی کے بعد فیروزہ کی آخری دھمکی۔

"میں اپنے بھائی کی دوسری شادی کرتی ہوں۔ تجھ کوکھ جلی کو اپنے میکے سے دفعان کر کے ہی رہوں گی۔" اور فاخرہ نمند کی تلملاہٹ سے لطف لیتی اس کی دھمکی کو چٹکیوں میں اڑا دیتی۔ آخر وہ کیوں فیروزہ کے ڈراوے کو خاطر میں لاتی جب اس کا کھونٹا ہی مضبوط تھا۔ قیوم۔ اس کا شریک حیات' اس کی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کے کانوں سے سننے کا عادی تھا جو اس کی ہر خواہش کو فوراً" پورا کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔ ایسے میں نند کی سوکن لانے کی دھمکیاں اسے محض بچے کی ٹرٹر ہی لگا کرتی تھیں۔ ہاں بس جب کبھی فرصت کے لمحوں میں اپنی سونی گود کا خیال آتا تو دل اس محرومی پہ لبالب بھر آتا تھا جسے فیروزہ کے طنز کے پتھر کبھی کبھار چھلکا دیتے تھے۔

اسی دم لائٹ چلی گئی تو قیوم چار سالہ بھانجی کو گود میں اٹھائے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاخرہ کی نظر شوہر پہ پڑی تو ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

"میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ میرے بچے ہوں'

میرے پیروں کے نیچے جنت تعمیر ہو، ہمیں اماں ابا کہنے والا کوئی ہو۔"

"اوئے خیر تو ہے کیوں رو رہی ہے؟" قیوم تیزی سے اس کے قریب آیا اور فکر مندی سے پوچھا۔ بیوی کے آنسو سیدھے اس کے دل پر گر رہے تھے۔

"کچھ نہیں بھرا! بس ایسے ہی بچوں کا ذکر نکلا تو بھر جائی رونے لگی۔" فیروزہ نے گڑبڑاتے ہوئے توجیہہ پیش کی ساتھ ہی کھا جانے والی نظروں سے فاخرہ کو دیکھا جس نے شوہر کو دیکھ کر آنسو بہانے شروع کر دیے تھے۔ پہلے تو اچھی خاصی خاموش بیٹھی تھی۔

"ارے یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے، میں سمجھا پتا نہیں کس بات پہ رو رہی ہے۔" قیوم نے اطمینان کا سانس بھرا اور ساتھ ہی مٹکے سے کٹورہ پانی کا بھر کر فاخرہ کے لبوں سے لگایا تھا۔ فیروزہ کو بھائی کی یہ ناز برداری ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔ سارا مسئلہ تو یہی تھا کہ وہ قیوم کو نہ بیوی کے خلاف بھڑکا سکتی تھی اور نہ ہی دوسری شادی پہ آمادہ کر سکتی تھی۔ کیوں کہ قیوم کو اپنی اس خوب صورت، کم عمر اور چنچل مزاج بیوی سے عشق نما محبت تھی۔ وہ اس کی چمکیلی سنہری آنکھوں میں آنسو تک نہیں دیکھ سکتا تھا کجا کہ دوسرا بیاہ رچالیتا۔

"اگر نصیب میں اپنی اولاد کی خوشی لکھی ہے تو ہمیں ضرور ملے گی۔ اگر نہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہیں۔ یہ بھی تو ہمارے بچے ہی ہیں۔" قیوم نے بھانجی کو گدگدایا تھا۔

"اور فیاض کے بال بچے بھی تو ہمارے ہی بچے ہوں گے۔" قیوم پرسکون اور آسودہ تھا۔ فاخرہ نے جتاتی ہوئی فخریہ نظروں سے فیروزہ کو دیکھا تھا جس نے تنفر سے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فاخرہ! اری او فاخرہ! کدھر ہو؟" کچی دیوار پار سے شادو نے زور سے آواز لگائی تھی۔

"کیا بات ہے بوا شادو؟ میں روٹی ڈال رہی ہوں۔" چولہے میں ٹمٹماتے انگاروں پہ کپاس کے سوکھے ڈانڈے رکھ کر زور سے پھونکیں مارتے ہوئے فاخرہ نے جواباً ہانک لگائی تھی۔

"سوہنی بی بی! ذرا ایک پیاز تو دے دے۔ میں نے تڑکا لگانا ہے۔" شادو لجاجت سے بولی۔

"ہاں کیوں نہیں، یہ لے کافی ہیں؟" فاخرہ فوراً چولہے سے اٹھی اور اندر کچن سے چار پانچ پیاز لا کر شادو کو تھما دیے۔

"ارے اتنے زیادہ کیوں لے آئی، صرف ایک ہی کافی تھا۔" شادو نے دوپٹے کی جھولی آگے بڑھا کر پیاز لے لیے۔

"تیرے چاچے کو اس بار منڈی پہ لینا بھول گئے تھے۔ اب لے آیا تو تجھے واپس کروں گی۔"

"ارے بوا! واپس کیوں کرو گی۔ کون سا میں نے سونا چاندی اٹھا کر دیے ہیں۔" فاخرہ نے اپنائیت بھری خفگی سے کہا۔

"جیندی رہ، شالا بال بچے اپنی گود میں کھلائے۔" شادو دعائیں دیتی دیوار سے اتر گئی۔

باتونی اور چرب زبان شادو کی پورے محلے سے خوب گاڑھی چھنتی تھی، مگر برتنے کی چیزیں ہمیشہ فاخرہ سے ہی مانگتی تھی کیوں کہ فاخرہ ایک تو انکار نہیں کرتی تھی، دوسرا چیز بھی ذرا "چوکھی" دیتی تھی۔ بھلے مہینوں ادھار نہ چکاؤ مجال ہے جو فاخرہ بھولے سے یاد دلا دے۔

صرف شادو پہ ہی کیا موقوف، آس پڑوس کی ساری عورتیں ہی بلا جھجک مانگنے چلی آتیں، پیاز، مرچ، گھی اور دیگر اشیا فاخرہ بلا تامل انہیں دے دیتی تھی۔ خوش اخلاقی اور دریا دلی کا تو یہ عالم تھا کہ خیرات مانگنے والی آتیں تو انہیں بھی چائے، شربت پلا کر ہی رخصت کرتی۔ اپنائیت، خوش اخلاقی اور فیاضی کی انہی خوبیوں کی بدولت فاخرہ کا پورے محلے میں بے حد احترام کیا جاتا تھا۔

"او کدھر رہ گئی ہے۔ بھوک سے میرے پیٹ میں وٹ پڑ رہے ہیں۔ چھیتی (جلدی) روٹی ڈال۔" قیوم نے پیچھے سے آواز لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے ادھر آ گئی۔ آگ بھڑک چکی تھی۔ دوپٹا سامنے سے ہٹا کر پیچھے چوٹی میں لپیٹ کر وہ پیڑے بنانے لگی۔ صحن کے وسط میں لگے قد آور جامن اور ٹاہلی کے درختوں کی پھننگیں ڈوبتے سورج کی نارنجی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ دن بھر تلاش رزق میں گرداں پنچھیوں نے واپس اپنے بسیروں میں اترنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی چہکار خاموش فضا کی جھولی بھر رہی تھی۔

فیاض نے ٹنکی کی ٹونٹی سے بہتی پانی کی موٹی دھار سے دونوں ہاتھوں کی اوک بھری اور زور سے منہ پہ چھینٹا مار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ابھی ابھی دکان بند کر کے آیا تھا۔ پورے دن کی نسبت اس وقت دکان پہ گاہکوں کا رش بڑھ جاتا تھا۔ قریبی دیہاتوں اور بستیوں سے روزگار کی غرض سے آئے افراد گھر لوٹنے سے ضرورت کی تمام اشیا خرید کر لے جاتے جن کا ان کے جھوک میں ملنا مشکل ہوتا۔

ایک محنتی اور سمجھ دار دکان دار کی طرح وہ اس وقت دکان بند کر کے کسی طور کثیر منافع سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا، مگر اس نے جلدی جلدی گاہکوں کو بھگتا کے گھر کی راہ لی تھی کیوں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کا بڑا بھائی قیوم اپنی بیل گاڑی پہ گائے اور بکریوں کا چارہ پٹھا اور موسمی سبزیاں لادے کھیتوں سے واپس لوٹنے کے بعد اکٹھے کھانا کھانے کے لیے اس کا منتظر بیٹھا ہو گا۔

"کاکا! تو بسم اللہ کرنا۔" کندھے پہ رکھی پلین سیاہ لنگی سے گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ قیوم کے ساتھ چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

"آج بڑی دیر نہیں کر دی تو نے؟" قیوم نے ماحول پہ غالب آتی سیاہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کاکا! بس گاہکوں کا بڑا رش تھا۔ ناپ تول کرتے کرتے دیر ہو ہی گئی۔" وہ شرمندگی سے بولا۔

"تجھے پہلے بھی کہا ہے میں نے کہ اگر مجھے دیر ہو جائے تو میرے انتظار میں بھوکا نہ بیٹھا رہا کر۔ روٹی کھا لیا کر۔ سارا دن کھیتی باڑی کرتے کرتے گھر آتے ہی تیری بھوک چمک اٹھتی ہو گی۔" وہ نرمی سے بولا۔

"ارے پہلے ایسا کبھی ہوا ہے کہ میں نے تیرے بغیر اکیلے نوالہ توڑا ہو۔ تجھے پتا تو ہے کہ تیرے بغیر ٹکڑا پانی میرے حلق سے نہیں اترتا اور تو بات کرتا ہے کہ میں اکیلے کھانا کھا لیا کروں۔" قیوم نے چھوٹے بھائی کو خفگی سے دیکھا۔ اس کی بات میں سو فیصد صداقت تھی کہ بیتے ایام میں دو اوقات کا کھانا وہ بھائی اکٹھے مل کر ہی کھاتے تھے ماسوائے دن کے وقت کے جب قیوم کھیتوں پہ اور فیاض اپنی دکان پہ ہوتا۔ جب تک ان کا والد ظہور الٰہی زندہ تھا، تینوں باپ بیٹے مل کر ایک ہی پیالے چنگیر میں کھانا کھاتے تھے۔ ابے کی وفات کے بعد ان کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا۔ بچپن میں اماں نے فیاض کو روٹی پہ دیسی گھی لگا کر چینی چھڑکنے کے بعد روٹی کون کی صورت تھمائی ہی تھی کہ ظہور الٰہی جی بھر کر غصہ ہوئے تھے۔

"بچے کے ہاتھ میں روٹی تھمانے کا مطلب جانتی ہے۔ جاہل عورت! بجائے اس کے کہ تو ان دونوں بھائیوں کو ایک ہی چنگیر پہ روٹی دیتی، تو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سامان اکٹھا کر رہی ہے۔ آج روٹی الگ کھائیں گے، کل کو گھر الگ کر لیں گے، پھر دل جدا ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔"

اور جب تک اماں نے فیاض کے ہاتھ سے ادھ کھائی روٹی لے کر کھولی اور اسے چنگیر میں رکھ کر دونوں بھائیوں کے آگے نہیں رکھ دی اس وقت تک ظہور الٰہی ان پر گرجتے برستے رہے۔ اپنی وفات کے آخری لمحوں تک وہ انہیں تلقین اور نصیحت کے ریپر میں لپٹا حکم نامہ جاری کرتے رہے کہ

"ہم دونوں بھائیوں میں بھی بڑا مثالی پیار تھا، کبھی ایک دوسرے کو پشت کر کے نہیں سوئے تھے۔ اب تم دونوں بھی آپس کی محبت میں کمی نہ آنے دینا۔"

فیاض تو اماں ابا کی وفات کے وقت بمشکل دس برس کا تھا مگر قیوم جو سترہ اٹھارہ سال کا گبھرو سمجھ دار جوان تھا کے نوخیز دل و دماغ پہ اباجی کے فرمودات کچھ اس طرح ثبت ہوئے کہ آنے والے کتنے ہی سالوں میں دونوں بھائیوں کا الگ کھانا تو درکنار، ایک جیسے ہی جوتے، ایک

ہی دکان سے لیا گیا کپڑا اور تو اور نائی کے پاس حجامت بھی اکٹھے کروائی جاتی۔ اہل علاقہ دونوں بھائیوں کی ذہنی ہم آہنگی محبت اور اتفاق کو دیکھ کر رشک کرنے کے ساتھ ساتھ سدا اس محبت کی ہمیشگی کی دعا کرنے لگتے۔ کئی ایک تو اس پرخلوص محبت کا راز پوچھنے لگتے۔ فیاض تو سادگی سے مسکرا دیتا' البتہ قیوم کے پاس خاصا مفصل جواب ہوتا تھا۔

"یہ کیا کم عقل عورت! دو الگ کٹوریوں میں سالن کیوں' ہمارا پیالہ کہاں ہے؟" قیوم نے فاخرہ کو سالن دو کٹوریوں میں ڈالتے دیکھا تو غصے سے پوچھنے لگا۔

"ہائے میں کملی! بھول ہی گئی تھی کہ اپنے خاندانی اور تاریخی پیالے کے بغیر تم بھائی کیسے روٹی کھا سکتے ہو۔" مصنوعی تاسف سے بولتے ہوئے فاخرہ ٹوکرے میں پیالہ ڈھونڈنے لگی۔

"زیادہ بڑبڑ نہ کر' جلدی ہاتھ مار' آج تو بھوک مار کے رکھ دیا ہے۔" قیوم نے غصے سے جھڑکا۔

"اور تو کدھر جا رہا ہے؟" کھانے کے بعد فیاض کو جوتوں کے بکل بند کرتا دیکھ کر استفسار کیا۔

"کاکا! دکان پر۔ رات کے ٹائم اچھی بکری ہو جاتی ہے' ہر آدمی گھر لوٹتے وقت سودا سلف لے کر ہی جاتا ہے۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"او یار! بس اب صبح کو دکان کھولنا' مل کے چائے پیتے ہیں۔ کوئی گپ شپ' کوئی نئی تازی۔" قیوم چارپائی پہ نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"کاکا! میں دس گیارہ بجے تک واپس آ جاتا ہوں پھر مل بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

"تیری واپسی اس وقت ہوتی ہے جب میں خراٹے لے رہا ہوتا ہوں۔ میں سارا دن کسی مار مار کر ہل چلا چلا کر اتنا تھک جاتا ہوں کہ رات دیر تک نہیں جاگ سکتا۔ خیر تو جانا چاہتا ہے تو جا۔" قیوم کے لب و لہجے سے بھرپور خفگی چھلک رہی تھی۔ فیاض نے بھائی کے چہرے پہ چھائی مایوسی اور اجنبیت کو واضح محسوس کیا' ساتھ ہی ان دو چائے کی پیالیوں کو بھی دیکھا جو اب ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھیں۔ قیوم نے کپ کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر جوتے کے بکل کھولنے لگا۔

☼ ☼ ☼

پردیسی ڈھولا
شالا جیویں ڈھولا
سفراں دا تھکیا
میں نئیں جگایا

نگین آئینے میں تازہ تازہ کیے فیشل سے چمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے بڑی ترنگ میں گنگنا رہی تھی۔ ہاتھ تیزی سے کمر کو ڈھانپے سیاہ گھنے بال سمیٹ کر چوٹی میں باندھ رہے تھے۔

فاخرہ چارپائی پہ لیٹی کافی دیر سے بہن کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ نگین کبھی تو گھنگھروؤں والی نتھلی ناک میں بلاوجہ ٹھیک کرنے لگتی تو کبھی کانوں میں پڑے بالے۔

"نگی! یہ کلپ کہاں سے آیا ہے؟" فاخرہ نے نگین کے بالوں میں لگے بے شمار نگوں سے چمکتے کلپ کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں سے یہ چین اور انگوٹھیاں آئی ہیں۔" نگین نے مڑ کر معنی خیزی سے جواب دیا۔

"دیکھ نگی! میں تجھے کہہ رہی ہوں کہ سدھر جا ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گی۔" وہ جھٹکے سے سیدھی اٹھ بیٹھی اور انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔

"میں اپنے گھر میں تیری راہ ہموار کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیل رہی ہوں اور تیری چال ڈھال ہی بگڑتی جا رہی ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"تاں! میں کوئی لولی لنگڑی ہوں یا مجھے رشتوں کی کمی ہے جو تو میرے لیے اتنا ہلکان ہو رہی ہے۔ دیکھ باجی! میں تجھے پہلے بھی کہہ چکی ہوں' مجھے تیرا دیور ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میری طرف سے صفاچٹ انکار ہے۔" نگین قطعیت سے بولتی ساتھ والی چارپائی پہ دھم سے بیٹھ گئی۔

"ہاں سرخاب کے پر لگے ہیں نا تیرے میں۔" وہ

طنز سے سراپا اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"فیاض کو بھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے' وہ تو میں اپنا اور تیرا بھلا سوچتی ہوں۔ دونوں بہنیں مل بیٹھ کے کھائیں گی۔ انجان لڑکی نجانے کیسی ثابت ہو۔ مجھ سے بیر ہی نہ باندھ لے۔ تو بہن ہے اکٹھے دکھ سکھ تو مل کے بانٹ سکتی ہیں۔" فاخرہ نے اب کے پیار سے رام کرنا چاہا۔ نگین نے کوئی جواب نہ دیا بس آرام سے کلائی میں پڑے بریسلٹ کو گھماتی رہی۔

"اتنا اچھا کاروبار ہے فیاض کا۔ بہت شریف اور سمجھ دار لڑکا ہے۔"

"کاروبار؟" نگین دل کھول کر ہنسی۔

"چھوٹی سی پرچون کی ہٹی کو تو دکان کہہ رہی ہے جس کے آگے پتی' چورن اور شیمپو کے پتے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ ہاہاہا۔"

"بکواس نہ کر۔ اچھا خاصا کما رہا ہے۔" فاخرہ نے غصے سے جھڑکا۔

"تو کیوں اس کے منہ لگ رہی ہے۔ خواہ مخواہ ٹیم اپنا زیان (ضائع) کر رہی ہے۔" چھپر کے نیچے مٹی کے چولہے کی لپائی کرتی رشیدہ جو کافی دیر سے دونوں بہنوں کی تو تکار سن رہی تھی۔ بول پڑی۔

"تو سمجھا نا اسے اماں! یہ میرے کیے کرائے پر پانی پھیرنے کا انتظام کر رہی ہے۔" فاخرہ نے ماں کو شکایت لگائی۔

"تو اسے چھوڑ' اپنا حال سنا۔ مرد پہ مٹھی قابو ہے نا۔" رشیدہ ہاتھ دھو کے ادھر آ بیٹھی۔

"ہاں اماں! مرد کی تو فکر نہ کر۔ دونوں ہاتھ خوب کھلے چھوڑ رکھے ہیں میں نے۔" فاخرہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"شاباش! بس اسی طرح آگے پیچھے' دائیں بائیں لٹاتی رہ' کچھ نہ چھوڑنا کا۔ جس دن کچھ جمع جتھا ہو گیا تو سمجھ لینا اسی دن قیوم بچوں کی خاطر دوسرا ویاہ رچا لے گا۔" رشیدہ دھیمی آواز میں رازداری سے بولی۔

"نہیں اماں! قیوم ایسا نہیں ہے' وہ مجھ پہ سوکن کبھی نہیں لائے گا۔ ہر وقت میری محبت کا دم بھرتا ہے۔" فاخرہ کی آنکھوں میں یقین کی چمک تھی۔

"ارے میری بھولی دھی! کب تک دم بھرے گا۔ یہ مرد تو بس یوں ہی لگ کے ہوتے ہیں' کانوں کے کچے' ناقابل اعتبار آج فیروزہ بھائی کو بیاہنے کے چکروں میں لگی ہوئی ہے کل کو کسی اور بدخواہ نے پٹی پڑھا دی تو تیری تو نیا گئی نیچے۔" رشیدہ کے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ لمحہ بھر کو اس کے چہرے پہ تفکر کے سائے لہرا گئے تھے۔

"پھر اماں! میں کیا کروں؟" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"کچھ بھی اور مت کر۔ جو کر رہی ہے بس وہی کافی ہے۔ ہاں بس مستقل مزاجی شرط ہے۔" رشیدہ کا انداز "بک اپ" کرنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اکرام ہاؤس۔" گیٹ پہ لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے اس نے خود کو تسلی دی کہ وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ چکا ہے۔ کال بیل شاید خراب تھی تب ہی تو بار بار پریس کرنے پر بھی کوئی آواز نہ سنائی دی تھی۔ دروازہ پہلے تو انگلی کے جوڑ سے کھٹکھٹایا پھر پورے ہاتھ سے تھپ تھپایا مگر کوئی ذی نفس اندر سے برآمد نہ ہوا۔

"اتنی جلدی اہل خانہ کیسے سو سکتے ہیں۔ ابھی تو دس ہی بجے ہیں۔" بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"مجھے خود سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مدثر کے ساتھ ہی آتا تو بہتر تھا۔" کافی دیر یونہی بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اس نے سوچا۔

مدثر سے اس کی دوستی اس وقت ہوئی تھی جب اس نے اس مارکیٹ میں مدثر کے والد اکرام اللہ صاحب سے دکان کرائے پر لی تھی۔

بے حد خوش مزاج اور یار باش مدثر کو فیاض کی سلجھی ہوئی اور متین طبیعت بہت اچھی لگی تھی تب ہی تو اکثر فارغ ٹائم میں اس کی دکان پہ آ جاتا۔

پچھلے ہفتے اکرام اللہ صاحب کے دل کا آپریشن ہوا

تھا۔ وہ مارکیٹ کے بیچوں بیچ تنگ راستے پر عیادت کرنے والوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ مدثر سے تو اس نے خیریت دریافت کرلی تھی۔ وہ اخلاقاً "ان کے گھر جاکر عیادت کرنا چاہتا تھا تب ہی تو آج دکان بند کرکے ادھر ہی چلا آیا۔ دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد بالآخر وہ بغلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو ہی گیا کاتک کی خنکی بھری رات کو ماہ نیم ماہ اپنی اجلی روشنی سے اجال رہا تھا۔

قطار میں بنے تمام کمروں کے دروازے بند اور کھڑکیوں سے روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ دائیں طرف کچن میں سے برتنوں کی کھڑ پڑ۔ وہ یکلخت ادھر متوجہ ہوا تو ادھ کھلی کھڑکی سے اسے کوکنگ رینج پہ مصروف عمل نسوانی ہاتھ دکھائی دیئے تھے۔ نسوانی وجود دوسرے پٹ کے پیچھے اوجھل تھا۔ اس نے سرعت سے نگاہ پھیری کیوں کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ مدثر کے گھر کی مستورات پردے کا اہتمام کرتی ہیں۔

وہ آگے بڑھ کر بند کمروں میں سے کسی ایک کو کھٹکھٹانے کے ارادے سے بڑھا ہی تھا کہ کچن میں سے گھبرائی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کچھ سمجھ پاتا کچن کا دروازہ کھٹاک سے کھلا اور بگولے کی مانند اڑتی ہوئی ایک لڑکی نکلی اور سیدھا اس سے آٹکرائی تھی۔ وہ اس افتاد پہ جو بوکھلایا سو بوکھلایا ادھر لڑکی بھی ایک اجنبی کو اپنے روبرو اتنے قریب پاکے بری طرح سراسیمگی کا شکار ہوئی تھی۔ حواس باختہ تو پہلے ہی تھی، مگر سامنے کھڑے نوجوان کی صورت میں ملنے والی "مصیبت" سے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ چیخ مار کر کسی کو آواز دیتی، فیاض کی زیرک اور معاملہ فہم نگاہوں نے تاڑ لیا کہ لڑکی خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں کہیں شکوک و شبہات کا شکار نہ ہو جائے تب ہی تو جلدی سے وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

"دیکھیں محترمہ! میں اکرام صاحب کی طبیعت پوچھنے کو حاضر ہوا ہوں۔ ان ہی کی دکان پہ اپنا جنرل اسٹور چلا رہا ہوں۔ آپ بتائیں آپ کچھ دیر پہلے اتنا زور سے کیوں چیخی تھیں۔" بولتے ہوئے فیاض کی نظریں سلونے روپ پہ جمی رہیں۔ لڑکی میں ایسا کچھ بھی چونکانے اور ٹھٹکا دینے والا نہیں تھا۔ سانولا چہرہ، درمیانہ قد ہاں سراپا خاصا متناسب اور دلکش تھا مگر فیاض کو لگ رہا تھا کہ اس چہرے پہ سجی غزال آنکھیں جن میں چھایا ہراس انہیں اور زیادہ خوب صورت بنا رہا ہے۔ پرسکوت ۔۔۔ ماحول، عقبی باغیچے سے پھولوں کی مہک لیے خنک ہوا اور ہاتھ کے فاصلے پہ کھڑی متوحش دوشیزہ کو دیکھتے ہوئے فیاض کے دل نے چپکے سے خواہش کی کہ کاش یہ وقت ٹھہر جائے یا وہ اپنی باقی کی ساری زندگی یہیں اسی جگہ پر اس لڑکی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بتا دے۔

"میں کچن میں چائے بنا رہی تھی کہ اچانک ایک سانپ آگیا۔ میں ڈر کر باہر بھاگی تو آگے۔۔۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا ہوا لبینہ! باہر کیوں کھڑی ہو اور یہ کون ہے؟" اسی دم مدثر باہر نکلا تو اس کی نظر ان دونوں پہ پڑی۔ اپنا تعارف کروانے کی بجائے وہ آگے بڑھا تو مدثر اسے پہچان کر مصافحہ کرنے لگا۔ لبینہ نامی لڑکی نے کچن میں سانپ کی موجودگی کی اطلاع بھائی کو دی اور غڑاپ سے اندر کمرے میں گھس گئی۔ سانپ ابھی تک اندر موجود تھا۔ مدثر نے اینٹ سے اس کا سر کچل دیا۔ لبینہ بدحواسی میں چولہا یونہی جلتا چھوڑ گئی تھی تب ہی تو چائے ابل ابل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ اس نے چولہا بند کیا تو مدثر اسے ابا کے کمرے میں لے آیا۔ شفیق، ملنسار اور ہمہ صفت اکرام صاحب کی پہلے بھی وہ دل و جان سے عزت کرتا تھا، مگر آج، ابھی تو ان سے ایک پدرانہ لگاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کی صحت و کمزوری کے متعلق اپنے جذبات سے بہت عاجزی و انکساری سے آگاہ کیا۔

مدثر چائے لے آیا تو رنگت اور ذائقے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہی چائے ہے جسے وہ ابھی کچھ دیر پہلے کچن میں ابلتا دیکھ کر آیا تھا۔

دیر سے ختم کرنے کی غرض سے وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا سوچ رہا تھا کہ اتنی مزے دار اور خوش ذائقہ چائے اس نے آج سے پہلے کبھی زندگی میں نہیں چکھی تھی گھر واپسی پہ ایک سرور انگیز مدہوشی نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ کو اس بار جاڑے نے ایسا جھاڑا کہ ایک ہفتے سے چارپائی پہ نڈھال پڑی تھی۔ پورا گھر تلپٹ پڑا تھا۔ فیاض کھانا ہوٹل سے لے کر آتا، البتہ ناشتا چائے پاپوں پہ چل رہا تھا۔

"ہائے! خدا نے ساس، نند کا منہ نہ دکھایا پر دیورانی ہی دے دیتا تو آج اتنی لاچاری نہ ہوتی۔" چوزے کی گرم یخنی کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ دکھ سے بولی۔

"میں بی بی فیروزہ کو لے آتا ہوں۔ دو چار دن یہاں رہ کر وہ کام نمٹا دیں گی۔" فیاض نے تجویز دی۔ ہوٹل کے تیز مسالوں والے کھانے کھا کھا کر وہ تنگ آچکا تھا۔ آج آخری دھلا استری شدہ جوڑا اس نے زیب تن کیا تھا۔

"ارے نہیں فیروزہ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" فاخرہ گھبرا کر بول پڑی۔ فیروزہ کے نوکیلے فقروں اور طنزیہ مزاج سے اس کی جان جاتی تھی۔

"وہ خود بھرے پرے سسرال میں رہتی ہے۔ پورے کنبے کا کام کاج نمٹاتی ہے۔ اب ہمارا بھی بار اس پہ پڑے۔۔۔ نہ یہ ظلم مجھے گوارا نہیں۔ بس قیوم! تو مجھے دیورانی لا کر دے۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھی۔ میری سنگتن۔" اس نے دیورانی لانے کی یوں بات کی جیسے کپڑوں کا جوڑا لانے کو کہہ رہی ہو۔

"ہاں تو بھلی چنگی ہو جا پھر فیاض کے ویاہ کا کچھ کرتے ہیں۔" قیوم نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"بس تو نے بات کرلی، میں خیر سے ٹھیک ہو گئی۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ کل ہی اپنے دیور کی بری بنوانے نکل پڑوں۔" وہ جوش سے کہتے ہوئے لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔ کمزور چہرے کی زردی پہ خوشی کا گلابی رنگ چھلکا تھا۔

"بری بنانے سے پہلے دیورانی تو تلاش کریں نا۔ گھر میں نہیں دانے، بھابھی چلیں بھنوانے۔" فیاض نے قدرے شوخی سے کہا۔

"ارے کاہے کی تلاش، سامنے ہی تو میرے پیو کا در ہے جہاں وہ بختاور رہتی ہے۔ میری بہن نگی۔" فاخرہ نے مسکراتے ہوئے تائید طلب نظروں سے قیوم کو دیکھا تو اس نے بھرپور اثبات میں سر ہلایا۔ فیاض ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ فاخرہ بھابھی اپنی بہن اس سے بیاہنے کی خواہاں ہے اور کاکا قیوم کی مکمل "آشیرباد" بیوی کو حاصل ہے تب ہی تو جب بھی گھر میں اس کی شادی کا تذکرہ ہوا، جھٹ سے دونوں نے نگین کا نام لے لیا۔ اسے نگین کسی صورت قبول نہیں تھی۔ ان پڑھ، ہر وقت خود پہ ڈھیروں میک اپ تھوپے، خوا مخواہ فری ہو جانے والی ٹوٹل کمرشل ادائیں رکھتی تھی۔ فیاض کا جب بھی اس سے واسطہ پڑا تو اس کے گداز جسم پہ کسے ریشمی کپڑوں اور ڈھیروں غازہ تھوپے چہرے سے سخت الجھن ہی محسوس ہوتی تھی۔

پسند تو اسے فاخرہ بھی کبھی بھابھی کے روپ میں نہ آئی تھی، نہ تو سگھڑاپا دیکھنے کو ملا نہ ہی کبھی دل سے گھر کا کوئی کام نمٹایا بس لگے بندھے روٹین کے کام سرانجام دینے کے بعد جو وقت بچتا اسے اپنے چہرے کو مانجھنے یا دیواروں پہ لٹک کر ہمسایوں سے گپیں لگانے میں ہی صرف کرتی۔ فاخرہ کی لاپروائی اور الڑھپن اپنی جگہ۔۔۔ مگر وہ اس کی فضول خرچی سے اتنا عاجز آچکا تھا کہ حد نہیں۔ دو ہفتوں کا سودا دو دنوں میں ختم کرتی تھی۔ گھی اور پانی اس کے سامنے برابر تھے۔ کئی بار قیوم کاکا کی توجہ بیوی کی اسراف پسندی کی طرف دلائی، مگر اس طرف سے جواب!

"تو کیا صرف تیری دکان سے گھر چل رہا ہے۔ میری زمینوں کا پھل اجاڑ رہی ہے تو کیوں کھل رہا ہے؟" قیوم کا سخت اور کٹیلا انداز اسے فاخرہ سے مزید برگشتہ کر دیتا۔ ایسے میں فاخرہ کی بہن کو قبول کرنا اس کے

نزدیک سراسر گھاٹے کا سودا ہی تھا اور وہ کسی صورت اس سودے کے لیے تیار نہیں تھا تب ہی تو دو ٹوک اور مضبوط انداز میں کہہ ہی ڈالا۔

"میں نگین سے شادی نہیں کر سکتا۔" قیوم و فاخرہ نے جھٹکا کھا کے پہلے تو ایک دوسرے کو پھر اسے دیکھا تھا۔ سراسر حیرانی، بے یقینی۔

"تاں تو پھر کس سے کرے گا؟" قیوم کے منہ سے نکلا۔

"لبینہ سے کروں گا۔ میرے دوست مدثر کی بہن اور اکرام اللہ صاحب کی صاحب زادی ہے۔" پرسکون انداز میں تعارف کروایا۔

"اچھا تو اپنے مالک دکان کی بات کر رہا ہے۔ اچھا تو پھر بیٹی کے ساتھ اس نے دکان بھی پکی پکی تیرے نام کرنے کا تو نہیں کہا نا؟" قیوم نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا تو فاخرہ کے لبوں پہ بھی محظوظ کن مسکراہٹ آگئی تھی۔ فیاض کو سخت برا لگا مگر لہجہ ہموار ہی رکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں، میری اکرام صاحب سے واجبی دعا سلام ہے۔ مدثر سے بھی کبھی اس موضوع پہ بات تک نہیں ہوئی۔"

"اوہ، تو اس کڑی نے آپو ہی آپ تجھے پھانس لیا نا۔ یہ بات کر۔" معنی خیزی سے آنکھیں گھماتے ہوئے فاخرہ پریقین لہجے میں بولی۔

فیاض کے چہرے پہ غصے کی سرخی لہرائی تھی، تاہم فاخرہ کو جواب دینے کی بجائے وہ تحمل سے قیوم سے مخاطب ہوا۔

"کاکا! میں لبینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور آپ دونوں اکرام صاحب کے گھر جائیں اور لبینہ کا ہاتھ مانگیں۔"

"اوئے تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ وہ اتنے بڑے کاروباری بندے، پیسے والے اور تو معمولی پرچون والا۔ رشتہ اپنے جیسوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔" قیوم نے اسے سمجھانا چاہا۔

"پیسے والے ہیں، مگر امیروں والی کوئی برائی نہیں ہے ان کے اندر۔ آپ جائیں رشتہ ڈالنے، مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔" وہ بھائی کے ہاتھ تھام کے ملتجی سا ہو کر بولا۔

"ہاں اگر چھوکری بھی اس کی طرح ضد پہ آئی ہوگی تو ماں پیو وچارے نہ کرنے جوگے نہیں رہے ہوں گے۔" فاخرہ زہریلے انداز میں بولی، پر اس نے قصداً فاخرہ کی ہرزہ سرائی کی طرف توجہ دینے سے اجتناب ہی کیا۔

"او جھلے! اپنے سے اونچے سمدھی خوار ہی کرتے ہیں۔ نگین کے لیے مان جا۔ ایک جیسے چٹائی پہ ٹکر کھانے والے۔ اب بھلا اکرام صاحب کے آگے ہم چارپائی، کرسی کہاں سے گھسیٹتے پھریں گے۔" قیوم اسے ہر صورت باز رکھنا چاہ رہا تھا۔

"خواہ مخواہ وہم ہے تیرا۔" وہ جھلایا۔

"تو بچہ ہے۔ رشتوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھ پا رہا۔ تو نگین کو میری سالی مت سمجھ۔ دیکھی بھالی بچی ہے اور جیسا کپڑا لتا چڑھا دیں گے، مجال ہے جو اعتراض کریں۔"

"تو اور کیا۔ میں تو کہتی ہوں زیور بنوانے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں اپنا زیور بہن سمجھ کر نہیں بلکہ دیورانی سمجھ کر اسے پہنا دوں گی پھر جب بھی اللہ نے دیا تو اسے اپنے بنوا کر دیں گے۔" فاخرہ نے کمال ہوشیاری سے شوہر کی بات کو بڑھایا۔

"ہونہہ! ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ بھی چوکھا آوے۔ آپ میری شادی پہ سود و زیاں کا حساب نہ کریں ہاں اگر بھرجائی کا اتنا ہی دل چاہ رہا ہے تو لبینہ کو اپنا زیور دے دیں۔" وہ مشورہ دینے کے سے انداز میں بولا تو فاخرہ سلگ اٹھی۔

"ہاں میرے پانچ تولے کے زیور، ہر مال دو روپیہ والی ریڑھی سے خریدے گئے تھے نا جو اس مہارانی کو دے دوں، جس نے ابھی اس گھر میں قدم رکھا نہیں اور بھائی، بھائی سامنے آ گئے ہیں۔" فاخرہ نے ترچھی نظر سے شوہر کو دیکھا جس کے چہرے پہ فاخرہ کی بات سن کر ایک عجیب سی سختی آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ قیوم نے شادی کے دس برسوں میں پہلی دفعہ اس کے ساتھ کھانا کھایا تھا کیوں کہ فیاض نے جواب کھانے کے ٹائم گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ رات گئے گھر لوٹتا تھا اور بنا کسی سے بات کیے اپنے کمرے میں گھس جاتا۔

اسے حقیقتاً "باپ کی مانند بھائی کی ہٹ دھرمی اور کٹھور پن نے دلگرفتہ کیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ ادھر اس نے لبینہ کا نام لیا، ادھر قیوم اس کا رشتہ مانگنے چل پڑے گا، مگر بھائی تو اس کوچے جانے کا روادار ہی نہ ہو رہا تھا جہاں اس کے دل کی خوشی کا سامان موجود تھا۔

کم دکھی اور پریشان تو قیوم بھی نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی کے اڑیل پن اور "چاند کی چاہ" نے اسے حیران و ششدر کرنے کے ساتھ دکھی بھی کیا تھا۔

ابے کی قل خوانی کے موقع پر جب برادری کے مردوں نے اس کے سر پہ سربراہی کی پگ باندھی تھی تو اسی وقت اس نے دل میں عہد کیا تھا کہ وہ کبھی اپنے چھوٹے بھائی کو پدرانہ شفقت کی کمی محسوس نہ ہونے دے گا۔ تب ہی تو بچپن سے جوانی تک تین ادوار میں اس نے فیاض کی ہر خواہش سر آنکھوں پہ رکھی اور فیاض نے بھی کبھی بڑے بھائی کے احترام میں کمی نہ آنے دی اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کیا۔

چند لمحوں کے وہ پل، جس میں اس نے لبینہ کو دیکھا اور جی بھر کر دیکھا تھا، اس کی زندگی کا حاصل بن چکے تھے۔ وہ کسی صورت اپنی اس نئی نویلی چاہ سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا، تب ہی تو ساری زندگی آنکھیں بند کر کے بھائی کی ہدایات پر عمل کرنے کے باوجود اس کے تجویز کردہ رشتے سے انکار کر دیا۔

"ہونہہ ہو یہ ساری بھابھی کی کارستانی ہے۔ وہی اس کے کان بھرتی ہے۔ ورنہ تو مجال ہے کہ کاکا میری اتنی بڑی خواہش کو اہمیت نہ دے۔" فیاض نے ناگواری سے دل میں سوچا۔

"میرا بھائی پڑھا لکھا ہے اسے پڑھی لکھی بیوی ہی ملنی چاہیے۔" فیروزہ مکمل طور پر فیاض کی ہمنوا تھی۔ وہ بھلا کیوں چاہتی کہ فاخرہ کی بہن اس گھر میں آئے۔ اس طرح تو دونوں بہنیں مل کر اس کا میکے میں داخلہ بھی بند کر دیتیں۔

"نہ تو پڑھی لکھی لڑکی کوئی دال کو بگھار اچھا لگا لیتی ہے کیا۔" فاخرہ نے چمک کر کہا اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن کو تعلیم میں صفر پوائنٹس مل رہے ہیں۔

"کیا پتا واقعی ہی بگھار اچھا لگا لیتی ہو، مگر مجھے اتنا ضرور علم ہے کہ ایک پڑھی لکھی بیوی ہی اچھی شریک حیات ثابت ہوتی ہے۔ اسے اپنے خاوند کی محنت کا پورا پورا خیال ہوتا ہے۔ وہ اس کی کمائی کو یوں اِدھر اُدھر دونوں ہاتھوں سے نہیں لٹا سکتی۔" فیاض نے سنجیدہ انداز میں براہ راست فاخرہ پہ چوٹ کی تھی تو اس نے تلملا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"ارے پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی چالاک اور چلتر ہوتی ہیں۔ دنیا پڑھ رکھی ہوتی ہے انہوں نے انگلیوں نچاتی ہیں۔" قیوم نے اپنی مخصوص سوچ کا برملا اظہار کیا، جس سے متفق صرف فاخرہ ہی ہو پائی تھی۔

"تو خواہ مخواہ کملا ہو رہا ہے۔ پڑھی لکھی بیوی تو شوہر کو گھاس تک نہیں ڈالتی۔" قیوم نے مزید خواندہ بیوی کے نقصانات پر روشنی ڈالی۔

"میں کوئی گدھا ہوں جو وہ مجھے گھاس ڈالے گی۔" فیاض برا مان گیا۔

"میرا پتر! تو سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے یہاں کہاں ہمارے گھر ٹک سکے گی۔ دیکھنا وہ تجھے بھی ہم سے لے کر الگ ہو جائے گی۔ پھر وہی چاچے اور ابے کی کہانی دہرائی جائے گی۔ چاچے اور ابے میں بڑی گوڑھی محبت تھی۔ پر چاچی نے شوہر کیا الگ کیا، دونوں بھائی ہی ٹوٹ گئے تھے تو بھی وہی صدمہ مجھے دینا چاہتا ہے۔" خدشات... ممکنات... تاویلات...

"کاکا! تو خواہ مخواہ وہمی ہو رہا ہے۔" فیاض زچ سا ہوا۔

"تو اس خیال کو دل سے نکال دے کہ بیوی تو کیا مجھے بعد کا کوئی بھی رشتہ تجھ سے دور کر سکتا ہے، تو میرے ماں باپ کی جگہ پر ہے۔ وقت بتائے گا کہ میں تیرے احترام اور محبت میں کبھی کمی نہ آنے دوں گا۔

پڑھی لکھی بیوی تو کیا کسی حور پری کی محبت بھی تیری محبت پہ حاوی نہیں ہو سکتی۔ اس دل میں تیرا جو مقام ہے وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" فیاض اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے بولا جس کا مقابل پہ خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

"دیکھ، بس مرد بن کر اپنے لفظوں کا پاس رکھنا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ دو بہنیں ہوں گی تو ہم بھائیوں کو بھی جوڑ کر رکھیں گی۔" قیوم کا لہجہ نسبتاً "کمزور تھا۔

"اوہ کاکا! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ دونوں بہنیں آپس میں پیار محبت سے رہیں گی، دیورانی، جیٹھانی کا رشتہ سابقہ رشتے کی مٹھاس ختم کر دیتا ہے۔ بس تو کسی بھی خدشے کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔" فیاض ہلکا پھلکا ہو کر بولا۔ کئی دنوں سے دل پہ چھائے غبار کے بادل ایک دم سے چھٹ گئے تھے۔

"او چل! جیسے تیری مرضی، تو خوش رہے مجھے بس یہی کافی ہے۔ بس پھر کل چلتے ہیں اکرام صاحب کی طرف۔" قیوم نے فاخرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ فیاض کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا وہ لوگ یہاں رشتہ جوڑیں گے۔ وہ بڑے لوگ اور ہم مزدوری دار طبقہ۔" فاخرہ کھین سے بولی۔

"کہاں کے بڑے لوگ۔ ہم کون سا کسی سے کم ہیں۔ اپنی محنت کا کھاتے ہیں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔" قیوم بھڑک کر بولا اس کی عزت نفس بھلا کہاں گوارا کر سکتی تھی ایسا تازیانہ۔

"پانچ کیا دس تولے چڑھائیں گے ان کی بیٹی کو۔ پورا نچ دج کے بیاہ لائیں گے۔" قیوم تکیے سے ٹیک لگا کر شاہانہ پن سے بولا۔

"او جیہے میرا کاکا!" فیاض نے وفور مسرت سے آگے بڑھ کر قیوم کو گلے لگا لیا۔

☆ ☆ ☆

اکرام اللہ صاحب نے رسمی چھان پھٹک کا بھی وقت نہیں مانگا اسی وقت "ہاں" کہہ دی۔ بھلا کاہے کی جانچ پڑتال کرتے۔ فیاض برسوں سے تو ان کی دکان پہ بیٹھا اپنا جنرل اسٹور چلا رہا تھا۔ شریف، محنتی اور نیک لڑکا، اگر مدثر کی دوستی اور گارنٹی نہ بھی ہوتی تو ان کی زیرک اور زمانہ شناس نگاہیں فیاض کی شخصیت کو پرکھ چکی تھیں کہ یہ نوجوان ان کی چھوٹی لاڈلی صاحب زادی کو تحفظ، عزت اور مان سے بھرپور ازدواجی زندگی کی مسرتیں دے سکتا ہے۔

قیوم کو اس وقت خاصا اچنبھا ہوا تھا جب اکرام صاحب کی طرف سے زیور اور گھر کے سلسلے میں کوئی مطالبہ نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ اپنی طرف سے انہوں نے اتنا زیادہ اور بڑھیا جہیز بیٹی کو دیا تھا کہ دیکھنے والے برملا ستائش کیے بنا رہ نہ پائے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ارے بھئی جلدی کرو۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔" کاٹن کے سفید سوٹ میں ملبوس کفوں کے بٹن بند کرتا ہوا فیاض کمرے کے اندر داخل ہوا تھا۔

"جی، بس چلتے ہیں۔" لبینہ دراز سلکی نم مشک بو بالوں کو کنگھے سے سلجھاتے ہوئے بولی۔

فیاض نے گہری نظروں سے لبینہ کو دیکھا جس کے چہرے پہ اس کی والہانہ چاہت اور وارفتگی کے رنگ اتنے خوب صورت اور واضح تھے کہ دیکھنے والے بے ساختہ بلائیں لے کر اس کی دائمی خوشیوں کی دعا مانگنے لگتے۔

"گیسوئے دراز کو اور بھی دراز کر۔" وہ ایک ایک قدم اٹھاتا ہوا قریب آ کے گمبھیر لہجے میں بولا تو لبینہ کے دل کی دھڑکن ایک دم سے تیز ہو گئی تھی۔ چہرے پہ جیسے بلش آن پھیر دیا گیا ہو۔

"بزبان اقبال آپ ہمارے ہوش و خرد اور قلب و نظر کو تو اس وقت شکار کر چکی ہیں جب چار ماہ قبل آپ کے گھر میں اتفاقی ملاقات ہوئی تھی۔" اس کے کان کے قریب مخمور آواز میں بولا تو لبینہ بے ساختہ بدن چراتے ہوئے نرمی سے اسے دور کرتے ہوئے بولی۔

"بس مجھے تیار ہونے دیں۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔" فیاض بے ساختہ ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے پرے ہوا تھا۔ وہ لوگ آج اکرام اللہ صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ حسب قاعدہ دولہا، دلہن کی دعوتوں کا سلسلہ سب سے پہلے سمدھی کے ہاں سے شروع ہوا تھا۔ لبینہ کی ساری شادی شدہ بہنیں بھی آج میکے میں موجود تھیں۔ قیوم اور فاخرہ کو بھی اتنی ہی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا جتنے لبینہ اور فیاض کو۔ لمبے سے دسترخوان پہ طرح طرح کے کھانے چنے گئے تھے جنہیں اکرام صاحب بصد اصرار انہیں لینے کو کہہ رہے تھے دو منزلہ سفید ماربل کی اینٹوں سے مزین، پرتعیش گھر، بیش قیمت آرائشی سامان، ہر چیز سے چھلکتی امارت و فیاضی قیوم اور فاخرہ دل ہی دل میں سخت مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ سخت بے چینی بھی محسوس کر رہے تھے۔ اکرام صاحب اور ان کے بیٹوں کی طرف سے گو کہ عزت و اکرام میں کوئی کمی نہ تھی، ان کے لب و لہجے کی انکساری اور طبیعت کی سادگی میں کہیں بھی شائبہ نہ تھا کہ ان کا شمار متمول اور صاحب حیثیت لوگوں میں ہوتا ہے، پھر بھی قیوم کا دل چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ ادھر سے غائب ہو جائے۔

کئی بار فیاض کو اٹھنے کا اشارہ کیا، مگر وہ لبینہ کی بھانجیوں اور بھتیجیوں سے ہنسی مذاق میں اتنا مشغول تھا کہ بھائی کی بے چینی اور گھبراہٹ کو محسوس نہ کر سکا۔

"اچھا! انکل آپ نے آنٹی کو منہ دکھائی میں کیا دیا تھا۔" یسری نے آنٹی کو شوخی سے دیکھتے ہوئے روایتی سا سوال فیاض سے کیا تھا۔

"ارے جی ہم تو بہت کچھ دینے کو تیار تھے، مگر انہوں نے ہی سب سے کم قیمت اور ارزاں چیز کو منتخب کر لیا۔" فیاض نے مصنوعی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"کیا چیز مانگ لی تھی؟" یسری نے حیرانی سے پوچھا۔

"فیاض احمد۔" فیاض نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ یسری کے ساتھ لبینہ بھی سر جھٹک کے مسکرا دی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔ بہت کم مایہ اور سستی میری ذات تھی، مگر آپ کی آنٹی جی کی ہمراہی نے ہمیں گراں اور اپنی نظروں میں بے بہا کر دیا۔"

"فیاض! گھر کب چلنا ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔" قیوم نے عادتاً" زور سے بولتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

"ٹھہریں بھائی! ابھی چائے آنی ہے پھر پی کر چلتے ہیں۔" لبینہ نے نرمی سے کہا۔ فیاض نے بھائی کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں لبینہ! بس اب چلتے ہیں۔ کاکا نے صبح منہ اندھیرے زمینوں پہ بھی نکلنا ہوتا ہے ان کے سونے کا ٹائم ہو رہا ہے۔" فیاض نے آرام سے اسے منع کیا تو سب ہی الوداعی ملاقات کو اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

واپسی پہ قیوم اور فاخرہ دونوں چپ چپ سے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج لبینہ کی بڑی بہن ثمینہ کے ہاں ان کی دعوت تھی۔ پورا گھر مدعو تھا، مگر قیوم نے عذر پیش کر دیا۔

"تم دونوں چلے جاؤ۔ میری شاید رات کو کھیتوں کو پانی دینے کی باری آ جائے۔" ثمینہ نے جاتے سمے قیوم اور فاخرہ کا کھانا بھی ساتھ دے دیا تھا۔

"یہ کیوں ساتھ لے آئے ہو۔ بھلا یہ مرغی اور مچھلی ہمارے گھر کبھی نہیں پکی۔" قیوم کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ لبینہ تو لبینہ خود فیاض کو بھی بھائی کی ناراضی کی سمجھ نہ آئی تھی۔

"نہیں بھائی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ دونوں نہیں آئے تو باجی نے کھانا باندھ دیا۔" لبینہ نے بوکھلا کر وضاحت دی۔ قیوم کے تیور تھے ہی اتنے تند کہ مقابل بے ساختہ وضاحتیں دینے پہ آ جاتا۔

"وہی تو پوچھ رہا ہوں۔ کیوں باندھ دیا۔ تم دونوں جہاں بھی دعوتیں کھانے جاؤ گے تو ہمارے لیے بھی باندھ لاؤ گے کہ دیکھو یہ ہم مرغ مسلم اور روغنی دعوتیں اڑا کر آ رہے ہیں۔" قیوم نے کینڈلی نظروں سے دونوں میاں بیوی کو دیکھا تھا۔ لبینہ کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑا تھا۔

"تو چھتی کر' میرے لیے روٹی نکال۔" کڑک کر فاخرہ کو حکم ملا تو وہ پھرتی سے کدو کا سالن اور گرم روٹی لے آئی۔ فیاض نے بے حد سنجیدگی سے بھائی کے بے گانہ انداز کو دیکھا پھر لبینہ سے مخاطب ہوا۔

"تم جاؤ! اور جاکر کھانا کھول کر رکھ دو۔ صبح کھالیں گے۔" لبینہ سرہلا کر منظر سے ہٹ گئی۔

"اور سنا کاکا! کہہ رہے ہیں اس بار پھٹی کی قیمت کچھ خاص نہیں ہے۔" فیاض آرام سے چارپائی پہ بیٹھ گیا اور روٹی کا نوالہ توڑ کر بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔ فاخرہ کینہ توز نظروں سے فیاض کو گھورنے لگی۔

"جب بھی بھائیوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کروں اسی وقت یہ ڈھیٹ سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیتا ہے۔" وہ دانت کچکچا کر خوا مخواہ ٹوکرے میں برتن کھڑکھڑانے لگی تھی۔

"ہر دفعہ یہ کہتے ہیں' مگر ریٹ چڑھ ہی جاتے ہیں' ہم ذرا دیر سے روئی بیچ دیں گے اس وقت مناسب قیمت لگ ہی جائے گی۔" قیوم نے پر سکون ہو کر جواب دیا تھا۔ چہرے پہ کچھ دیر پہلے کے چھائے تناؤ اور تلخی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لہجہ بھی ہموار اور دھیما ہو چکا تھا۔

فیاض بھائی کا مزاج شناس اور نباض تھا۔ بھرے پیٹ کی وجہ سے وہ چھوٹے چھوٹے لقمے لیتا رہا اور اس وقت تک شریک طعام رہا جب تک قیوم نے پیٹ بھر کر منہ سے ہارن نما ڈکار نہیں نکالی۔ لبینہ کھانا اندر رکھ کر باہر آئی تو جھٹکا کھا کر رہ گئی۔ دونوں بھائیوں کو آپس میں ہنستے' گپیں لگاتا دیکھ کر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنا فیاض کو کھانا کھاتے دیکھ کر۔ ابھی تو فیاض باجی کے ہاں سے تمام ڈشوں سے خوب انصاف کر کے آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج پھر تم لوگوں کی دعوت ہے کہیں؟"

بائل گرین کامدار جوڑے میں ملبوس اور مناسب میک اپ میں سجی سنوری لبینہ کو دیکھتے ہوئے قیوم نے استفسار کیا تھا۔

"جی کاکا! آج لبینہ کے چاچا کے ہاں دعوت ہے۔ وہ اگلے ہفتے دبئی جارہے ہیں تو اس لیے انہوں نے سوچا کہ دعوت اسی ہفتے نمٹالی جائے۔" فیاض صفائی دینے کے انداز میں بولا۔

"او یار! تیرا سسرال تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا نہیں ہوتا جارہا؟" قیوم نے مسخرے پن سے کہا تو فاخرہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ لبینہ کو جیٹھ کا یہ مذاق خاصا برا لگا تھا۔

"کبھی تیری سالیوں کے ہاں دعوت ہے تو کبھی سالے کے سسر کے ہاں' بس اپنے سسر کی دعوت بھگتالی ہے کیا یہ کافی نہیں؟ دور کے سسرالیوں کے ہاں دعوت کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" قیوم نے تحکمانہ پن سے کہا تو لبینہ نے بے ساختہ پریشان ہو کر شوہر کی شکل دیکھی تھی جہاں پہ اضطراب چھایا ہوا تھا۔

"جی کاکا! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' مگر یہ بھی دیکھیں یہ لبینہ کے نہ صرف اکلوتے چچا بلکہ امینہ کے سسر بھی ہیں۔ اس کے بھائی کا سسرال بھی ہے۔ انکار کرنا مناسب نہیں لگتا۔" فیاض بھائی کے چہرے پہ نظریں جمائے اٹک اٹک کر بولا۔

"او جا یار! جا۔ میں بھول جاتا ہوں کہ اب تو شادی شدہ اور بیوی سسرال والا ہے۔ تیری تو ایک لمبی چوڑی پیسے والی سسرال ہے۔ جن کے ہاں کھانا کھانا تیرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں' تو بھلا انہیں کیسے انکار کر سکتا ہے۔ میں ہی جھلا اور کم عقل ہوں جو ریڑھی سرپٹ دوڑاتا اس امید پہ گھر آتا ہوں کہ میرا ماں جایا اس انتظار میں ہوگا کہ مل کر ٹکر روٹی کھائیں۔" قیوم بے حد جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔ لہجے میں گہری افسردگی اور مایوسی گھلی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں' صرف یہ ایک ہفتہ ہے۔ پھر سے اپنی روٹین پہ آجائیں گے۔" فیاض نے شرمندگی سے وضاحت دی۔

"یہ ٹریکٹر والا بڑا رولا ڈال رہا ہے تو اس سے بات کر نا بندے کا پتر بن کر سارے رقبے پہ ہل چلائے پیسے ایڈوانس کس لیے مانگے تھے پھر جواب ادھورا کام چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔" قیوم نے فیاض کی وضاحت پر توجہ نہیں دی۔ اپنا تازہ تازہ مسئلہ بیان کیا۔

"اچھا میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔" فیاض نے موبائل نکال کر کانوں سے لگایا تو لبینہ اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مسئلہ کافی گمبھیر تھا۔ کافی دیر بحث و تمحیص کے بعد کہیں جاکر معاملہ سیٹ ہوا تھا۔

"میں ان پڑھ چٹا جاہل تھا' تب ہی تو حساب خرچے کی باریکیاں سمجھ نہیں آرہی تھیں میرے پڑھے لکھے بھرانے تو منٹوں میں مسئلہ حل کر دیا۔" قیوم نے فخر اور محبت سے اس کی پیٹھ تھپکی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ وہ اندر کمرے میں آیا تو لبینہ کپڑے تبدیل کیے' بازو آنکھوں پہ رکھے سو رہی تھی۔ چہرے سے ناراضی واضح تھی۔ اس کا دل بحر ندامت میں ڈوب گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ نے دودھ کی دیگچی ابلنے کے لیے مٹی کے چولہے پہ چڑھائی۔ انگاروں پہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر پھونک ماری اور اندر کچن میں چلی گئی۔ کچن میں رکھے ٹی وی پہ اس کی پسندیدہ سرائیکی فلم لگی ہوئی تھی۔ ایکشن' بے حجابانہ رومانس اور ہیجان خیز ڈانسوں سے بھرپور مسالہ دار فلمیں وہ کافی شوق سے دیکھتی تھی۔ بھاری بھرکم تھرکتی ہیروئنوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والے رقص اسے بہت پسند تھے تب ہی تو کیبل پہ سارا دن وہ یہی "چیٹ پٹی" تفریح ہی دیکھتی رہتی تھی۔

لبینہ نے جیٹھانی کو دودھ چڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ پورے صحن کی صفائی کے بعد منہ ہاتھ دھو کر جب چولہے پہ آئی تو حیران رہ گئی کہ دیگچی ہنوز چڑھی ہوئی تھی۔ لکڑیاں سلگ کر دھواں چھوڑ رہی تھیں مگر آگ نہ جل پائی تھی۔ اس نے ایک دو پھونکیں ماریں تو آگ بھڑک اٹھی تھی۔ دودھ تیزی سے اوپر آیا تو اس نے اتار کر اندر ہوا دانی میں رکھ دیا۔

"باجی! ایک کٹورا چینی تو دے دیں۔ اماں کہہ رہی ہیں کل واپس کر دیں گے۔" ساتھ والی منی کٹورہ لیے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"مگر بیٹا! آپ پچھلے ہفتے دو بالٹی آٹا ادھار لے گئی تھیں۔ وہ ابھی تک واپس نہیں کیا۔" اس نے نرمی سے منی کو یاددہانی کروائی۔

"باجی! وہ آپ سے تو نہیں لیا تھا۔ وہ تو فاخرہ خالہ سے ادھار لیا تھا۔" منی نے ہکلا کر کہا۔ ساتھ ہی مدد طلب نظروں سے فاخرہ خالہ کو دیکھا بھی تھا۔

"ہاں یہ آٹا مجھ سے لے گئی تھی۔" فاخرہ نے ٹی وی آف کر کے لاپروائی سے جواب دیا۔

"چاہے جس سے بھی ادھار لیا ہو۔ واپس کرنا تو لازمی ہوتا ہے نا۔ ابھی کل یا پرسوں ماسی کلثوم چائے کی پتی ادھار لے گئی تھیں۔ وہ ابھی تک واپس نہیں کی۔" اس نے ڈبا کھول کر کٹورہ چینی سے بھرا اور منی کو تھماتے ہوئے پھر سے یاد کرایا کہ۔

"آپ نے آٹا واپس کرنا ہے امی سے کہہ دینا۔"

"ویسے لبینہ! تم اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہو۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں' مگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اتنا حساب رکھتی ہو کہ حد نہیں۔" فاخرہ نے گہرے طنز سے اس سے کہا۔

"حساب رکھنا پڑتا ہے بھابھی! پہلے نہیں رکھتی تھی' مگر اب رکھتی ہوں کیوں کہ میرا شوہر ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور چلا رہا ہے۔ باپ کی بے شک جاگیر تھی' مگر وہ ان بیاہی زندگی تھی۔ یہاں تو چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ اس کی باتوں کا جواب فاخرہ کی مسلسل تمسخرانہ مسکراہٹ تھی جو اس کے لبوں پہ چپکی ہوئی تھی۔

"اگر اسی طرح گھر کی ایک ایک چیز یوں لٹتی رہی تو بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الٹا فیاض کا کاروبار بھی ٹھپ ہو سکتا ہے۔"

"تو تمہارا کیا خیال ہے' صرف تمہیں ہی گھر کے

نفع نقصان کا احساس ہے' میں دشمن ہوں گھر کی۔" فاخرہ نے چبھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں' میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ بے شک برتنے کی چیز ہمسایوں کو دیا کریں' مگر پلیز واپسی کا تقاضا بھی کیا کریں کہ مہنگائی زوروں پہ ہے۔ آج کل ہر کوئی کفایت شعاری سے کام لے رہا ہے۔" اس نے نرمی سے جواب دیا۔

"اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ اتنا چھوٹا دل بھی کس کام کا؟" فاخرہ نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"فیاضی اور وسعت قلبی بلاشبہ انسانی شخصیت کا زیور کہلاتے ہیں' مگر اسراف ــــ بھی ہر حال میں قابل مذمت ہے ــــ" اس نے سہولت سے اپنی بات مکمل کی اور باہر آگئی۔

فیاض نے شادی کے اولین دنوں میں فاخرہ کی تکنین کو دیورانی بنانے کی خواہش سے لے کر اس کی فضول خرچ اور بے دریغ پیسہ اڑانے کی عادت تک سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے گریجویشن کیا تھا۔ بے حد ذمہ دار اور حساس طبیعت کی مالک۔ اپنے محنتی شوہر کی کمائی کو یوں پانی کی طرح بہتا دیکھ کر اس کا دل خوب کڑھتا تھا' مگر وہ سیدھے سیدھے فاخرہ سے بات کرنے یا فیاض سے اس کی شکایت لگانے کی بجائے خود ہی اصلاح احوال کے لیے فاخرہ سے نرم اور دیبے لہجے میں ہاتھ ہولا رکھنے کی طرف توجہ دلاتی رہتی تھی۔

رات کو محلے میں مہندی کا فنکشن تھا۔ اس نے فاخرہ کو میک اپ کردینے کی آفر کی۔

"آئیں بھابھی! میں آپ کو تیار کروں؟" وہ خوش دلی سے مخاطب ہوئی۔

"نہیں رہنے دو۔ مجھے خود کرنا آتا ہے۔" فاخرہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"ہونہہ! اپنی بڑھیا اور قیمتی چیزوں کی شو مارنا چاہتی ہے تاکہ میں تعریف کروں اس کی۔" دل ہی دل میں کلستے ہوئے فاخرہ اپنے چہرے پہ ڈھیروں فاؤنڈیشن لگاتی رہی۔

پراعتماد اور باوقار لبینہ کو فنکشن میں موجود خواتین خاصے اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک تو نئی نویلی دلہن دیکھنے کا شوق اور دوسرا بڑے گھر کی بیٹی۔

"دلہن رانی! تو بہت اچھی ہے' پر میری نوں (بہو) تو خواہ مخواہ تیری برائیاں کرتی ہے۔" وہ ایک بزرگ خاتون کو سلام کرنے لگی تو ان کے جواب نے اسے حیران کردیا تھا۔

"میری کیوں برائیاں کرتی ہیں۔ مجھے تو ابھی تین ماہ بھی نہیں ہوئے اس محلے میں آئے ہوئے۔" اس نے دل میں سوچا۔ پھر جلد ہی ان خاتون کی بات کا جواب اسے مل گیا۔

"ارے یہ دیکھی ہے۔ فاخرہ کی دیورانی۔۔۔ بڑی کنجوس ہے۔ جب بھی کوئی چیز مانگنے جاؤ تو فوراً" پچھلا حساب مانگنے کھڑی ہوجاتی ہے۔ تھڑدلی۔ فاخرہ جتنا بڑا دل نہیں ہے اس کا۔"

آواز اس کے پیچھے سے عورتوں کے مجمع سے آئی تھی۔

"اوہ!" وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔

فاخرہ کو ڈانس کے لیے اٹھایا تو وہ دل کھول کر ناچی' کھانا کھلنے کے وقت بطور خاص اسے دیگ پہ سالن تقسیم کرنے کے لیے بٹھایا گیا جو اس کے لیے خاصے اعزاز اور فخر کی بات تھی۔ گھر والے اسے بہت اپنائیت اور محبت دے رہے تھے۔ وہ لبینہ کو دکھانا چاہتی تھی' مگر رش میں لبینہ نظر نہیں آرہی تھی۔

گھر آکر وہ تھکاوٹ سے ہائے وائے کرتی رہی۔

"کیا ہوا! کیا ہل چلایا یا کنواں کھدوایا ہے تم سے ہمسایوں نے؟" قیوم نے ازراہ تفنن پوچھا۔

"بس کیا بتاؤں ہر طرف ایک ہی آواز' باجی فاخرہ' مامی فاخرہ' دلہن کی بری دکھائے تو خالہ فاخرہ' کھانا بانٹے تو چاچی فاخرہ اب تھکاوٹ تو ہونی ہے نا۔"

وہ لبینہ کو دیکھتے ہوئے جتا کر بولی کہ دیکھو محلے میں میری کتنی عزت ہے۔ لبینہ جواب میں کچھ کہنے کی بجائے دودھ کی لسی بنانے لگی۔ دودھ میں کڑواہٹ تھی۔ یہ دھوئیں کی کڑواہٹ تھی جو کافی دیر سلگتی لکڑیوں پہ دیگچی چڑھانے سے دودھ میں پیدا ہوچکی

تھی۔ دودھ پینے کے قابل نہ تھا۔

"جاؤ فیاض! ہوٹل سے دو کلو دودھ خرید کر لاؤ' اگر سوتے وقت دودھ نہ ملے تو جسم کی تھکاوٹ دور نہیں ہوتی۔" قیوم نے اس سے کہا۔

"اگر کام توجہ اور ذمہ داری سے ہو تو بھلا یہ نقصان کیوں ہوگا۔" فیاض جھنجلا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے روزانہ کی کمیٹی ڈالی ہوئی تھی' مگر یہ خواہ مخواہ کی فضول خرچیاں اس کی ساری بچت کو خراب کرکے رکھ دیتی تھیں۔ اب جو پیسے کمیٹی کے لیے الگ کیے تھے' انہی میں سے دودھ خریدنا پڑا۔ فیاض کے چہرے پہ برہمی اور جھنجلاہٹ دیکھ کر لبینہ کا جی چاہا کہ وہ فاخرہ کو خوب کھری کھری سنائے' مگر مصلحتاً" خاموش رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

فاخرہ کو لبینہ بہت بری لگتی تھی اور لگنی بھی چاہیے تھی کیوں کہ لبینہ نے اس کے سارے ارمان' سارے ارادے جو خاک میں ملا ڈالے تھے۔ اس کی بہن کے حق پر قابض ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر لبینہ کو اس گھر سے باہر نکال دے۔ ساتھ فیاض کو بھی' جس نے اس کی بہن میں کیڑے نکال کر لبینہ سے بیاہ رچالیا تھا۔

وہ اکیلے گھر کی راجدھانی کا مزا لوٹنا چاہتی تھی۔ لبینہ کو اس کی فضول خرچیوں پر اعتراض ہوتا' تب ہی تو وہ اسے دبے لفظوں میں ٹوک دیتی تھی اور یہی روک ٹوک اسے سخت گراں گزرتی تھی۔

اسے دونوں بھائیوں کا ایکا بھی بے چین رکھتا تھا۔ وہ بڑی شدت سے اس دن کی منتظر تھی جب دونوں بھائی ایک دوسرے سے منہ موڑ کر اپنی الگ الگ دنیا بسائیں گے۔

فیاض کا لبینہ کے چاؤ چونچلے اٹھانا بھی اسے برا لگتا تھا۔ فیاض بیوی سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ بے حد خیال رکھنے والا شوہر بھی تھا۔ گاہے بگاہے اسے گفٹ دیتا۔ ہفتے میں دو تین دفعہ میکے ملوانے لے جاتا۔ برملا شوخ جملے اچھالتا رہتا جنہیں سن سن کر لبینہ کبھی شرم سے سرخ پڑجاتی تو کبھی گھورنے لگتی۔ فاخرہ کو میاں بیوی کی ذہنی ہم آہنگی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ نواں مہینہ ہونے کو آرہا تھا' مگر ابھی تک نئے نویلے دلہا دلہن بنے رہتے تھے۔

محبت تو قیوم بھی اس سے کرتا تھا۔ اتنی محبت کہ اس کی خاطر اپنی سگی بہن اور بھائی کو بلادریغ جھڑک دیا کرتا تھا۔ اس کی آنکھ میں آنسو تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھ سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا تھا۔ مگر اظہار کے معاملے میں کورا تھا۔ نہ تو کبھی نرم گرم نظر ڈالتا نہ ہی کوئی شوخ' جذبات میں ہلچل مچانے والی سرگوشی اس کے کانوں میں انڈیلتا۔ عجیب نخس اور رف سا بندہ۔

ایسے میں لبینہ اور فیاض کی باہمی محبت و لگاؤ اسے انگاروں پہ لوٹنے پہ مجبور کردیتے تھے۔ وہ بس یہی چاہتی تھی کہ قیوم بھائی اور بھابھی سے اتنا بددل اور برگشتہ ہوجائے کہ خود سے انہیں بے گھر کردے۔ کیوں کہ لاکھ اس سے محبت جتانے کے باوجود' قیوم تاحیات اپنے اباجی کے قول کو نبھانے کا عزم رکھتا تھا۔ بھائیوں کے ایک ساتھ مل کر کھانے اور زندگی بسر کرنے کا عزم۔

وہ بندوق فیاض اور لبینہ کے کندھے پہ رکھ کر چلانا چاہتی تھی کہ قیوم یہ سمجھے کہ یہ دونوں میاں بیوی اب ایک ساتھ ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ لبینہ کی متحمل طبیعت اور فیاض کی نرم خوئی اور نیک ــــ فطرت فاخرہ کے لیے خاصی معاون و مددگار ثابت ہورہی تھی۔

☆ ☆ ☆

فیاض کو زیادہ مرچ مسالے والا سالن پسند نہ تھا اور فاخرہ شام کو سالن بناتے وقت مٹھی بھر مرچیں جھونک دیتی تھی۔ روٹیاں ادھ جلی اور کچی ہوتیں۔ شوہر کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ کر لبینہ نے شام کا کھانا خود پکانا شروع کردیا۔

باقی سارے کاموں میں بھی فاخرہ کا یہی حال تھا۔

ایک تو مارے باندھے ایک آدھ کام کرتی اور جو کرتی بے حد بے ڈھنگا اور ادھورا ہوتا جسے لبینہ کو خود ہی مکمل کرنا پڑتا۔ لبینہ کو تپانے کی خاطر وہ محلے والوں کو جھولی بھر کر چیزیں اٹھا کر دے دیا کرتی' پیاز' لہسن' آلو۔ تعلیم یافتہ اور فہم و شعور کی دولت سے مالا مال لبینہ سے فاخرہ کے ارادے کوئی ڈھکے چھپے نہ تھے۔ وہ بخوبی سمجھ رہی تھی کہ فاخرہ یہ ساری حرکتیں صرف اس لیے کرتی ہے تاکہ لبینہ کا امیج گھر والوں کی نظروں میں خراب ہو سکے۔

لبینہ کے بڑے بھائی آصف کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ بھابھی ناظمہ خود مدعو کرنے آئیں۔ فاخرہ کو بھی انہوں نے بصد اصرار آنے کو کہا تھا' مگر اس نے انکار کر دیا۔ ان کے گھر کی امارت سے تو اس کے حواس ہی جامد ہو جاتے تھے۔ اچھی بھلی چلتی زبان گنگ ہو جاتی مرعوبیت اور احساس کمتری کے احساس سے مغلوب ہو کر ایک ایک کی شکلیں دیکھنے سے بہتر ہی تھا کہ ایسے لوگوں سے میل جول بڑھایا ہی نہ جائے۔

فیاض اور لبینہ نے خود فنکشن اٹینڈ کیا۔ ننھے مطب کے لیے کافی بڑا سا گفٹ لے کر بھی گئے۔ ناظمہ بھابھی نے فاخرہ کے لیے کیک اور دوسرے کھانے کے آئٹمز بھیجنے چاہے تو اس نے گھبرا کر منع کر دیا۔ ذہن میں شادی کے اولین دنوں میں قیوم کا بگڑنا یاد تھا۔

"اگر اسی طرح ہر دوسرے دن دکان بند ہوتی رہی تو خوب کما چکے تم۔" وہ ہنستے مسکراتے گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اپنے کمرے کے سامنے قیوم کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر فیاض سے سخت لہجے میں مخاطب ہوا۔

"جی کاکا! میں سمجھا نہیں۔" فیاض نے نرمی سے پوچھا۔ وہ دونوں اب اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ جب بھی لبینہ کے میکے سے ان کی واپسی ہوتی اس وقت قیوم کافی ناراض' بدگمان اور برافروختہ ہوتا تھا۔ ماتھے پہ تیوریاں اور زبان میں کڑواہٹ گھلی ہوتی تھی۔

"یہی کہ تم جو بلاناغہ اپنے سسرال دعوتیں بھگتا کر آتے ہو تو اس دوران دکان پہ کون بیٹھتا ہے؟" قیوم نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کاکا! روزانہ کہاں؟ آج آصف بھائی کے بیٹے کی سالگرہ تھی تو چلے گئے۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی "غلطی" سے اس کا ذہن ہٹانا چاہا۔

"دیکھو فیاض! میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ تم آہستہ آہستہ مجھ سے پیٹھ پھیرتے جا رہے ہو۔ کبھی سالے کے بیٹے کا عقیقہ تو کبھی سالگرہ۔ بھائی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے' دل کا حال بانٹنے کا تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا لیکن سسرال کی خوشیوں میں شامل ہونے کا وقت مل جاتا ہے۔" قیوم گلہ آمیز اور سخت شاکی انداز میں پشت پہ ہاتھ باندھے کہہ رہا تھا۔

"کاکا! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ اب میں دنیاداری بھی نہ نبھاؤں۔ تیرے گوڈے سے لگ کر بیٹھا رہوں بس۔" فیاض اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ تنگ آچکا تھا صفائیاں دے دے کر۔ وضاحتیں پیش کر کر کے قیوم نے ٹہلنا بند کر دیا اور حیرانی سے فیاض کو دیکھا جس کے چہرے پہ اکتاہٹ تھی۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری باتیں واقعی بچکانہ اور فضول ہیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے وہ مل بیٹھ کے کر لیں تو بہتر ہے۔" قیوم نے ٹھنڈے اور سرد لہجے میں کہا اور اندر اپنے کمرے میں آگیا۔

"فاخرہ! تو ٹھیک کہتی ہے یہ چالاک لڑکی میرے بھائی کو مجھ سے چھینتی جا رہی ہے' ہم دونوں بھائیوں کے دلوں میں دراڑ ڈال رہی ہے۔" قیوم' فاخرہ کے قریب چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے سخت کبیدگی سے بولا تو وہ خوشی سے ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تو اور کیا۔ تجھے روز کہتی ہوں۔ لبینہ نے فیاض کی آنکھوں پہ اپنے باپ کی دولت کی وہ پٹی باندھی ہے کہ اب اسے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فیاض کا دل ہر وقت اپنے سسرالیوں میں لگا رہتا ہے۔ سالیوں کے بچے تو آرام سے چیزیں اٹھاتے اور کھاتے رہتے ہیں اس کی دکان سے۔" وہ بڑے دھیمے انداز میں اس کے کانوں میں زہر پھونک رہی تھی۔

"اب مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" فیاض نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا مطلب صابن نہیں ہے؟" فاخرہ نے بھونچکا ہو کر فیاض کو دیکھا تھا' مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بنا سکون سے اپنی موٹر سائیکل چمکانے میں لگا رہا۔

"میں تو چلو گھر میں میلے کچیلے کپڑے پہنے رکھتی ہوں' مگر تیرا بھائی مرد ذات ہے کیا کام پہ یونہی غلیظ کپڑوں میں چلا جائے؟" وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ابھی کچھ دیر قبل اس نے محلے کے بچے کو فیاض کی دکان پہ کپڑے دھونے والا صابن لینے بھیجا تھا' مگر بچہ یونہی خالی ہاتھ لٹکائے واپس آگیا تھا اس جواب کے ساتھ۔

"بھائی نے کہا ہے چلو بھاگ جاؤ۔ کوئی صابن وابن نہیں ہے۔" فاخرہ تو غصے سے سو سو بل کھا کے رہ گئی تھی۔

"ہاں صابن واقعی میرے پاس نہیں ہے' فضول میں اڑانے کے لیے۔ ابھی اس ماہ کے شروع میں پوری دو درجن ٹکیاں آپ کے حوالے کی تھیں' وہ کہاں گئیں؟" وہ سیدھا ہو کے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"وہ صابن۔ اس میں سے آدھے تو میں اپنے میکے چوری چھپے دے آئی ہوں کیا تمہاری بیوی نے تمہیں بتایا نہیں؟" فاخرہ نے کٹیلی نظر لبینہ پہ ڈالتے ہوئے طنز سے کہا۔

"میکے نہیں بلکہ محلے میں بانٹی ہوں گی یقیناً۔" وہ گیلا کپڑا پانی سے بھری بالٹی میں ڈالتے ہوئے بولا۔

"دیکھ فیاض! اگر اس طرح تو حساب کتاب لیتا ہے تو پھر تجھے بھی اپنے بھائی کی کمائی کا حساب دینا ہو گا۔" فاخرہ غصے سے بری طرح چیخی کہ لبینہ نے سہم کر دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے تھے۔

"او کیوں شور ڈال رہی ہے؟" قیوم منہ پھاڑ جمائیاں لیتا اور مخمور آنکھوں کو مسلتا ہوا باہر آگیا۔ وہ صبح سے سو رہا تھا کیوں کہ رات بھر جاگ کر کھاد کی فصل کو پانی جو دینا پڑا تھا۔

"وے قیوم دیکھ تو! تیرا بھائی مجھ پہ خرچہ تنگ کر رہا ہے۔" فاخرہ زار و قطار روتے ہوئے قیوم کی طرف مڑی تھی۔ لبینہ تو اس کی مکاری پہ دنگ کھڑی تھی۔

"او ہوا کیا ہے؟" قیوم نے سوئی سوئی آنکھوں سے جملہ افراد کے چہروں کو دیکھا۔

"کتنے دنوں سے میلے کپڑے پہنے پھر رہی ہوں۔ بدبو سے دماغ پھٹنے کو آرہا ہے' مگر یہ فیاض مجھ سے صابن کا حساب مانگ رہا ہے تو اس کا حساب چکتا کر پھر مجھے کسی دکان سے صابن لا دے تاکہ میں بھی اجلے کپڑے تن پہ ڈالوں۔" فاخرہ نے لہجے میں مقدور بھر لاچاری و مسکینیت بھری۔

قیوم کے پہلے سے سخت چہرے پہ مزید سختی ابھر آئی تھی۔

"فیاض! میری زنانی سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں جو مسئلہ ہے مجھ سے کہہ۔" قیوم دبنگ انداز میں بولا۔

"او کاکا! وہی بہت پرانا مسئلہ' اتنی فضول خرچی کہ حد نہیں' میں منوں کے حساب سے گھر سودا ڈلواتا ہوں مگر ہفتہ نہیں گزرتا کہ کبھی چینی ختم تو کبھی گھی' میری دکان کا سارا نفع تو ادھر گھر میں جا رہا ہے۔ نہ آمد کا پتا چل رہا ہے نہ خرچ' دکان دن بہ دن خالی ہوتی جا رہی ہے۔" فیاض نے مخصوص دھیمے انداز میں صورت حال واضح کی۔

"تو اس کھانے کا ذمہ دار میری بیوی کو کیوں ٹھہرا رہا ہے اس گھر میں تیری جورو بھی تو ہے۔ وہ بھی شریک ہے سارے خرچ کھاتے میں۔" قیوم قہربار نظروں سے لبینہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"جو بھی ہو' میں تو اتنا چاہتا ہوں کہ اس گھر کا بار اٹھانا میرے بس سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ بجلی کا بل دیکھیں' پورے آٹھ ہزار' پانی کا بل' فریج کی قسطیں میں آخر کہاں کہاں جا کے کھپوں؟" فیاض تقریباً" روہانسا ہو رہا تھا۔

"تیرے کہنے کا مطلب کیا ہے کہ پورے گھر کا بوجھ صرف تیرے کندھوں پہ ہے؟ میں کیا صرف باہر

بیٹھکیں لگانے جاتا ہوں؟" قیوم غصے سے ایک دم پھٹ پڑا تھا۔

"سارا دن کسی چھوڑتا ہوں تو ہل اٹھا لیتا ہوں۔ پوہ کی ٹھنڈی راتوں میں جاگ جاگ کر فصلوں کو پانی لگاتا ہوں اور تیری پھنے خانی بڑھتی جارہی ہے۔" قیوم کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔

"کاکا! تو بات کو غلط سمت لے جارہا ہے' میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ خدانخواستہ میں آپ کو دیوار کے ساتھ لگا رہا ہوں۔" فیاض نے تحمل مزاجی کا دامن نہ چھوڑا۔

"تیری بات کا جو بھی مطلب ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شادی کے بعد تو پہلے جیسا فیاض نہیں رہا۔ اب تو بیوی کی زبان بولنے لگا ہے۔ میری ہر بار فصل کا جتنا بھی منافع ہوتا ہے وہ میں تجھے دیتا آرہا ہوں کہ تو اپنے کاروبار کو بڑھائے مگر جب سے تیری بیوی اس گھر میں آئی ہے' میری بیوی کا کھانا پینا تجھے کھٹکنے لگا ہے اور یہ سارا کیا دھرا اس لبینہ کا ہے۔" قیوم انگلی لہرا لہرا کر لبینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ اس الزام پر دکھ سے سن رہ گئی تھی۔ فیاض بھی بھائی کی الزام تراشیوں پہ سخت دل گرفتہ ہو رہا تھا۔

"ابا نے کہا تھا کہ ہم دو بھائیوں کو توڑا عورت نے تھا۔ ہم کو بھی ایک عورت ہی آکر جدا کرے گی اور وہ عورت تیری بیوی ہے جو چاچی خدیجہ کا کردار ادا کررہی ہے۔ دیکھنا یہ بھی چاچی کی طرح تجھے ہم سے دور لے جائے گی اور میں تجھے دیکھنے سے بھی رہ جاؤں گا۔" قیوم کے منہ سے سنگ باری جاری تھی۔

"معاف کیجیے گا بھائی صاحب!" لبینہ جو کافی دیر سے دانت پہ دانت جمائے اپنی ذات کو رگید تا دیکھ رہی تھی' قیوم سے خلاف عادت اونچی آواز میں مخاطب ہوئی۔

"میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں' آپ بلاناغہ اپنے والد اور چچا کی باہم محبت و اتفاق کی کہانی سناتے آرہے ہیں۔ اس دو بھائیوں کی "لو اسٹوری" میں بقول آپ کے کہ آپ کی چاچی خدیجہ — "ولن" کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے شوہر کو لے کر الگ ہوگئیں تو آپ کے چچا کی وہ طوفانی اور آفاقی محبت کیا ہوئی جو ان کو اپنے چھوٹے بھائی یعنی آپ کے ابا جی سے تھی' پھر چپ چپاتے کیوں بیوی کے پیچھے ہولیے صاف کہہ کیوں نہ دیا کہ ہم دونوں بھائیوں کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کرسکتی۔" وہ ٹھوس لہجے میں قیوم کی گدلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنز سے بولی۔

قیوم کی کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگی تھیں۔ لبینہ نے پہلی دفعہ یوں اس سے دوبدو بات جو کی تھی' ورنہ پہلے تو ہمیشہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بھائی جان' بھائی صاحب بڑے ادب و احترام سے کہتی تھی۔ لبینہ کی "بدتمیزی" پہ تو قیوم کا خون نقطہ کھولاؤ کے آخری پوائنٹ پہ آگیا تھا۔

"تم عورتوں کے داؤ اور فریب اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ اچھے بھلے مردوں کی عقل بھی اڑا دیتی ہو اور میرے چاچا سیدھے سادے کھیتی باڑی کرنے والے۔ بھلا کہاں تک عورت کی چالوں کا مقابلہ کرتے۔" قیوم زہرخند انداز میں بولا۔ فاخرہ کے چہرے پہ سکون و مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں موجزن ہونے لگی تھیں۔

"اگر بالفرض بیوی کے کہنے پہ الگ گھر بسا بھی لیا تھا تو اس میں آخر کیا برائی تھی کوئی بھائی سے قطع تعلقی تو نہیں کی تھی۔ کوئی خوشی غمی اکیلے تو نہیں جھیلی تھی۔" لبینہ کا انداز پرسکون تھا۔

"دیکھا' دیکھا آخر دل کی بات زبان پہ آہی گئی نا۔" لبینہ کی بات سن کر قیوم بے ساختہ چلا اٹھا تھا۔ فوراً فیاض کی طرف مڑا۔

"سن رہے ہو نا اپنی لاڈلی بیوی کے فرمودات کہ چاچا کا فیصلہ درست تھا اب تو تمہیں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اس گھر کے بیچ دیوار کھڑی کرنا چاہتی ہے۔ ہم بھائیوں کا اکا ختم کرنا چاہتی ہے۔" قیوم کی آواز میں جوش بھرتا جارہا تھا۔ فیاض بے حد دکھ اور بے یقینی کی کیفیت میں بھائی کی دیوانگی بھری اور ہوش و فہم سے عاری باتیں سن رہا تھا۔

"دیکھو لڑکی! ایک بات لکھ کر اپنے گلے میں تعویذ

بنا کر لٹکا لو۔" قیوم لبینہ کی طرف مڑا۔

"تم پڑھی لکھی اور حد سے زیادہ چالاک ہو۔ تمہارے ارادے مجھ سے کچھ ڈھکے چھپے نہیں ہیں' لیکن تم ہم دو بھائیوں کو الگ کرسکو گی یہ ایسے ناممکن ہے جیسے گندم بو کر چاول کی فصل کاٹنا۔ ہمارے ابا و چچا کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ بھائی کے بھائی اور بیلی کے بیلی۔۔۔ مگر چاچی کے داؤ پیچ نہ سمجھ سکے' لیکن ہم دونوں میں کوئی بھی اتنا سادہ اور کانوں کا کچا نہیں ہے۔"

اتنی بے عزتی۔۔۔ اتنی توہین۔ لبینہ جھٹکے سے چارپائی سے اٹھی اور روتی ہوئی اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ فیاض خود کو بے بسی کی انتہا پہ محسوس کررہا تھا۔

"کاکا! آپ زیادتی کررہے ہیں۔ لبینہ پڑھی لکھی اور متوازن سوچ کی حامل لڑکی ہے۔ اس نے کبھی آپ کے یا بھرجائی کے بارے میں کوئی غلط بات مجھ سے نہیں کی۔" فیاض احتجاجی انداز میں بولا۔ لبینہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"اس نے ہمارے بارے میں غلط بات نہیں کی اور تو خواہ مخواہ میرے منہ کو آرہا ہے۔" قیوم نے طنز سے ہنکارہ بھر کر کہا۔

"کان کھول کر سن لے فیاض! میں ہاتھ پاؤں والا کماتا دھماتا مرد ہوں' میری بیوی کو ٹکے ٹکے کی چیزوں کے لیے تیرا ترسانا میری برداشت سے باہر ہے۔ میرے کون سے دس بارہ بچے ہیں۔ بس یہی ایک زنانی ہے اور اس کا خوشی سے کھانا بھی تم میاں بیوی کو چبھتا ہے۔ اگر ثواب کی خاطر ادھر ادھر کسی کو دے بھی دیتی ہے تو اس گھر میں لکڑی' سبزی' جانوروں کا چارہ' تیل کے لیے سرسوں اور دسیوں چیزوں میں خود لاتا ہوں۔ صرف تیری دکان سے۔ آتا ہی کیا ہے؟ صرف سالن کا گھی' مسالا۔" قیوم نے تفخرانہ انداز میں کندھے جھٹکتے ہوئے رعونت سے کہا تھا۔

"جی کاکا! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" فیاض کے لہجے میں نمی گھلی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سیانے سچ کہتے ہیں کہ بیل پہ لگا پہلا پھول بھلے ہی کتنا خوشنما کیوں نہ لگ رہا ہو' لیکن اسے ایک دن کریلا ہی بننا ہوتا ہے۔"

لبینہ رندھی ہوتی آواز میں بولی۔ اس کی آواز میں چھپے گلہ آمیز طنز کو پاتے ہوئے فیاض تڑپ اٹھا تھا۔

"میں کیا کروں' مجھے بتاؤ' تمہیں راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان کی آواز سننے سے محروم ہوجاتا ہوں اور اگر ان کی حکم عدولی کروں تو تمہارا یہ روپ میرے لیے تکلیف دہ ہے۔" فیاض نے دونوں ہاتھ بالوں میں ڈال کر بال اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیے تھے۔ اس کے شکست خوردہ انداز پہ لبینہ کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

لبینہ کی خالہ زرینہ جو ملتان کی رہائشی تھیں کچھ عرصہ قبل ان کے شوہر حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے تھے۔ لبینہ نے کئی بار فیاض کو پرسہ دینے کے لیے ملتان کی تیاری کرنے کو کہا' مگر ہر بار کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آجاتی اب تو خالہ زاد بھائی طاہر کے ہاں تین بیٹیوں کے بعد بیٹے کی تولد کی مبارک باد بھی دینی پڑ گئی تھی۔

"فیاض! اب تو طیبہ (بھتیجی) کی شادی بھی سر پہ آگئی ہے خالہ جان شادی پہ آئیں تو سچ بات ہے میں شرمندگی سے ان سے مل نہ پاؤں گی' وہ مجھ سے ناراض ہیں ان کی خفگی بھی بجا ہے' خاندان کا ہر فرد پرسہ دے آیا ہے صرف ہم دونوں ہی سست واقع ہوئے ہیں۔" لبینہ کے سنجیدگی سے جتانے پہ وہ سرہلا کے بولا۔

"ہاں کیوں نہیں کل ہی چلتے ہیں۔"

قیوم کو اپنی ملتان روانگی کی اطلاع دی تو وہ بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ چہرے پہ ایکا ایکی دل گرفتی کے آثار چھاگئے تھے۔

"ہمارے ابا کہتے تھے کہ خوددار مرد اپنے سسرال کا پانی پینا بھی حرام سمجھتا ہے۔ اب تجھے کیا کہوں۔ اپنی عقل سمجھ تو تو نے اپنی بیوی کے ہاں گروی رکھ دی ہے' وہ تجھے اپنے اشاروں پہ جہاں چاہے لے جارہی ہے اور

تو دنبے کی مانند کھنچا چلا جا رہا ہے۔"

قیوم شرمندہ کردینے والی نظریں اس پہ گاڑتے ہوئے بولا۔

"کاکا! اس کے خالو کی وفات کا پرسہ دینا ہے بس اتنی سی بات ہے۔ کوئی سیر سپاٹے نہیں کرنے جا رہے ہیں ہم۔" فیاض کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بھائی کے ذہن پہ چھائے شبہات و توہمات کے جالے کیسے صاف کرے۔ اس کی مشکوک طبیعت اس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہی تھی۔

"مرد بن فیاض! بجائے بیوی کو تڑی لگا تا کہ وہ دبک کر بیٹھ جائے تو تجھے سمجھانے آ گیا ہے۔ اوئے کوئی عقل کر یوں بیوی کا پلو تھامے اندھا گونگا بنا چلتا رہے گا تو سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گا۔ اپنی بھرجائی کو دیکھ' کب سے نانکوں کے پنڈ مالٹے کھانے کی ضد کر رہی ہے' مگر میں نے اس وقت ڈانٹ کے چپ کرا دیا کہ زیادہ سر پہ چڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مالٹے اپنے شہر میں بھی بہت ہیں۔" قیوم تکوار مار کہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے فخر سے بولا۔

"جی' مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ آپ نے بیوی کو کتنا سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" فیاض دل ہی دل میں طنز سے مخاطب ہوا۔ بہرحال سنجیدگی سے اسے کہنا پڑا۔

"کاکا! بیوی پر اعتماد اور یقین ہی تو زندگی کا حسن ہے۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کی خوشیوں کا خیال رکھنا' خواہشوں کا احترام کرنا تو اس رشتے کو مزید پائندگی اور دوام بخشتا ہے۔ ہمارے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ نو عمر بیوی کے جذبات کا خیال رکھا کرو۔"

"تو یوں کہہ نا کہ تو اپنی بیوی کے ساتھ ملتان ضرور جائے گا۔ میری بات کو پشت پہ ڈال دے گا۔" قیوم سرد و سپاٹ لہجے میں اس سے استفسار کر رہا تھا۔ فیاض گم سم سا بھائی کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی اجنبیت کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

شوہر کی بے وقعتی اور بے حیثیتی پہ لبینہ کو پھوٹ پھوٹ کے رونا آیا تھا۔

"اباجی نے کہا تھا کہ شریف لوگ ہیں۔ ان پڑھ ہیں تو کیا ہوا۔ اخلاق' بلند کرداری اور وسعت قلبی جیسے انسانی محاسن تعلیم کی کمی کو بخوبی ڈھانپ لیتے ہیں۔ ذرا ایک بار آ کر جھانک لیں کہ ان کی بیٹی ان "شریفوں" میں کیسے زندگی گزار رہی ہے۔" فیاض کو لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی زندگی رسہ کشی کا مقابلہ بن گئی ہو۔ اس میں نجانے کس کی جیت ہوگی۔ اگر کاکا قیوم کی ہوئی تو...؟ اس کا دل بے اختیار ڈوب کر ابھرا تھا۔

اگلے دن وہ سویرے چھ بجے ملتان روانگی کے دو ٹکٹ کٹوا کے لے آیا۔ لبینہ کو اس بات کی اتنی خوشی نہیں ہوئی کہ اس کا شوہر اس کی خواہش کا احترام کر رہا ہے بلکہ زیادہ خوشی تو فیاض کو مضبوط بننے اور اپنے حقوق کے لیے قدم اٹھاتا دیکھ کر ہوئی تھی۔

وہ ترنگ سے بیگ تیار کرنے لگی۔ پہلی بار محبوب شوہر کے ساتھ لمبے سفر کا خیال اس کے اندر مسرت آمیز پھریری دوڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

طیبہ کی شادی پہ لبینہ ہفتہ قبل میکے آ گئی تھی۔ پہلی پہلی پیاری بھتیجی کی شادی اور ڈھیروں ڈھیر کام۔ وہ ہر کام انتہائی نفاست اور خوش اسلوبی سے نبٹاتی تھی تب ہی تو بھابھی انجم نے ڈھیروں کام اس کے ذمے لگا دیے۔

فیاض روزانہ رات کو وہیں آ کے کھانا کھاتا' ساتھ ہی مدثر کے ساتھ مل کر دو چار کام بھی نبٹا دیتا تھا۔ فیاض کو اس گھر کی محبت اور اپنائیت بہت اچھی لگی تھی اور لبینہ کے لیے فیاض کا اپنے سسرالی رشتہ داروں کا احترام کافی باعث طمانیت و مسرت تھا۔

مایوں اور مہندی کی تقاریب میں فاخرہ بھی شامل ہوئی تھی۔ فیاض کو ہر کام میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مخصوص شیطانی چمک لہرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فیاض! یار تم میرے ساتھ رقبے پہ چل سکتے ہو؟" قیوم اندر آ کر بولا۔

"کیوں خیریت؟" فیاض چونکا۔

"ہاں وہ دینو گدڑیے والا مسئلہ ہے۔ اس کے ریوڑ سے میں نے ایک بھیڑ چرا کر اندر کوٹھڑی میں بند کر دی تو اس نے مجھ پر پرچہ کٹوا دیا ہے۔" قیوم پریشانی سے ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔ فیاض پہلے تو اس کا منہ دیکھتا رہا پھر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"کاکا! آپ کو کیا ضرورت تھی ایسی چھوٹی حرکت کرنے کی۔ یعنی کسی کا جانور چھپا دیا۔"

"کمال کرتے ہو۔ اس دینو کے بچے نے میرا کتنا نقصان کیا ہے۔ پتا ہے تمہیں۔ میرے کھالے سے ریوڑ گزار دیا سارا کھالا ٹوٹ گیا' پانی دوسرے کے رقبے میں چلا گیا اب ٹیوب ویل والے سے کہو وہ تمہیں اضافی پانی دیتا ہے؟" قیوم بھڑک کر غصے سے بولا۔

"بات کرتے ہو' میں نے ساری رات جاگ کر پانی لگایا' مجھے کیا پتا تھا کہ پانی ضائع ہو رہا ہے۔"

"اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" فیاض اکتا کر بولا۔ اس کی نظریں ہاتھ میں دبے موبائل پہ تھیں جس پہ لبینہ کی کال آ رہی تھی۔ وہ اسے بلا رہی تھی کہ طیبہ کی بارات آ چکی ہے۔ اسے اب فوراً" شادی پہ آ جانا چاہیے۔

"تم میرے ساتھ چلو' دینو کا بچہ اپنی سنگت ساتھ کو وہیں رقبے پہ لیے کھڑا ہے تم چل کر بات کرو۔" قیوم عجلت بھرے انداز میں بولا' بھائی کے چہرے پہ چھائی بے چینی اسے صاف نظر آ رہی تھی۔

"کاکا! اس وقت میرا جانا اتنا ضروری نہیں ہے' آپ سب مل بیٹھ کر معاملہ سلجھالیں۔ اس کی بھیڑ واپس کر دیں۔" فیاض جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"خاک سلجھالوں' میں ان پڑھ انہیں اتنا اچھا قائل نہیں کر سکتا جتنا تم پڑھے لکھے قائل کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھنا' جبی (ناوان) تو میں لے کر رہوں گا۔ آخر انہیں بھی تو خسارہ بھرنا پڑے نا۔" قیوم دبنگ انداز میں بولا تو وہ بے بسی سے بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔

معاملہ سنجیدہ ضرور تھا' مگر سنگین نہیں جتنا قیوم نے ظاہر کیا تھا۔ دینو نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے اپنے ریوڑ کو آئندہ فصلوں میں سے نہ گزارنے کا وعدہ کیا تو فیاض نے بھیڑ پکڑ کر اس کے حوالے کر دی۔

"تو نے کوئی مردوں والا فیصلہ نہیں کیا۔ ذرا ڈٹ کر بات کرتے تو دینو کی جیب ہلکی کر سکتے تھے' مگر نہیں تم نے تو پہلے ہی قدم پہ کمزوری دکھا دی۔" قیوم اس کی کارکردگی سے خوش نہ تھا۔

"تو کیا کرتا' ان سے کہتا کہ وہ پہلے اچھی طرح لڑ جھگڑ لیں پھر ہم اپنا دل ٹھنڈا کریں گے۔ کوئی قتل عمد کا مقدمہ تھا جو اتنا رولا ڈالتے۔" فیاض کو بھائی کی ذہنیت پر افسوس ہوا تھا۔

اس نے کئی بار لبینہ کو کال ملانے کی کوشش کی مگر موبائل آف ہی ملا۔ سائے مغرب کی طرف لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ یقیناً" بارات کی روانگی عمل میں آ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں مجھ سے ایسی کون سی خطا ہو گئی تھی جس کی سزا میں مجھے آپ جیسا بزدل' کمزور اور کم ہمت شخص ملا۔ جس کے پاس نہ قوت ارادی ہے' نہ اپنی بات منوانے کا حوصلہ' مٹی کا مادھو' ڈھی' بے جان بت جس کے پاس سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو۔" لبینہ کے لہجے کی کاٹ بہت سخت تھی۔ وہ جب سے آئی تھی اس وقت سے مسلسل اس پہ گرج برس رہی تھی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ مت بھولو کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ کوئی تمہارے باپ کا غلام نہیں۔" فیاض غصے سے ڈٹ کر بولا۔

"مٹی کا مادھو' کاٹھ کا الو" یہ سارے توصیفی الفاظ۔ تو وہ کاکا فیاض کی زبان سے اپنی شان میں سر جھکا کے سنتا ہی رہتا تھا' مگر آج لبینہ کے منہ سے سنے

تو میٹر ہی گھوم گیا تھا۔

"ہاں صرف نام کا شوہر‘ جسے بیوی کے حقوق کی ادائیگی کے الف بے کا بھی پتا نہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"اب اگر تمہاری بھتیجی کی بارات میں شامل نہ ہونے سے تمہارے حقوق میں کوتاہی ہو رہی ہے تو میں اسے تمہاری کم فہمی ہی کہہ سکتا ہوں‘ ناشکری عورت۔"

فیاض دھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لبینہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"کاکا ٹھیک کہتا ہے۔ پڑھی لکھی بیوی بہت سوال جواب کرتی ہے بجائے تم یہ پوچھتیں کہ میں وقت پہ کیوں نہ آسکا تھا‘ آتے ہی عدالت لگا کر کھڑی ہو گئیں کاش اگر اس وقت بھائی کی بات مان لی ہوتی تو آج یوں دو پاٹوں میں نہ پس رہا ہوتا‘ مگر نہیں اس وقت تو مجھ پہ عشق کا بخار طاری تھا‘ موسمی بخار۔" فیاض زہر خند ہو کر ہنسا۔

لبینہ صدماتی کیفیت میں فیاض کو دیکھنے لگی جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ اس کے حسن وجاہت کے قصے سناتی فیاض کی زبان آج کیسے اس کو دو کوڑی کا کر دینے پہ در پے ہے۔

"آپ نے اس دن میری انسلٹ کی۔ اباجی کے سب داماد تھے‘ مگر آپ نہیں‘ میں سب کے سوالوں کو جواب دے دے کے تنگ آگئی تھی‘ آپ دونوں بھائیوں کی "عجب پریم کی غضب کہانی" سناتی تو اپنی ہی ہنسی بنوا لیتی میں۔" وہ قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔

"کیوں ہنسی بنواتیں؟ کیا دو بھائیوں میں محبت تم لوگوں کے ہاں ہنسی مذاق سمجھا جاتا ہے۔ ہاں مجھے اپنے بڑے بھائی سے محبت ہے‘ ان کا کہا سر آنکھوں پہ‘ جاؤ جا کر بتا دو اپنے ہوتوں سوتوں کو۔" فیاض اس پر آگ برسا کر باہر چلا گیا۔

وہ کتنی ہی دیر خاکستر ہوئی روح سے روتی بیٹھی رہی۔ صرف وہی تو نہیں‘ وہ تو گھر کے ہر فرد کو تقریباً "رگیدنے" پہ تلا ہوا تھا آج کل وہ نرم خو‘ متحمل مزاج اور ہر ایک کے جذبات کا خیال رکھنے والا فیاض نجانے کہاں جا چھپا تھا۔ اب تو گویا بارود کے ڈھیر پہ جا بیٹھا تھا۔ ذرا سی گرمی کیا دکھائی کسی نے فوراً" پھٹ پڑنے کو آجاتا۔

☼ ☼ ☼
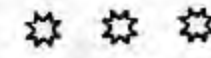
"کاکا! مجھے پیسے دیں میں نے دکان میں سامان ڈلوانا ہے۔" وہ قریب والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"کون سے پیسے؟" قیوم نے بھنویں اچکائیں۔

"وہ پیسے جو آپ کو گندم بیچنے پر ملے ہیں۔ میرا ہاتھ آج کل بڑا تنگ ہے۔ دکان بالکل خالی ہو گئی ہے گاہک واپس لوٹ جاتے ہیں۔" وہ سخت پریشانی سے بولا۔

"تو یار! دکان کیوں خالی ہو گئی ہے اتنی سیل کا آخر منافع بھی ہوتا ہے نا۔ وہ کہاں ہے‘ اس سے دکان کو بھرو۔" قیوم نے ہلکے پھلکے انداز میں مشورہ دیا۔

"کیسے بھروں‘ وہ منافع تو یہیں اس گھر میں آجاتا ہے‘ بچت خاک نہیں ہو پا رہی۔ پہلے مجھے سر کھجانے کو بھی فرصت نہیں ملتی تھی‘ مگر اب جو اکا دکا گاہک آتے بھی ہیں تو بمشکل مطلوبہ چیز انہیں مل پاتی ہے۔" وہ جوتے کے تلوے سے زمین کو رگڑتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔ اس کی ہر ہر حرکت سے اس کا ذہنی اضطراب چھلک رہا تھا۔ قیوم پر سکون انداز میں اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"تو اب میں کیا کروں۔ نفع خاک نہیں ہوا۔ سستے میں گندم بیچی‘ جو پیسے ملے ان سے گرمیوں کی سبزی کے بیج اور پنیری خریدلی ہے میں نے۔" قیوم نے آنکھ میچتے ہوئے انگلی کان میں ڈال کر کھجائی تھی۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کل سے دکان بند۔ ایسی خالی دکان پہ مکھیاں مارنے سے تو رہا میں۔ بجلی‘ پانی کا بل‘ کبھی ایک چیز کی مرمت تو کبھی دوسری چیز کا نقصان سارا بوجھ ایک دکان نہیں برداشت کر سکتی اور آپ بھی چند کنالوں سے سارے گھر کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے۔" وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔

"کیوں نہیں اٹھا سکتا میں‘ نہ تو میں نے تیری طرح ملتان‘ لاہور کے بیوی کو سیر سپاٹے کرانے ہیں نہ سسرالیوں کی شادیوں پہ بھاری بھاری تحفے دینے ہیں‘ غضب خدا کا آج ایک بھانجے کا عقیقہ ہے تو کل بھتیجی کی سالگرہ ان لوگوں کو ذرا احساس نہیں کہ داماد کی کمر توڑ کر اپنی بیٹی کو ہی خوار کر رہے۔"

"معاف کیجیے گا بھائی!۔" لبینہ تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلی تھی۔ وہ کب سے اندر بیٹھی دونوں بھائیوں کی بحثا بحثی سن رہی تھی‘ مگر جب اس کے میکے کو قیوم نے لپیٹ میں لینا چاہا تو اس بار وہ برداشت نہ کر سکی۔

"میرے میکے والے اللہ کے فضل و کرم سے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ دامادوں کی جیبیں خالی کرانے کا فی الحال ہمارے ہاں کوئی تصور متعارف نہیں ہوا ہے‘ خدا سلامت رکھے انہیں‘ جب بھی واپس آئی ہوں‘ مجھے لدا پھندا ہی بھیجا ہے انہوں نے۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

"خاموش لڑکی! اپنے امیر میکے کی بڑائی ہمارے سامنے نہ جتایا کرو۔" قیوم کو لبینہ کی مداخلت سخت بری لگی تھی۔

"جب سے تم آئی ہو‘ ہمارے گھر کا سکون درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے‘ میں اپنے بھائی سے جی بھر کر باتیں کرنے سے رہ گیا ہوں۔ گھر کا ماحول اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس کی ذمہ دار صرف تم ہو۔" قیوم اس کی طرف انگلی اٹھا کر زور سے بولا۔

"چہ خوب‘ میں نے ماحول خراب کیا ہے۔" لبینہ طنز سے مسکرائی تھی۔

"چلیں ماحول تو میں نے خراب کیا جو کیا آپ جو ہماری زندگی خراب کر رہے ہیں‘ اس کا آپ کو احساس نہیں۔ گھر میں ہر وقت ایک کرفیو سا آپ نے لگا رکھا ہے۔ بندہ کھل کر سانس تک نہیں لے سکتا۔ اچھے خاصے بھائی کو ابنارمل بنا کے رکھ دیا ہے۔ "بھائی نے" کا ایک منتر پھونکا ہے اس کے کانوں میں کہ اسے کسی اور رشتے کے حقوق کی پامالی کا ذرا برابر بھی ادراک نہیں ہے۔ بس "بھائی ناراض نہ ہو جائے" کی تلوار سر پہ لٹکتی رہتی ہے۔" وہ بے خوفی سے قیوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

"دیکھا فیاض! یہ ہے تمہاری چودہ پاس پڑھی لکھی بیوی‘ جسے تم بہت مان اور چاہ سے بیاہ لائے تھے نا؟ جسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک کسی نے نہیں سکھائی۔" قیوم مڑ کر فیاض سے طنزاً" مخاطب ہوا۔

"لبینہ! تم جاؤ‘ اپنے کمرے میں۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے ہماری باتوں میں مداخلت کرنے کی۔" فیاض اسے جھڑک کر بولا۔

"نہیں فیاض! میں آج جان کر رہوں گی کہ آخر کون سا ایسا وہم ہے جس کی بدولت یہ دونوں میاں بیوی مجھ سے روز اول سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ میری ہر اچھائی انہیں نظر نہیں آتی‘ بس نظر آتا ہے تو میرا میکے آنا جانا۔ فاخرہ بھابھی پہ تو ایسی کوئی قدغن نہیں ہے‘ صرف میرے ساتھ ہی یہ امتیاز کیوں۔ وہ گھر کا گھر اجاڑ رہی ہیں دونوں ہاتھوں سے چیزیں بانٹنا ان کا مشغلہ ہے‘ صرف اور صرف اپنے جذبہ نمود و ریا کی تسکین کے لیے۔ اگر منظم طریقے سے اس گھر کا بجٹ بن جائے تو اس روز کی کل کل سے نہ صرف جان چھوٹ جائے گی بلکہ رشتوں میں تقدس واحترام بھی موجود رہے گا۔"

قیوم کو لبینہ کی خود اعتمادی اور بے خوفی خوب کھل رہی تھی‘ تب ہی تو زہر خند انداز میں بولا۔

"ہاں ایسی ہی لچھے دار گفتگو کر کے تم نے میرے شریف بھائی کو پھانسا تھا‘ میرے اچھے بھلے سیانے بھائی کی مت ماردی تھی۔ میری بھولی بھالی‘ ان پڑھ‘ انجان بیوی پہ فضول خرچی کا الزام تھوپ کر تم میرے بھائی کو ہم سے برگشتہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"ہاں جی اپنی بیوی انجان اور بھولی بھالی اور میں شاطر خرانٹ‘ آپ کی الزام تراشیوں کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ آج کسمپرسی تک پہنچانے میں آپ کی بیوی کا ہی ہاتھ ہے۔ اس کی شاہ خرچیاں ہی اس گھر کو لے ڈوبی ہیں۔"

"باس! اب ایک اور لفظ نہیں۔ میں اب فاخرہ کے بارے میں ایسا ویسا ایک لفظ برداشت نہیں کرسکتا۔" قیوم ۔ مغلوب الغضب ہو کر ہاتھ اٹھا کر دھاڑا!

"تف ہے تم پر' تمہاری بیوی اتنی ڈھٹائی' دیدہ دلیری سے میرے منہ کو آرہی ہو اور تم کھڑے منہ دیکھ رہے ہو میرا۔" قیوم نے فیاض کو لتاڑا تھا۔

"لبینہ! تم جاؤ یہاں سے۔" فیاض اس کا بازو تھام کر سختی سے بولا۔

"آپ ایک خود غرض اور بیمار ذہنیت کے انسان ہیں۔" لبینہ قیوم کو دیکھ کے غرائی تھی۔

"ہاں بس اسی دن کی کسر رہ گئی تھی کہ چھوٹے بھائی کی بیوی مجھ پہ خود غرضی کا الزام لگائے۔ چلو شکر کہ کوئی بڑا الزام نہیں لگایا' پھر تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاتا۔ افسوس پرائی بچی کا نہیں' اپنے ماں جائے کا ہے' جس نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ارے اتنے سے تھے۔" قیوم نے ہاتھ سے اونچائی ظاہر کرتے ہوئے رقت آمیزی سے کہا۔ "جب تمہیں اسکول بھیج کر خود کو کسی کدال اور گینتی میں گم کردیا' محنت' مزدوری کی' اپنے دل کو مار کر تیری خواہش پوری کی کہ ابا کی تاکید تھی' ببول کے درخت کاٹ کر' اپنے ہاتھ چھلنی کیے' دامن تار تار کیا' پر تجھے کبھی نہ کہا کہ فیاض آج تو بھی میرے ساتھ کام پہ لگ جا۔ دو بھائی مل کر جلدی کام ختم کرلیں گے۔ پر نہیں خود دھوپ جھیل کر تجھے چھاؤں دی۔ میں چٹا ان پڑھ' گنوار اور تو پوری دس جماعتیں پاس' کبھی تیرا اسکول سے ناغہ نہ ہونے دیا۔" احسان کی لمبی فہرست تھی۔

"میں زلزلوں' سیلابوں اور طوفانوں سے پچھلی تاریخیں یاد کرنے والا اور تیرے شناختی کارڈ پہ "میٹرک پاس" لکھا ہے' میں انگوٹھا چھاپ۔" قیوم کھڑے سے چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ چہرہ پسینے سے تر اور سانس پھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"تو خوب ان احسانات کا بدلہ لے رہے ہیں۔ بھائی' بھابھی کی آپس میں محبت اور والہانہ لگاؤ آپ کو کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ بجائے ہمیں دعا دیتے ہر وقت ہم دونوں کے بیچ غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کرنے پہ لگے رہتے ہیں۔" لبینہ خوب اونچا بول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"تم جاؤ اندر' یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔" فیاض دانت پیستے ہوئے بولا' مگر وہ اسے نظر انداز کیے سابقہ ٹون میں قیوم سے مخاطب ہوئی۔

"میاں بیوی میں رنجشیں پیدا کرنے والے' دلوں کو ویران کرنے والے اور تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں اور قیوم بھائی آپ بھی شیطان کے ساتھ "برادرانہ تعلقات" خوب نبھا رہے ہیں۔"

"چٹاخ۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں فیاض کا ہاتھ بلند ہوا اور لبینہ کے رخسار پر زور سے نشان ثبت کر گیا تھا۔

ماحول میں یک دم سے سکوت در آیا تھا۔ لبینہ گال پہ ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے فیاض کو دیکھ رہی تھی اور اس کی نظروں کی حیرانی کی تاب نہ لاتے ہوئے فیاض نے نگاہیں زمین پہ گاڑ دی تھیں۔

چند منٹ یونہی سکتے کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد وہ یکلخت مڑی اور تیزی سے اندر کمرے میں چلی گئی۔ جتنی تیزی سے آنسو اس کے رخساروں پہ رواں تھے۔ اتنی ہی تیزی سے اس کے ہاتھ ضرورت کی اشیا بیگ میں ٹھونستے جارہے تھے۔

"مجھے معاف کردو لبینہ! میں بس غصے میں۔ پلیز تم اتنی جذباتیت سے کام مت لو۔" فیاض اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور ملتجی انداز میں کہنے لگا۔

"ہونہہ جذباتیت کیوں؟ اسے عقل مندی کہیں۔ جذباتیت اور نادانی تو آپ سمجھ رہے تھے میری تحمل مزاجی اور بردباری کو۔ سوچا جیسے کریں گے' چپ چاپ سہتی جائے گی۔ مگر فیاض احمد! آپ شاید اس غیر فطری ماحول میں رہنے کے عادی ہیں' میں نہیں' میں ایک جیتی جاگتی نارمل انسان ہوں' نارمل رویوں میں پلی بڑھی ہوں۔ یہاں سب سائیکی بستے ہیں' اگر میں مزید

چند دن یہاں رہی تو لازما" پاگل ہو جاؤں گی۔" بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے وہ قطعیت سے بولی۔ گالوں پہ ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے موبائل پہ مدثر کو میسیج کردیا۔

"ہاں میں مانتا ہوں قیوم کاکا میرے بارے میں شدت پسندی کا شکار ہیں۔"

"شدت پسندی نہیں' عدم تحفظ کا۔" لبینہ نے بات کاٹ کے تصحیح کی۔

"جو بھی ہے۔ میاں بیوی دکھ سکھ کی سانجھ کا رشتہ ہے۔ تمہیں میری پرابلم سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تمہیں بخوبی علم ہے کہ بھائی اور بھابھی کو کتنی منتوں سے میں اس شادی پہ راضی کرپایا تھا' تمہارا یوں چلے جانا۔ میری کتنی انسلٹ ہوگی سب کے سامنے۔" فیاض گلہ آمیز لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے بولا تو لبینہ کے لبوں پہ مجروح سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"چہ خوب؟! اپنی بے عزتی کا خیال ہے اور میری جو روز بے عزتی ہوتی ہے۔ آپ کے بھائی اور بھابھی ہر وقت میری تضحیک اور تذلیل کا سامان اکٹھے کیے رہتے ہیں' کبھی میرے جذبات' احساسات پر ترس کھایا آپ نے؟ میں ایک روایتی زندگی گزارنا چاہتی ہوں جیسے میرے اماں ابا نے گزاری' جیسے بھائی اور بھابھی گزار رہے ہیں۔ ہم دونوں نے کبھی مل بیٹھ کے کھانا نہیں کھایا۔ سال ہونے کو آگیا ہے' میں اکیلی کھانا کھاتی ہوں' کبھی باہر گھمانے نہیں لے گئے کہ قیوم بھائی جو اپنی بیوی کو کبھی گھمانے نہیں لے جاتے۔ مجھ ایسی "روایت شکن" لڑکی واقعی سب کو بری لگنی ہی چاہیے۔" لبینہ کے مضبوط لہجے پہ آنسوؤں کی نمی غالب آگئی تھی۔ مدثر کی بائیک کی آواز سن کر اس نے چادر اوڑھی اور بیگ اٹھا لیا۔

"نہیں لبینہ! تم ایسے مجھے اکیلا کرکے نہیں جاسکتیں۔ میں تمہارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔" فیاض بے قراری سے اس کے راستے میں مزاحم ہوا تھا۔

"میں تمہیں اتنی چاہت سے صرف اس لیے بیاہ لایا تھا کہ مل کر دوستی' ذہنی ہم آہنگی سے زیست کا سفر کاٹیں گے۔"

"مگر فیاض! اس سفر میں محبت کے ساتھ' اگر بیوی کی عزت و احترام اور مان و وقار کا زاد راہ نہ ہو تو یہ شاہراہ کانٹوں سے اٹ جاتی ہے اور میں مزید اپنا دامن تار تار نہیں کرسکتی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوطی سے بولی اور چھپاک سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ لے پورے ستر ہزار ہیں۔"

"مگر کس لیے؟" وہ حیران ہوا۔

"ارے تیری دکان میں سودا ڈالنے کے لیے۔ کہہ نہیں رہا تھا کہ دکان خالی ہوگئی ہے' گاہک خالی لوٹ جاتے ہیں۔ بریسم کا نفع ہے یہ' کافی اچھی اوسط رہی ہے اس دفعہ۔" قیوم مسکرا کر بولا۔

اس نے خاموشی سے پیسے پکڑ لیے اور اگلے دن تک دکان لبالب سامان سے بھر گئی۔ اس کا جنرل اسٹور پھر سے سانس لینے لگا تھا۔ سارا دن اور رات گئے تک خوب رش رہتا' مگر یہ سارا شور اس کے اندر کے سناٹے کو نہیں توڑ پارہا تھا۔ رات کو گھر لوٹتے وقت قدم خود بخود ہی کسی اور انجان راہ کو مڑ جاتے تھے۔ اس کا گھر لبینہ کے احساس سے ہی مہک رہا ہوتا اس کے ریشمی ملبوس کی سرسراہٹ بالکل کانوں کے قریب سنائی دیتی تھی۔ اس کے رنگین آنچل کو کئی بار الماری کے پیچھے سے لہراتے دیکھا تھا' مگر جب بھی تھامنے کی سعی کی تو ہاتھ خالی ہی رہے تھے۔

لبینہ کو میکے گئے مہینہ ہونے کو آگیا تھا۔ مدثر سے نارمل دعا سلام تھی معلوم نہیں لبینہ نے انہیں کیا وجہ بتائی ہوگی۔

قیوم کاکا پہلے جیسے ہوگئے تھے۔ بہت پیار اور خیال کرنے والے۔ کم خیال تو فاخرہ بھی نہیں رکھتی تھی' مگر اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوتا جارہا تھا۔ گویا۔

"تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

قیوم بھی بھائی کی اداسی اور مغموم حالت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ صاف معلوم تھا کہ بیوی کی عدم موجودگی پہ پریشان وافسردہ ہے۔

"ارے میں تجھ سے کہتا تھا ناکہ یہ اونچے گھر کی پڑھی لکھی لڑکیوں کے پر اور پرواز دونوں ہی اونچے ہوتے ہیں' تیری بیوی کو اگر تجھ سے محبت ہوتی تو یوں تجھے نہ چھوڑ کے میکے جا بیٹھتی۔ ہاں بھئی امیر باپ کی عیاشیاں، ہم مزدوروں کے گھر کہاں۔"

قیوم چارپائی پہ چت لیٹے فیاض کو دیکھتے ہوئے بولا۔ قیوم کی نگاہیں چپ چاپ بسیط آسمان پہ نجانے کیا کھوج رہی تھیں۔

"شوہر نے ذرا سا ہاتھ کیا اٹھالیا کہ بنو میکے کو چل دیں۔ ارے مرد تھپڑ تو کیا لاتوں گھونسوں پہ رکھ لیتے ہیں بیوی کو اور یہ اتنی نازک مزاج۔"

"کاکا! آپ نے بھی فاخرہ بھابھی پہ ہاتھ اٹھایا؟" فیاض نے ایک دم سے گردن موڑ کر قیوم سے پوچھا تھا۔

"ہاں' میں نے تو نہیں' پر ہمارا ابا اماں کو خوب پیٹ ڈالتا تھا۔" قیوم خفیف سا ہو کر بولا۔

"میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"کتنی بار تو تیرے سامنے اسے جھڑک دیتا ہوں۔ ڈانٹ دیتا ہوں' مجال ہے جو برا مان جائے۔" قیوم قدرے کمزور لہجے میں بولا۔

"تیری بیوی کی طرح تو نہیں ہے کہ شوہر کے مزاج کی گرمی سردی نہ سہہ پائے۔ خیر تیری بھابھی سالن گرم کر رہی ہے' اٹھ کر ہاتھ دھولے' پھر روٹی کھاتے ہیں۔" قیوم محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"آپ بھابھی کے ساتھ کھانا کھالیں۔ وہ آپ کی بیوی ہے' اس کو شریک طعام کرنا آپ کا فرض ہے' مجھے جب بھوک لگے گی تو میں کھالوں گا۔" وہ رکھائی سے کہتا ہوا اٹھ بیٹھا' پاؤں میں چپل ڈال کر اندر کمرے میں آگیا۔

☼ ☼ ☼

فاخرہ کا ننھیال قریبی پسماندہ گاؤں میں رہائش پذیر تھا' زندگی کی بنیادی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے ان کی اکثر آمدورفت قصبے میں ہوتی رہتی تھی۔

اب بھی بیمار نانی ڈاکٹر کو دکھانے پورا کنبہ آیا ہوا تھا۔ فاخرہ نے بے حد پھرتی سے بہت بڑی دعوت کا اہتمام کرلیا۔

چائے کے ساتھ سرو کرنے کے لیے قیوم اس کی دکان سے تقریباً" سارے بسکٹ اور کیک کے ڈبے اٹھا کے لے آیا۔

"مگر کاکا! یہ تو بہت سارے ہیں۔ آپ ایک دو ڈبوں سے کام چلالیں۔ ویسے بھی کھانے پہ کافی کچھ انتظام ہے۔" فیاض نے دبے دبے سے اعتراض کیا۔

"ارے تو اس پر دل چھوٹا کر رہا ہے۔ تو نے ان لوگوں کی خاطر مدارات نہیں دیکھی۔ اتنی عزت کرتے ہیں کہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔" قیوم مسکراتے ہوئے بولا۔

"اور ویسے بھی تیری دکان پہ بار نہیں آرہا' یہ میں اپنے کھیسے سے سسرالیوں کی عزت کر رہا ہوں۔ یاد نہیں پچھلے ماہ تجھے ستر ہزار روپے دیے تھے۔" قیوم اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا تھا۔

"ارے یہ نانی کا تو ایک بہانہ ہے' ہم تو آپ لوگوں کو دعوت دینے آئے ہیں' میرے گھر چار بیٹیوں کے بعد کاکا ہوا ہے۔ اس کا میں دھوم دھام سے عقیقہ کرنے والا ہوں۔ آپ نے ضرور آنا ہے۔" فاخرہ کا ممیرا بھائی شوکت چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھرا کیوں نہیں آئیں گے۔" قیوم خوش دلی سے بولا۔

"اور قیوم لالا میرے پتر کی شادی بھی آپ کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ کب آپ بار فصل سے فارغ ہوں اور ہم لوگ تاریخ رکھیں۔" باجی سکینہ نے اپنائیت سے استفسار کیا۔

"بس بہن میری' میں فارغ ہوں' جب آپ لوگوں کا بلاوا آئے تو ہم حاضر ہوجائیں گے۔" قیوم نے فاخرہ کو دیکھتے ہوئے انکساری سے جواب دیا تو فاخرہ کھل کر

سسرال وی۔ سسرالیوں کی طرف سے ملنے والی عزت اور
اپنائیت سے قیوم کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔
"اور یہ نویں نکور (دلہن) کدھر ہے؟ میں تو اس
کی منہ دکھائی بھی لے آئی تھی۔" سکینہ نے دوپٹے
کے پلو سے مڑا تڑا پچاس کا نوٹ نکالتے ہوئے باآواز
بلند فاخرہ سے دریافت کیا تھا۔
"رسہ تڑا کر بھاگ گئی ہے۔ گھر بسانے والی لڑکی
ہوتی تو آج آپ لوگوں کو نظر آرہی ہوتی۔" قیوم
حقارت آمیز لہجے میں بولا تو فیاض بھائی کے الفاظ پہ بے
ساختہ تڑپ اٹھا تھا۔ لبوں سے کچھ نہ کہا بس خشمگیں
نظروں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ ☼ ☼
"قیوم! میری ایک بات مانے گا۔" کانوں میں بڑے
بڑے جھمکے لٹکاتے ہوئے فاخرہ نے دلار سے پوچھا
تھا۔
"میں نے تیری کون سی بات نہیں مانی، پہلے تو یہ بتا
مجھے۔" قیوم سجی سنوری بیوی پہ پرشوق نگاہیں گاڑتے
ہوئے شاہانہ پن سے بولا۔
"ہم ماسے رفیق کے ہاں سے نیچے کچے کے علاقے
میں ضرور جائیں گے۔ وہاں میری ممیری بہن ساجدہ
بیاہی ہوئی ہے۔ اس کا گھر بار میں نے دیکھنا ہے۔"
"وہاں کیوں نہیں چلیں گے۔ اگر گاؤں جا ہی
رہے ہیں تو سب سے دعا سلام کریں گے نا۔" قیوم کو
خود فاخرہ کے ننھیالی گاؤں جانے میں مزا آتا تھا۔ یہ ان
پڑھ، سادہ دیہاتی لوگ دامادوں کی اتنی عزت کرتے
تھے جتنا کہ بیٹی کو اپنے گھر میں خوش دیکھنا مقصود ہو۔
تب ہی تو ان سے ملنے والی اہمیت اور تکریم قیوم کو ہر
سال گاؤں میں کھینچ لے جاتی تھی۔
کافی سارے مواقع اکٹھے نمٹانے تھے تب ہی تو قیام
کا لمبا ارادہ تھا۔ فیاض ان کی جوش و خروش سے تیاری
کو خاموش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"کاکا! آپ کیوں ساتھ جا رہے ہیں۔ صرف بھابھی
چلی جاتی۔ اتنے دن کی غیر حاضری کا کام پہ اثر نہیں
پڑے گا؟" وہ سکون سے پوچھ رہا تھا۔
"او کملا انسان! جب رشتے کیے جاتے ہیں تو انہیں
نبھانا بھی پڑتا ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو کیا وہ میرے ور
بھی آئیں گے؟ اور تو دیکھ بھی رہا تھا کہ وہ مجھے کتنی
محبت اور چاہت سے دعوت دے رہے تھے۔" قیوم
گردن اکڑا کر بولا۔ جھلسی ہوئی رنگت والے محنت
کش قیوم کی ذات پہ احساس کمتری کا عنصر غالب تھا جو
اس کی کم روئی اور تعلیم سے محرومی نے دان کیا تھا۔
اپنی شخصیت پہ چھائے احساس کمتری کے رنگوں کو
چھپانے کے لیے وہ تحکمانہ مزاج اور ملکیت پسند ہوتا
گیا تھا۔ تب ہی تو لبینہ کی پراعتماد اور متوازن شخصیت
کو دیکھ کر اس کا احساس کمتری دوچند ہو جاتا تھا۔ فیاض
کی فرماں بردار غفور نرم طبیعت میں اس کی حاکمیت
پسندی کی تسکین کا بخوبی سامان موجود تھا۔ اس لیے
فیاض کی خود سے ہٹی ذرا سی توجہ بھی اسے کھولا کے رکھ
دیتی تھی۔ "حور کے پہلو میں لنگور" یہ جملے باآواز بلند
اس نے اپنی شادی کے روز تقریباً" ہر شخص کے منہ
سے سنے تھے۔
فاخرہ کی کم عمری، خوب صورتی اور چنچل طبیعت
نے ایسا کچھ گھائل کیا کہ وہ ہر بات بیوی کے کانوں
سے سننے اور اس کی زبان بولنے کا عادی بننے لگا۔ اسی وجہ
سے لبینہ جو محض اسے اس لیے ناپسند آئی تھی کہ اس
نے اس کے معصوم اور انجان بھائی پہ ڈورے ڈالے
ہیں، سخت زہر لگنے لگی تھی کہ فاخرہ کو جو دیورانی پسند
نہیں آئی تھی فاخرہ کے ساتھ بھی لگ بھگ قیوم والا
مسئلہ تھا۔ لبینہ کے سگھڑاپے، بول چال سے جھلکتی
خود اعتمادی اور خوش مزاجی کے سامنے اسے اپنا آپ
بالکل صفر لگا کرتا تھا۔
لبینہ کا بیش قیمت جہیز، صاحب حیثیت میکا اور
فیاض کی پرجوش و والہانہ محبت ان سب نے مل کر
اسے شدید قسم کے احساس محرومی سے دوچار کر دیا تھا
پھر تو قیوم کی جذباتیت اور شدت پسندی نے اس کے
لیے کام ہی آسان کر دیا تھا۔
"تم فکر نہ کرنا۔ ہوٹل سے کھا پی لینا۔ بس ایک دو
ہفتوں کی بات ہے، ہم لوٹ آئیں گے۔" جاتے سمے
فاخرہ بے حد اپنائیت سے فیاض سے بولی تو اس نے بے

حد اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ دو ہفتے یوں گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ ماسی
سکینہ کے بیٹے کی شادی بھگتائی، خوب ملنا ملانا ہوا،
دعوتیں کھائیں، مگر پھر بھی کچھ رشتہ داروں کے گھر
وقت کی قلت کے باعث نہ جا سکے تھے اور وقت فیاض
کو بھی کم ہی لگ رہا تھا، مگر پھر بھی بے حد چستی سے کام
لیتے ہوئے دو ہفتوں کے اندر گھر کے بیچوں بیچ نہ صرف
دیوار اٹھ گئی تھی بلکہ آمدورفت کے لیے پچھلی گلی میں
دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔
"میں نے سوچا آپ لوگ نجانے کب تک آئیں،
اس لیے کھانا تیار کر لیا۔ آپ لوگ ہاتھ منہ دھو کر تازہ
دم ہو جائیں، میں تب تک کھانا لگا لیتی ہوں۔" گیلے
ہاتھ پونچھتے ہوئے لبینہ سامنے آکر مسکراتے ہوئے
بولی تو فاخرہ و قیوم ایک دم جھٹکا کھا کر رہ گئے تھے۔
"یہ یہاں کہاں سے آگئی۔" قیوم حلق کے بل
چیخا۔
"اپنے گھر سے۔" لبینہ نے مسکرا کر انگوٹھے سے
پیچھے اشارہ کیا تو ان دونوں کو معاً" کچھ تبدیلی کا احساس
ہوا۔ گھر ایک دم چھوٹا لگنے لگا تھا اور سامنے بلاکس سے
بنی دیوار.....
"فیاض! یہ سب کیا ہے؟ کس نے کیا ہے یہ؟
ہمارے گھر کو کس نے تقسیم کیا؟" قیوم نے غصے سے
پوچھا۔
"کاکا! یہ میں نے کیا ہے۔ "اپنا گھر" بچانے اور
بسانے کے لیے میرا الگ گھر بنانا بہت ضروری تھا۔"
فیاض نے ادب سے جواب دیا۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ لڑکی اس گھر میں نہیں
آئے گی اور تم نے اس کے کہنے پہ ہم سے جدائی اختیار
کر لی۔ مجھ سے الگ ہونے کا سامان کر بیٹھے؟" قیوم
بے یقینی سے بولا۔
"یہ لڑکی میری بیوی ہے۔ اس کی عزت کرنا اور
دوسروں سے کروانا میرا فرض بنتا ہے تب ہی میں نے یہ
قدم اٹھایا ہے۔ آپ کی عزت اور تکریم مجھ پہ واجب
ہے لیکن لبینہ کے بھی بے شمار حقوق مجھ پہ عائد
ہوتے ہیں۔ ہم بھائی مل بیٹھ کے اچھا وقت کیسے گزار
سکتے ہیں جب ہماری بیویوں کی طبع متصادم ہوں اور
ویسے بھی ہر وقت کی کل کل سے میں تنگ آچکا ہوں۔
میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ ایسے ماحول میں پروان چڑھے
جہاں رشتوں کی توقیر نہ کی جاتی ہو۔"
فیاض نے کہتے کہتے شوخی بھری نگاہ لبینہ پر ڈالی تو
اس نے سرخ ہو کر چہرہ قدرے دوسری طرف موڑ لیا۔
فیاض کی بات پہ فاخرہ کو ایک دم سے چکر آیا تھا۔ وہ
بھاری قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔
مزید کھڑے رہنا دوبھر ہوا تھا۔
"میں تجھے اس فیصلے پہ کبھی معاف نہیں کروں گا۔
تو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی محبت کو مجھ پہ ترجیح دے رہا
ہے۔" قیوم ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔
"نہیں میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دے رہا ہوں۔
میں رشتوں میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا
کہا ہر لفظ میرے لیے مقدم ہے، مگر میں نے لبینہ سے
بھی ٹوٹ کے محبت کی ہے۔ میں اسے یہاں اس لیے
نہیں بیاہ کے لایا تھا کہ روز معمولی معمولی باتوں پہ اس
کی عدالت لگی رہے۔ نہ پسند کی شادی کا یہ مطلب
نکلتا ہے کہ اب مجھے آپ کی محبتوں کی ضرورت نہیں
رہی۔" وہ قیوم کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی
سے بولا۔ قیوم کا چہرہ سپاٹ ہی تھا۔
"ہم اگر روز ایک ساتھ ایک ہی پیالے میں کھانا نہ
کھا سکیں یا ایک ہی تھان سے کپڑا نہ کٹوا سکیں تو اس کا
یہ مطلب نہیں کہ ہم بھائیوں کی محبت پہ خدانخواستہ
زوال آگیا ہے۔ ہمارے ساتھ جڑے اور بھی رشتے
ہیں جو ہم سے ایسی ہی توجہ، محبت اور لگاؤ مانگتے ہیں
جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے متقاضی ہیں۔ ان
رشتوں کے حقوق میں ہماری "محبت" کبھی مزاحم نہ
ہو، میں بس آپ سے یہی چاہتا ہوں۔"
فیاض نے نرمی و سکون سے اپنی بات مکمل کی اور
قیوم کے کندھے پہ زور دے کر "اپنے گھر" کی طرف
چل دیا جہاں اس کی شریک حیات لبینہ موجود تھی۔

☼ ☼

اکتالیسویں قسط ۴۱

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے
بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل
طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے
سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ
اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور
مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل
جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری
مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی
سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے
کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو
بھی دیتی ہیں۔

"صرف علیزے ہی نہیں باقی سب بھی رو رہے ہیں۔"

انوشہ اک عجیب سے افسوس سے دوچار تھی اور زری کو مزید بے چینی اور خفگی ہونے لگی تھی۔

"پلیز انوشہ... کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ مجھے پریشانی ہونے لگی ہے سب کیوں رو رہے ہیں آخر... وہ بھی اس وقت؟" زری کو سچ مچ بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی اس کا دل طرح طرح کے وہم اور وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا اور اس کی یہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھتے ہوئے ہی انوشہ خود بھی بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور پھر انہی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ہی انوشہ نے اسے الف تا ے ساری بات بتا ڈالی تھی اور زری سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی اسے اپنے جسم پہ یوں لگا جیسے چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو انوشہ' یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میرا دل بند ہو جائے گا؟" زری کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ سب سچ ہے زری آپی... یہ سب سچ ہے ایک اذیت ناک سچ... ہم مر گئے ہیں... ہم جیتے جی مر گئے ہیں... آج کی رات کوئی بھی سو نہیں پائے گا... آج کی رات سب کی تڑپتے ہوئے گزرے گی اور آج کی رات سب عذاب سے دوچار رہیں گے... کیونکہ آج ہم لوگوں کا غرور' ہم لوگوں کی انا اور ہم لوگوں کا نام کیچڑ میں مل گیا ہے' ہم غلیظ ہو گئے ہیں' ہم گناہ گار ہو گئے ہیں آپی...

ہماری آنے والی سات نسلیں بھی دل آور شاہ کی گناہ گار رہیں گی۔

ہم ان کے سامنے سر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔

انہوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا... لیکن اس کے باوجود وہ اتنے مضبوط اور بلند کردار رہے کہ انہوں نے ایک بار بھی علیزے کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی' حالانکہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر گزرتا' مگر وہ ایسے نہیں نکلے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے ہماری عزت کو عزت ہی رہنے دیا۔" انوشہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی اور یونہی روتے روتے اس نے فون ہی بند کر دیا تھا۔

"دل آور شاہ... !تت تم اتنی اذیت لیے پھرتے تھے... اتنی اذیت"

زری زیر لب کہتی ہوئی ضبط نہیں کر سکی تھی اور اس کے آنسو بے آواز چال چلتے رخساروں پہ بہہ آئے تھے اور دل آور شاہ کی ذات کا دکھ اس کے دل کی رگوں کو کاٹنے لگا تھا اور اس کا دل چاہا وہ بتول شاہ کی تباہ شدہ زندگی پہ دھاڑیں مار مار کر روئے...!

☼ ☼ ☼

دل آور شاہ خود تو چلا گیا تھا لیکن ان سب کے لیے ایک عذاب چھوڑ گیا تھا... کبھی نہ ختم ہونے والا عذاب... جن کو اب ان لوگوں نے ساری عمر جھیلنا تھا اور ساری عمر ایک دوسرے سے نظر چرا کے رہنا تھا۔ کیونکہ ان کے گھر سے ان کی اس عزت دار حویلی سے ایک عورت بے آبرو ہو کر نکلی تھی اور اس عورت کی آبرو ریزی کا داغ اب اس حویلی کے ہر فرد کے ضمیر پہ آ پڑا تھا اور اس نام نہاد حویلی کی شان و شوکت مٹی میں مل گئی تھی۔

اب اس حویلی میں سب کا دم گھٹ رہا تھا۔

لیکن علیزے کو تو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا اس ایک رات میں ہی دم نکل جائے گا' وہ رو رو کر اور تڑپ تڑپ کر پاگل ہو گئی تھی اور یہی حال عائشہ آفندی کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنے بیڈ روم میں بیٹھی ہچکیوں سے رو رہی تھیں دل آور شاہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کو چیر رہا تھا اور وہ درد سے نڈھال ہونے لگی تھیں البتہ ایک آسیہ آفندی تھیں' جو جہاں کی تہاں پتھر کی ہو کر رہ گئی تھیں اور جن کے احساسات اور جذبات کرب ناکی کی انتہا پہ پہنچ کر مفلوج ہو گئے تھے۔

ان کے دل و دماغ پہ بے حسی چھا گئی تھی یوں جیسے ان کے جسم سے جان ہی نکل چکی ہو یا پھر پوری کائنات ختم ہو چکی ہو اور اب ان کے لیے اس زندگی میں اور اس کائنات میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ دل آور نے سچ کہا تھا اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے وہ خود الجھ جائیں گی۔ اذیت میں آ جائیں گی اور... اور رشتوں کے بھرم ٹوٹ جائیں گے... اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا اب وہ نہ رو سکتی تھیں اور نہ ہنس سکتی تھیں' ہاں البتہ گھٹ گھٹ کر مر ضرور سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جودت آفندی اپنے بیڈ روم میں صوفے پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔

لیکن اس کے دماغ میں ابھی بھی دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی... اور بار بار گونج رہی تھی۔

عورت قابل احترام ہستی ہے۔

عورت محبت کا پیکر ہے۔

عورت اس دنیا کا زیور ہے۔

عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔

عورت مرد کا غصہ سہنے کے لیے نہیں بنی۔

عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی۔

اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آفندی کا انتقام علیزے آفندی سے لو اور اس کی سزا اسے دو" جودت ہاتھوں کی مٹھیاں اور لب بھینچے دل آور شاہ کی بچی اور کھری آواز کے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔" انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم ہی اسے لے کر آئے ہو' تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دو' وہ نکاح کر لو اس سے۔

تم مرد ہو وہ عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے۔

مرد سے ہی نام مانگتی ہے' جو نام نہیں دیتے وہ نامرد ہوتے ہیں' بے غیرت ہوتے ہیں' عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔"

دل آور شاہ کے یہ الفاظ اتنے کاٹ دار تھے کہ جودت یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

"اور ہاں آذر آفندی... !میری بدکرداری اور بدنیتی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں' لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آفندی جیسا باکردار' معزز اور عزت دار نہیں ہوں۔ ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا' حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ مگر مجھے وقار آفندی بننا گوارا نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔"

اس کے آخری جملے نے جودت کو اور زیادہ مضطرب کر ڈالا تھا اور پھر وہ اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پہ ٹیپ لگا ہوا تھا۔

وہ جب سے ہوش میں آئی تھی بے بسی سے پھڑپھڑاتے ہوئے بار بار اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ اس کے پاؤں اور اس کا منہ اتنی سختی سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہٹ سکی تھی اور اسی بے بسی کی سی حالت میں ہی اس کی پوری رات گزر گئی تھی۔ اور اس گزرنے والی رات کا احساس اسے سامنے ہی دیوار پہ لگے وال کلاک اور گلاس ونڈو سے ذرا سے سرکے ہوئے پردے سے ہوتا رہا تھا' جو رات کی سیاہ تاریکی کے بعد اب ملگجی سی روشنی میں بدل رہا تھا۔

اور مریم کے آنسو بے اختیار اس کے رخساروں پہ بہہ آئے تھے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سیاہ رات اس کی قسمت کے دن پہ حاوی ہو گئی ہے اور پورا دن تاریک پڑ گیا ہے اب کچھ بھی ہو جائے وہ یہ سیاہی کبھی مر کے بھی نہیں مٹا سکتی۔۔۔ اور اسی سیاہی کے غم نے اسے رلا دیا تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ یہ سیاہی عدیل کو' امی کو' آپا جی کو اور اس کی معصوم بہنوں کو نگل لے گی' جیتے جی مار دے گی اور وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔

ابھی وہ اس غم کا اس دکھ کا ماتم منا رہی تھی کہ اچانک ہی اسے دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی تھی' اور اس نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا لاک کھلنے کے بعد چند سیکنڈز کے وقفے سے دروازہ بھی کھل گیا تھا لیکن انتہائی آہستگی کے ساتھ۔

حسب توقع جودت آفندی کی ہی صورت نظر آئی تھی جس کو دیکھتے ہی مریم کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے بلکہ ان آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی کیونکہ اسے موت کا فرشتہ اپنے قریب سے بھی قریب تر ہوتا نظر آ رہا تھا اور یقین ہو چلا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی مر جائے گی۔

جبکہ دوسری طرف وہ تھا جودت آفندی خاموش' شرمندہ اور ندامت کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے سر جھکائے ہوئے۔

آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور بہت ہی بوجھل سے انداز میں آ کر بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

مریم اس کے بیڈ پہ بیٹھنے سے پھڑپھڑائی تھی' تڑپی تھی اور اس کی اس مرغ بسمل کی سی تڑپ پہ جودت نے گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا اس کی آنسوؤں سے بھیگی متورم آنکھیں وحشتوں کے عذاب سے بھر گئی تھیں اور جودت کے دل پہ اک اور ملامت کا داغ لگا تھا اک اور طمانچہ پڑا تھا اس کے ضمیر کے منہ پر۔۔۔ اور اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کے اس کے منہ پہ لگا ٹیپ کھول دیا تھا اور پھر یونہی آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیے تھے' جن کے کھلتے ہی مریم یکدم اٹھ بیٹھی تھی اور اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ذرا سا توقف لینے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے یکدم اک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاگ نہیں سکی تھی کیونکہ جودت نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے اس کی ساری پھرتی ختم کروا ڈالی تھی اور وہ ایک ہی جگہ پہ ساکت سی ہو گئی تھی کیونکہ اسے جودت کے انداز سے اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ ویسا نظر نہیں آ رہا تھا' جیسا کل تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔۔۔" لہجہ دوٹوک تھا' نجانے کیوں پہلی بار میں ہی اثر کر گیا تھا اور مریم چند سیکنڈ کے وقفے سے بالآخر بیٹھ ہی گئی تھی اور جودت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"اپنے گھر جانا چاہتی ہو۔۔۔؟" جودت کا سوال اسے مذاق لگا تھا' اس نے گردن موڑ کر اسے بہت ہی عجیب سی نظروں سے دیکھا' مگر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔

"لیکن تمہاری زندگی کی ایک رات گھر سے باہر گزر چکی ہے۔" اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

"اس ایک رات میں تمہارا بہت کچھ کھو گیا لیکن مجھے بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے۔۔۔" جودت کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

"مجھے عبرت حاصل ہوئی ہے۔" اس کی اگلی بات بھی عجیب تھی اور مریم اس کی عجیب سی باتوں پہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر چپ چاپ۔

اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

"مجھے معاف کر دو مریم! میں نے تمہیں اور تمہاری پاکیزگی کو سب کی نظروں میں مشکوک اور بے یقین کر دیا ہے' میں نے تم سے تمہاری ذات کا غرور چھین لیا ہے۔۔۔ پلیز مجھے معاف کر دو' میں بہت اذیت میں ہوں' بہت پچھتا رہا ہوں۔" جودت کے اندر کا کرب اس کے لہجے میں اتر آیا تھا اور وہ چند قدم کھڑکی کی سمت بڑھانے کے بعد دوبارہ مریم کی سمت پلٹ آیا تھا اور بے ساختہ اس کے سامنے قالین پہ ہی دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

"لیکن تم غم نہ کرو' اپنی اس غلطی کا مداوا بھی میں ہی کروں گا' تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا' تمہارا ساتھ دوں گا' عزت دوں گا' تمہیں' مقام دوں گا' محبت دوں گا اور وہ سب کچھ دوں گا جس کی تم خواہش کرو گی۔۔۔ بدل دوں گا اپنے آپ کو۔۔۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔۔۔ تمہارا بن کے جیوں گا' جب تک جیوں گا۔" جودت نے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیے تھے اور مریم بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"اب کہہ رہے ہو یہ سب۔۔۔ اب کیا فائدہ ہے۔" وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"پہلے نہیں کہہ سکتا تھا' پہلے مجھ پہ میرے اندر کا شیطان حاوی تھا' لیکن اب مجھ پہ میرے اندر کا انسان حاوی ہے' اب میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہاری بہتری کے لیے ہو' کیونکہ گزشتہ ایک رات نے ہی ہمیں پوری زندگی کے لیے سبق سکھا دیا ہے' اپنی اوقات دکھا دی ہے' ہمیں' اور اپنے گریبان میں جھانکنے پہ مجبور کر دیا ہے۔" وہ بڑی تلخی سے کہہ رہا تھا۔

"مگر اب مجھے کیا حاصل۔۔۔؟" وہ تڑپی تھی۔

"بتاؤں گا' تم بس ایک بار مجھے معاف کر دو۔" جودت نے التجائیہ سے لہجے میں کہا تھا اور مریم نے بڑے زخمی سے انداز میں اپنے سامنے دوزانو بیٹھے معافی کے اس طلب گار کو دیکھا تھا جس کی غلطی کو گزرے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے' لیکن اس کی چوبیس سالہ زندگی پہ داغ چھوڑ گئی تھی اور مریم نے نفرت سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا' جبکہ جودت نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

"پلیز مریم۔۔۔! ایک بار' پھر ایک بار۔۔۔ مجھے معاف کر کے تو دیکھو۔" وہ ابھی بھی ملتجی تھا اور وہ ایک بار پھر کچھ بھی کہنے کے بجائے رو پڑی تھی اور جودت نے نیچے قالین پہ گرا اس کا دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا تھا' جس پہ وہ روتے روتے دم بخود سی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

عدیل ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا' اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بیڈ کے قریب آ کر موبائل اٹھا لیا تھا' نمبر لاہور کا تھا' رات کو بھی اس کے نمبر پہ چند مسڈ کالز تھیں لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ کس کی ہیں۔

"ہیلو۔۔۔؟"

"عدیل! کہاں ہو۔۔۔ کہاں چلے گئے ہو۔۔۔؟ گھر آ جاؤ۔۔۔ میرے بچے گھر آ جاؤ۔" عابدہ خاتون اس کی آواز سنتے ہی بے اختیار شروع ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی ان کے رونے کی بھی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

"امی! کیا ہوا ہے ابا جی ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔" عدیل کا پہلا خیال فاروق نیازی کی طرف ہی گیا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ ٹھیک ہیں بیٹا، لیکن مریم۔۔۔" وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھیں۔

"مریم۔۔۔ کیا ہوا ہے مریم کو۔" عدیل کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کل سے گھر نہیں آئی میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں بیٹا، تم گھر آجاؤ۔" عابدہ خاتون نے عدیل کے سر پہ پہاڑ توڑ ڈالے تھے اور موبائل فون اس کے ہاتھ میں لرز کے رہ گیا' بلکہ وہ مضبوط قدموں پہ کھڑا لڑکھڑا گیا تھا اور بے اختیار بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

"آپ۔۔۔ یہ۔۔۔ کک کیا کہہ رہی ہیں مریم کل سے گھر؟" وہ جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔

"ہم برباد ہو گئے ہیں بیٹا۔۔۔ ہم کل سے برباد ہو گئے ہیں۔۔۔" عابدہ خاتون نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

"عدیل اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت۔۔۔؟" نبیل دروازے پہ دستک دے کر خود ہی اندر چلا آیا تھا کیونکہ ان دونوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اکٹھے ناشتا کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ابھی وہ اسی غرض سے اسے بلانے کے لیے آیا تھا، مگر اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ کر نبیل بھی متفکر ہو گیا تھا۔

"عدیل۔۔۔! میں تم سے مخاطب ہوں اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کیا ہوا ہے۔۔۔ کس کا فون تھا۔" نبیل اس کے ہاتھ میں تھمے موبائل کو دیکھ چکا تھا اور اس کا کندھا ہلا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

"امی کا۔۔۔!" عدیل کی آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ جیسے کسی گہرے پاتال میں سے سنائی دے رہی ہو۔۔۔

"کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔؟" نبیل کو مزید پریشانی ہوئی تھی۔

"میری سسٹر مریم۔۔۔ کل اکیڈمی گئی تھی۔۔۔ اور کل سے ابھی تک واپس نہیں آئی۔" عدیل کسی روبوٹ کی طرح بتا رہا تھا۔

"کیا۔۔۔" نبیل کو یکدم اتنی بڑی بات سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔

"ہاں۔۔۔! کل میں ہی اسے اکیڈمی ڈراپ کر کے آیا تھا۔"

"او مائی گاڈ۔۔۔! یہ کیا ہو گیا؟" نبیل نے تو جیسے سر تھام لیا تھا۔

"ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں تھا نبیل صاحب۔۔۔ اور "اور۔۔۔ آج وہ عزت بھی۔"

"پلیز عدیل! نیگیٹو مت سوچو اور جلدی اٹھو' ہمیں ابھی واپس چلنا ہے۔" نبیل اس کا کندھا تھپک کر بولا۔

"اب۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے' پہلے تمہارے گھر پہنچتے ہی ساری تفصیل معلوم کرتے ہیں' اگر حل نہ نکلا تو رپورٹ درج کروا دیں گے' باقی کا کام دل آور سنبھال لے گا۔" نبیل سارے کام کا پلان ترتیب دیتے ہوئے عجلت سے پلٹ گیا۔

"اور ہاں تم جلدی سے اپنا سامان پیک کر لو' میں بل کلیئر کرتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے اسے ہدایت بھی کر گیا تھا

☼ ☼ ☼

وہ اپنے آفس میں بیٹھا اپنے کسی کیس کی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ جب اس کا منشی دروازے پہ دستک دے کر ذرا سا اندر کی طرف نمودار ہوا تھا۔ "سر۔۔۔! کوئی لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"لڑکی اور لڑکا۔۔۔؟" دل آور کو حیرت ہوئی۔۔۔

"جی ہاں۔۔۔! کہتے ہیں کہ آپ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔"

"اوکے! بھیج دو۔" اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنی فائل سمیٹنی شروع کر دی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔" دروازے پہ دستک کے بعد جودت کی آواز ابھری تھی اور دل آور فائل سمیٹتے سمیٹتے رک گیا تھا کیونکہ وہ جودت کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

"کیا ہم اندر آسکتے ہیں۔۔۔؟" اس نے اجازت طلب کی اور دل آور ٹھٹک کر متوجہ ہوا تھا۔

"ہوں۔۔۔ کم ان۔" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اجازت دی تھی اور اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی جودت مریم کو ساتھ لیے اندر آگیا تھا۔

"بیٹھو۔۔۔!" دل آور نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"تھینک یو۔۔۔" جودت مرے مرے سے لہجے میں کہتا کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مریم بھی بیٹھ گئی تھی۔ دل آور نے بے شک اسے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا لیکن اس کا حافظہ کمزور نہیں تھا جبھی تو وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ عدیل عمر کی بہن ہے۔

"دل آور بھائی! وہ دراصل مجھے آپ کی ہیلپ کی ضرورت ہے۔" جودت نے اب اس کے سامنے تمہید باندھنے کی کوشش کی تھی۔

"سر کہہ کر مخاطب کرو گے تو زیادہ بہتر ہوگا۔" اس نے بہت سخت لہجے میں اسے تنبیہہ کی تھی۔

"لیکن میں آپ کو علیزے کے حوالے سے۔"

"علیزے کا اور میرا حوالہ آج ختم ہو جائے گا' اس لیے مناسب یہی ہے کہ کسی بھی حوالے کے بغیر بات کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور کس ہیلپ کے لیے آئے ہو۔"

دل آور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بات ہی ختم کر دی تھی اور جودت اس کا اتنا دو ٹوک انداز دیکھ کر چپ سا ہو گیا تھا۔

"میں انتظار کر رہا ہوں تمہاری بات کا۔۔۔ مجھے کچھ اور بھی کام نبٹانے ہیں۔" اس نے اسے بولنے اکسایا۔

"دہ۔۔۔ وہ دراصل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" جودت نے بمشکل بات کرنے کی ہمت مجتمع کی تھی۔

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔۔۔؟" دل آور استہزائیہ بولا تھا۔

"نئی بات ہے۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی غلطی کا احساس پہلی بار ہوا ہے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے۔۔۔!" جودت اب بات کہنا شروع ہو چکا تھا اور دل آور نے اس کی ساری بات پورے دھیان سے سنی تھی۔۔۔ اور ایک گہری سانس لے کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اس نکاح کے بعد تمہارے گھر والوں کا کیا ری ایکشن ہو گا۔۔۔ جانتے ہو نا؟"

"جی جانتا ہوں۔۔۔!"

"پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"جی ہاں۔ ! پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں دل آور شاہ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں' وقار آفندی کے نقش قدم پر نہیں۔" جودت کا لہجہ مضبوط تھا۔

"کیا اس لڑکی کے گھر والوں کو فیس کر لو گے؟" دل آور اس سے ہر طرح کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

"میں ہر چیز کو فیس کرنے کا سوچ کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں' ورنہ آسان طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اسے چپ چاپ اس کے گھر چھوڑ کر واپس آجاتا' لیکن نہیں۔ میں اسے دغا نہیں دے سکتا۔ ہرگز نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی غلطی کے بعد تلافی کے لیے ڈٹ جانے والے جودت کو دیکھ کر دل آور کو یقین آگیا تھا کہ وہ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتا ہے۔

اسی لیے اس نے اس کا کیس اوکے کر دیا تھا اور اگلے چند ہی منٹوں بعد ان کے نکاح کی رسم ادا ہو گئی تھی' اور دل آور نے عدیل کو فون کر کے اپنے پاس اپنے آفس میں آنے کا کہا تھا وہ اب نبیل کے ساتھ سیدھا اس کے آفس میں آرہا تھا اور ایسی ہی ایک کال آذر آفندی کو بھی کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"علیزے پلیز یار۔ بس کرو یہ رونا دھونا۔ دل آور بھائی اتنے اچھے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔" کومل نے بیڈ پہ بیٹھی گھٹنوں میں منہ چھپائے' رات سے بھوکی پیاسی اور مسلسل روتی علیزے کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اس کے بالوں کو سہلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ اچھا ہے' بہت اچھا ہے۔ حد سے زیادہ اچھا ہے' اس کی اچھائی کو مجھ سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا' مگر اب میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب اس کی اچھائی کی حد ختم ہو چکی ہے' اب وہ۔ وہ نہیں رہا' وہ رات کو یہاں سے جاتے ہوئے کس حال میں گیا ہے یہ میں جانتی ہوں۔ میں۔۔۔ صرف میں۔" علیزے روتے ہوئے اور کہتے ہوئے یکدم پھٹ پڑی تھی۔

"تو پھر۔ اب کیا ہو سکتا ہے علیزے؟" یہ سارا معاملہ جان لینے کے بعد کومل کا دل بھی نرم ہو چکا تھا اس کے لیے۔

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے' مجھے اس کے گھر میں رہنا ہے' اور صرف اس کی ہو کر رہنا ہے۔" علیزے نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"لیکن علیزے۔!" کومل نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے اس کے پاس جانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہے' کیونکہ میں اس کی بیوی ہوں۔ مسز دل آور شاہ۔ میں خود اسے چھوڑ کر آئی تھی تو اب مجھے خود ہی اس کے پاس جانا بھی ہے۔" علیزے نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" یہ سوال ایک اہم سوال تھا اور علیزے کے آنسو پھر سے رواں ہو گئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

"بولا نا علیزے! کیا محبت کرتی ہو ان سے؟" کومل نے سوال دہرایا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ ہے ہی محبت کے قابل۔ لیکن افسوس کہ میری اب اتنی بھی اوقات نہیں ہے کہ اس سے محبت کر سکوں۔ کیونکہ وہ سچ کہتا ہے محبت بڑی حویلی والوں کے بس کی اور سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ میرے بس کی بھی نہیں ہے۔" علیزے کہتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔

"لیکن علیزے بغیر محبت کے تو یہ فاصلے نہیں مٹ سکتے۔" کومل اسے سمجھا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب مجھے ہر کام محبت سے ہی کرنا ہے۔ محبت سے' عقیدت سے' اور عزت سے۔ اب وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ علیزے بھی نہیں۔" علیزے نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور کومل کو اس کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

چٹاخ۔۔۔

آذر نے ساری صورت حال دیکھنے اور سننے کے بعد ایک انتہائی زوردار تھپڑ جودت کے منہ پر رسید کر دیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکا کر اس کا یہ تھپڑ سہہ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس تھپڑ سے زیادہ کا حق دار ہے۔

"تم نے بھی وہی کیا جو آج سے کئی سال پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم نے بھی آخر یہ ثابت کر دیا کہ تمہارے اندر بھی وہی جراثیم ہیں ذلالت والے، خباثت والے اور بے غیرتی والے۔"

آذر کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جودت کو کھڑے کھڑے گولی مار دے، یا پھر اسے مار مار کر فنا کر ڈالے۔ لیکن کیا کرتا مجبور تھا، بے بس تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہاں، ول آور شاہ بھی تھا جس کے سامنے وہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا، وہاں عدیل عمر نیازی بھی تھا جو خود بھی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جس کے وہ لوگ گناہ گار تھے، وہاں نبیل حیات بھی تھا، وہاں مریم بھی تھی، اور آذر اتنے لوگوں کے سامنے کیا کر سکتا تھا بھلا۔

"بھائی آپ لوگ جانتے ہیں، میں رات بھر آپ لوگوں کے ساتھ ہی گھر پہ رہا ہوں، میں نے اور کوئی بھی غلط حرکت نہیں کی۔"

"غلط حرکت جو تم کر چکے ہو، کیا وہ کم ہے؟؟" آذر دبے لہجے میں دانت پیس کر بولا تھا۔

"لیکن میں اپنی اس غلط حرکت کا ازالہ بھی تو کر رہا ہوں نا۔" جودت پھر بھی جھجکا نہیں تھا۔

"یہ ازالہ نہیں ہے۔ ازالہ میں کروں گا۔" آذر نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا اور کہتے ہوئے عدیل کی سمت پلٹا تھا۔

"عدیل صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک عزت دار اور شریف گھرانے میں عزت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور میں اس وقت آپ کی اسی عزت کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ ہم یہ نکاح خاموشی کی چادر میں چھپا کر نہیں رکھیں گے، بلکہ سب کے سامنے آپ کی عزت کو اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے کر جائیں گے، اور اسے بھی وہی مقام دیں گے جو ہمارے گھر میں باقی بہوؤں کا ہو گا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آیا تو آپ میرا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔

آپ کی بہن کو میں اپنی بہن سمجھ کر اپنی ذمہ داری پہ اپنے گھر لے کر جاؤں گا اور بہت دھوم دھام سے لے کر جاؤں گا، آپ بس ایک مہینے کا یا پھر چند دنوں کا وقت دے دیں، ان شاءاللہ یہ شادی اب ہماری شادیوں کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔"

آذر نے عدیل کے قریب آتے ہوئے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی طرف سے مریم کے تحفظ کا پورا پورا یقین دلایا تھا جبکہ عدیل سرخ۔ چہرہ لیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا، یہ اگر ول آور شاہ کا نہ ہوتا تو وہ یقیناً "جودت آفندی کو کب کا لہولہان کر چکا ہوتا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ول آور شاہ کا لحاظ آڑے آ گیا تھا کیونکہ یہ معاملہ وہ ہینڈل کر رہا تھا۔

"عدیل!" نبیل نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور کندھے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کسی نرم فیصلے پہ اکسانے کی کوشش کی تھی۔

"دیکھیں ہم سے جو غلطی ہو چکی ہے میں اس کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، ہمیں معاف کر دیں۔ آپ یہی سمجھیں کہ آپ نے اپنی سسٹر کا رشتہ طے کر دیا ہے اور چند دن بعد اس کی شادی ہے ہم شادی کے وقت بھی آپ لوگوں پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے، آپ کو کسی بھی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" آذر نے سچ مچ عدیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

عدیل ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ باقی کا معاملہ نبیل نے خود ہینڈل کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جب چاہو بارات لے کر آ جانا۔ مریم اب آپ لوگوں کی ہی امانت ہے۔"

آذر کے لیے نبیل کی طرف سے اتنی تسلی ہی کافی تھی، پھر وہ مریم کے سر پہ ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر نکل گیا تھا اور نبیل ول آور کے ساتھ مریم کو۔ لیے اپنی گاڑی میں آ گیا تھا جہاں عدیل بھی موجود تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟؟"

جودت کے پیچھے پیچھے آذر بھی تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہوا تھا لیکن کومل، حرمت اور انوشہ وغیرہ کو پریشان دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

"وہ۔ وہ علیزے۔ صبح سے بلکہ رات سے مسلسل رو رہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوکی ہے رات سے۔" کومل کے اشارے پہ حرمت نے ہی بات کہنا شروع کی تھی۔

"کیوں رو کیوں رہی ہے؟؟" آذر نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا تھا۔

"اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ ول آور بھائی کے پاس۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ ول آور بھائی اسے طلاق نہ دے دیں وہ رات کہہ کر گئے تھے۔" حرمت نے جلدی جلدی وجہ بھی بتا دی تھی۔

"نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔" آذر کو ول آور پہ یقین پختہ ہو چکا تھا۔

"وہ ایسا ہی کریں گے، میں ان کی زبانی سن چکا ہوں، وہ کہہ رہے تھے کہ میرا اور علیزے کا حوالہ۔ آج تک ہی ہے، آج یہ حوالہ ختم ہو جائے گا۔ یعنی آج وہ یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔"

جودت بھی آگے بڑھتے بڑھتے ان کی یہ بات سن کر رک گیا تھا اور جودت کی یہ بات سن کر آذر کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی ٹھٹک گئی تھیں۔

"دیکھا وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بے چاری؟؟" اب کی بار کومل بھی بول پڑی تھی اور اس نے علیزے کی حمایت کی تھی۔

اور آذر چند سیکنڈ وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچنے کے بعد ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"علیزے۔!"

آذر دروازے پہ دستک دے کر اندر آ گیا تھا اور علیزے اس کی آواز سننے کے باوجود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی گھٹنوں میں منہ چھپائے جوں کی توں بیٹھی رہی۔

"آؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔" آذر نے اس کے قریب آ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

علیزے کو یکدم کرنٹ چھو گیا تھا وہ مارے بے یقینی کے فوراً "اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آ۔ آپ۔ سچ کہہ رہے ہیں، آپ مجھے چھوڑ آئیں گے کیا؟؟"

"ہاں، سچ کہہ رہا ہوں۔ تم اٹھو میں گاڑی نکالتا ہوں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ہمیں ایک بار پھر پچھتانا پڑ جائے۔"

آذر کل رات والی کہانی اور آج کے دن والی حقیقت سے بری طرح بدظن اور بدگمان ہو چکا تھا اور اب تو اس بات پہ اور بھی زیادہ یقین کامل ہو چکا تھا کہ زندگی میں کہیں بھی، کسی بھی وقت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ علیزے سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور علیزے یوں بے تابی سے اٹھی تھی جیسے کسی نے اسے جنت میں داخل ہونے کی نوید سنادی ہو۔

وہ تیزی سے اپنے آنسو پونچھتی، چپل پہن کر دوپٹا اوڑھ کر اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی ہی تھی کہ وقار آفندی کے بیڈ روم کے سامنے اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے کیونکہ آسیہ آفندی بیڈ روم سے باہر نکل رہی تھیں، اس ایک رات میں ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ جیسے وہ صدیوں کی مریض

ہوں۔

"اللہ حافظ مما! میرے لیے دعا کیجیے گا۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اللہ حافظ۔۔۔ جاؤ اپنے گھر میں آباد رہو' اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے' لیکن اب اتنا یاد رکھنا کہ اس شخص کو زندگی میں کسی بھی موقعے پر دعا مت دینا' ورنہ کہیں کی بھی نہیں رہو گی' کیونکہ آج تو شاید وہ تمہیں قبول کرلے گا مگر بار بار ایسا نہیں کرے گا' آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔"

آسیہ آفندی نے بڑے دو ٹوک سے انداز میں اسے سمجھایا تھا اور اسے رخصت کردیا تھا۔ اور علیزے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی خالی ہاتھ میکے سے نکل آئی تھی' اب اس کی منزل وہ تھی جہاں اس کا "ڈرائیور" تھا۔

☆ ☆ ☆

"وہ بہت اچھا ہے بھابھی! بہت اچھا ہے۔۔۔ بہت اعلا ظرف ہے۔ بلند کردار ہے۔ اتنا کہ مجھے خود پہ فخر ہونے لگا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے' بس۔۔۔ یہ دل اس کے دم پہ دھڑکتا ہے۔ میں۔۔۔ میں جی رہی ہوں تو صرف اس کی خاطر۔ صرف اس کے لیے۔ یہ زندگی صرف اسی کی امانت ہے۔ وہ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ اس سے محبت کا احساس تو ہے نا۔"

آخر وہ بھی تو اپنے دل میں اتنے دکھ اتنی اذیتیں لیے جی رہا ہے نا۔

آخر بتول آنٹی نے بھی تو کانٹوں بھری یہ زندگی بسر کی ہے نا۔

تو پھر میں کیوں نہیں؟ میں کیوں نہیں جی سکتی بھلا۔ میں کیوں نہیں کرسکتی ایسا۔

میں۔۔۔ میں کروں گی۔ میں جیوں گی بھابھی۔ میں جیوں گی سب کچھ اپنے دل میں دفن کرکے جیوں گی' خوشی خوشی جیوں گی' اور دل آور شاہ کی محبت میں سر اٹھا کر جیوں گی' اس طرح کہ ہر محبت کرنے والے کو مجھ پہ اور میری محبت پہ رشک آئے گا۔ کسی کی محبت میں پاگل ہوجانا' یا مرجانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ کسی کی محبت سینے سے لگا کر جی لینا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے۔

میں محبت کا اک نیا روپ دکھاؤں گی سب کو' میں دل آور شاہ پہ قربان۔

میرا رب راضی۔۔۔ میرا جگ راضی۔۔۔ میں دل آور شاہ پہ قیامت تک راضی۔ جو دکھ اس نے سہے' جو قربانیاں اس نے دیں۔ اس کے آگے تو یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اب جس حال میں وہ خوش۔ اس حال میں زری بھی خوش۔"

زری نے رو رو کر کہتے ہوئے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے تھے اور اس کے اس فیصلے پہ نگارش کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اس نے زری کے بالوں کو سہلاتے ہوئے گلے سے لگالیا تھا۔ لیکن جیسے ہی یہ ساری داستان عبداللہ تک پہنچی تھی وہ سن کر ششدر سا رہ گیا تھا کہ دل آور۔۔۔ کی زندگی کا یہ کون سا باب ہے' جو ان لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا؟

☆ ☆ ☆

دل آور شاہ کے گھر کے سامنے ہی گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے آذر نے علیزے کی طرف دیکھا تھا اور علیزے کا دل دھڑک اٹھا تھا اس نے بھی بے ساختہ ہی آذر کی سمت دیکھا تھا۔

"جاؤ علیزے! اپنے گھر جاؤ' دیر مت کرو۔ گھر بسنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں' لیکن گھر اجڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر اجڑے۔ کیونکہ دل آور شاہ جیسے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اور جن کو ملتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان کی قدر کریں۔ اس لیے تم بھی اس کی قدر کرو' کیونکہ اب ہم سے بھی زیادہ

تمہارے لیے اس کو اہم ہونا چاہیے۔ اسی کی عزت میں تمہاری عزت ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم خود بھی اس چیز کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکی ہو' تمہیں مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاباش۔۔۔ تم جاؤ اور خوش رہو۔"

آذر نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا تھا اور علیزے سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

"تھینک یو آذر بھائی۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ آہستگی سے کہتی دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی اور گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی بڑے خوشی بھرے انداز میں گیٹ وا کردیا تھا۔ اور آذر گاڑی آگے بڑھا لے گیا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی۔۔۔!" گلاب خان کے لہجے سے ہی اس کے اندر کی خوشی جھلک رہی تھی کہ وہ علیزے بی بی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا ہے۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟" علیزے بھی بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

"الحمد للہ بی بی جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آئیں۔۔۔ آپ اندر آئیں نا۔ باہر کیوں کھڑی ہیں؟" گلاب خان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بے پناہ خوشی اور شفقت کا اظہار کیا تھا اور علیزے۔۔۔ آہستگی سے سر جھکا کر اندر آگئی تھی لیکن اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس گھر میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہو۔

اور یہ تو واقعی ایک سچ تھا۔ پہلے جب وہ آئی تھی تو دل آور اسے لے کر آیا تھا' اور وہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں آئی تھی' لیکن آج جب وہ آئی تھی تو خود اپنی رضا سے آئی تھی اور پورے ہوش و حواس میں یہاں آئی تھی اس لیے دل دھڑکنا تو ایک فطری سا عمل تھا۔

"دت۔۔۔ تمہارے صاحب کہاں ہیں؟" اس نے گیراج میں محض ایک گاڑی کھڑے دیکھ کر بے ساختہ استفسار کیا تھا۔

"صبح سے آفس گئے ہوئے ہیں' ابھی تک نہیں آئے۔" گلاب خان نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب تک آئیں گے؟" اس کی بے چینی کا عالم ہی نرالا تھا۔

"بس آجائیں گے تھوڑی دیر تک۔۔۔ آپ کہتی ہیں تو میں فون کرکے بلا لیتا ہوں۔" گلاب خان نے اپنا موبائل نکالا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔ رہنے دو ابھی وہ خود ہی آجائے گا۔" علیزے نے فوراً" اسے روک دیا تھا لیکن علیزے کو دیکھ کر بل ڈوگ نے دور سے ہی بھونکنا شروع کردیا تھا کہ اسے اس کی موجودگی کا بھی پتا چل جاتا تھا۔

"ارے علیزے بی بی! یہ آپ کو دیکھ کر خوش ہورہا ہے۔" گلاب خان نے اسے متوجہ کیا تھا اور علیزے ہلکے سے مسکراتی ہوئی لان کے آخری کونے کی طرف آگئی تھی جہاں دیوار میں پیوست کھونٹے سے کسی شیر کی سی جسامت والا بل ڈوگ بندھا ہوا تھا' پہلے علیزے کو اسے دیکھ کر بہت ڈر لگتا تھا' وحشت ہوتی تھی' جھرجھری آتی تھی' لیکن آج وہ سب بھی بہت پیچھے چلا گیا تھا آج اسے دل آور شاہ کے گھر کے کتے سے بھی ایک اپنائیت اور انسیت سی محسوس ہورہی تھی۔ کیونکہ آج اس کا تن من دل آور شاہ کے نام پہ ہی مائل ہوا جارہا تھا۔

"گلاب خان۔۔۔ گلاب خان۔ کس کے ساتھ باتیں کیے جارہے ہو؟ کون آیا ہے۔" گل کوریڈور میں ہی تھی شاید اسی لیے گیٹ کھلنے کی آواز اور گلاب خان کی باتیں کرنے کی آواز سن کر رہ نہیں سکی تھی اور باہر نکل آئی تھی لیکن باہر لان میں بل ڈوگ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ لپک کر علیزے کے قریب آئی تھی۔

"علیزے بی بی!" گل کا لہجہ چہک سا گیا تھا۔

"کیسی ہو گل۔۔۔؟" علیزے خود ہی اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"آپ کیوں چلی گئی تھیں علیزے بی بی۔ کیوں چلی گئی تھیں؟ صاحب کو اکیلا چھوڑ دیا آپ نے ذرا بھی خیال نہیں آیا؟ بڑی بے وفا نکلی ہیں آپ۔" گل نے ایک ہی سانس میں اتنے شکوے داغ دیے تھے اور علیزے سچ مچ شرمسار سی ہوگئی تھی کہ گل ایک نوکرانی ہو کر اپنے صاحب کے لیے اتنی حساس ہو رہی ہے' اور اس نے اس کی بیوی ہو کر بھی اس کا احساس نہیں کیا تھا' بے وقعت کر کے چلی گئی تھی اسے۔ "لیکن تمہارے صاحب کی وفا میں اتنا اثر ہے کہ وہ وفا مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔" علیزے گل کا ہاتھ تھپک کر کہتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

"لیکن علیزے بی بی! صاحب آپ سے صرف وفا نہیں کرتے۔ محبت بھی کرتے ہیں۔" اب کی بار گل نے بڑے کام کی بات کی تھی۔

"اچھا۔ وہ کیسے؟" علیزے کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی اور گل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"وہ ایسے کہ جب آپ کو گولی لگی تھی تو صاحب جی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں' ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ اور جب آپ اپنے میکے چلی گئی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ صاحب جی کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو گل" علیزے بے ساختہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے ٹھہر گئی اور بڑے دل سے پوچھا تھا۔

"گلاب خان کی قسم۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی جی! صاحب جی کو بڑا پیار ہے آپ سے۔ جب آپ چلی گئی تھیں تو اکثر اپنے کام کے لیے آپ کو ہی آواز دیتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے اور کئی بار تو مجھے ہی علیزے کہہ گئے۔ بڑی شرم آئی مجھے۔ اور بڑا ترس بھی آیا۔"

گل بھی آج بڑے دنوں بعد اس طرح کھل کے بول رہی تھی اور علیزے تو جیسے دل تھام کے رہ گئی تھی' دل اور پہ گزرنے والی کیفیات کا سن کر اس کے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"مجھے مس کرتا تھا وہ۔" علیزے دروازہ کھول کر اپنے اور دل آور کے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔

"اس دنیا میں انہوں نے صرف آپ کو ہی تو مس کیا ہے بی بی جی۔ پر مجھے لگتا ہے کہ آج رات نہیں کیا۔" گل نے کہتے کہتے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ علیزے چونک کر متوجہ ہوئی تھی اسے گل کا آخری جملہ کرنٹ کی طرح لگا تھا۔

"تت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔"

"بتاؤ نا گل تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔" علیزے کی بے چینی عروج پہ تھی۔

"آج میں نے کمرے کی صفائی کی تو سگریٹ کے ٹکڑے بہت کم ملے۔ ورنہ روزانہ تو سگریٹوں کا انبار لگا ہوتا تھا' جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج۔" گل کا وہی ایک جواب تھا۔ نفی والا۔ اور علیزے اس کے مشاہدے پہ حیران رہ گئی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔ آج رات میں نے خود اسے بہت مس کیا تھا' شاید اسی لیے اس نے مجھے مس کرنا چھوڑ دیا۔" علیزے افسردگی سے کہتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں بی بی جی۔ اب آپ آگئی ہو نا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" گل بڑے اطمینان سے کہتی نیچے قالین پہ بیٹھ گئی۔

"لیکن مجھے سب کچھ ٹھیک کرنا نہیں آتا گل۔ اور ویسے بھی وہ مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرے گا۔" علیزے کو اس کے کل والے تیور یاد آرہے تھے۔

"ارے بی بی جی! آپ کو نہیں پتا۔ کوئی بھی شوہر اپنی بیوی سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب اس کی بیوی اسے منانے کے لیے خود چل کر اس کے پاس آتی ہے۔" گل آہستگی سے مسکرائی تھی مگر

علیزے ہنوز اسے نا سمجھی سے ہی دیکھ رہی تھی۔

"مگر مجھے تو منانا بھی نہیں آتا۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔

"اچھی طرح تیار ہونا تو آتا ہے نا۔" گل نے اس کے حلیے کو دیکھ کر کہا۔

"تیار ہونا۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ ٹھٹکی۔

"مطلب خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ بس آپ نئے کپڑے پہن کر سر سے پاؤں تک تیار ہو جائیں۔ صاحب کی ناراضی آپ کو دیکھ کر ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔" گل کا لہجہ معنی خیز سا ہو رہا تھا اور علیزے کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مم۔۔۔ مگر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی گل۔" وہ سن کر ہی جھجک گئی تھی۔

"ارے یہ کیا بات ہوئی علیزے بی بی! صاحب آپ کے لیے اتنا کچھ کر لیتے ہیں اور آپ ان کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے یہ تو۔" گل نے مایوسی اور تاسف سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اس کے سر ہلانے کے ساتھ ساتھ علیزے کا دل بھی ہل گیا تھا۔

"اگر میں ایسا کر لوں تو کیا وہ مان جائے گا۔" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"ناراض رہیں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ فائدہ اسی میں ہو گا کہ مان جائیں۔" گل آج اسے کچھ اور ہی مشورے دے رہی تھی اور علیزے دل آور کو منانے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ فوراً ہی ہر بات کے لیے مان گئی تھی۔ اور گل اٹھ کر اس کے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

دودھیا ہاتھوں پہ ریڈ کلر کی نیل پالش اس کے مخملی ہاتھوں کو اور بھی دو آتشہ بنا گئی تھی اور ابھی وہ آخری ناخن پہ نیل پالش کا آخری کوٹ لگا ہی رہی تھی کہ باہر گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور علیزے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ نیل پالش کی شیشی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی تھی۔

"علیزے بی بی۔ صاحب جی آگئے۔" گل علیزے کی ہدایت کے مطابق فوراً بھاگتی ہوئی آئی تھی اور علیزے یکدم ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آپ چلی جائیں۔ میں بھی نیچے جا رہی ہوں۔" گل تیزی سے کہتی ہوئی شڑاپ سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا رخ نیچے کچن کی طرف تھا لیکن تب تک دل آور اندر آچکا تھا۔

"السلام علیکم صاحب!" وہ آہستگی سے بولی۔

"وعلیکم السلام!" اس نے لاپروائی سے جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیے۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے؟" اس نے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دل آور سے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں بھوک لگ رہی ہے' کھانا لگا دو' میں چینج کر کے نیچے ہی آرہا ہوں۔" وہ عجلت سے کہتا ہوا اوپر اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا' مگر بیڈروم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

کمرے میں نیل پالش کی ایک مخصوص سی خوشبو اسے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہو گئی تھی' حالانکہ اپنے کمرے میں یا اپنے گھر میں اس نے یہ خوشبو پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی' لیکن پھر بھی وہ اس سے انجان نہیں تھا' کیونکہ اپنے آس پاس اکثر خواتین کے پاس وہ یہ خوشبو محسوس کر چکا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ گل نے کمرے کی کوئی صفائی وغیرہ کی ہو۔؟" وہ خود کو خود ہی بہلاتا سر جھٹک کر آگے بڑھ کے بریف کیس ٹیبل پہ رکھ کے خود بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور نیچے جھک کر اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔ اور بوٹوں کے

تسمے کھول کے اور پاؤں بوٹوں سے آزاد کرتے ہی وہ چند سیکنڈز کے لیے بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا مگر بازو بیڈ پر پھیلاتے تو
وہ ایک بار پھر ٹھٹکا تھا اس کے ہاتھ سے کوئی ریشمی چیز ٹکرائی تھی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔
وہ ریشمی چیز علیزے کا دوپٹا تھا' بلیک کلر کا انتہائی باریک شیفون کا دوپٹا۔ جس کے چاروں اطراف ریڈ کلر کے
سوتی دھاگے اور چھوٹے چھوٹے نفیس نگوں کا کام بنا ہوا تھا' یہ سوٹ اسی نے علیزے کو لے کر دیا تھا جب وہ اسے
پہلی بار شاپنگ پہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا' لیکن علیزے نے ایک بار بھی یہ سوٹ اور یہ دوپٹا استعمال نہیں کیا تھا'
تو پھر آج یہ دوپٹا یہاں کیا کر رہا تھا۔؟ وہ دوپٹا ہاتھ میں لیے یکدم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"گل۔۔ گل۔۔ کہاں ہو؟" وہ گل کو آوازیں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔
"جج۔۔ جی صاحب؟" وہ بوکھلائی ہوئی کچن سے باہر نکلی تھی۔
"کمرے میں کوئی آیا تھا کیا؟" وہ اوپر ریلنگ کے قریب کھڑا نیچے کھڑی گل سے پوچھ رہا تھا۔
"جج جی صاحب جی۔ مم میں گئی تھی۔ علیزے بی بی کی ساری چیزیں نکال کر سیٹ کی ہیں۔ اور ابھی کر ہی رہی
تھی کہ آپ آگئے۔" گل بہانا بنا گئی تھی۔
"تو تمہیں کیا ضرورت تھی ان چیزوں کو نکال کر سیٹ کرنے کی؟ جہاں پڑی تھیں پڑی رہتیں۔ یہ چیزیں کل بھی
بے کار تھیں اور آج بھی بے کار ہیں۔ چاہے یہاں رکھو۔ چاہے وہاں رکھو۔" وہ خفگی سے کہتا ہوا وہاں سے ہٹ کے
دوبارہ کمرے میں آگیا تھا اور ہاتھ میں پکڑا وہ دوپٹا دوبارہ بیڈ پہ اچھال دیا تھا اور خود واش روم میں گھس گیا تھا۔
لیکن جیسے ہی وہ واش روم سے شاور لے کر تولیہ رگڑتا ہوا باہر نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا' اس کے دماغ
میں ایک بار پھر کھدبد ہوئی تھی۔
ڈریسنگ ٹیبل پہ سامنے ہی نیل پالش' پرفیوم' ہیئر برش اور ایک باڈی لوشن پڑا ہوا تھا' جن کو دیکھ کر صاف لگ رہا
تھا کہ انہیں سیٹ کر کے نہیں رکھا گیا بلکہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استعمال کون کر سکتا تھا بھلا؟ گل سے تو اسے
ایسی امید ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسی کوئی حرکت کر سکتی تھی۔ تو پھر کس نے کیا تھا استعمال؟ یہ سوال اس کے
ذہن میں سوال ہی رہا تھا' جواب نہیں بن سکا تھا' کیونکہ جواب لیتا بھی تو کس سے۔ وہ کپڑے وغیرہ چینج کر کے نیچے
آیا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔
پچھلے کافی دنوں سے اس کی روٹین چلی آ رہی تھی کہ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے کے پچھلی سائیڈ والے ٹیرس پہ
آ کھڑا ہوتا تھا جہاں سے اس کے گھر کا سوئمنگ پول ایک بہت ہی خوبصورت سا منظر پیش کرتا تھا۔ سوئمنگ پول
میں پڑنے والی روشنیوں کا اثر اتنا تیز تھا کہ ان کا عکس دل آور کے چہرے پر بھی پڑتا تھا اور پانی میں لہراتی روشنیوں
کا عکس بھی لہرا رہا ہوتا تھا۔ اور اس وقت بھی ایک ایسا ہی منظر دکھائی دے رہا تھا' وہ کھانا کھا کر ٹیرس پہ نکل آیا تھا
اور دونوں ہاتھ ریلنگ پہ جمائے سوئمنگ پول کی سمت دیکھنے لگا تھا۔
ابھی اسے تقریباً پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ چند ملی جلی خوشبوؤں کا اک نرم سا جھونکا اس کی سانسوں میں
آسمایا تھا اور علیزے نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی پشت پہ اپنی پیشانی ٹکادی تھی۔
"آئی مس یو ڈرائیور۔ آئی رئیلی مس یو۔" وہ عین اس کے عقب میں کھڑی اس کی پشت سے اپنی پیشانی
ٹکائے بہت دھیمے اور لرزتے ہوئے لہجے میں بہت ہی معصوم سا اظہار کر رہی تھی۔ اور دل آور کو یوں لگا تھا کہ جیسے
کسی نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کا کر دیا ہو وہ چند لمحے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا تھا۔
"ڈرائیور!" علیزے نے اپنے دونوں ہاتھ بھی اس کی پشت پہ رکھ دیئے تھے' لیکن اب کی بار وہ برداشت نہیں
کر سکا تھا اور یکدم اک جھٹکے سے اس کی سمت پلٹا تھا۔
"تم۔۔ تم یہاں؟" وہ غصے اور بے یقینی سے بولا تھا البتہ علیزے پہ نظر پڑتے ہی چونکا تھا' کیونکہ وہ سراپا اور

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
وہ خبطی سی دیوانی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو نکھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
تھوڑی دور ساتھ چلو	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	300/-
امر بیل	عمیرہ احمد	600/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	250/-
ریگ زارِ تمنا	ماہا ملک	500/-
اِک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	350/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
ٹکے دا تماشا	شازیہ چوہدری	250/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
میرے چارہ گر	رخسانہ نگار عدنان	400/-
کوئی دیپک ہو	رخسانہ نگار عدنان	350/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
ستاروں کا آنگن	نسیم سحر قریشی	450/-
تو شریکِ سفر رہا	نسیم سحر قریشی	350/-

سے اور ہی نظر آرہی تھی۔

"آئیم سوری ڈرائیور۔ ایم رئیلی سوری۔" علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" وہ بہت ہی پتھریلے سے لہجے میں بولا تھا۔

"تمہارے لیے۔" علیزے نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے۔ اور جھجکے بغیر کہہ دیا تھا۔

"تم گئی بھی تو میرے لیے ہی تھیں نا؟" وہ تلخی سے کہتا دوبارہ ریلنگ کی سمت مڑ گیا تھا۔

"تمہارے نزدیک میرے جانے کی اہمیت ہے۔ لیکن میرے آنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟" اس نے جیسے شکوہ کیا تھا۔

"جب اہمیت تھی تب تم آئی نہیں۔ اور آج جب سب کچھ ختم ہو رہا ہے تو۔" اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"یہ۔ یہ۔ کک کیا کہہ رہے ہو تم تت۔ تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" علیزے کی زبان اور الفاظ بے ربط سے ہوگئے تھے۔

"طلاق کے پیپرز تیار ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا اور میرا رشتہ پین سے لکھے ہوئے ایک سائن تک رہ گیا ہے۔ اور جیسے ہی یہ سائن ہوگئے۔ ہر چیز ختم۔ ہر بات ختم۔ ہر رشتہ ختم۔ پھر تم بھی آزاد۔ اور میں بھی۔ میں وہی ڈرائیور کا ڈرائیور۔ تم وہی بیگم کی بیگم۔"

وہ دانت پیس کر کہتا ہوا دوبارہ پلٹا اور اس پہ اک اچٹتی سی نظر ڈال کر مضبوط قدم اٹھاتا کمرے میں آگیا تھا۔

"میں جانتی ہوں ڈرائیور! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ مجھے تم کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں کیا کرتی۔ مجھے کچھ پتا بھی تو نہیں تھا۔ میں تو ہر حقیقت سے انجان تھی۔ مجھے تو صرف وہ پتا تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ اور پھر ہم دونوں کا آپس میں رویہ بھی تو ایسا ہی تھا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں تھے۔ ایسے حالات میں میرا بڑی حویلی چلے جانا کوئی بری بات نہیں تھی۔ ہاں اب اگر میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں تو بے شک ناراض ہو جانا۔ بے شک طلاق دے دینا۔ بے شک گھر سے نکال دینا۔ لیکن اس بار۔ صرف اس بار معاف کر دو۔" علیزے نے اس کے سامنے بے اختیار اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میرے ظرف کی حد ختم ہو چکی ہے۔ تھک چکا ہوں معاف کر کر کے۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"تمہارے ظرف کی حد ہماری سوچ سے بھی زیادہ وسیع ہے ڈرائیور۔ پلیز۔" وہ التجا کر رہی تھی۔

"آئیم سوری۔ میرے پاس اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔" وہ سنگدلی سے کہہ کر رخ موڑ گیا تھا۔

"پلیز ڈرائیور! مجھے وقار آفندی کی بیٹی نہیں۔ اپنی اماں کی بہو سمجھ کر معاف کر دو۔"

علیزے نے کچھ اس انداز میں اور کچھ ان الفاظ میں التجا کی تھی کہ دل آور کو کھڑے کھڑے کرنٹ چھو گیا تھا ایک تو اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی اور دوسرے اس نے اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ رکھے تھے۔ اس کا پتھر ہوا کلیجہ ایک بار پھر تڑخ گیا تھا۔ اس نے علیزے کو بڑی کاٹ دار نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے میں معاف کر دیتا ہوں، لیکن میری کچھ شرائط ہیں، کیا وہ پوری کر سکو گی تم؟"

وہ عین اس کے سامنے کھڑا اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے اب اس اسٹیج پہ پہنچ چکی تھی کہ اس نے ذرا سی بھی تاخیر کیے بغیر اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر فوراً "ہاں" بھر لی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

"میں نے آج تک ایسی خوددار لڑکی اس کلاس میں نہیں دیکھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے بڑی بڑی باتیں اپنے ماحول سے سیکھی ہیں۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس بھی آتا۔ برے یا بھلے سب ماحول کے اثرات ہیں۔ کئی بار میں اس کی گستاخیوں اور بدتمیزیوں کو پس پشت ڈال کر اپنے دل کو صاف کرلیتی ہوں۔ اس کی زبان درازی اور بدکلامی پر اسے برا بھلا کہنے کے بجائے ہنس کر ٹال جاتی ہوں اور جب اس کا غصہ ذرا مدھم پڑتا ہے تو پھر اسے پیار بھری نصیحت کرنے کا فریضہ بھی ضرور ادا کرتی ہوں۔" صنوبر نے زاہدہ کے جانے کے بعد اپنی سہیلیوں کے سامنے اس کی فراخ دلی سے مدح سرائی شروع کردی۔

"سن کر خوشی نہیں ہوئی۔" غزالہ نے بھنویں چڑھا کر کہا۔

"دیکھو تو اس کی اکڑ کہ ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس تو طوعاً" کرہاً" لے ہی آئی تھی مگر کیا مجال ٹرے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کمر میں ذرا سا خم آیا ہو۔ ایسی ملازمہ کو تو میں ایک دن برداشت نہ کروں۔ چاہے مجھے نوکری ہی کیوں نہ چھوڑنی پڑ جائے ویسے اس غیرت مند نے تمہیں اپنے مطابق بنا ہی ڈالا ہے۔"

"بھئی اس کی خوبیوں پر نظر ڈالو۔ چوری چکاری کی اسے عادت نہیں۔ ادھر ادھر منہ ماری اور تاک جھانک سے اسے بے پناہ نفرت ہے۔ شادی کے نام پر تو آگ بگولا ہوجاتی ہے۔ نیک پاک اور شریف ایسی کہ آنکھیں بند کرکے یقین کرلیں۔ نہ چھچھوری اور نہ ہی باتونی ہے۔ بہت خوبیاں ہیں اس میں۔ صرف پندرہ سال کی ہے۔

پرسوں کی بات ہے میرے ڈیڑھ سالہ بیٹے نے میرے منہ پر کس کر تھپڑ مار دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور میں بوسہ دیتے ہوئے ہنسنے لگی۔ اسی اثنا میں اس نے میرے بال نوچ ڈالے۔ میں نے اپنے بال چھڑائے اور اسے گدگدیاں کرکے محظوظ ہونے لگی۔ تو زاہدہ نے پوچھا۔

"باجی آپ کتنا پڑھی ہوئی ہیں۔" میں نے ریان سے کھیلتے ہوئے اسے اپنی تعلیم بتائی تو وہ نخوت سے بولی۔

"باجی آپ کی تعلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں ان پڑھ آپ سے بہتر ہوں۔ کتابیں رٹ لینے سے عقل مند نہیں بنتے باجی۔ دماغ کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں چونکی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"بچے نے آپ کو تھپڑ مارا' بال نوچے' آپ اس سے ناراضی کا اظہار کرتیں۔ اسے سمجھاتیں کہ اس نے یہ غلط حرکت کی ہے۔ الٹا آپ اس سے کھیلنے لگیں۔ آپ کی تربیت لے کر بڑا ہوگا۔ اچھی تربیت کریں گی تو ٹھیک ہے ورنہ ڈھیروں گلے شکوے آپ کا پیچھا کریں گے۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولے جارہی تھی اور میں سوچنے لگی کہ اس بچی نے تو مجھے بمعہ ندامت کے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ بہت غور و خوض کرنے والی بچی ہے۔ امپریسڈ۔"

"میری بات یاد رکھو۔ یہ پندرہ سالہ چلاکو ہی تمہیں لوٹے گی۔ گھر کے اندر کام کرنے والے ملازم اتنے عقل مند اور ہوشیار نہیں ہونے چاہئیں۔ تھوڑے بے وقوف اور ڈرپوک ہوں تو بہتر ہے۔ جو ہمارے رعب داب میں آسکیں۔ ذرا اپنا پیسہ اور جیولری اس کی پہنچ سے دور ہی رکھنا۔ نوکروں کی نیت دھوپ کے سائے کی طرح بدلتی ہے۔ اتنا بھی اعتماد اچھا نہیں۔" عارفہ نے نصیحتاً" کہا۔

"فار گاڈ سیک۔ غریب و مفلس لوگوں سے نفرت کرنے والا جہنمی ہے۔ توبہ توبہ کرو۔ ویسے آپس کی بات ہے۔"

"تمہاری سوچ ہی نیگیٹو ہے۔ اس لیے تم سے تو کوئی ڈھنگ کی بات نہیں ہوسکتی۔"

"اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ دیکھو پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں آئی بی لیو شی از گڈ۔ عارفہ میری جاب زاہدہ کی وجہ سے ابھی تک قائم ہے۔ ورنہ میری حیثیت بچے پیدا کرنے والی مشین اور گورنس سے بڑھ کر ہرگز نہ ہوتی۔" صنوبر نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم مجھے کنونس نہیں کرسکتیں۔" عارفہ نے حتمی فیصلہ سنایا اور ہنسنے لگی۔

صنوبر ادھر ادھر کی باتوں سے سب کو محظوظ کرتے ہوئے زاہدہ کی سرگوشی پر توجہ دینے لگی۔ صنوبر ایکسوزمی کہہ کر وہاں سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا نہایت سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ زاہدہ اس کی پرستائش نظروں کو بھانپتے ہوئے بولی۔ "باجی آج سلیم چاچا کی مدد کے بغیر ہی ڈائننگ ٹیبل میں نے لگایا ہے۔ پسند آیا کہ نہیں۔ کہیں نقص ہے تو مجھ سے ڈرے بغیر ہی بتادیں۔ اگلی دفعہ محتاط رہوں گی۔ ایسا ٹیبل لگاؤں گی کہ آپ کی یہ تمام سہیلیاں دنگ رہ جائیں گی۔"

"تم سے ڈرے بغیر۔ یہ خوب رہی۔" صنوبر نے مسکرا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔

"باجی! میں نے غلط تو نہیں بولا۔ ہم اللہ میاں سے کیوں ڈرتے ہیں؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تم بتاؤ۔ میں تو نہیں جانتی۔" صنوبر ذرا سا چڑ گئی۔

"کیوں کہ ہمیں اس سے لالچ ہوتا ہے۔ ہم اس کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے۔ ورنہ وہ تو ہم سے ہاتھ کھینچ لے گا۔" وہ ہمیشہ کی طرح دلائل پر اتر چکی تھی۔

"جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔ لگی ہے مجھے سمجھانے۔" وہ سختی سے بولی تو زاہدہ نے سر کو جھٹکا دیا اور اونہہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

"کم بخت بہت ہی سرپھری ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس پر تھپڑوں کی بارش کروں۔"

"نہ نہ ایسے مت کرنا۔ ریان کو کون سنبھالے گی۔ تمہارے بالوں میں تیل کون لگائے گی۔ جب آفس سے تھکی ہوئی واپس گھر آتی ہو تو تمہارے پاؤں کی مالش کون کرے گی۔ بولو۔ جواب دو۔ نئی لڑکی ڈھونڈنے میں مہینے لگاؤگی نجانے کتنی چھٹیاں کرنی پڑ جائیں۔ باعتبار لڑکی ڈھونڈ نہ پاؤگی۔" دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی صدا پر وہ ہمہ تن گوش ہوگئی کہ چھناکے سے کانچ کے برتن ٹوٹنے پر وہ اپنی دنیا سے باہر نکل آئی اور تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ فرش پر کرسٹل کے گلاسز کا انجام دیکھ کر ایک دم سے لال بھبھوکا ہوگئی۔ زاہدہ شان بے نیازی سے کھڑی کرسٹل کے ڈھیر کا جائزہ لے رہی تھی۔ چہرے پر ملال تھا نہ ہی ندامت۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" صنوبر چیخ دباتے ہوئے بولی۔

"باجی ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گیا۔ اس میں میرا تو قصور نہیں۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ٹوٹنے کی چیز تھی۔ کل کے بجائے آج ٹوٹ گئی۔"

"تو کیا میرا قصور ہے؟" صنوبر آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔

"باجی ٹرے آپ کے ہاتھ سے گرجاتا تو بتائیں کہ آپ کیا کرتیں؟ انہیں کچرے میں ڈال دیتیں اور بہت جلد نئے گلاس خرید لاتیں۔ ابھی بھی یہی کیجیے گا۔" وہ بے پرواہی سے بولی تو صنوبر کا دل چاہا کہ اس کے بال نوچ ڈالے مگر اپنے خسارے کو مدنظر رکھتے ہوئے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ذرا ہاتھ بچا کے کانچ اٹھانا۔ کہیں خود کو زخمی نہ کرلینا۔ ٹوٹنے کی چیز پر کیا افسوس کرنا۔ اللہ خیر کرے اور آجائیں گے۔" وہ تلملاتی ہوئی موڈ کو خوش گوار کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئی۔

☆ ☆ ☆

"زاہدہ میں نے تمہیں یہ جوڑا تو نہیں دیا تھا۔ تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اٹھا بھی لیا اور محترمہ نے زیب تن بھی فرمالیا۔" صنوبر نے زاہدہ کو جنریشن کا نیا جوڑا پہنے ہوئے دیکھ کر اچنبھے سے کہا۔

"حیرت کی بات ہے کہ تم نے پوچھنا تک گوارہ نہ کیا۔ بیٹا یہ تو تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ ایسا کرنے سے اعتماد اور بھروسے میں دراڑ آجاتی ہے۔"

"باجی! کیا دکان پر صرف یہی ایک ہی جوڑا تھا۔ کیا اس کے ساتھ کے اور نہیں تھے؟ ذرا سوچ کر بتائیں اور اس رنگ میں کتنے تھے؟" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولی۔

"بے شمار تھے۔" وہ تذبذب سے بولی۔ مدعا سمجھ نہ

سکی تھی۔

"یہ جوڑا مجھے میری بڑی بہن نے دیا ہے۔ اگر آپ کے جوڑے سے ملتا جلتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں نے چرالیا ہے۔ میں نے آج تک تو کسی چیز کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اب یہ چند ٹکے کا جوڑا ہی تو چراؤں گی۔" وہ تنک کر بولی۔ "آپ کے زیور پیسے کی مجھے خبر ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں۔ کبھی بے ایمانی کی ہے میں نے۔ مجھ پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لیں۔"

"تو بیٹا ایسے کرو۔ کل اپنی بہن کو لیتی آنا۔ میں خود اس سے بات کرنا چاہتی ہوں کہ اس کے پاس سات ہزار کہاں سے آئے جو تمہیں جوڑا خرید دیا۔" وہ بھی تنک کر بولی۔

"اگر بہن کے سامنے آپ نے مجھے ذلیل کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ابھی اپنا کوئی پھٹا پرانا جوڑا مجھے نکال دیں۔ وہ پہن لیتی ہوں۔ اگر آپ کو یہ جوڑا اتنا ہی پسند ہے تو لے لیں۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی تو صنوبر سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ اس کی دھاندلیوں کا جواب کیسے دوں؟

"باجی آج آپ چھٹی کرلیں۔ مجھ سے ریان سنبھالا جائے گا نہ ہی اس کا کام ہوسکے گا اور نہ ہی آج اس سے کھیل سکوں گی۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ ایک ہی روٹین سے تنگ آگئی ہوں۔" وہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔

"کیوں بہنا؟ طبیعت خراب ہے کیا؟" وہ چونک کر بولی۔ "ابھی تو تم تکرار کرنے میں خوب ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھیں۔ یک دم کیا ہوگیا؟"

"باجی سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ لگتا ہے کھوپڑی تو اڑ ہی جائے گی آج۔ آپ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیں۔ مجھ سے ایسی فضول باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ گھر میں کوئی ایسی جرات کرکے تو دیکھے۔" وہ سر کو دباتے ہوئے بولی۔

"تمہیں ابھی گولی دیتی ہوں۔ چائے پیو گولی کھاؤ اور ادھر ہی قالین پر لیٹ جاؤ۔ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں آج چھٹی نہیں کرسکتی۔ بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے میری۔ جانا ضروری ہے۔ جاؤ چاچا کو بولو۔ تمہارے لیے کڑک سی چائے بنائے۔ ریان کے جاگنے تک آرام کرو۔ جب اس سے کھیلو گی تو درد وغیرہ فوراً" غائب ہو جائے گا۔ میری باتیں دل کو مت لگایا کرو۔ تم تو میری چھوٹی سی پیاری سی بہن ہو۔ ملازمہ تھوڑی ہو۔" وہ خوشامدی لہجے میں بولی۔

"باجی آپ کے سر میں درد ہوتا ہے تو آپ نظر نہیں آتیں۔ پھر آپ ہوتی ہیں اور آپ کا کمرہ میں ہوتی ہوں اور میرا دبانا اور مالش کرنا۔ مجھے آج تک بڑے لوگوں کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ لوگ ہمیں انسان کیوں نہیں سمجھتے؟ قسم سے باجی آپ کے اور میرے خون کا رنگ ایک جیسا ہے۔ اماں کہتی ہیں۔ جمنا اور مرنا بھی فرق نہیں۔ درد اور بیماری کا احساس بھی ایک ہی طرح کا ہے۔ پھر ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟" وہ منہ بسورتی ہوئی بولی۔ "مجھے ایسا رویہ پسند نہیں۔ دل چاہتا ہے کہ کام چھوڑ دوں۔"

"بس زیادہ باتیں نہ کرو۔ گولی کھاؤ اور چپکے سے لیٹ جاؤ۔ کام چھوڑ کر نکھٹو باپ اور بھائیوں پر ظلم مت ڈھانا۔ میرے گھر میں تمہیں تکلیف ہے نہ ہی کسی قسم کی روک ٹوک ہے۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

"ریان نے زیادہ تنگ کیا تو میں آپ کو فون کردوں گی۔ فوراً" پہنچ جائیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے چارہ رو رو کر ہلکان ہو تا رہے اور میں اسے گود ہی نہ لے سکوں۔ آپ کی غیر حاضری میں چاچا بھی قہر تا چشم بن جاتا ہے۔ بہت برا لگتا ہے مجھے۔" وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔

"پگلی وہ تو ہر وقت تمہاری ہیلپ کرتا ہے۔ ورنہ ریان تم اکیلے نہ سنبھال پاتیں۔ بے فکر رہو۔ کچھ نہیں ہونے والا تمہیں۔ جوان جہان ہو جان بھی خوب بنا رکھی ہے سردرد سے آج تک تم نے کسی کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر ریان کو رلایا تو خبر مجھ تک پہنچ جائے گی۔" صنوبر الجھ کر بولی۔

"چاچا پورا شکایتی ٹٹو ہے باجی۔ جھوٹ بولتا ہے۔

آپ کو الو بناتا ہے۔ باقی میں نے سردرد میں موت کو قریب سے دیکھا ہے۔ ہمارے پڑوس میں جوان لڑکے کے سر میں درد ہوا تھا چند گھنٹوں میں ہی نس پھٹ گئی اور وہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ باجی مجھے مرنے کا کوئی شوق نہیں۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے سوائے آپ کی نوکری کے اور ڈانٹ کھانے کے۔" وہ بھی الجھ کر بے ساختہ بولی۔

"اف، بہت منہ پھٹ ہو۔"

"اپنی ماں کو میرا پیغام دینا۔ مجھے آکر مل بھی جائے اور تمہاری تنخواہ بھی لے جائے۔" صنوبر نے اس کی باتوں سے تنگ ہوکر ناگواری سے کہا اور وال کلاک کی طرف دیکھ کر چائے تیزی سے پینے لگی۔

☆ ☆ ☆

"باجی! تسی بلایا سی۔ اے دسوں۔ سب ٹھیک ٹھاک جا رہا ہے ناں۔" زاہدہ کی ماں صنوبر کے پاؤں میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ماسی۔ بات یہ ہے کہ تمہاری بیٹی حد درجے کی خود سر اور بے باک لڑکی ہے۔ تم اس کا رشتہ طے کرو۔ لڑکا جیسا بھی ہوا اسے جاب دلوانا میرا کام ہے۔ اس کی فوراً" شادی کردو۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔" صنوبر نے آہستگی سے کہا تو ماں بیٹی کو اس کی تنقید پسند نہ آئی۔ کیوں کہ انہیں اس کی عادت جو نہیں تھی۔

"امی کن کھول کے سن لوؤ۔ کسی باؤڈری سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر تم نے ایسی غلطی کی تو مجھے تیری قسم اس کا گلا دبا کر آجاؤں گی۔ یہ تم ہی ہو کہ آج بھی ابے سے جوتے کھا کر پیسے اسے تھما دیتی ہو۔ اور وہ اپنے نشوں میں اڑا دیتا ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو مٹی گوبر ہی رہ جاتا ہے۔" زاہدہ چیخ کر بولی۔ ماں سر جھکائے اس کی اول فول سن کر مسکرا دی جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"باجی سب سے چھوٹا بیٹا شادی واسطے بڑا ہی تنگ کرنے لگا تھا۔ آخر کل ہی ایک میراثیوں کی لڑکی کو بھگا لایا ہے۔ میں نے اسے بڑی بیٹی کے گھر چھپا دیا ہے۔" وہ اک طویل آہ بھر کر بولی۔

"اسے فوراً" واپس کردو ماسی۔ کسی نئی مصیبت میں ہی گرفتار نہ ہو جانا۔ جانتی ہو وہ بدلہ لینے سے باز نہیں آئیں گے۔" صنوبر یہ سن کر دہل گئی۔

"باجی دروازے پر آئی دولت کو لات مارنے والے بے وقوف ہوندے ہیں۔ میں نے بیٹے کی شادی تو کرنی ہی ہے۔ کون اپنی بیٹی میرے ناکارہ بیٹے کو دے گا۔ تھوڑی مدد کردیوؤ۔ کل جمعہ اے نکاح کردیواں۔ فر ساڈا کوئی بال بھی ٹیڑھا نہیں کرسکدا۔" ماسی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ غضب نہ ڈھانا۔ لڑکی واپس بھیجو۔ اس معاملے میں، میں تمہاری ایک پائی کی مدد نہیں کروں گی۔ تمہاری تو عقل ہی ماری گئی ہے۔" صنوبر نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے گھر میں دو جوان بچیاں ہیں۔ ان کے بارے میں سوچو۔ تمہارے چاروں بیٹے حد درجے کے کام چور ہیں۔ ماں بہنوں کی محنت کی روٹی کھاتے ہوئے انہیں شرم کیوں نہیں آتی۔ ڈوب مریں چلو بھر پانی میں۔ اور چلے ہیں نئی دشمنی خریدنے۔"

"انہاں دا کوئی قصور نہیں جی۔ ساری غلطی انہاں دے مرن جوگے ابے دی اے۔ میں محنت مزدوری کرکے سب دا پیٹ بھر سکدی آں۔ تے انہاں دیاں دو دھیاں وی محنت کرکے اپنے بال بچے نوں پال لین گیاں۔" اس کے لہجے میں بدلے کی جھلک نمایاں تھی۔

"تم لوگوں کے حالات بدل نہیں سکتے۔ افسوس ہے تمہاری عقل پر۔" صنوبر تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

"جاؤ یہاں سے۔ آج کے بعد اپنی شکل نہ دکھانا۔ بچوں کو بگاڑنے میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تمہارے چرسی خاوند کا نہیں۔ وہ تو نشے میں دھت دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک کونے میں پڑا ہوتا ہے۔ اگر تم چاہتیں تو آج تمہارے گھر میں چار کڑیل جوانوں کی تنخواہیں آرہی ہوتیں۔ تم نے انہیں ہڈ حرام بنا ڈالا۔ بیٹیوں

سے لوگوں کے گھروں میں کام کرایا اور ان کے منہ کا نوالہ بیٹوں کے منہ میں ڈالا۔ ماسی میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں مزید تمہاری احمقانہ باتیں سننے کی ہمت نہیں رکھتی۔" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "میں نے صاحب کی مخالفت کے باوجود تمہیں دو کمروں کا گھر بنا کر دیا کہ جھونپڑی میں جوان بچیوں کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ کم از کم دروازے پر تالا تو ہوگا۔ کوئی دیوار پھلانگنے کا تو دس بار سوچے گا۔ اب تم نے ایک نیا ڈرامہ شروع کردیا ہے۔ میری بات مان جاؤ۔ اس غلطی کا خمیازہ بہت اذیت ناک ہوگا۔ لڑکی کو واپس بھیج دو۔"

"مدو نہ کرن دے بہانے نے سارے۔" ماسی نے ایک طویل آہ بھری اور کھڑی ہوگئی۔

"ٹھیک اے۔ تواڈی مرضی۔ اللہ توانوں خوش رکھے۔ میں ماں آں باجی پچھل پیری نہیں۔ تے ایسہ بہنیاں نے ڈانیاں نہیں کہ اپنے ہی پیاریاں نوں نگل جان زاہدہ دی چھ مہینے دی تنخواہ ایڈوانس دے دیوؤ۔ انکار نہ کریو۔ جمعے نوں پیسے ضرورت ہون گے۔ تسی تے کھرا جیا جواب دے دیتا اے۔ اسی کم کرے۔ تواڈے تے قرض لوئیے دوسریاں کوں۔ زیادتی اے جی۔ دل مندا پے گیا اے۔"

"یعنی تم اپنے ارادے سے ٹلنے والی نہیں۔" صنوبر نے فکر مندی سے کہا۔ "کل روتی پیٹتی میرے پاس آئی تو جوتے لگاؤں گی۔"

"جی تسی مدد تے کرنی نہی۔ فرعب جمان دا کی فائدہ۔" وہ بے لحاظی سے بولی۔

"ماسی تم تو خوامخواہ ہی ناراض ہونے لگی ہو۔ تمہیں زاہدہ کی تنخواہ ایڈوانس نہیں ملے گی۔ جاؤ جو مرضی ہے کرو۔ کل کوئی حادثہ پیش آیا تو خود ہی بھگتنا۔ اس بار صاحب تمہارا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ بات یاد رکھنا۔ لگتا ہے۔ تمہاری ہر وقت کی روں روں مجھے بھی تمہارے جیسا بے وقوف اور پاگل بنا دے گی۔ تمہارا ایک مسئلہ حل کرتی ہوں تو دوسرا منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے۔ اب میں تنگ آگئی ہوں۔" وہ بے زاری سے بولی۔ اور لاؤنج سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماسی بھی بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"چاچا تین دن سے زاہدہ غائب ہے۔ لگتا کسی اور لڑکی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

"پہلے اس کی ماں سے معلوم کرلو کہ ہوا کیا ہے؟ پہلی دفعہ اس سے ہاتھ کھینچا ہے لگتا ہے اس کی شان میں گستاخی کردی ہے۔" صنوبر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"میڈم! آپ کی نرم مزاجی نے انہیں بگاڑ دیا ہے۔ اس بار انکار کرنا اور تنقید کرنا انہیں پسند نہیں آیا۔ مجھے تو لگتا ہے۔ وہ کام چھوڑ گئی ہے یا آپ کی منتوں کے انتظار میں ہوگی۔ اگر آپ کی مجبوری اور ضرورت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ واپس آبھی گئی تو منہ مانگی تنخواہ کا مطالبہ کرے گی۔ ان کی مکاریوں اور چالبازیوں کو میں جانتا ہوں۔" چاچا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"چاچا میں اپنے گردوپیش دیکھتی ہوں کہ جو لوگ اپنے ملازمین کی صبح دھتکار و پھٹکار سے کرتے ہیں اور شام مار و لتاڑ سے اور مہینے کے وسط میں آدھی تنخواہ دیتے ہوئے ان کی بیسیوں کوتاہیوں اور غلطیوں کو گن لیتے ہیں اور بغیر اجازت کے کی جانے والی چھٹی کی تنخواہ دیدہ دلیری سے کاٹ لیتے ہیں۔ انہیں صدقہ و خیرات دینے کے بجائے بڑے اداروں میں اپنی پہچان کراتے ہیں اور انہیں دو وقت کا کھانا اپنے ہاتھ سے ناپ تول کر دیتے ہیں۔ معمولی سے احسان کو دس بار گن لیتے ہیں تو یہی ملازمین ایسی بیگمات کے سامنے تیر کی مانند سیدھے رہتے ہیں۔ چاچا ایسا کیوں ہے۔ تم تو اس قوم کی مینٹلٹی سے بخوبی واقف ہو میں ان کی ذہنیت کو نہیں جانتی۔ آج یہ معمہ تو حل کردو۔ میں تو سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں۔" صنوبر نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

"اسے کتنے پیار سے رکھا ہوا تھا میں نے۔ پھر بھی وہ بغیر بتائے ہی چلی گئی۔ بڑی ہی نمک حرام نکلی۔"

"میڈم میرا تعلق بھی ان ہی لوگوں سے ہے۔ میں

آپ کا پرانا وفادار ملازم ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھر کے ہر فرد کو میری عادت ہوگئی ہے۔ میں نے کبھی بھی اس کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ زاہدہ نے آپ کی ضرورت اور مجبوری کی آڑ میں آپ کو ہر پل لوٹا ہے اس کی ماں نے ہر وقت بلیک میل کیا ہے۔ اس نے آپ سے بدتمیزی کی تو آپ نے درگزر کر ڈالا۔ آپ کی چیزیں چرائیں تو آپ نے تفتیش کرنے کے بجائے صبر و تحمل سے کام لیا اور پھر سب سے بڑی غلطی جو کہ بار بار آپ سے سرزد ہوتی رہی۔ وہ تھی زاہدہ کی بے وجہ تعریف۔ جس نے اس میں غرور بھر دیا تھا۔ جسے وہ خود داری کا نام دیا کرتی تھی۔ اب تو وہ خود کو بہت عقل مند سمجھنے لگی تھی۔ میں نے آپ کو کبھی بتایا نہیں کہ وہ مجھے نام سے پکارنے لگی تھی۔ کئی بار مجھے بے وقوف کہہ کر میرا مذاق بھی اڑایا۔ میں اس لیے خاموش رہا کہ اگر میں نے اسے کچھ کہہ دیا تو آپ مجھے اس کے سامنے ہی ذلیل کردیں گی کیوں کہ آپ کو بھی تو اس سے مطلب تھا۔ میڈم عزت، پیار اور توجہ نہ تو خوشامد سے ملتی ہے نہ ہی لٹھ مارنے سے۔ ایک درمیانی رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے تو حد ہی کر ڈالی کہ اگر کسی وقت آپ صبر و تحمل کے دائرے سے باہر نکل آتی تھیں۔ تو اگلے ہی پل آپ کے لہجے میں مٹھاس گھل جایا کرتی تھی جبکہ میں کھول کر رہ جاتا تھا۔" وہ ذو معنی باتوں سے اپنے بھی بدلے لے رہا تھا۔

"اب تو جو ہونا تھا ہوچکا۔ میں زیادہ چھٹیاں نہیں لے سکتی۔ کوئی قابل اعتماد لڑکی کی تلاش شروع کرو۔ بس اس بات کا دھیان رکھنا زاہدہ کی طرح صاف ستھری ہو۔ کم بخت جب سے وہ میرے پاس آئی تھی۔ ریان ایک دفعہ بیمار نہیں پڑا اور نکھرا اجلا ایسے تھا جیسے ماں کی آغوش میں پروان چڑھ رہا ہو۔ چاچا کام کرنے میں کیا خوب تھی مگر بدتمیز ہر کام اپنی مرضی سے کیا کرتی تھی۔ جو کام میں کہہ دیتی تھی اسے آرڈر سمجھ کر اگنور کرنا اس کا روز کا معمول تھا۔ اس کے گھر کے ماحول نے اسے بے باک اور بدلحاظ بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ اپنے جھگڑالو اور دھاندلی باز بھائیوں کے ساتھ ایک پل نہ رہ سکتی یہ اس کی مجبوری تھی۔" صنوبر نے سرد آہ اندر ہی دبالی۔

"بس چاچا جہاں پھول کھلتا ہے وہاں کانٹا بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر اسے معاف کردیا کرتی تھی۔"

"میڈم آپ فکر مت کریں۔ اسی تنخواہ میں زاہدہ سے بہتر لڑکی ڈھونڈ نکالوں گا۔" چاچا نے تسلی و تشفی دینے کے انداز میں کہا۔

"مگر یہ کارروائی جلد ہونی چاہیے۔ میں ریان کو تمہاری نگہداشت میں دے سکتی ہوں مگر اس کا کام تم سے نہیں کراسکتی۔ بچے پالنا مردوں کا کام نہیں ورنہ تم سے بڑھ کر میں اور کس پر اعتماد کرسکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میڈم آپ دو چار سال کے لیے نوکری چھوڑ دیں۔ ریان اسکول جانے لگے تو آپ بھی نوکری پکڑ لیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے کسی چیز کی کمی نہیں۔ نجانے آپ اتنا معصوم بچہ دوسروں پر چھوڑ کر پرسکون کیسے رہتی ہیں؟" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

"چاچا وہ جاب چھوڑنا تو ناممکن ہے۔ کیریئر کا سوال ہے۔ دو چار سال کے بعد میں بہت پیچھے رہ چکی ہوں گی۔ میرے جونیئرز میرے باس ہوں گے۔ یہ میری توہین ہے۔ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ عورت صرف بچے پالنے میں ہی اپنی زندگی گزار دے۔ اب یہ دور ہمارا بھی ہے۔ مرد جیسی تعلیم اور اسی جیسے حقوق حاصل کرنا ہمارے فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔" وہ فخر سے گردن اونچی کرکے بولی تو چاچا مسکرا کر اسے دیکھنے لگا اور سوچتے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

"میڈم ذرا اپنا زیور پیسہ دیکھ لیں۔ پتا چلے ہاتھ صاف کر گئی ہے۔ ان کی خاموشی سے مجھے شک ہونے لگا ہے۔ ورنہ بتا کر جاتی۔"

"چاچا وہ ایسی نہیں تھی۔ بہت سچی اور کھری تھی۔ اس لیے تو بدزبان اور بدلحاظ بھی تھی۔" لہجے میں پھر رحم و ترس عود کر آیا تھا۔ "وہ بہت معصوم تھی۔"

"پھر بھی ایک نظر دیکھ تو لیں۔ تسلی کرنے میں کیا

حرج ہے۔ پیسے کی کھنک اور سونے کی چمک بڑے بڑے ایمانداروں کو اندھا بہرہ کر دیتی ہے۔ اتنا بھی کسی پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

"بات تو درست ہی کہہ رہا ہے۔ اسے تو میرے ہر چور خانے کا علم تھا۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ بے چینی سے دروازہ کھول کر اپنی کلازٹ کھول کر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔ خالی شاپرز اور خالی جیولری باؤچیز کے سوا وہاں اور کچھ نہ تھا۔ وہ لرزتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی اور ہانپتی کانپتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"چاچا زاہدہ صفایا کر گئی۔ تمہارا خیال درست نکلا۔ سارے کام چھوڑو اور ماسی کے گھر جاؤ۔ اسے بتاؤ کہ ابھی یہ خبر صاحب تک نہیں پہنچی۔ پردے داری میں ہی سونا اور پیسہ واپس لوٹا دے۔ اسے معاف کر دوں گی۔ کسی کے سامنے نام تک نہ لوں گی۔ اگر وہ مکر گئی تو یاد رکھے کہ اس کا انجام بہت بھیانک ہو گا۔ اس کی اولاد عمر بھر جیلوں میں چکی پیستے مر جائے گی۔ چاچا کام میں دیکھ لوں گی۔ سائیکل پکڑو اور جاؤ۔ جلدی واپس آ جانا اگر صاحب کو علم ہو گیا تو سب سے پہلے میری شامت آئے گی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں یہ معاملہ میں حل کر لوں گا۔ ایک ایک پائی اور ایک ایک رتی نکلوا لوں گا۔ حرام کا مال نہیں کہ آسانی سے ہضم کرے گی۔ اللہ کرے سب کچھ آپ کو واپس مل جائے۔" چاچا نے ایرن اتارتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا ریان روتا ہوا اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گیا تو صنوبر نے اسے گود میں لے کر حتمی اور مستحکم فیصلہ کیا کہ چاچا کے تجربے کے مطابق میری فیملی کے لیے یہی مناسب ہے کہ فی الحال جاب کو خیرباد کہہ دوں۔ اس وقت میری ضرورت میرے بچوں کو ہے۔ جن کے سامنے اک روشن مستقبل بانہیں پھیلائے کھڑا ہے۔ جن کی کامیابی اور خوشی میری اسی قربانی میں پوشیدہ ہے اور اس کامیابی کی اہمیت ایک دن کی نہیں عمر بھر کی ہے۔ سودا گھاٹے کا نہیں۔

یہ سوچ کر اس نے ایک پر تسکین سانس لی اور طمانیت سے لبریز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ لاؤنج میں بے قراری سے چاچا کا انتظار کرتے ہوئے اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ ریان کو پش چیئر میں سیٹ کر کے اسے لے کر کچن میں آ گئی اور ڈنر تیار کرنے لگی۔ شوہر کی پسندیدہ سویٹ ڈش بھی بنا ڈالی۔ سلاد کاٹ کر ٹیبل بھی لگا دیا، مگر چاچا کی واپسی نہ ہوئی۔

"کہاں رہ گیا؟ جانتا بھی ہے کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ بچہ سنبھالوں گی کہ کام کروں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی مین ڈور سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ ریحان کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی تو وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گئی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ آکاش کے کونوں پر پھیلی ہوئے لالی اور ملگجی — روشنی کو اس نے کتنی مدت بعد اتنے غور سے دیکھا تھا۔ ریحان حیرت سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"واہ۔ بیگم بمعہ ریان کے ہمیں ویلکم کہنے یہاں کھڑی ہیں۔ لگتا ہے بارش کے امکان ہیں۔" وہ مسرت و حیرت سے مغلوب ہو کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آئندہ روزانہ ایسے ہی ہو گا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"بھئی سورج نے اپنی سمت کیسے بدل لی؟ لمحہ فکریہ ہے۔" وہ ریان کو اس کی بانہوں سے لیتے ہوئے بولا۔

"ریحان آج ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں نے مجھے اک نوید مسرت سنائی ہے جو عام نوعیت کی نہیں۔ زاہدہ چلی گئی اک بہت اہم سبق سکھا گئی۔ پھر چاچا بھی اک نئے درس سے روشناس کر کے غائب ہو گیا وہ بھی واپس آنے کے لیے نہیں گیا۔ قصور ہمارا ہے۔ ہم ان غریبوں اور مسکینوں کو آزمائش میں ڈالتے وقت یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بھی بشر ہیں پیغمبر نہیں کہ ہمارے تشکیل کردہ امتحان پر پورے اتریں گے۔

ہم ہر ایک سے صرف بھلائی کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟ مکمل بھروسے کے بعد جب ہم دھوکہ کھاتے ہیں تو اس وقت ان کی خوبیوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور برائیوں کو بڑھ چڑھ کر بیان کرنے لگتے ہیں۔ بے شک انسان بہت کمپلی کیٹڈ ہے۔" وہ آسمان کے کناروں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی لالی کو دیکھ کر نجانے کس فسوں میں بولے جا رہی تھی۔

"خدا خیر کرے۔ تمہاری فلسفیانہ باتیں میرے سر سے گزر رہی ہیں۔ ہوا کیا ہے؟ کیا جانے والے زادراہ لے کر رخصت ہوئے ہیں، جو ہوش و حواس میں نہیں ہو۔" وہ مذاق میں بولا تو وہ کافی دیر خاموش کھڑی رہی۔

"اگر زادراہ پر میرا حق ہے تو وہ مجھے واپس مل کر رہے گا۔ کیوں کہ آپ کی اور میری انکم میں حرام کی ایک ذرے کی ملاوٹ نہیں۔" وہ تحمل سے بولی۔ لمبی آہ کو اس نے اندر ہی دبا لیا۔

"صنوبر اگر ہم ایک بھوکے اور پیاسے کے سامنے ڈھیر سارا کھانا پانی، دودھ ڈال کر اس سے یہ توقع رکھیں کہ یہ ہماری اجازت کے بغیر اسے منہ تک نہیں لگائے گا یہ کیسے ممکن ہے کیسی جاہلانہ سوچ ہے۔ ہم ایک پل کے لیے نظر دوسری طرف گھمائیں گے اور وہ فوراً کھانے پر حملہ آور ہو جائے گا۔ زندگی کا ایک اہم اصول پلے باندھ لو۔ کہ نہ کسی کا حق مارنے کی کوشش کرو۔ نہ ہی اپنے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی کسی کو جرات دو۔ یہ نقصان قابل واپسی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم بڑے نقصان سے بچ گئے۔ ریان اور تم سلامت ہو جو نعمت ہمارے پاس ہے اس پر سجدہ ریز ہو جاؤ۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"ریحان جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو تو تاریک اندھیاری راتوں میں ایک جگنو مشعل راہ بن سکتا ہے۔ آج میں نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اپنی ذات کو پہچانا ہے۔ اپنے رول کی شناخت کی ہے۔ رب العالمین نے مجھے رانی کا درجہ سونپ کر اپنے راجہ پر حاکمیت کرنے کی خوشخبری سنائی تھی جسے میں نے اپنی ہتک سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا۔ آپ کو، بچوں کو اور اپنی اس جنت کو دوسروں کے سپرد کر کے میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس حقیقت پر سرنگوں کرنے کی کامیابی میں، میں آپ کو اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھلاؤں گی اور ہماری کل کی صبح افراتفری سے نہیں بلکہ نہایت اطمینان اور محبتوں کے ہلکوروں میں طلوع ہو گی۔" وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے سینے سے سر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ تو وہ مسرت آگیں لہجے میں بولا۔

اسی ذات میں پستی کے کھنڈر ہوتے ہیں
اسی ذات میں کوہ ندا رہتا ہے

☼ ☼

سلمٰی فقیر حسین

دو ماہ پہلے جب احمر آیا تھا۔ بتارہا تھا کہ پڑھائی کے بعد لندن میں اس نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کرلیا ہے۔ میری ماہ نور کے ساتھ تو اس کی اتنی دوستی ہوگئی تھی کہ دونوں گھنٹے بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔"

تائی آسیہ گردن اکڑائے بڑے فخر اور مزے سے عالیہ پھوپھو کے بیٹے احمر کے متعلق بتا رہی تھیں۔ جس کی امیری اور ہینڈسم پرسنالٹی پر خاندان کی ہر دوسری عورت اپنی بیٹی کا حق سمجھتی تھی۔ ان میں سرفہرست نام تائی آسیہ کا تھا۔

بچپن میں تو میرے اور اس کے بیچ بھی بہت دوستی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب جب دو ماہ پہلے وہ آیا تھا تو اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ اس نے پانچ منٹ سے زیادہ اس سے بات کی ہو۔ احمر کا پرسوچ اور نرم انداز سے اسے دیکھنا۔ بہت عجیب لگا تھا۔ وہ لوگوں کی سخت اور چبھتی نظروں کی اتنی عادی ہوچکی تھی۔ کہ اسے احمر کی آنکھوں کی نرمی عجیب سے احساس سے دوچار کرتی رہی تھی۔ اور وہ جو عالیہ پھوپھو کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے سامنے جانے سے کتراتی رہی تھی۔

"انمول یہ انڈہ بھی لو بیٹا۔" اسے سوچ میں گم دیکھ کر علی احمد نے ابلے انڈوں کی ٹرے اس کی طرف کھسکائی تھی۔

"جی ابا" انڈا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے واضح طور پر تائی کے چہرے کی ناگواری محسوس کی تھی۔ پتا نہیں کیوں؟ انہیں علی احمد کا انمول کے ساتھ نرم اور دوستوں والا رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔

"میری ماہ نور انمول سے پورے چار سال چھوٹی ہے۔ ان شاء اللہ اس سال اسے احمر کے سنگ بیاہ کر لندن بھیج دوں گی۔" بہت عام سے بولے جانے والے لفظوں کے پیچھے کیا طنز چھپا تھا۔ وہ تینوں افراد بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

"عالیہ نے کیا ماہ نور اور احمر کے رشتے کے متعلق کوئی بات کی ہے؟" آمنہ بیگم، علی احمد کے منہ کے بگڑتے زاویوں کو دیکھ کر بات کو ہلکا پھلکا رنگ دینے کو بولیں۔

"ابھی کوئی بات عالیہ نے کی تو نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے۔ وہ ماہ نور کو ہی اپنی بہو بنائے گی۔ پورے خاندان میں 'میری ماہ نور ہی احمر کے جوڑ کی ہے۔ ویسے تو انمول کا جوڑ بھی احمر کے ساتھ بن سکتا ہے۔ مگر وہ کیا ہے ناکہ آنکھوں دیکھی مکھی بھلا کون نگلتا ہے۔ ایسی لڑکیوں کی شادیاں کہاں ہوتی ہیں۔ بے چاری ساری عمر والدین کی دہلیز پر بیٹھی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔"

وہ میٹھی چھری بنی بظاہر انمول کو ہمدردی سے دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔ مگر ان کے سخت جملوں نے انہیں اپنی جگہ چور سا بنادیا تھا۔

یہی وہ باتیں تو ہیں جن کی پروانہ ہوتے ہوئے بھی انمول احمد دکھی اور رنجیدہ ہوجایا کرتی تھی۔ جس پر اسے اپنے زندہ رہنے پر شرمندگی ہونے لگتی کیونکہ یہ وہ باتیں تھیں۔ جو اس کے والدین کو خون کے آنسو رلاتی تھیں۔ چھبیس سال کی ہونے کے باوجود اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسے پروا نہیں تھی کیونکہ وہ اللہ کی رضا میں خوش رہنے والی صابر سی بندی تھی اور اس کے والدین بھی اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پر اس کی شادی کی امید چھوڑ چکے تھے۔ مگر جب کوئی بہت جتا کر انہیں بتاتا کہ ان کی بیٹی انمول سے چھوٹی ہے اور اس کی شادی ہورہی ہے تو وہ دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کی ویران زندگی پر غمزدہ ہوجاتے۔

ابھی بھی تائی آسیہ کی باتوں پر جہاں انمول نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے سر پلیٹ پر جھکا لیا تھا۔ وہیں آمنہ بیگم نے سہمی ہوئی نظروں سے علی احمد کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ جو غیض و غضب سے مٹھیاں بھینچے اپنے غصے کو شاید کنٹرول کرنے کی کوشش میں تھے۔

وہ جانتے تھے بھابی یہ باتیں صرف اس کا دل دکھانے کے لیے کرتی ہیں۔ اس کی وجہ علی احمد کے ہاتھوں خود کا ریجیکٹ ہونا تھا۔ وہ ان کے بڑے بھائی علی ارشد کی منگ تھیں۔ مگر نہ جانے کب وہ علی احمد کو پسند کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے اپنی پسند کا اظہار علی

احمد سے کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ ساتھ دے تو وہ علی ارشد سے اپنی منگنی ختم کر کے ان کا ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ مگر علی احمد کے ضمیر نے یہ گوارہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی منگ پر بری نظر رکھیں۔ تب ہی انہوں نے اپنی بڑے واضح اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ انہیں پسند نہیں کرتے اور وہ ان سے بھابی کے سوا کوئی رشتہ نہیں بنانا چاہتے۔

تب تو آسیہ بیگم خاموش ہو گئی تھیں۔ مگر انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں کبھی خوش نہیں رہنے دیں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ انمول، علی احمد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ کبھی اس کے خلاف بول کر وہ انہیں زچ کرتی رہتی تھیں۔

"میں تو کہتی ہوں کہ اب اس لڑکی کو گھر میں بٹھالو۔ ہم تو اس کی وجہ سے پہلے ہی لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ پہلے پڑھنے اور اب پڑھانے کے بہانے گھر سے باہر رہتی ہے۔ اب نا جانے کیا گل کھلانے والی ہے۔" تائی جان اسے یونیورسٹی کے لیے تیار ناشتے میں مصروف دیکھ کر اپنی گل افشانیاں جاری رکھے ہوئے تھیں۔

"بس بہت ہو گیا بھابی۔" علی احمد جو تنے ہوئے غصہ ضبط کرتے انہیں سن رہے تھے۔ ان کی آخری بات پر ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ میری بیٹی کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا بولیں۔ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ایک بدترین حادثہ تھا جو ہماری بیٹی کی زندگی کی تمام خوشیاں لے کر چلا گیا۔ ہم اس حادثے کو بھول چکے ہیں اور آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ ہمارے زخموں پر نمک چھڑکیں۔" علی احمد شدید غصے کے عالم میں دو ٹوک اور واضح انداز میں بول رہے تھے۔ وہ جس کی ذات کے متعلق بحث کی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی۔ یوں جیسے اس کے متعلق نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔

"ارے ایسا میں نے کیا کہہ دیا جو تمہیں برا لگ رہا ہے۔ میں نے تو اپنائیت کے ناتے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بھلے کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں رہا۔" تائی جان کو علی احمد کا غصہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ تب ہی بگڑے زاویوں سے منہ بناتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ ہمیشہ انہیں پہلے زچ کرتیں پھر لڑنے پر اتر آتی تھیں۔

علی احمد مزید بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر انمول نے اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پر رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ علی احمد نے ناراض سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"جانے دیجیے بابا! مجھے اب ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔" کا واضح پیام آنکھوں میں لیے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ علی احمد جو آنکھوں کے راستے اس کے دل کا حال جان لیا کرتے تھے۔ سمجھتے تھے وہ خود کو کتنا بھی مطمئن اور پرسکون دکھانے کی کوشش کرے۔ اندر سے خود اس کا دل بھی تائی کی باتوں سے زخمی ہو گیا ہو گا۔ وہ صرف اس کے منع کرنے اور اس کا دل رکھنے کے خیال سے بھائی کو کوئی سخت جملہ سنانے کے بجائے کرسی دھکیل کر بغیر ناشتا کیے اٹھے اور بریف کیس اٹھا کر آفس کے لیے نکل گئے۔

ان کے گھر سے کوئی ناراض اور ناشتا کیے بغیر کم ہی جاتا تھا۔ وہ تینوں افراد اپنے دکھ کو دل میں چھپائے ایک دوسرے کو خوش رکھنے کا فن بخوبی جان گئے تھے۔ ان کی پرسکون سی زندگی میں ہلچل تب ہی ہوتی تھی۔ جب کوئی خاندان کا فرد ان کے ہاں آیا ہوتا۔ انمول کے متعلق کبھی ہمدردی اور کبھی طنز کی صورت اٹھنے والا سخت جملہ آمنہ اور اسے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا اور علی احمد کو آپے سے باہر۔ جس پر ہمیشہ گھر کا ماحول ڈسٹرب ہوتا اور وہ ایک دوسرے سے نظریں چرائے رہتے۔

ابھی بھی تائی جان کی بات پر علی احمد کے غصے سے سارا ماحول کھنچا کھنچا اور اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

اس نے ایک نظر آمنہ کو دیکھا جو سر جھکائے بے دلی سے پلیٹ میں رکھے ہاف بوائل انڈے کو کانٹے سے ہلا رہی تھیں۔

"خدا حافظ مما۔" اس نے کہا۔ اور ناشتا ختم کیے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جبکہ آمنہ بیگم اسے ناشتا ختم کرنے کا بھی کہہ نہیں سکیں۔ تائی جان پہلے سے ہی اٹھ کر جا چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اب مزید تم سے دور رہنا میرے بس میں نہیں ہے انمول! میں نہیں چاہتا کہ لوگ ہمارے تعلق کو غلط نظر سے دیکھیں یا تم پر کوئی انگلی اٹھائے۔ اس لیے پلیز شادی کے لیے ہاں کر دو۔" وہ ہمیشہ کی طرح یونیورسٹی کے گیٹ میں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اور اس کے آتے ہی اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھتے ہوئے بول رہا تھا۔

وہ جو پہلے ہی تائی جان کی باتوں پر دلگرفتہ ہو رہی تھی۔ فراز کی شادی والی بات پر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ موسم سرما کے خنک موسم میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمک اٹھے تھے۔ شادی کا ذکر اسے ہمیشہ یونہی اداس اور پریشان کر دیتا تھا۔

"انمول تم ہمیشہ شادی کی بات پر اتنا پریشان کیوں ہو جاتی ہو۔" وہ اس کے سامنے آ کر اس کی اداس سی شکل کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اگر تمہارے دل میں یہ ڈر ہے کہ میری اپر کلاس فیملی تمہیں قبول نہیں کرے گی تو مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ تمہیں پانے کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔"

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے فراز! پھر بات کریں گے۔" وہ بمشکل یہ دو جملے بول کر اپنے لڑکھڑاتے وجود کو گھسیٹتے ہوئے اس کے قریب سے نکلتی چلی گئی تھی۔

فراز نے رخ موڑ کر عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اور اس کی نظروں نے بہت دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تائی امی واپس اپنے گھر جا چکی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ بے شک وہ خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کرتی تھی کہ اسے کسی بھی بات کی پروا نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی ذات کے متعلق اٹھنے والے مشکوک سوالوں سے کیسے اندر سے ٹوٹتی تھی؟ کیسے وہ اپنے دل کے زخموں کو چھپا کر اپنے پیرنٹس کے خیال سے مسکراتی تھی۔ یہ بات صرف وہی جانتی تھی۔ مگر یہی سوال جب اس کے والدین، اس کی زندگی کی دو محبوب ترین ہستیوں کو دکھ دیتے ان کی آنکھوں میں آنسو لاتے تو اس کی تکلیف و دکھ کئی گنا بڑھ جاتے اور وہ اپنی جگہ چور سی بن جاتی۔

صبح والے واقعے کے بعد وہ کافی افسردہ تھی۔ اوپر سے فراز کا شادی پر زور دینا۔ اسے مزید افسردہ اور دلگرفتہ کر گیا تھا۔ جانتی تھی کہ ماضی کا وہ بھیانک سچ جو وہ خود سے بھی چھپائے پھرتی ہے۔ شادی کے لیے ہاں کرنے پر اسے فراز کو یہ سچ بتانا پڑے گا۔ وہ یہ سچ بتانے سے نہیں ڈرتی تھی۔ اسے صرف فراز کے یہ سچ جان لینے کے بعد کے رد عمل سے ڈر لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ساری دنیا کے سوالوں کے جواب دے سکتی ہے مگر فراز نے اگر اسے شک سے دیکھا یا پھر کوئی مشکوک سوال اٹھایا۔ جو اس کے دل کو زخمی کر دے تو شاید وہ برداشت نہ کر سکے۔

وہ بہت عرصے کے بعد خود کو بہت تھکا تھکا محسوس کر رہی تھی۔ ذہن فراز میں الجھا ہوا تھا اور وہ صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"بھوک لگی ہے تو بیٹا کھانا لاؤں۔" لاؤنج سے ملحقہ کچن میں ڈنر کی تیاری کرتی آمنہ نے اسے یوں اداس سا سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا تھا۔ مقصد صرف اس کا ذہن بٹانا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ تینوں ایک دوسرے کے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔

"نہیں مما! پاپا آنے والے ہیں پھر مل کر ایک ساتھ کھائیں گے۔" اس نے صوفے کی بیک پر بازو رکھ کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا اور دوبارہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ علی احمد ابھی آفس سے نہیں آئے تھے اور وہ ٹائم پاس کرنے کے لیے اخبار بینی کرنے لگی۔ مختلف خبروں

سے ہوتے ہوئے اس کی نظر ایک خبر پر آکر جیسے تھم گئی تھی۔

"پانچ سال کی بچی کے ساتھ زیادتی اور مجرم فرار۔"

اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی تھی۔ وہ دم سادھے سانس روکے یک ٹک اسی خبر پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کوئی خوف' درد کوئی چبھن تھی۔ جس نے ایک لمحے میں اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسے اپنا دم رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ایک دم آنکھیں بند کرکے صوفے کی بیک سے تھکے ہوئے انداز سے ٹیک لگا کر اس خوف سے دور بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ خوف وہ درد اپنی پوری شدت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

اسے برسوں بعد آج وہ چھوٹی لڑکی یاد آئی اور اسے اپنی ہوس کا شکار بناتا۔ وہ ظالم' بے ضمیر چوکیدار جس کی مکروہ شکل پر پچھلی خباثت یاد آنے پر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر خوف سے زردیاں اتر آئی تھیں۔

"مما۔" وہ اپنے سر کو صوفے کی بیک پر گراتے ہوئے اتنے زور سے چیخی تھی کہ آمنہ بیگم کے ہاتھ سے گرم دودھ کی پتیلی چھوٹ گئی تھی۔ گرم دودھ ان کے پیر پر گرا تھا مگر وہ اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار اس کی طرف بھاگی تھیں۔

"مما مجھے بچالیں۔ پلیز پاپا۔ پپا پلیز مجھے بچالیں۔" وہ بلک بلک کر روتے چیختے ہوئے ایک ایک چیز اٹھا کر پٹخ رہی تھی۔

"میری جان! میں تمہارے پاس ہوں کیا ہوا ہے۔" وہ زمین پر بکھرے کانچ کے ٹکڑوں سے بچتے ہوئے اس کے قریب آتے ہوئے بولی تھیں۔ انہوں نے اس کی وحشت کو کم کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پکڑنے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔

"چھوڑیں! مت چھوئیں مجھے۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے دھاڑی تھی۔

"پلیز اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دیں۔" وہ تھکے سے انداز میں بولتے ہوئے نڈھال سی دونوں ہاتھوں میں اپنے چکراتے سر کے ساتھ گرنے والے انداز میں گھٹنوں کے بل زمین پر ڈھے سی گئی تھی۔

"بیٹا میں ہوں تمہاری مما!" وہ اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے رو دی تھیں۔ جبکہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ان کی گود میں سر رکھے ہوئے بے ہوش ہوگئی تھی۔

گھنٹہ بھر بے ہوش رہنے کے بعد' اسے ہوش آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔ علی احمد پریشان سی صورت لیے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ جبکہ آمنہ بیگم اس کے بے حد قریب بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ اس کا ہاتھ آمنہ کے ہاتھ میں تھا جسے وہ دھیرے دھیرے سہلا رہی تھیں اور ان کے آنسو اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ وہ چند ہی گھنٹوں میں اسے بیمار اور بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ دکھ' پچھتاوا' افسوس کیا کچھ ان کے چہرے پر رقم نہیں تھا۔ یہ دکھ یہ پچھتاوا ہی تو وہ ان کے چہرے پر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس کی ماں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بے شک لوگ اس کے ساتھ ہونے والے حادثہ کا ذمہ دار اس کی ماں کو سمجھتے تھے کہ جس کی لاپروائی سے اسے یہ حادثہ پیش آیا۔ مگر وہ آج تک کسی کو بھی یہ بات نہیں سمجھا پائی کہ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس کی نادانی تھی۔ اگر وہ گرمیوں کی اس سنسان دوپہر میں اپنی ماں کو سوتا ہوا چھوڑ کر ساتھ والے گھر میں بلی کے بچے سے کھیلنے نہ جاتی تو شاید وہ چوکیدار کی ہوس اس کی درندگی کا شکار نہ ہوئی ہوتی۔ جبھی جو وہ اس واقعے کے متعلق سوچتی تو اسے کبھی اس حادثے میں اپنے والدین کی کوئی کوتاہی نظر نہ آئی۔

اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ ان کی بے حد لاڈلی تھی۔ وہ گر نہ جائے' اسے کوئی چوٹ نہ لگ جائے' اسے کچھ ہو نہ جائے۔ یہی خیال و فکر تھی کہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے۔ اسکول چھوڑ کر آنے کی ذمہ داری اگر اس کے پاپا کی تھی تو چھٹی کے وقت اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو گیٹ کے سامنے اپنا منتظر پایا تھا۔

شام کو وہ جب قاری صاحب کے پاس سپارا پڑھنے بیٹھتی تو آمنہ بیگم اس سے تھوڑے فاصلے پر کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے بیٹھ جاتیں۔ تاکہ وہ ان کی نظروں میں رہے۔ اتنی توجہ' اتنی احتیاط کے باوجود اگر اس کے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا تو اس میں اس کے والدین کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو خود اس حادثے کے بعد ٹوٹ سے گئے تھے۔

اسے زندگی کی طرف واپس لانے اور اس بھیانک حادثے کو بھلانے کے لیے انہوں نے اپنا گھر محلہ اور وہ شہر چھوڑ دیا تھا۔ جہاں کبھی انصاف دلائیں گے کا نعرہ لگاتے ہوئے میڈیا کے نمائندے' اپنے کھلے سوالوں سے اس آٹھ سال کی بچی کے نوخیز ذہن کو جھنجوڑ رہے تھے تو کبھی ہمدردی اور افسوس کے بہانے آنے والوں کی زبان کے نشتر' اس کی ذات کو توڑ پھوڑ رہے تھے۔ اسے اس حادثے کو بھولنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ ہر مرد کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی اور چیخنا چلانا شروع کردیتی اور اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اس کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے علی احمد نے دلگرفتی سے کہا تھا۔

"ہم جتنی بھی کوشش کرلیں۔ یہ لوگ ہماری بیٹی کو یہ حادثہ بھولنے نہیں دیں گے۔ یہ لوگ اور ان کی چبھتی نظریں ہماری بیٹی کو جینے کے قابل نہیں چھوڑیں گی۔ میں جانتا ہوں۔ انسان پر ہونے والا ظلم و حالات اسے نہیں مارتے لیکن اپنوں کی شکی نظریں اور سخت رویے مار دیا کرتے ہیں۔ اور میں اپنی بیٹی کی زندگی اور اس کی ذات کو توڑ پھوڑ کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے ان رویوں سے اسے دور لے جانا چاہتا ہوں۔ اتنی دور جہاں ہماری بیٹی کا ماضی جاننے والا کوئی نہ ہو۔ بہتر ہے ہم یہ شہر چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں۔"

نئی جگہ نئے ماحول میں آکر وہ آہستہ آہستہ بہلنے لگی تھی۔ شاید وہ مکمل طور پر جوان ہونے تک اس حادثے کو بھول جاتی۔ مگر خاندان میں ہونے والی کسی نہ کسی تقریب میں کوئی نہ کوئی جملہ ایسا ضرور ہوتا۔ جو نئے سرے سے اس کے زخم تازہ کردیتا اور وہ کتنے دن نڈھال رہتی۔ نتیجہ اس نے تقریب میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ اپنے بے حد قریبی رشتے داروں کو اپنے گھر آنے سے نہ روک سکتی تھی اور نہ ہی روکنا چاہتی تھی۔ مگر ان کی آنکھوں میں اپنے لیے ترس' ہمدردی یا کوئی چبھتی ہوئی چیز اسے ہمیشہ ڈسٹرب رکھتی۔ اور اس کی ماں اسے دیکھ کر ہونٹ کچلنے لگتی۔ علی احمد اپنوں کے سنگ دل رویے پر دلبرداشتہ ہو کر انہیں اپنے گھر بلانے سے کترانے لگے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سچ میں اس سے محبت کرتے اور چاہتے کہ وہ اس حادثے کو بھول کر اپنی زندگی میں آگے بڑھے۔ جن میں اس کے والدین کے بعد نمایاں نام اس کی پھوپھو عالیہ کا تھا۔ جنہوں نے کبھی اپنے بچوں کو اس کے ساتھ کھیلنے سے نہیں روکا۔ جنہوں نے ہمیشہ اس کی برتھ ڈے' اس کے پاس ہونے' اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو منانے کے لیے اسے گفٹ بھیج کر اسے یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے لیے کتنی خاص اور پیاری ہے۔ تب ہی اس نے فیصلہ کیا تھا کہ چاہے وہ اندر سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ مگر خود سے محبت کرنے والوں کے سامنے' ہمیشہ خود کو مضبوط رکھے گی۔

مگر آج پتا نہیں کیسے وہ کسی کمزور لمحے میں آکر خود کو سنبھال نہیں پائی تھی۔ اور اب اپنے والدین کو پریشان اور نڈھال سا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو نا بیٹا۔" علی احمد اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ آمنہ بیگم نے بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں پاپا آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ چہرے پر مصنوعی بشاشت لاتے ہوئے اٹھنے لگی تب ہی اس کو بازو میں چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے بازو کو ہاتھ سے مسلا شاید ڈاکٹر نے انجکشن لگایا تھا۔

"تم نے ہمیں بہت مایوس کیا ہے انمول۔ ہماری زندگی کا واحد مقصد یہی رہا ہے کہ ہم تمہیں اتنا مضبوط بنائیں کہ تم سخت سے سخت حالات کا بھی تنہا مقابلہ

کر سکو۔ پر اعتماد بنو کہ کوئی تم پر انگلی اٹھانے سے پہلے سو بار سوچے۔ مگر ایک خبر پڑھنے کے بعد جو تمہاری حالت ہوئی ہے اسے دیکھ کر ہمیں لگ رہا ہے کہ ہم اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔" وہ اس کے قریب بیٹھے اس سے بہت خفا بہت ناراض لگ رہے تھے۔

"ایسے مت کہیے پاپا! آپ کی بیٹی ویسی ہی ہے۔ جیسا اسے آپ بنانا چاہتے تھے مگر وہ کیا ہے کہ انسان ہوں۔ بعض اوقات ڈیپریشن کا شکار ہو کر خود کو سنبھال نہیں پاتی۔" وہ ان کے اور آمنہ کے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر انہیں اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے یقین دلانے والے انداز میں بولی۔ "مگر اس پاپا آج کے بعد میں ڈیپریشن کو کبھی خود پر حاوی ہونے نہیں دوں گی۔ میں جانتی ہوں آپ تائی جان کی باتوں پر بھی غصہ ہیں کہ انہوں نے میرے بارے میں بہت کچھ غلط کہا اور میں خاموش رہی۔ آپ خود ہی بتائیں پاپا اگر میں انہیں کچھ کہتی تو کیا وہ میری بات سمجھتیں؟ کیا وہ پھر کبھی میرے بارے میں برا نہیں بولتیں؟ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں پاپا! جنہیں دوسروں کے زخم کھرچنے میں مزا آتا ہے اور تائی جان بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ایسے لوگ کبھی نہیں سمجھتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ

"ان کی آنکھوں کانوں اور دلوں پر مہر لگادی گئی سو وہ نہ تو سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔" جو قرآن و حدیث کو ماننے اور پڑھنے کا وعدہ کرنے کا دعوا کرنے کے باوجود اسے نہیں سمجھتے کہ انہیں قرآن و حدیث میں کیسے دوسروں کا دل دکھانے، انہیں تکلیف پہنچانے سے روکا گیا ہے تو وہ بھلا میرے اور آپ کے سمجھانے سے کیا سمجھیں گے۔ آپ ہی تو کہتے ہیں۔ جہالت کا جواب جہالت سے دینا۔ سراسر حماقت ہے۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے اور بردبار سے انداز میں بول رہی تھی۔ علی احمد نے پرستائش انداز میں اس کے قائل کرنے والے انداز کو دیکھا تھا۔

"عورت کی نرم روی، اس کے لہجے کا دھیما پن دوسروں کے بدصورت رویے پر کھلے دل سے معاف کر دینا عورت کا شیوہ ہے۔ جو اس کی شخصیت کو خوبصورت بناتے ہیں اور ہر عورت کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکے تھے۔ "لیکن جب بات عزت و کردار پر آجائے تو عورت کو خاموش نہیں رہنا چاہیے۔" وہ دل سے اس کی باتوں کے قائل ہوئے تھے۔ مگر چاہتے تھے کہ اپنے کردار پر انگلی اٹھانے والوں کے سامنے خاموش نہ رہے۔

"میں جانتی ہوں پاپا! لیکن جو خود سمجھنا نہ چاہے انہیں کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے۔ جہاں مجھے لگے گا میرا بولنا ضروری ہے میں وہاں خاموش نہیں رہوں گی۔ میں نے جتنا قرآن کو پڑھا اور سمجھا ہے اس سے مجھے یہی سبق ملا ہے کہ جن لوگوں نے صبر شکر کے ساتھ اللہ پر کامل ایمان رکھا وہ ہمیشہ سرخرو اور کامیاب رہے ہیں۔ میں بھی صبر و شکر کے ساتھ اللہ پر مکمل بھروسا رکھ کر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تائی جان جیسے لوگوں کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جو مسلمان ہونے کے باوجود، دوسروں کا دل دکھاتے ہیں اور کسی کے سمجھانے پر سمجھنے کی بجائے واویلا کرتے ہیں۔" شاید زندگی میں پہلی بار وہ اتنا بول رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جیسے کہ وہ اللہ کے قریب ہو جانا چاہتی ہو اور اسے دنیا والوں کے رویے کی پروا نہ ہو۔ اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ تب ہی علی احمد نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

★ ★ ★

عالیہ پھوپھو کا فون آیا تھا۔ وہ کچھ دنوں میں پاکستان آنے والی تھیں۔ سب سے بات کرکے انہوں نے اس سے بھی بات کی تھی وہ ان سے بات کرکے بہت خوش تھی ان کے لہجے میں اس کے لیے موجود مخصوص محبت و اپنائیت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی کھنک تھی۔ جسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی ان کا معنی خیز انداز میں اس سے کہنا کہ وہ صرف اس کے لیے آرہی

ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ پھوپھو اس سے بہت محبت کرتی ہیں مگر آج ان کا لہجہ اسے بڑا عجیب اور پراسرار سا لگا تھا۔ پھر نا جانے پھوپھو کو کیا سوجھی تھی کہ انہوں نے فون احمر کو تھما دیا تھا۔ وہ بہت اپنائیت اور خلوص سے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تھا اور وہ اس کے لہجے کی شوخی پر حیران ہوتے ہوئے اس کے سوال کا جواب ہوں، ہاں میں دیتی رہی تھی تب ہی وہ اس سے بولا تھا۔

"تمہیں یاد ہے انمول! بچپن میں ہم تتلیوں کے رنگ چرایا کرتے تھے اور جب تم سے کوئی تتلی نہیں پکڑی جاتی تھی تو میں تم سے اپنی تتلی کے رنگ بانٹ لیا کرتا تھا۔" وہ ماضی کے خوب صورت دنوں میں کھویا بہت دھیمے اور پرخلوص لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں" ماضی میں جھانکتے ہوئے کیسی کسک جاگی تھی اور وہ ایک ہاں کے سوا کچھ نہیں بول پائی تھی۔ تب ہی خاموشی سے اپنے ہونٹ کچلتی رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں انمول! تم مجھ سے تھوڑا ناراض ہو کہ میں تم سے دوستی کا دعوا کرنے کے باوجود کبھی تمہارے دکھ سکھ میں تمہارے ساتھ نہیں رہا۔ مگر یقین کرو انمول میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری بہت ذہین و فطین اور پراعتماد دوست یوں بکھری ہوئی ملے گی۔ میں اپنی اسٹڈی میں اتنا مصروف تھا کہ میرا تمہاری طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ مگر اب جب اتنے عرصے کے بعد میں پاکستان آیا تو تمہیں دیکھ کر مجھے خود پر شرمندگی ہونے لگی کہ میں کیسا دوست ہوں جو تم سے اتنا غافل ہو گیا کہ پلٹ کر تمہاری خبر ہی نہیں لی۔ مگر اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں تم سے اپنی دوستی اور محبت کا فرض ضرور نبھاؤں گا۔" بہت سچے اور پرخلوص دل سے بولتے بولتے اس کی آواز جیسے سرگوشی میں ڈھل گئی تھی اور محبت کا لفظ تو اس نے اتنا آہستہ بولا تھا کہ وہ سن بھی نہیں پائی تھی بس آنسو تھے جو نہ جانے کیوں خاموشی سے بہہ نکلے تھے۔

"میں اپنی زندگی کا ہر رنگ تم سے بانٹ لینا چاہتا ہوں۔" اسے خاموش دیکھ کر وہ بہت واضح اور محبت بھرے انداز میں بولا تھا اور اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

اس کا ذہن احمر اور پھوپھو کی باتوں پر الجھ سا گیا تھا۔ احمر کے بڑے واضح انداز میں کہنے پر بھی وہ اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی یا جان بوجھ کر سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ احمر پر تائی جان کی نظر ہے اور تائی کسی طور احمر کو اس کا ہونے نہیں دیں گی۔ تب ہی اپنے منتشر سوچ میں الجھے ذہن کو جھٹکتے ہوئے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کسی سے کوئی امید نہیں لگانا چاہتی تھی۔

وہ دو دن بعد یونیورسٹی آئی تھی اور سیدھی اسٹاف روم میں چلی گئی۔ فراز جو کچھ لکھنے میں مصروف تھا اسے دیکھ کر دلکشی سے مسکراتا ہوا اپنی نشست چھوڑ کر اس کے قریب آگیا تھا۔

"شکر ہے انمول تم آگئیں۔ تمہارے نہ آنے کی وجہ سے میں اتنا اداس ہو گیا تھا۔ اوپر سے تمہارا موبائل بھی آف جا رہا تھا۔ سچ آج بھی اگر تم نہ آتیں تو میں ضرور تمہارے گھر چلا آتا۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے شکوہ کرتے ہوئے فکر مند ہو رہا تھا۔

"تو آجاتے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اتار کر رکھتے ہوئے خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"تم سگنل تو دو میں آج ہی تمہارے گھر آکر تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے نام کروا آؤں۔" وہ اسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے والی چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔

ایک ہی لمحے میں اس کا پرسکون چہرہ تاریک سا ہو گیا تھا۔ وہ جتنا اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فراز اس کے دل کی حالت سے بے خبر اتنا ہی شادی کرنے میں انٹرسٹ لے رہا تھا۔

"تم میرا ماضی نہیں جانتے فراز! جان جاؤ تو شاید میرا نام لیتے ہوئے بھی ہچکچاؤ۔ بہتر ہے ہمارے بیچ سے یہ شادی والی بات نکل جائے اور ہم صرف اچھے دوست بن کر رہیں۔" وہ اسٹاف روم سے اندر آتے ٹیچرز کو

دیکھتے ہوئے کھوئے سے انداز میں بولی تھی۔

"مجھے تمہارے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہے انمول۔ میں حال میں جینے والا انسان ہوں اور صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے سامنے جو گاؤن اسکارف میں ملبوس باحیا آنکھوں والی لڑکی بیٹھی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ پچھلے تین سال سے محبت کرتا ہوں۔ جب وہ میرے ساتھ میری یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی جس نے مجھ جیسے فلرٹ لڑکے کو محبت کرنا سکھایا اور آج وہ فلرٹی لڑکا اس کی محبت میں اس قدر ڈوب چکا ہے کہ اگر وہ اسے ایک دن نہ دیکھے تو اسے لگتا ہے وہ دن اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں۔ جو اپنے کروڑوں کے بزنس کو چھوڑ کر صرف انمول علی کی محبت اور اس کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر لیکچرار کی جاب کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے قریب رہ سکے لیکن اگر کوئی بات جو تمہیں ڈسٹرب کر رہی ہے اور تم مجھے بتانا چاہتی ہو تو میں ضرور سننا چاہوں گا۔"

اس کی نظریں اس کے معصوم و پاکیزہ چہرے پر ناچ رہی تھیں اور وہ اپنی محبت کا یقین اور وہ اس کے لیے کتنی خاص ہے اور دل میں کیا مقام رکھتی ہے بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔

روح اور جسم سے محبت کرنے والوں میں ظاہری طور پر صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ روح سے محبت کرنے والے کی نظریں، محبوب کو دیکھ کر اس کے احترام میں جھک جاتی ہیں اور جسم سے محبت کرنے والے کی نظریں، محبوب کے جسم کا طواف کرنے میں مصروف ہوتی ہیں۔

"میں اپنی زندگی اپنے ماضی کا کڑوا سچ تم سے شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس کے بعد تم جو بھی فیصلہ کروگے مجھے منظور ہوگا بس ایک ریکویسٹ ہے تم سے کہ میرا ماضی جاننے کے بعد اگر تم مجھ سے شادی نہ کرنا چاہو تو مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کرنا اور اگر مجھے اپنا دوست رکھنے کے بھی روادار نہ رہو تو خاموشی سے چلے جانا۔ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤگے تو کبھی بھی تم سے شکوہ نہیں کروں گی۔ لیکن اگر میرا ماضی جاننے کے بعد تمہارے ہونٹوں پر میرے لیے ایک بھی غلط جملہ آیا تو جینا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔"

وہ آنکھوں میں نمی، دل میں خدشے لیے اپنی انگلیوں کو موڑتے ہوئے بہت بے بس نظر آ رہی تھی بالآخر اس نے اسے اپنی زندگی کا بدترین سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تمہیں شاید میری محبت پر بھروسہ نہیں ہے ورنہ تمہارے لہجے میں خدشے نہیں بلکہ یقین کی کھنک ہوتی۔ مجھے تو تم سے ایسی محبت ہے اگر تم چار بچوں کی ماں بھی ہوتیں تو میں تم سے ہی شادی کرتا۔ پھر بھی تمہاری تسلی کے لیے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھے تم سے کوئی تعلق نہ رکھنا ہوا تو یہ جاب چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ویسے مجھے یقین ہے مجھے جاب نہیں چھوڑنی پڑے گی۔" وہ پریقین سا مضبوط لہجے میں بولا تھا۔ بے شک دوسرے ٹیچرز کی موجودگی میں وہ بہت آہستہ بول رہا تھا۔

"محبت پر مجھے بھروسا ہے فراز شاید انسانوں پر نہیں ہے۔"

"محبت تو ہمیشہ اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ لیکن لوگ بدل جاتے ہیں بے شک میں نے تم سے بہت زیادہ امیدیں نہیں باندھیں پھر بھی تمہیں کھونے کا احساس مجھے نڈھال کیے جا رہا ہے۔" اس نے فراز کی شوخ مسکراہٹ لیے پریقین سے چہرے کو غائب دماغی سے دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اپنی فائل اٹھا کر پریڈ لینے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

فراز کی پرشوق نظریں اس کی پشت پر تھیں۔

فراز کسی ضروری کام کی وجہ سے یونیورسٹی آف ہونے سے پہلے ہی چلا گیا تھا وہ جو آج اسے سب سچ بتا دینے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی۔ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایسے کیوں بیٹھی ہو بیٹا؟" وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی ٹکائے اداس سی لان کے بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی تھی۔ جب علی احمد (جو ابھی ابھی آفس سے آئے تھے) اسے یوں اداس اور تنہا بیٹھا دیکھ کر پوچھ رہے تھے۔

"دھوپ میں بیٹھنے کو دل کر رہا تھا اس لیے یہاں آکر بیٹھ گئی پاپا!" اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنے کپڑوں کو جھاڑتے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

جاتی سردیوں کے دن اسے ہمیشہ یونہی اداس اور بے کل کر دیا کرتے تھے۔ اس بار تو فراز کے شادی پر زور دینے پر اداسی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اب جب وہ اسے سب سچ بتا دینے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔ دل نہ جانے کیوں مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا تھا۔ دل اسے یہ سچ بتانے سے روک رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں بیٹا! کوئی بات ہے جو تمہیں پچھلے چند دنوں سے پریشان کر رہی ہے۔ تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتیں تو میں تمہیں بتانے پر مجبور نہیں کروں گا لیکن تم سے اتنا ضرور کہوں گا۔ زندگی میں جب بھی کوئی مشکل فیصلہ لگے، اپنے ضمیر کی ضرور سنو۔ ضمیر ہمیشہ انسان کو صحیح فیصلہ کرنے میں مدد دیتا ہے اور اللہ کے سوا کبھی کسی سے امید مت لگانا۔ کیونکہ انسانوں سے لگائی جانے والی امیدیں اکثر ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔"

اس کے دل کی بات جان لینے والا اس کا باپ آج بھی اس کے دل کی اتھل پتھل جان گیا تھا اور اب اسے بڑی شفقت اور پیار سے دیکھتے ہوئے اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ علی احمد کی باتوں پر پرسکون اور مطمئن ہو جایا کرتی۔ آج بھلا وہ کیسے ان کی امید دلاتی زندگی جینے کا درس دیتی باتوں سے پرسکون نہ ہوتی۔ وہی تو تھے جن کے ساتھ مان اور بھروسے نے اسے حالات کو فیس کر کے پچھلی باتوں کو بھول کر آگے بڑھنے اور زندگی سے اپنا حق وصول کرنا سکھایا تھا۔ بے شک ابھی وہ حالات اور زندگی کے مشکل دور کو ثابت قدموں سے چلنا سیکھ رہی تھی، ابھی بھی لوگوں کی باتوں سے دل دکھی ہو جاتا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی اگر اس کے والدین اسی طرح اس کے ساتھ کھڑے مان اور بھروسہ دیتے رہے تو وہ یقیناً "ایک دن لوگوں کی باتوں پر دکھی اور شرمندہ ہونا بھی چھوڑ دے گی۔

"شکریہ پاپا! اس محبت اور بھروسے کے لیے جس سے اس حادثے کا شکار ہو جانے والی بہت سی لڑکیاں محروم ہو جاتی ہیں۔ آپ نے یہ محبت اور مان دے کر ثابت کر دیا ہے کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اب مجھے یہ پروا نہیں ہے کہ فراز کیا فیصلہ لیتا ہے۔" اس نے سوچا تھا اور علی احمد کا ہاتھ پکڑ کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ علی احمد کو آج برسوں بعد وہ ویسی ہی مضبوط اور پراعتماد سی انمول لگی تھی جیسا وہ اسے بنانا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ آج انہیں اس کے چہرے کا اعتماد مصنوعی نہیں لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" وہ اس وقت یونیورسٹی آف ہونے کے بعد قریبی پارک میں بیٹھے تھے جب انمول نے بینچ کی سطح پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے سب بتا دیا تھا وہ کتنے ہی پل کسی —— بے جان مجسمے کی طرح یک ٹک بے یقین نظروں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بولا تھا۔

"ایسا ہی ہوا ہے اور یہی میرے ماضی کا وہ سیاہ باب ہے۔ جس کی وجہ سے میں تمہیں خود سے شادی کرنے سے روک رہی تھی۔ بہرحال! اب جب تم سب جان گئے ہو تو تم جو بھی فیصلہ کروگے مجھے منظور ہوگا۔" وہ سر جھکائے اپنے ہونٹوں کو کچلتے ہوئے وضاحت دے کر اس کے فیصلے کی منتظر تھی۔ کتنا مشکل ہوتا ہے نا اپنی ذات کو عیاں کر کے اپنے زخم ادھیڑ کر کسی کو دکھانا۔ وہ کتنی ہی مضبوط اور پراعتماد بننے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس لمحے فراز کی بے یقین سی نظریں اور پھیکا سا انداز دیکھ کر وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔

"پھر بات کریں گے۔" وہ اس کی بات کا یقین ہو جانے کے بعد کہ وہ مذاق نہیں کر رہی اجنبی سے

انداز میں کہتا۔ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گیا تھا۔

اس نے دل کے اجڑنے پر افسردہ نظروں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

پھر اسے اسٹاف سے پتا چلا تھا کہ فراز نے جاب چھوڑدی ہے۔ وہ اس خبر پر ذرا سا افسردہ ضرور ہوئی تھی کہ اس نے اپنا ایک اچھا دوست کھودیا' مگر دکھی نہیں تھی بلکہ اسے اچھا لگا تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق اس سے سوال جواب کیے بغیر چلا گیا ہے۔ شکوہ ہوا تھا تو صرف اللہ سے کہ اس نے فراز کو اس سے مانگا تھا اور اس (اللہ) نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ اس کے دل کو ہمیشہ یہ یقین سا رہا تھا کہ اگر کبھی اس نے اللہ سے کچھ مانگا تو وہ اسے ضرور دے گا۔

آج اسے فراز نہیں ملا تھا تو وہ اللہ سے تھوڑی خفا ہوگئی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اللہ کبھی بھی' انسان کے مانگنے پر اسے کوئی ایسی چیز نہیں دیتا۔ جس سے اسے اپنے بندے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اللہ کے ہر عمل میں انسان کے لیے کوئی نہ کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے یقین تھا فراز! تم واپس میرے پاس آجاؤ گے۔" وہ ایک ماہ بیس دن کے بعد اسے دیکھ رہی تھی اس نے اسے پارک میں بلایا تھا اور وہ بے پناہ خوشی کے حساس میں گھری ہوئی چلی آئی تھی اور اب مخصوص بینچ پر بیٹھی — مان بھرے لہجے میں بول رہی تھی۔

"میں تمہارا ماضی جاننے کے بعد بھی تمہیں بھول نہیں پا رہا انمول! یہ اس بات کی دلیل ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" اس کی ماضی والی بات پر اس کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

"مگر تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ میری فیملی کا کتنا اونچا نام ہے۔ لوگ ہمارے خاندان کی بہت عزت کرتے ہیں اب اگر میں تم سے شادی کروں گا تو لوگ میری فیملی کی طرف انگلیاں اٹھائیں گے کہ میں نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کیوں کی۔" وہ بول رہا تھا اور وہ حیران ہو رہی تھی کہ وہ اسے یہ سب کیوں سنا رہا ہے۔ اس نے تو اسے شادی کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ تب ہی وہ اسے خاموش ہوتا دیکھ کر بولی تھی۔

"میں نے اس حادثے کے بعد لوگوں سے توقعات رکھنی چھوڑدی ہیں۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرسکتے کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"

وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے وعدوں کے برعکس اسے چھوڑنے پر شرمندہ ہے اور شاید اپنے ضمیر کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے معافی مانگنے آیا ہے۔

"مگر تم چاہو! تو ہم اپنے درمیان کی دوری ختم کرسکتے ہیں۔" وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

"کیسے؟" انمول کچھ حیران سی ہو رہی تھی۔ اسے آج اس کی آنکھیں بڑی عجیب اور پراسرار سی لگ رہی تھیں۔ وہ محبت جو ان آنکھوں میں اس کے لیے ہوتی تھی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

"ہم دونوں جب ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے ہیں تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم دونوں ایک رات کے لیے ایک ہوجائیں۔ جہاں ہم اور ہماری محبت ہو۔"

وہ بہت چالاک نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے آمادہ کرنے کی کوشش کررہا تھا اور وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر دم بخود بیٹھی بے یقینی دکھ' رنج سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کسی نے اسے بہت اونچے پہاڑ سے اٹھا کر نیچے پٹخ دیا ہے اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس سے محبت کا دعوے دار اس سے اس کا جسم مانگ رہا تھا اور وہ کسی ہوس کے پجاری کو محبت کا دیوتا سمجھے بیٹھی تھی۔

"میرے جیسی دولت مند آسامی کو دیکھ کر تو شاید کوئی شریف لڑکی بھی اتنا نہ سوچے جتنا تم سوچ رہی ہو۔ اگر چاہو تو میں تمہیں بے منٹ کردوں گا۔" وہ

اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ (گویا وہ شریف نہیں تھی)

مگر اب انمول کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ مزید سنتا اس کے بس میں کہاں رہا تھا۔ تب ہی اس بت میں جان پڑی تھی اور "شٹ اپ!" کی آواز کے ساتھ اس کا ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ!" زندگی میں شاید ہی کبھی اتنے زور سے چیختے ہوئے اس نے کسی سے بات کی ہو پارک تقریباً" خالی تھا۔ ورنہ ضرور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے۔

"میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں جس کی تم بولی لگانے آئے ہو جن لڑکیوں کے ساتھ یہ حادثہ ہوجاتا ہے وہ بھی اتنی ہی شریف اور باکردار ہوتی ہیں جتنی کوئی بھی گھر میں بیٹھی دوسری شریف لڑکی۔ کیونکہ ان کے ساتھ ہونے والے گناہ میں نہ ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے اور نہ جرم ہوتا ہے۔

میں نے تمہیں اپنا دوست' خود سے محبت کرنے کا دعوے دار سمجھ کر اپنے ماضی کا وہ بھیانک باب کھول کر دکھایا تاکہ بعد میں تم مجھے دھوکے باز نہ کہہ سکو اور تم نے کیسے میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے مجھے شرافت اور کردار کے معیار سے ہی باہر کردیا۔ اچھی دوستی محبت نبھائی ہے تم نے فراز!" باوجود کوشش کے بھی اس کی آنکھوں اور لہجے میں نمی اتر آئی تھی۔

اس نے غیر محسوس طریقے سے اپنا رخ موڑ لیا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے آنسو دیکھے۔

"تم سے اتنی محبت کی میں نے کہ اپنے رب سے شکوے کرنے پر اتر آئی۔ مجھے لگا وہ (اللہ) مجھ سے پیار نہیں کرتا جس نے میرے بارہا مانگنے پر بھی تمہیں مجھے نہیں دیا۔ لیکن آج تمہارا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد مجھے خود اپنے آپ شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں نے ایک ایسے شخص کے لیے رب سے شکوے کیے جو کسی طور میری سچی اور پاک محبت کے قابل ہی نہیں تھا اور آج تمہارے بھیانک کردار والی اصل شکل دکھا کر اللہ نے مجھے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ مجھ سے کتنا پیار

کرتا ہے اور اسے میری کتنی پروا ہے تب ہی تو اس نے میری پاکیزہ اور صاف ستھری سوچوں سے تمہیں نکال کر دور پھینکنے کی کوشش کی ہے۔"

"پاکیزہ اور تم۔" وہ جو کتنے لمحوں سے اس کی جرأت پر گال پر ہاتھ رکھے ناگواری اور کڑے تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اب طنزاً ہنسی ہنستے ہوئے انتہائی زہرخند لہجے میں بولا تھا۔

"مت بھولو انمول علی! کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تم اپنی عزت بہت پہلے کھو چکی ہو۔ کوئی شریفوں والا حلیہ اپنا کر شریف نہیں بن جاتا۔" وہ اس کے گاؤن اور اسکارف کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے زہر اگل رہا تھا۔

"میں پاکیزہ ہوں۔"

وہ بہت مضبوط اور پرسکون سی تھی۔ "کیونکہ میں نے نہ کوئی گناہ کیا ہے اور نہ کوئی ایسا غلط کام کیا ہے جس پر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو۔ اگر کسی کے ضمیر پر بوجھ ہونا چاہیے تو وہ اس چوکیدار کے ضمیر پر جس نے ایک چھوٹی سی بچی کو اپنی ہوس کا شکار بنایا یا فراز حیات کے۔ جس نے ایک لڑکی کی سچی اور پاکیزہ محبت کا مذاق اڑایا اور اس کے کردار کی ایسی دھجیاں اڑائیں کہ اس کی روح تک گھائل ہو گئی۔ اللہ کے نزدیک ہر وہ انسان پاکیزہ ہے جس نے اپنی سوچوں کو پاکیزہ رکھا اور اپنے کردار کو مضبوط بنایا ہے اور تم ان دونوں چیزوں پر پورا نہیں اترتے۔ وہ لڑکی بہت بدنصیب ہو گی جو تمہاری بیوی بنے گی۔ شکر اللہ نے مجھے بدنصیب ہونے سے بچا لیا۔"

وہ بولتے بولتے جیسے تھک سی گئی تھی۔ اتنا بولنا اس کی عادت کہاں تھی اس کے لہجے میں کیسا سکون کیسا ٹھہراؤ تھا کہ فراز صرف دیکھ کر رہ گیا۔

"زندگی میں موقع ملے تو ضرور سوچنا! شرافت اور کردار کے معیار پر کون پورا اترتا ہے میں یا پھر تم۔" وہ کہنے کے ساتھ رکی نہیں تھی بلکہ اپنا بیگ اور فائل اٹھا کر بڑے مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی اور وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ بے حس و حرکت گم سم کھڑا تھا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی گاڑی تک ہی چلا جائے۔ انمول کے دکھائے جانے والے حقیقت کے آئینے میں اسے اپنی شکل بہت بھیانک لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

عالیہ پھوپھو کتنے عرصے بعد ان کے ہاں آئی تھیں۔ لندن رہنے کی وجہ سے وہ بہت کم آتی تھیں مگر ان کے بھیجے ہوئے کارڈ اور گفٹ اسے ملتے رہتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ پھوپھو اس سے بہت پیار کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ ان کے آنے کا بے تابی سے انتظار کرتی تھی۔ ابھی بھی وہ ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کے لائے ہوئے گفٹ کھول رہی تھی۔ پرفیوم، جوتے، جیولری وہ ایک ایک چیز کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ علی احمد اور آمنہ بیگم کچھ دور صوفوں پر بیٹھے عالیہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کے پراعتماد اور پرسکون سے چہرے کو دیکھ رہے تھے اس کے چہرے اور آنکھوں میں آج ایک الگ ہی رنگ اور چمک تھی شاید وہ صبر شکر کے ساتھ اللہ پر مکمل بھروسا کرنا سیکھ گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے اور وہ اپنے بندوں کو ان کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا۔

"بھائی صاحب، بھابھی! آپ انمول کو میری بہو بنا دیں۔" عالیہ نے انہیں انمول کو دیکھتا پا کر بہت محبت و اپنائیت سے کہا تھا۔

"دیکھیں بھائی صاحب! انکار مت کیجیے گا، میں اتنی دور سے صرف انمول کو آپ سے مانگنے کے لیے آئی ہوں۔" وہ ان کے چونکنے پر نا جانے کیا سمجھی تھیں کہ جلدی سے اپنے آنے کی وضاحت دینے لگیں۔

"عالیہ کیا تم واقعی انمول کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہو۔" آمنہ بیگم پر تو ان کی بات سن کر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی تب ہی ان کی بات کا مطلب سمجھ کر بھی وہ ان سے تصدیق چاہ رہی تھیں۔

"ہاں بھابھی میں انمول کو اپنے احمر کے لیے مانگنے آئی ہوں جب انمول پیدا ہوئی تھی اس کی موہنی سی صورت دیکھ کر ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے اپنے احمر کی بہو بناؤں گی مگر بعد میں اس کی ساتھ ہونے والے حادثے پر میں غیر ارادی طور پر اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹ گئی تھی کہ شاید انمول کے ساتھ شادی پر احمر یا اس کے پپا کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ مگر اب جب احمر نے ہی انمول کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ انمول میری بہو بنے اور احمر نے اپنے پپا کے اعتراض کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اسے فرق نہیں پڑتا کہ ماضی میں انمول کے ساتھ کیا ہوا۔ اسے تو سارے خاندان کی لڑکیوں میں انمول ہی معصوم اور سمجھ دار لگی ہے۔ جب یہی بات میں نے آسیہ بھابھی کو بتائی تو وہ خاموش سی ہو گئیں شاید صوفیہ کی طلاق کی وجہ سے خاموش اور افسردہ تھیں۔"

عالیہ خوشی خوشی انہیں ایک ایک بات تفصیل سے بتا رہی تھیں اور علی احمد کو یاد آیا تھا کہ بھابھی کیسے اپنی ماہ نور کے لیے احمر کا سپنا سجائے بیٹھی تھیں ابھی کل ہی تو کسی جاننے والے نے انہیں بتایا تھا کہ بھابھی کی بڑی بیٹی صوفیہ کے شوہر نے کسی عورت کے چکر میں اسے طلاق دے کر بھابھی بیگم کے گھر بھیج دیا تھا۔

علی احمد کو لگا بھابھی بیگم کے ساتھ جو ہوا وہ ان کے بڑے بولوں اور مغرور و نخوت بھرے لہجے کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ غرور کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ان کی بیٹی نے اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھ کر صبر و شکر کا دامن تھامے رکھا تھا تب ہی تو وہ پھر سے نواز دی گئی تھی اور انعام کی صورت میں اسے احمر جیسا کھلے اور صاف ذہن کا محبت کرنے والا ہم سفر مل رہا تھا۔ وہ اس پر جتنا بھی شکر کرتے کم تھا۔

"بھائی صاحب انمول میری ہے نا؟" عالیہ انہیں سوچوں میں گم دیکھ کر آس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد نے دھیرے سے اثبات سے سر ہلا دیا تھا اور دل ہی دل میں اس بات پر شرمندہ ہوئے جو اس کی رحمت سے اس بات پر مایوس ہوئے تھے کہ شاید اس حادثے کے بعد ان کی بیٹی کی شادی نہیں ہو گی اور اسے ساری عمر تنہا رہنا پڑے گا جبکہ اللہ کو اسی لیے تو مہربان رحم کرنے والا کہا گیا ہے کیونکہ وہ ہر دکھ کے بعد سکھ کا موسم ضرور لاتا ہے۔ بس اللہ پر یقین اور بھروسا ہونا چاہیے۔

حادثے زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ خوب صورت بھی ہو سکتے ہیں اور بدصورت بھی، وہ سزا بھی ہو سکتے ہیں آزمائش بھی۔ کسی بھیانک حادثے کو انسان کا گناہ سمجھ کر اس انسان سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ حادثوں میں انسان کا کوئی ذاتی عمل دخل نہیں ہوتا۔ وہ سراسر اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور حادثہ کسی انسان کے لیے جزا ٹھہرا اور کسی انسان کے لیے سزا۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس نے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو جج کریں کہ وہ گناہ گار ہے یا بے گناہ۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو نفرت کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پائیں گے جبکہ اللہ نے انسان محبت کرنے کے لیے بنائے ہیں اس لیے ہمیں محبت کرنی چاہیے نفرت نہیں۔

☼ ☼

ناولٹ

فرح بخاری

اتوار کے دن کام کرنے والا آدمی صرف آرام ہی کرنا چاہتا ہے لیکن یہ میری اماں اور اکلوتی آپا راضیہ میرے آرام کی ازلی دشمن کہاں چین لینے دیتی ہیں۔ جانتی ہیں کہ میں ان کی محبت کا مارا کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں اس لیے جذباتی بلیک میلنگ کا شکار بھی نتیجتاً" مجھے ہی ہونا پڑتا ہے۔ خیر ان کی شکایتیں اس وقت میرا ٹاپک نہیں ہے۔۔۔ بات ہو رہی ہے مظلوم زین العابدین یعنی مجھ خاکسار کی' جو اس وقت نومبر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مارننگ میں آٹھ بجے سیٹھ عثمان سے ملنے جا رہا ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ ابا مرحوم نے کسی زمانہ میں شہر سے دور ایک زمین خریدی تھی' جس پر اس وقت انہیں اماں سے خوب کھری کھوٹی سننا پڑی تھیں۔ لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ جہاں شہر پھیل کر کئی ویرانوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے وہیں ہمارا کھوٹا سکہ بھی اب چل نکلا۔ پچھلے دنوں سننے میں آیا کہ ہماری زمین کے ساتھ والا رقبہ اب رہائشی کالونی میں تبدیل ہونے والا ہے۔ وہ زمین سیٹھ عثمان کی تھی اور وہی وہاں ایک رہائشی منصوبہ شروع کروا رہے تھے مجھے اپنے آفس کے دوست نے یہ بات بتائی اور مشورہ دیا کہ اپنی زمین بھی سیٹھ عثمان کو بیچ دوں کیونکہ ان کا منصوبہ کافی بڑا ہے اور یہ زمین لازمی ان کے لیے کار آمد ثابت ہو گی اور مجھے بھی بدلے میں اچھے دام مل جائیں گے۔

جب یہ بات اماں اور آپا کو پتا چلی تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس وقت جا کر زمین بیچ دوں اور پیسے لے آؤں۔ خیر تو سیٹھ صاحب سے مل کر یہ طے پایا تھا کہ سنڈے کو وہ جگہ دیکھ کر کوئی فیصلہ کریں گے اور اب اسی چکر میں' مجھے صبح سویرے زمینوں پر دھکا دے کر بھیجا جا رہا تھا۔

سیٹھ صاحب کی باتوں اور انداز سے صاف جھلک رہا تھا کہ زمین ان کو بہت اچھی لگی لیکن مجھ سے سرسری لہجہ اپناتے ہوئے اتنا کہا کہ میں زمین کے کاغذات ان کے وکیل کو دکھا دوں۔ قیمت تو وہ ویسے ہی کافی معقول بتا رہے تھے اور کاغذات کی طرف سے بھی مجھے تسلی تھی کیونکہ پیپرز سب لیگل اور درست تھے' یعنی ایک طرح سے یہ معاملہ اب تقریباً" حل ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے سر سے ایک بوجھ اترتا محسوس کیا۔ اور کافی ہلکے پھلکے خوشگوار موڈ میں واپسی کا سفر شروع کیا۔

روڈ پر رش زیادہ ہونے کی وجہ سے میں نے بائیک دائیں موڑ کر چرچ والا روڈ لے لیا۔ اس روڈ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر رہتی تھی۔ کچھ دور آ کر میں نے بائیک سائیڈ پہ روکی اور نیچے اتر آیا۔ ایک گہرا سرد سانس لیتے ہوئے میں نے چشمہ اتارا۔ سامنے کھیت کے بیچوں بیچ پرانا چرچ نظر کے سامنے تھا اور دماغ کی اسکرین پر ایک اور منظر۔۔۔ جس میں وہ تھی' دس سال پہلے یہیں اسی جگہ میرے ساتھ بائیک پر۔۔۔

"زین' ابھی ابھی کچھ بہت پیارا سا کہو۔۔۔" جبین نے کان کے قریب اونچی آواز میں آرڈر دیا۔

"خیریت؟ یہ ابھی ابھی پہ اتنا زور کیوں۔۔۔ ابھی تو

گھر کافی دور ہے۔" میں نے خواہ مخواہ کی تشویش ظاہر کی

"ارے بدھو۔۔۔

مجھے یہ روڈ اور یہ چرچ بہت بہت پسند ہے۔۔۔ پتا نہیں پھر کبھی یہاں سے اکٹھے گزرنا ہو گا بھی یا نہیں ۔ یہ تو قسمت کی بات ہے کہ کل کون کہاں ہو گا' برسوں بعد کبھی یہاں سے گزری تو تمہاری بات یاد کر کے خوش ہو جاؤں گی۔" اس نے سہولت سے اپنا بے تکا مقصد بیان کیا اور میں حکم کی تعمیل میں واقعی کچھ اچھا سا سوچنے لگا کہ عین اسی وقت ذیلی سڑک سے ایک کار پوری رفتار سے ایسے نکلی کہ ہماری بائیک باقاعدہ جھٹکا کھا گئی۔ میں نے بمشکل بائیک سنبھال کر بریک لگائے۔ جبین نے مضبوطی سے مجھے تھام لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے دوبارہ بائیک اسٹارٹ کی۔

"چلو اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں برسوں بعد یہاں سے گزرنا تو سوچنا کہ ایکسیڈنٹ سے بال بال بچے تھے۔" میں نے مزے سے ٹالا۔

"جاؤ کنجوس۔۔۔ تم سے پیاری بات کی ویسے بھی کہاں امید تھی۔" اس نے منہ بسورا تھا۔

میں نے ایک زوردار آہ کھینچتے ہوئے آس پاس دیکھا۔ "پتا نہیں تم دوبارہ کبھی یہاں سے گزری بھی ہو یا نہیں اور پتا نہیں مجھے یاد بھی کیا ہو گا یا۔۔۔" بس یہی وہ نقطہ تھا جہاں آکر میری سہانی یادوں میں درد کا کانٹا چبھ جاتا اور میں اپنے آپ سے بھی دور بھاگنے لگتا تھا۔

"میں زین العابدین۔۔۔ چھتیس سالہ خوش شکل، غیر شادی شدہ، تیس ہزار ماہانہ کمانے والا ایک ذمہ دار آدمی ہوں، جو اپنی فیملی، دوستوں اور سوسائٹی میں نہایت معقول اور نارمل انسان سمجھا جاتا ہے۔۔۔ اور اس میں واقعی کوئی شک نہیں کہ میں نے ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کو اپنی ذاتی پسند ناپسند پہ مقدم سمجھا ہے۔۔۔ لیکن ایک حقیقت پسند اور عملی سوچ رکھنے والے شخص کے بارے میں کوئی ہرگز یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اندرونی طور پر وہ اتنا جذباتی بھی ہو سکتا ہے، بلکہ مجھے خود بڑی دیر سے یہ ادراک ہوا کہ محبت میری زندگی میں سانس لینے جتنی اہم ہے اور جب یہ ادراک ہوا تب پہلی بار مجھے اپنے دل سے خوف محسوس ہوا کیونکہ تب تک سیمین میری زندگی سے جا چکی تھی اور میں نے اکیلے اس احساس کے ساتھ زندگی گزارنی تھی کہ آخری سانس تک اس درد سے نجات ممکن نہیں ہے۔۔۔ اس سے پہلے میں یہی سمجھتا تھا کہ جب تک آپ اور آپ کا محبوب محبت کے دائرے میں رہتے ہیں زندگی کو بھرپور انداز میں جیتے ہیں لیکن جونہی کوئی ایک کسی وجہ سے اس دائرے سے باہر نکلتا ہے دوسرا اپنے ماحول میں واپس لوٹ آتا ہے۔

ایسی مضحکہ خیز لوجیک پر میں اس لیے یقین کرتا تھا کیونکہ دوبار خود مجھی پر یہ صادق آچکی تھی، لیکن سیمین مجھے محبت کے جس دائرے میں قید کر گئی تھی اس میں رہتے آٹھ سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا اور اس بیچ نہ تو اسے دیکھا تھا نہ ہی کوئی رابطہ ہوا تھا۔۔۔ اسی لیے میں خود کو کسی حد تک عجیب سمجھتا ہوں، خوشی ہو اداسی یا کوئی پریشانی میں آج بھی دل ہی دل میں سب سے پہلے ہر بات سیمین سے شیئر کرتا ہوں۔۔۔ ہر لمحہ کسی نہ کسی حوالے سے وہ میرے قریب ہوتی ہے۔ شاید یہ اس محبت کا جواب ہے جو سیمین نے مجھ سے کی تھی، نہ صرف محبت بلکہ حد سے زیادہ کیئر اور توجہ جو مجھے سیمین سے ملی تھی، میں اس کے صلہ میں تب تو شاید اسے کچھ نہیں دے پایا تھا لیکن آج جبکہ وہ میرے ساتھ نہیں ہے تو روگ بن کر میرے پورے وجود میں سرائیت کر چکی ہے۔۔۔ میں کبھی اس کے پیار میں مجنوں نہیں تھا۔ محبت ضرور تھی اور بہت زیادہ تھی لیکن اس وقت شاید میں سیمین کی محبت کو بھی ثانیہ اور رباب کے تعلق جیسا عارضی تصور کر رہا تھا۔

ثانیہ میری ٹین ایج کی محبت تھی ان دنوں سوائے ثانیہ کے چہرے کے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا، پھر وہ بھی میرے جذبات سے آگاہ ہو گئی اور اس کی طرف سے بھی اچھا رسپانس ملنے لگا، میری اچھی صورت نے رسپانس کے معاملہ میں مجھے کبھی نامراد نہیں ہونے دیا تھا۔

کچھ دنوں تک تو سب کچھ ٹھیک ہی چلا لیکن محبت کے اس طوفان میں طغیانی اس وقت آئی جب ثانیہ نے کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ میں تو دنوں رانجھا بنا ناکام محبت کی دہائی دیتا رہا لیکن انجام کار طوفان نے بمع طغیانی اپنا رخ موڑ لیا۔ روز نئے نئے چہرے پسند آنے لگے پر معاملہ کہیں جم نہ سکا۔ پھر رباب میری زندگی میں آئی، رباب کو میں نے ایک عزیز کی شادی میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے پوری پوری توجہ دے رہی تھی۔ میں بھی لاابالی مست سا نوجوان تھا اس کے رسپانس کا مثبت جواب دینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ اس نے مجھے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ہم موقع ملنے پر گھنٹوں باتیں کرتے۔ دو چار مرتبہ باہر گھومنے بھی گئے، آپس میں گفٹس کا تبادلہ بھی ہوا لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا مجھے اس سے بات کرنا ڈیوٹی جیسا لگنے لگا، روٹین کے حال احوال کے بعد میرے پاس بولنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہوتا تھا۔ کچھ وہ بھی اکتائی اکتائی اور غائب دماغ سی لگتی۔۔۔ جیسے دلچسپی کا محور تبدیل ہو چکا

ہو۔ لیکن میں نے کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ شک کرنا اور پیچھے پڑنا میرے مزاج میں شامل نہیں تھا، بس دل ایک دم اچاٹ ہو گیا تھا۔ خود کو ڈھیر ساری لعنت ملامت بھی کی کہ افیئر چلانے سے پہلے کچھ دیر کے لیے سوچ لیتا۔ بہرحال رباب سے تعلق کم کرتے کرتے بالآخر بالکل دوری اختیار کر لی اور خود کو سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف مائل کرتے ہوئے رباب سے کوئی تعلق نہ رکھنے کا سچا تہیہ کر لیا اور "تہیہ" اس لیے سچا تھا کیونکہ محبت سچی نہیں تھی، ورنہ محبت کی کھینچی لکیر کے پار جانا کتنا کٹھن ہوتا ہے اس کا صحیح ادراک سیمین کی جدائی کے دوران ہوا تھا بلکہ ہو رہا تھا۔

چار سالہ تعلق میں کبھی مجھے اس کی محبت میں کمی ہوتی نظر نہیں آئی تھی، جہاں تک مجھ جیسے غیر مستقل مزاج انسان کا تعلق تھا تو شاید میری ناقص عقل کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہی اللہ پاک نے سیمین کو میری زندگی میں بھیجا تھا کیونکہ واحد وہی تھی جس سے نہ کبھی میرا دل اچاٹ ہوا نہ دور بھاگنے کا خیال آیا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اس کی عادت سی پڑتی جا رہی تھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ محبوبہ کم اور دوست زیادہ تھی۔ مشکل میں سہارا بننے والی مہربان اور مخلص ساتھی۔۔۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے درمیان شادی کا موضوع کبھی نہیں آیا۔ سیمین کو شاید اس کی انا اجازت نہیں دیتی تھی کہ لڑکی ہوتے ہوئے وہ ایسی بات کرنے میں پہل کرے جبکہ مجھے اپنا بھروسا کم تھا۔ حالانکہ مجھے سیمین سے زیادہ آئیڈیل بیوی نہیں مل سکتی تھی لیکن ہر بار ہی کچھ کہتے کہتے زبان رک جاتی۔

اس روز ہم شہر کے ایک مضافاتی روڈ پر گھومنے نکلے تھے اور اسی وقت سڑک سے کافی نیچے اتر کر درختوں کے درمیان ساتھ ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جب اچانک ہی بنا سوچے میں نے پوچھ لیا۔

مجھ سے شادی کرو گی۔۔۔؟

"نہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"جس سے محبت ہو اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے، خوامخواہ محبت کا سارا چارم خراب ہو جاتا ہے اور تم کیا چاہتے ہو آج جو میں اور تم پھولوں، ہواؤں اور گیتوں کی باتیں کرتے ہیں، کل شادی ہونے پر آٹے دال کے بھاؤ پر لڑائی کریں۔" اس نے بے فکری سے کہتے ہوئے نہر کے پانی کو پیروں سے اچھالا اور میں جو اب اٹھ کھڑا ہوا تھا خاموشی سے درخت کے تنے کو ہلا کر اس پہ سوکھے پتے گرانے لگا۔

"یہ دیکھو تمہارے جوتے پر تو کیچڑ لگی ہے۔" اس نے میری سنجیدگی دیکھ کر بات بدلی اور باقاعدہ میرے جوتے اتار کر نہر کے پانی سے دھونے لگی۔

"ارے کیا کر رہی ہو۔" میں بوکھلا ہی گیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنا جوتا دیکھنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا، لیکن وہ تو وہ تھی۔۔۔ خوب اچھی طرح مل مل کر نہ صرف جوتا دھویا بلکہ ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر کر میرے پیر بھی دھو دیے تو میں ہنستے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"بیویوں کی طرح میرے چاؤ بھی اٹھا رہی ہو اور شادی سے بھی انکاری ہو۔"

"ہاں وہ تو ہوں کیونکہ تمہاری آنکھوں میں بے اعتباری ہے، لیکن خیر دعا کروں گی تمہیں بہت اچھی بیوی ملے۔۔۔ مجھ سے بھی اچھی تمہارے سب کام کرے اور تم مجھے بھی بھول جاؤ۔۔۔"

"آدھی دعا ضرور اچھی ہے۔۔۔ لیکن پوری دعا مت مانگنا کیونکہ تمہیں کبھی بھلا نہیں سکتا؟" میں نے پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں قہقہہ لگایا۔

"دس سال بعد یہ باتیں کہو گے تب مانوں گی۔ پیار تو ہر ایک کو کسی نہ کسی سے ہو جاتا ہے زین جی۔۔۔ اب کون سا سچا والا ہے اسے پرکھنے کے لیے کچھ مدت تو چاہیے ہی؟" اس نے معنی خیزی سے شاید ثانیہ اور رباب سے میرے عارضی تعلق کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں ہنس پڑا اور جواب بھی اسی کے انداز میں معنی خیزی سے دیا۔

"کسی سیانے سے سنا تھا کہ محبت بار بار ہو جاتی ہے

کیونکہ محبت کا جنون ہوتا ہے جو سوار بھی ہوتا ہے اور اتر بھی جاتا ہے لیکن عشق صرف ایک بار ہوتا ہے کیونکہ عشق کا درد ہوتا ہے جو کبھی کم کبھی زیادہ تو ہوتا ہے لیکن جاتا نہیں ہے۔ویسے کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟؟"

میرا اشارہ شادی نہ کرنے والی بات کی طرف تھا وہ بھی سمجھ گئی تھی اس لیے شرما کر صرف نفی میں سرہلا دیا۔ مجھے اپنے سوال کا جواب پہلی بار میں ہی مل گیا تھا۔

"لیکن آج تو دس بھی نہیں پورے بارہ سال ہو گئے ہیں جبین جی۔۔۔ (بارہ سالوں میں سے چار وہ جو ہم نے ایک ساتھ گزارے اور باقی آٹھ سال جدائی کے ۔۔۔) میرا پیار تو تمہاری دی ہوئی مدت بھی کراس کر چکا ۔۔۔ بھول تو تم گئیں مجھے۔۔۔ اتنی گنجائش بھی نہیں چھوڑی کہ اپنے پیار کی سچائی کے بارے میں ہی بتا سکوں میں نے ایک آہ بھر کر جبیں سے نظر ہٹائی۔

☆ ☆ ☆

اماں اور آپا رات سے ہی بچوں کو لے کر خالہ کے ہاں گئے ہوئے تھے۔۔۔ اگرچہ اتوار کا دن تھا لیکن خلاف توقع میری آنکھ جلدی کھل گئی موسم بہت ہی خوشگوار ہو رہا تھا۔ موڈ ایک دم فریش ہو گیا۔ چائے بنانے کچن میں آیا لیکن اچانک ایک خیال کے آتے ہی ہاتھ روک لیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کچن چھوڑا اور الماری کھول کر ایک پریس شدہ ڈریس نکالا اور دس منٹ میں تیار ہو کر گھر بند کیا اور سیدھا دریا کا رخ کیا۔ ایک تو موسم خوشگوار اوپر سے صبح کا وقت۔۔۔ دریا کا نظارہ بے حد خوب صورت لگا۔

سردیوں کی آمد آمد تھی' اس لیے دریا کی سائیڈ پہ رش بالکل نہیں تھا ورنہ ہمارے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی یہ واحد تفریح گاہ تقریباً" سارا سال ہی پر ہجوم رہتی تھی۔ دریا کے کنارے درختوں کے سائے تلے چھوٹے چھوٹے چائے کے ہوٹل تھے۔ سبزے پر ہی کرسیاں اور میزیں رکھ کر سادہ سے ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک پر سکون گوشے کا انتخاب کیا اور چائے کا آرڈر دیا۔ دریا کا چوڑا پاٹ نظر کے سامنے تھا۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے تصور میں اس وقت بھی وہ بسی تھی جو میری زندگی کا سب سے حسین باب' سب سے قیمتی تحفہ تھی۔۔۔ رباب اور تانیہ کے تو خیال سے ہی اپنے آپ میں ندامت محسوس ہوتی تھی۔ جن راستوں پہ جبین کے ساتھ حسین سفر کیے وہاں سے کبھی تانیہ اور رباب کے ساتھ بھی گزرا ہوں گا لیکن آج ان راہوں سے صرف جبین کی مہک آتی ہے' کبھی بھولے سے بھی وہ چہرے دوبارہ یاد نہیں آئے جو کبھی آنکھ کا چین' دل کا قرار ہوا کرتے تھے۔۔۔ کبھی کبھی لگتا اگر چوبیس گھنٹے جبین کا تصور میرے ساتھ نہ ہوتا تو زندگی کتنی بے کیف اور پھیکی ہوتی۔

میرے لیے سب سے خوب صورت لمحہ وہ ہوتا ہے جب اس کی یاد سے وابستہ کوئی چیز میرے سامنے آجاتی ہے۔ جیسے کوئی جگہ' کوئی گانا' کوئی جملہ یا کوئی چیز وغیرہ۔۔۔ اور ایسا اکثر ہی ہو جاتا ہے' کیونکہ چار سالہ تعلق میں ہم نے زندگی کو بھرپور انداز میں جیا تھا۔۔۔ شہر کا کون سا کونا تھا جہاں ہمارے قدم نہیں پڑے تھے۔ اکثر صرف اسی کو یاد کرنے کی خاطر میں ان جگہوں پہ جاتا تھا۔ کانوں میں اس کی سرگوشیاں سنائی دیتیں تو کیونکہ اس کا کہا ایک ایک جملہ کسی صحیفے کی طرح یاد تھا۔

جبین سے میری پہلی ملاقات یہیں دریا پر ہی ہوئی تھی۔ بارہ سال پہلے اٹھائیس جولائی کی وہ گرم سہ پہر مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس وقت میری عمر چوبیس سال تھی یونیورسٹی سے فارغ ہوئے کچھ ہی ٹائم گزرا تھا ہم دوستوں کی ہر شام دریا کنارے گزرا کرتی تھی۔۔۔

اس روز میں وقت سے ذرا پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ میرے دوست ثاقب اور کامران بھی بس وہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے سڑک کنارے ان کا انتظار کرنے کا ارادہ کیا اور بائیک روڈ کی سائیڈ پر لگادی۔ خود اس پہ ترچھا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

اس وقت دریا پر کافی رش تھا میں آنے جانے والوں کو دیکھ کر وقت گزار رہا تھا۔ اسی وقت ایک سفید گاڑی بالکل میرے قریب آکر رکی اور اس میں سے چار' پانچ خواتین اور لڑکیاں نیچے آئیں۔ وہ سب روڈ سے اتر کر دریا کنارے بنے فیملی کیبن کی طرف بڑھ گئیں۔ میرا سارا دھیان لڑکیوں کی طرف تھا۔

ہنستی کھلکھلاتی وہ سب باری باری کیبن میں داخل ہونے لگیں۔ سب سے آخر میں سفید چادر میں ایک لڑکی تھی۔۔۔ تین سیڑھیاں اتر کر وہ ذرا دیر کو رکی اور پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر ہلکا سا ہاتھ ہلایا۔

میں تو بری طرح گڑبڑا گیا۔ گھبرا کر تھوک نگلا اور سوچنے لگا کہ کیا میں اس کو جانتا ہوں۔ لیکن کچھ سمجھ نہیں آیا۔ دیکھنے میں تو اچھی پڑھی لکھی فیملی لگ رہی تھی۔ کوئی ایسا ویسا گمان کرنے کو بھی دل نہیں مانا۔ اسی وقت اپنے پیچھے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جس گاڑی سے وہ سب اتری تھیں وہ اس وقت بالکل میرے پیچھے سے گزر رہی تھی اور ایک پانچ چھ سال کا بچہ ابھی تک سر باہر نکالے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

اوہ۔۔۔ میری جھینپی جھینپی ہنسی نکل گئی تو وہ لڑکی مجھے نہیں اس بچے کو ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا دونوں بے ہودہ لڑکوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے لیے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔ بائیک سے اتر کر کچھ دیر وہیں چہل قدمی کی۔ بیس پچیس منٹ بعد وہ عورتیں کیبن سے باہر آنے لگیں میں دوبارہ بائیک پہ ٹک کر ان کو دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی اب بھی سب سے آخر میں نکلی تھی اور نکلتے ہی سب سے پہلے میری طرف دیکھا اس کی نظروں میں گھبراہٹ صاف جھلک رہی تھی۔ وہ شاید اس وقت سمجھ گئی تھی کہ اس کے ہاتھ ہلانے کا میں نے غلط مطلب نکالا تھا۔

اس لیے میرے چہرے سے کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی' میں اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا تو وہ اور بھی پریشان نظر آنے لگی اور جھٹ اس نے اپنا آدھا چہرہ چادر میں چھپا لیا تھا'

گوری رنگت اور پنک گالوں والی اس پیاری لڑکی کی آنکھیں اور بھنویں گہری سیاہ تھیں' جس کی وجہ سے اس کا چہرہ نہایت پر کشش ہو گیا تھا۔ گلابی ہونٹ بچوں جیسی ناراضی کا تاثر دیتے تھے۔

میرے دل نے جھٹ سے سو بٹا سو (100/100) نمبر دے دیے۔ وہ سب عورتیں اب پیدل ہی دائیں طرف کو چل پڑی تھیں' یقیناً" اب ان کا رخ نزدیکی پارک کی طرف تھا میں نے آرام سے ان کو دور تک جاتے دیکھا اور کچھ سوچ کر بائیک اسٹارٹ کی۔ اس لڑکی کو مزید پریشان کرنے کا خیال دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ میں نے بائیک پارک کے باہر روک کر اپنے لیے آئس کریم لی۔ پارک روڈ سے کافی نیچے تھا اور اس کی دیوار بھی چھوٹی تھی اس لیے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔۔۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور خاصی ٹینشن سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔۔۔ میں ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔ بلکہ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ جب وہ لوگ پارک سے نکل کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے گاڑی کا بھی پیچھا کیا۔۔۔ میں نے اسے گھر تک چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا اس لیے ان کی گاڑی کے پیچھے پیچھے ہی رہا۔

اور یہ دیکھ کر تو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس کا گھر میرے چچا کی دکان سے چند گز آگے ایک گلی میں تھا۔ میں گلی کے سرے پر ہی رک گیا تھا وہ گاڑی سے اتر کر مجھے غصے سے دیکھتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ چچا کی دکان پر تو اکثر آنا جانا رہتا تھا لیکن اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خیر اب تو آنا جانا زیادہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے دل میں ارادہ کیا اور بائیک موڑ کر چچا کی شاپ پر آگیا۔ آنے والے دنوں میں چچا کی دکان کے چھ چکر کاٹے لیکن ایک ہی کامیاب رہا جب وہ کسی خاتون کے ساتھ شاپ کے سامنے سے گزری اور مجھے دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔۔۔ اس دن وہ مجھے دیکھ کر کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب نظر آئی۔

مجھے دل ہی دل میں ترس بھی آیا کہ وہ مجھے ایک فلرٹ اور غنڈہ ٹائپ لڑکا سمجھتے ہوئے اپنی عزت کو

خطرے میں محسوس کررہی تھی۔ لیکن میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ میرے سگے چچا کی دکان ہے جہاں میرا اکثر آنا جانا رہتا ہے۔ اگر ایک بار بھی اور اس نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو جانے اس کا کیا حال ہوگا۔ اس دن میں خود بھی سنجیدگی سے اپنے مذاق کے بارے میں سوچنے لگا' دل میں پشیمانی بھی ہوئی اور اپنے برے امیج کا لیبل ہٹانے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ لیکن کیسے؟ اسی سوچ بچار میں دو ہفتے چچا کی دکان کا رخ نہیں کیا لیکن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر چچا کے بیٹے وسیم کا فون آگیا ہر سال کی طرح وہ لوگ دھوم دھام سے میلاد منا رہے تھے۔ ان کے ہاں اس دن دیگیں پکتیں اور غریبوں اور جاننے والوں میں بانٹی جاتی تھیں۔ میں ہمیشہ ان کا ہاتھ بٹانے جاتا تھا۔ اس دن بھی صبح سویرے دکان پر آگیا۔ میلاد گھر میں پڑھوالیا گیا تھا۔ کچھ دیگیں معمول کے مطابق دکان پر بھیجی گئیں ہم نے آس پاس کی دکانوں پہ پلاؤ کی ڈشز بانٹنا شروع کردیں۔ مجھے جانے کیا ہوا' چپکے سے ایک ڈش بھر کر ان کے دروازے پر آگیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے پیچھے سے ایک خاتون کی آواز آئی۔

"کون۔۔۔؟"

"جی میں وسیم لوگوں کی شاپ سے آیا ہوں۔ وہ المدینہ والے ہیں ناوہ۔۔۔ آج عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو۔۔۔ انہوں نے یہ بھیجا ہے۔" میں نے الٹے سیدھے لفظوں میں کسی طرح اپنی آمد کا مدعا بیان کیا اور ڈش آگے کردی جسے ہاتھ بڑھا کر لے لیا گیا اور مجھے رکنے کا بھی کہا گیا شاید برتن واپس کرنے کے لیے ۔۔۔ کچھ دیر بعد ایک ہاتھ بمع ڈش کے باہر آیا لیکن یہ وہ ہاتھ نہیں تھا جس نے ڈش لی تھی وہ کسی بڑی عمر کی خاتون کا ہاتھ تھا اور یہ نازک سفید ہاتھ تو۔۔۔ سوچ کر ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں نے جان بوجھ کر ڈش واپس نہیں لی اور خاموش بھی رہا تو کچھ دیر بعد دوپٹے میں آدھا چھپایا اس کا چہرہ دروازے کی اوٹ سے باہر نکلا مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی آنکھیں پھیلیں۔۔۔

کچھ دیر تو میں بنا پلک جھپکائے دیکھتا رہا۔ کیونکہ گہرے پنک دوپٹے سے چہرے کو ناک تک ڈھانپے وہ کوئی معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی اس نے کچھ گھورتے ہوئے اسٹائل میں ڈش کو جھٹکا تو میں نے مسکراتے ہوئے اب کی بار ڈش لے لی۔

"وسیم لوگ آپ کے کیا لگتے ہیں؟ اس نے بہت جھجک کر اور شک بھرے لہجے میں سوال کرنے کی ہمت کی۔

"جی' وسیم میرا چچا زاد ہے۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا' پہلی بار اس سے بات کرنے کا موقع مل رہا تھا دل چاہا بات کسی طرح لمبی ہو جائے لیکن وہ تو پلٹ رہی تھی۔

"سنیے۔۔۔" میں نے کافی عجلت سے آواز لگائی تو وہ مڑکر مجھے دیکھنے لگی۔

"وہ۔۔۔ مجھے آپ سے ایک بات کی وضاحت کرنی تھی۔۔۔ ایکچولی اس روز دربار پر مجھے سمجھ آگئی تھی کہ آپ مجھے نہیں بلکہ پیچھے ایک بچے کو دیکھ کر مسکرائی تھیں' لیکن میں نے پھر بھی آپ کو تنگ کیا۔ آپ میری وجہ سے اتنے دن پریشان رہیں۔ اس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔ آئی ایم سوری۔۔۔" میں نے از حد شرمندگی سے کہہ کر اس کا ری ایکشن دیکھنے کے لیے سر اٹھایا وہ کچھ دیر چپ رہی پھر بنا کچھ کہے ہولے سے سر ہلایا اور دروازہ بند کردیا۔ میں کافی مایوس سا واپس آیا۔ اس کی سنجیدگی نے مجھے اور بھی بے چین کردیا تھا۔ آنے والے دنوں میں مجھے اس بات کا اندازہ تو ہو گیا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی تھی کیونکہ اس کا آنا جانا مخصوص ٹائمنگ میں ہوتا تھا۔ میرے زیادہ آنے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے تین بار آمنا سامنا ہو ہی گیا۔ پہلی بار تو کافی شکوہ بھری ناراض نظر سے دیکھا۔ لیکن اگلی دو مرتبہ میں اس نے جس طرح نظر چرائی میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

اب اس کی نظر میں شکوے کی جگہ صرف پہچان کا عنصر ہوتا تھا اور مجھے بہت دنوں سے اسی بات کا انتظار تھا۔ لیکن اب میں نے چچا کی شاپ پر جانا کافی کم کردیا

تھا کیونکہ اسکولوں میں چھٹیاں تھیں' اس کا فون نمبر میں نے پہلے ہی ٹیلیفون ڈائریکٹری سے حاصل کرلیا تھا۔ اس تبدیلی کے بعد فون پر بات کرنے کی ہمت بھی آگئی۔ لیکن پورا ایک ہفتہ لگاتار فون ملانے کے باوجود ایک بار بھی اس کی آواز سنائی نہیں دی۔۔۔ میں نے تنگ آکر ملانا ہی چھوڑ دیا۔ ایسا لگنے لگا کہ اس معاملے کا آگے بڑھنا قسمت میں ہی نہیں لکھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس معاملے کو شعوری کوشش سے آگے بڑھنا ہی نہیں تھا بلکہ قدرت نے بنا کوشش کے موقع فراہم کرنے کا اپنا سا بندوبست کر رکھا تھا اور وہ بھی ایسی جادو اثر ملاقات۔۔۔ جس کے بارے میں' آج بھی سوچوں تو دل باغ و بہار ہونے لگتا ہے۔

شیخ صاحب کی بیٹی کی شادی تھی۔ شیخ صاحب ہمارے پڑوسی تھے۔ ایک بیٹی کے علاوہ ان کے تین بیٹے بھی تھے جن سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ شادی کے سب کاموں میں' میں نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ آج ان کے گھر میں مہندی کا زنانہ فنکشن تھا۔ میں لان میں کھانے کی ارینج منٹ تک کروا آیا تھا۔ چونکہ خواتین آنا شروع ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں اپنے گھر آگیا۔ میری امی اور آپا بھی شادی میں شرکت کے لیے شیخ صاحب کے ہاں جا چکی تھیں۔ ان کی چھت پر خوب بلند آواز میں ڈیک بج رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو اکیلا گھر بیٹھے گانے سن کر لطف اندوز ہوتا رہا پھر سوچا ذرا دروازے پر نکل کر آنے جانے والوں کا ہلا گلا دیکھا جائے۔ ہمارے گھر کی کافی لمبی ڈیوڑھی تھی جس کے دونوں سروں پر دروازے تھے ایک دروازہ اندر گھر میں کھلتا تھا اور دوسرا باہر گلی میں۔۔۔ میں گھر والے دروازے سے نکل کر ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ یہاں ہلکا اندھیرا رہتا تھا میں ٹھٹک کر رکا' ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر مجھے کوئی نظر آیا۔

"کون ہے۔۔۔؟" میں سمجھا اپنے گھر والوں میں سے کوئی واپس آرہا ہے۔ لیکن ایک گھبرائی ہوئی سی زنانہ آواز سنائی دی۔

"ج ج جی۔۔۔ میں۔۔۔"

اتنے میں میں اور قریب آیا اور دیکھنے کی کوشش کی کہ کون ہے اور جب صاف صاف سمجھ آیا تو ہوش ہی اڑ گئے۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔ میرے اپنے گھر میں۔۔۔ بالکل اکیلی۔۔۔ میری طرف گھبرائی گھبرائی نظروں سے دیکھتی ہوئی۔ بہت دیر تک نہ میں کوئی سوال کرسکا نہ ہی اس سے کچھ بولا گیا۔ شاید وہ بھی اتنی ہی حیران تھی مجھے اپنے سامنے پاکر اوپر سے ڈیک پر بجتا گانا۔

آنکھ اٹھی محبت نے انگڑائی لی
دل کا سودا ہوا چاندنی رات میں
ان کی نظروں نے کچھ ایسا جادو کیا
لٹ گئے ہم تو پہلی ملاقات میں
آنکھ اٹھی۔۔۔

میں ان خوب صورت لمحوں کو ہزاروں مرتبہ اپنے ذہن میں تازہ کرچکا ہوں لیکن آج بھی اس کے حسن میں تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔۔۔ جیسے کسی فلم کا سین اٹھا کر کوئی اصل زندگی میں رکھ دے۔۔۔ بہت دیر بعد وہ سب سوال ذہن میں آنا شروع ہوئے جو سب سے پہلے پوچھنے کے تھے۔ وہ بھی اب نظر چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"آپ یہاں۔۔۔؟"

"وہ میں۔۔۔ شادی۔" اس نے جھجک کر بولنا شروع کیا تو میں سمجھا کہ یقیناً" وہ غلطی سے ہمارے گھر میں داخل ہوئی ہے۔

"جی شادی ساتھ والے گھر میں ہے۔۔۔ یہاں نہیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" اس نے میری بات کاٹی "وہ تو مجھے بھی پتا ہے لیکن۔۔۔" کالی کالی سہمی سی آنکھیں میرے چہرے پر جمائے وہ رک گئی تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ رکشا سے اترتے وقت میری شرٹ کا دامن سائیڈ سے تھوڑا سا پھٹ گیا تھا۔ شیخ صاحب کے دروازے کے سامنے بہت رش تھا میری امی نے کہا یہاں کوئی نہیں ہے دوپٹہ ٹھیک سے سیٹ کرکے آجانا وہ خود اندر چلی گئی ہیں کیونکہ آپ کے گھر کی سیڑھیاں

اونچی ہیں۔" اس نے اس بار مکمل جواب دیا۔

"اوہ اچھا" میں نے سر ہلایا "ایک منٹ میں آپ کو سیفٹی پن لا دیتا ہوں۔ آپ یہیں رکیں۔" میں اسے رکنے کا کہہ کر گھر کے اندر چلا گیا اور چند منٹ میں سیفٹی پن لے آیا۔

"تھینکس ــــ" اس نے پن میرے ہاتھ سے لے کر اپنا دوپٹہ پھیلایا اور شرٹ کی سائیڈ کو اس سے کور کرتے ہوئے سیٹ کرنا شروع کیا۔ اپنی چادر اس نے تقریباً" ہٹا کر سائیڈ پر کرلی تھی۔ میں تھوڑا دور ہو گیا لیکن کبھی کبھی نظر چرا کر اس کو دیکھ بھی رہا تھا۔ آج پہلی بار اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہلکے ہلکے میک اپ اور لائٹ پرپل سوٹ میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے کی اچھی سی فال تو بنالی تھی لیکن اب کندھے پر پن لگانا مشکل ہو رہا تھا دو بار اس کا ہاتھ پھسلا تیسری مرتبہ میں نے بنا کچھ کہے پن اس کے ہاتھ سے لے لیا اور آگے بڑھ کر لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت میرے بہت قریب تھی۔ اوپر سے گانے کے بول۔

زندگی ڈوب گئی ان کی حسین آنکھوں میں
یوں میرے پیار کے افسانے کو انجام ملا

میں نے اپنی تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے دھیان پن کی طرف لگایا اور جیسے ہی پن اچھی طرح ٹک گئی میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"شکریہ ــــ" اس نے لمحہ بھر کو نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ یقیناً" اب اس کے جانے کا ٹائم تھا لیکن دل چاہ رہا تھا کسی طرح اس کو روک لوں۔ وہ بھی نہایت سست قدموں سے مڑی تھی۔ ہم دونوں ہی اس انوکھی اور پیاری ملاقات کے زیر اثر تھے۔

"بات سنیں ــــ" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ آواز دے ڈالی تو وہ بنا مڑے رک گئی۔

"آپ فون کیوں نہیں اٹھاتیں ــــ؟"

"جی ــــ؟" وہ حیرت سے مڑی۔

"پچھلے دو ہفتوں سے کال کر رہا ہوں۔ ریسیور اتنا بھی بھاری نہیں ہوتا کبھی کبھی تکلیف کرلیا کریں۔" میں نے شرارت کی تو وہ پہلی مرتبہ ہنسی اور بنا کچھ کہے باہر نکل گئی۔

بس اس کا یوں ہی ہنس دینا ہماری دوستی کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ لیکن یہ سب اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ میں نے اگلے ہی روز اسے فون کر دیا۔ وہ شاید منتظر تو تھی تبھی فون اسی نے اٹھایا لیکن کافی سنجیدہ تھی۔ اس کے اس روز کے چند سوالوں نے نہ صرف مجھے حیران کیا بلکہ پوری طرح میرا دل بھی لے لیا۔ یہ ہماری پہلی باقاعدہ بات چیت تھی اور اس نے پہلی مرتبہ میں ہی پوچھ لیا کہ میں منگنی شدہ یا میرڈ تو نہیں ہوں۔

"ایسا کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں نہیں چاہتی میری وجہ سے کسی اور لڑکی کی زندگی تباہ ہو ــــ ابھی تو پہلا مرحلہ ہے میں اپنے قدم یہیں روک لوں گی۔ آگے ہی آگے بڑھتے جانا ہم دونوں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو گا۔" وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ میں کچھ دیر تک لاجواب سا ہو گیا۔ جس کا اس نے شاید کوئی اور مطلب نکالا۔

"کوئی بات ہے کیا؟" سبین نے اٹک اٹک کر سوال کیا تو میں چونکا۔

"اوہ ــــ جی نہیں بس میں ذرا حیران ہوں۔"

"آپ کی حیرت بجا ہے لیکن۔" وہ ذرا دیر کو رکی۔

"دراصل ایسے معاملات کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ میں ڈرپوک بھی ہوں' اور محتاط بھی۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور "میں سمجھ سکتا ہوں ــــ" میں نے اس کی بات کاٹی وہ جو کہنا چاہتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا وہ لڑکی تھی اور پہلی مرتبہ کسی پر بھروسا کر رہی تھی "تو میرا یقین کیسے کرلیا آپ نے ــــ" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ میں نے سوچا آخر ایسی اچھی اور محتاط لڑکی مجھ سے دوستی کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئی۔

"دراصل ــــ" وہ کہتے کہتے رک گئی بلکہ اس کی خاموشی کافی لمبی ہو گئی۔

"جی ــــ جی میں سن رہا ہوں۔"

"میں آپ کے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ خود مجھے نہیں پتا کہ کیوں ــــ" وہ بہت مشکل سے الفاظ ادا کر رہی تھی لیکن مجھے ان چند الفاظ نے بے پناہ خوشی بخشی۔ میں اندر سے مسکرایا۔

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا ان شاءاللہ اور ہمیشہ سچ بولوں گا۔"

"زندگی حقیقی معنوں میں بے حد حسین ہو گئی تھی۔ سبین نہ صرف بہت خوب صورت تھی بلکہ بہت سادہ مزاج' سچی اور ایماندار تھی۔ اس کا اظہار خالص تھا جو سیدھا دل پر اثر کرتا تھا۔ باوجود اس کے کہ مجھ سے ملنے سے پہلے وہ محبت کی الف بے سے بھی ناواقف تھی۔ وہ محبت کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ ہم دونوں کا تعلق متوسط گھرانوں سے تھا۔ باہر سے نرم و نازک نظر آنے والی سبین اندر سے بہت بہادر اور حوصلہ مند تھی۔ وہ اپنی فیملی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے حال ہی میں گریجویشن کیا تھا اور فوراً" ہی ایک اسکول میں جاب شروع کردی تھی۔ اس کا ارادہ پرائیویٹ ایم اے کرنے کا تھا۔ اس کے والد ذرا پرانے خیالات کے آدمی تھے اور کافی حیل و حجت کے بعد اسے جاب کی اجازت دی تھی۔ اس لیے وہ کافی احتیاط پسندی سے اپنی زندگی گزار رہی تھی لیکن مجھ سے اسے واقعی بہت بری طرح محبت ہو گئی تھی۔

بعض اوقات میں اس کی اتنی توجہ اور پیار سے بہت شرمندہ ہو جاتا تھا۔ وہ مجھ پر حد سے زیادہ بھروسا کرنے لگی تھی۔ زیادہ تر تو ہم پیار محبت کے بجائے صرف اپنے اپنے گھریلو معاملات ڈسکس کرتے رہتے تھے۔ وہ جب موڈ میں آکر مجھ سے اپنی ہر چھوٹی چھوٹی بات شیئر کرتی تو مجھے اس پر بڑا پیار آتا تھا۔ ان دنوں بھی مجھے کچھ کچھ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ سبین کے ساتھ محبت کا معاملہ اوروں سے بہت خاص اور الگ ہے' اس کے لیے میرے جذبات میں جو خلوص اور کھرے پن کا عنصر تھا وہ کبھی تانیہ اور رباب کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی میری طبیعت میں پہلے والی بے چینی اور اضطراب باقی رہا تھا۔

سبین کا اسکول شہر کے مضافاتی علاقہ میں تھا وہ وہاں تک کبھی ٹیکسی کبھی ڈائسن یا بس وغیرہ میں جاتی تھی۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے اس کی اس اتنی سی آزادی سے ضرور فائدہ اٹھایا تھا یعنی کبھی کبھار اس کو اپنی بائیک پر پک یا ڈراپ کرلیتا تھا یا کبھی کبھار ادھر ادھر کی سیر کرنے چلے جایا کرتے تھے۔ وہ میری محبت میں چپ چاپ بات مان لیتی تھی ورنہ یہ بات اس کے اصول کے سخت خلاف تھی کیونکہ اب تک اس نے والدین کے بھروسے پر ایک بار بھی آنچ نہیں آنے دی تھی لیکن دوسری طرف میرے بارے میں بھی پر یقین تھی کہ میں اس کے ساتھ ٹائم پاس نہیں کر رہا اس لیے تھوڑی حیل و حجت کے بعد مان جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ چار سالہ تعلق میں ہم نے خوب انجوائے کیا۔ دنیا جیسے اچانک ہی بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ ہر لمحہ پیارا لگتا تھا ہر بات اچھی لگتی تھی۔ سبین سے نہ ملتا تو زندگی کے اس حسین ترین رخ سے محروم رہتا میری یادداشت میں ہر موسم کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خوب صورت لمحہ قید تھا۔ کیونکہ ہم تپتی دوپہروں' ٹھٹھرتے دنوں اور بہار خزاں کے بے شمار لمحوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔

ایک دن وہ مجھے ایک بزرگ کے مزار پر لے گئی۔ میں پہلے کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور خوب تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ مزار بہت ہی پرسکون جگہ پر تھا۔ جانے وہاں اور کوئی آتا جاتا بھی تھا یا نہیں لیکن اس وقت تو وہاں مکمل ویرانی کا ڈیرا تھا۔ صرف کبوتروں کی غٹرغوں تھی اور ہم دونوں' مجھے اس جگہ جا کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آس پاس خوب سبزہ تھا۔ ہم نے ہینڈ پمپ سے پانی پیا ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی' آبادی سے گزرتے ہوئے تندور سے روٹی لی اور پکوڑوں کے ساتھ کھائی' میں چونکہ گاڑی چلا رہا تھا جو میں اپنے دوست حمید سے مانگ لایا تھا تو سبین مجھے نوالے بنا بنا کر کھلا رہی تھی' ایک تو شدید بھوک اوپر سے سبین کے ہاتھوں سے کھانا' میں نے جب کہا کہ آج تو پکوڑے بھی چکن لگ رہے ہیں تو وہ بہت ہنسی۔

"پلیز۔ ایسے فلمی ڈائیلاگ نہ بولو۔"

"ہاں آج تو تمہیں فلمی ڈائیلاگ لگ رہے ہیں' سالوں بعد جب شوہر جلی روٹیوں پہ جھاڑ پلائے گا تب میرے فلمی ڈائیلاگز کی قیمت معلوم ہوگی" میں نے مظلوم بننے کی حد کردی جبکہ وہ مجھے حیرت سے دیکھے گئی۔

"واہ' جیسے تم سے شادی کرلی تو تم نہیں جھاڑو گے"۔ اس نے میرے جذباتی جملوں کو ہوا میں اڑایا تو میں نے اگلے نوالے پر اس کا ہاتھ پکڑ کر کاٹنے کی ایکٹنگ کی' اس نے خوامخواہ چیخ ماردی جبکہ میں نے بجائے کاٹنے کے اس کا ہاتھ چوم لیا تو اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ میں نے ہنس کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ واپسی کے راستے میں ایک جگہ ٹیوب ویل لگا دیکھ کر میں نے گاڑی روک دی۔ ہم نے وہاں منہ ہاتھ دھوئے۔ وہ میری طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھی۔

"کچھ ہوا ہے کیا۔۔۔؟" میں نے معصوم بن کر سوال تو کیا لیکن ہونٹوں پر دبی دبی ہنسی بھی تھی' میری ہنسی نے اس کی سنجیدگی خاک میں ملادی' وہ مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ آج یہ حالت ہے کہ اس مزار پر سال میں ایک' دو مرتبہ جانا میرا معمول بن چکا ہے۔ مجھے عجیب سی انسیت ہوگئی ہے اس جگہ اور اس مزار سے۔

وہ اپریل کا مہینہ تھا جب ایک بار پھر میں اپنے دوست سے گاڑی لے آیا۔ وہ سفر ہماری زندگی کا سب سے حسین اور یادگار سفر تھا۔ ہمارے شہر سے کچھ فاصلے پر بیراج ہے وہاں تک کا راستہ بہت سرسبز اور خوب صورت ہے' بیراج سے کچھ پہلے ایک ریسٹ ہاؤس آتا ہے' ریسٹ ہاؤس کے اندر جانے کے لیے تو پرمیشن وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اندر کس نے جانا تھا' ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی پر تھا اور اس کے اردگرد کا علاقہ اور پارک گھومنے پھرنے کے لیے کافی تھا' وہاں کبھی کبھار کسی کالج یا اسکول وغیرہ کے بچے پکنک کے لیے آجاتے تو رش ہوجاتا ورنہ عموماً" بالکل تنہائی اور سکون ہوتا' میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ کاش آج وہاں کوئی نہ ہو اور اللہ نے میری دعا سن لی۔ اس دن ہم نے وہاں خوب سیر کی۔ پہاڑی کے کنارے لگے جنگلے کے قریب کھڑے ہم نیچے جھیل کا نظارہ کررہے تھے۔ جھیل کے ساتھ ساتھ مین روڈ تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ وہاں سے کسی کسی وقت کوئی ٹرک یا گاڑی گزر رہی تھی' میں ہیبن کے پیچھے کھڑا تھا نہ صرف میں نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھے بلکہ ایک بار اس کے کندھے پر تھوڑی ٹکا کر آئی لو یو بھی کہا تو اس نے مجھے دھکا دے کر دور کیا۔

"وہ دیکھو نیچے سے ٹرک گزر رہا ہے۔۔۔ ڈرائیور مفت میں مزے لے رہا ہوگا۔" اس نے جس گہری سنجیدگی سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا میرا قہقہہ نکل گیا۔

"ارے پاگل جب وہ ٹرک ہی ہمیں اتنا سا دکھائی دے رہا ہے تو ہم اس کے ڈرائیور کو کتنے چھوٹے نظر آرہے ہوں گے۔"

"اچھا تو مجھے یاد دلانا جب ہم گاڑی میں وہاں سے گزریں گے تو میں اوپر دیکھوں گی۔ پتا تو چلے یہ جگہ کیسی دکھائی دیتی ہے۔

"جی بہتر۔۔۔" میں نے سر جھکایا" بلکہ اجازت ہو تو یہاں بھی کوئی یادگار کام کرجائیں تاکہ آپ آئندہ کبھی یہاں تشریف لائیں تو آپ کو اس ناچیز کی یاد آئے۔"

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔۔۔؟" اس نے آنکھیں سکوڑ کر کمر پہ ہاتھ رکھے اور میں ہنستا چلا گیا کیونکہ میں اکثر اسے اس کے کہے جملے سے چڑاتا تھا کہ "بہت سالوں بعد جب یہاں آئیں گے تو اس بات کو یاد کریں گے۔"

"اور یادگار کام مثلاً" کیا ہوگا۔۔۔؟" اس نے بھنویں اٹھائیں۔

"یادگار کام۔۔۔" میں نے سوچنے والے انداز میں انگلیاں بجائیں "ہاں جیسے درختوں کے گرد گانا گانا۔۔۔ تم کو بانہوں میں اٹھا کر پہاڑ سے اترنا۔۔۔ یا تم کو گلے ۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ اس نے نتھنے پھلائے" یا پہاڑ سے چھلانگ لگا کر کوئی نیا ریکارڈ بنانا۔۔۔" اس نے میری بات کاٹ کر اضافہ کیا اور میں ڈھٹائی سے ہنسنے لگا "تو تمہیں کوئی آپشن قبول نہیں؟"

"نہایت بے ہودہ آپشنز ہیں۔۔۔ چلو اب۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی تھی۔

ایک دن ہیبن نے مجھے اپنے اسکول سے فون کیا۔ اسکولوں میں سردی کی چھٹیاں ہورہی تھیں اور کوئی پارٹی وغیرہ تھی وہ جلدی فارغ ہوگئی تھی اس لیے اس نے مجھے بلالیا۔ میں تو فوراً" ہی نکل پڑا۔ وہ سخت سردی کا دن تھا۔۔۔ دھند سے بھری اس ٹھنڈی ٹھنڈی صبح کو یاد کرکے آج بھی رگ وپے میں سردی دوڑ جاتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ سوچ کر بہت حیرت ہوتی ہے کہ محض دس' بارہ برس پہلے ملک اور شہر کے حالات اتنے اچھے تھے کہ ہم بلا خوف وخطر کہیں بھی منہ اٹھا کر چل پڑتے تھے جبکہ آج تو ہر شخص اپنے سائے سے بھی خوفزدہ نظر آتا ہے۔ خیر تو ایئرپورٹ روڈ سے کچھ دور جہاں اس کا اسکول تھا میں نے گنے کے کھیتوں کے قریب سخت سردی میں اس کا انتظار کیا تھا۔۔۔ تقریباً" دس بجے وہ پیدل چلتی ہوئی' میرے قریب آئی' اس روز ہم نے خوب بائیک دوڑائی تھی۔ وہ بار بار میری ناک پہ مفلر سیٹ کررہی تھی تاکہ مجھے ٹھنڈ نہ لگے۔ ہم نے وہاں ایک پرانے ہوٹل پر چائے پی اور اب واپسی کا سفر شروع کردیا تھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ دھوپ بھی اچھی نکل آئی تھی' میں نے مفلر اس کو تھمایا۔۔۔ اتنی دیر سے وہی پٹر پٹر بولے جارہی تھی۔

" لو اسے اپنے منہ پر باندھ لو' کیونکہ اب بولنے کی باری میری ہے"۔ میں نے مصنوعی غصہ دکھانے کی کوشش کی۔

"اچھا مثلاً" کیا بولیں گے آپ"؟ اس نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

"کہہ تو ایسے رہے ہیں جیسے غزل سنانے والے ہیں"۔

"کیوں کیا میں غزل نہیں سنا سکتا"؟ میں ہنسا تو اس نے اور بھی اونچا قہقہہ لگایا۔

"تم اور غزل۔۔۔ مان ہی نہیں سکتی"۔

"ہوں۔۔۔" میں نے گلا کھنکارا "تو سنیں میڈم' غزل پیش خدمت ہے

قریب آکے بہت دور ہوگیا وہ شخص
نہ جانے کون سی دنیا میں کھوگیا وہ شخص
خیال و خواب کی تفسیر مجھ کو سمجھا کر
میری ہی ذات میں مجھ کو ڈبو گیا وہ شخص
میں اپنی چشم تحیر کو کیسے سمجھاؤں
پلک پلک میں تو موتی پرو گیا وہ شخص
قمر اسے تو سدا میں نے پیار بانٹا تھا
اور عمر بھر کی جدائی سمو گیا وہ شخص

میں نے کافی روانی اور سر میں غزل پڑھی اور وہ تو حیرت سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔۔۔ اس وقت ہم بائیک کچے راستے کی سائیڈ پہ روک کر نیچے اترے ہوئے تھے۔

"اتنا ہی بدذوق لگتا تھا جو اس قدر حیران ہو؟" میں نے گھورا تو وہ ہنس پڑی۔

"ارے اس سے بھی زیادہ۔۔۔ لیکن غزل واقعی بہت زبردست تھی' پر تھی بہت اداس سی۔۔۔ کس کے فراق میں تھی۔" اس نے شرارت سے ابرو اٹھا کر سوال کیا تو میں جھینپ گیا۔

"۔۔۔ ویسے ہی پسند ہے۔"

"سچ بتاؤ۔۔۔ مجھے تمہارا یقین نہیں ہے" اس نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔ اندر سے اچھی خاصی جیلس لگ رہی تھی میں اس کی کیفیت سے مزا لینے لگا۔

"کوئی نہیں یار۔۔۔ اچھی غزل ہے اس لیے پسند ہے!"

"ایک بات پوچھوں۔۔۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"ہم۔۔۔ پوچھو۔۔۔" میں نے مسکراہٹ دبائی' کسی حد تک اندازہ ہوچکا تھا کہ کیسا سوال آسکتا ہے۔

"کیا تمہیں ثانیہ اور رباب کی اب بھی یاد آتی ہے اور۔۔۔" وہ کچھ دیر کو رکی "تمہیں ان سے دوری کا

کتنا افسوس ہے"۔ وہ کچھ نروس سی تھی سوال کرتے وقت، مجھے اس کی گھبرائی صورت آج بھی نہیں بھولتی۔ شاید وہ کسی غیر متوقع جواب کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ میں نے سینے پہ ہاتھ باندھے اور بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم افسوس کی بات کرتی ہو سبین۔۔۔ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت بھی بجائے ان کے تم میرے ساتھ کیوں نہیں تھیں۔"

"سچ زین۔۔۔" سبین نے کچھ ایسے جذباتی اور تشکر بھرے انداز سے میری طرف دیکھا کہ میرا دل اس کی اس عاجزی پر موم کی طرح پگھل گیا۔

"اتنی مشکور کیوں ہو سبین۔۔۔؟ تم تو خود سراپا لائق چاہت ہو، مجھ سے اتنی محبت مت کرو کہ میں بجائے مغرور ہونے کے شرمندہ ہونے لگوں۔"

"شرمندہ کیوں۔۔۔؟" وہ پھر پریشان ہو گئی۔

"کیونکہ تمہاری طرف محبت کا ہاتھ پہلے میں نے بڑھایا تھا اور آج تمہاری محبت اس پہل سے کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ میں اس صلے کا ہرگز اہل نہیں تھا۔ اس لیے سوچتا ہوں کاش تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔"

"مثلاً" کیا۔۔۔" وہ اب مسکرانے لگی تھی۔

"تمہیں کیا چاہیے۔۔۔" میں اس وقت بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"میرا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوگا زین۔۔۔ کہ مجھ سے اپنی محبت کبھی کم نہ کرنا۔ دل کے بہت اندر، بہت گہرائی میں ہمیشہ اسے زندہ رکھنا۔"

"بلاشک و شبہ۔۔۔ چاہو تو لکھوا لو۔" میں مسکرایا۔

"اور جناب یہ غزل بنا کسی وجہ کے پسند ہے۔ ہاں البتہ تم مجھ سے شادی کے لیے تیار نہ ہوئیں تو پھر شاید تمہارے فراق میں زیادہ پر اثر اور اچھی لگے"۔ میں اس کے منہ سے کچھ سننا چاہتا تھا۔ لیکن وہ خوامخواہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"ہاں جی۔۔۔ تو چلیں۔۔۔" میں نے بائیک سنبھالی تو وہ بھی پیچھے بیٹھ گئی۔۔۔ ہم باتیں کرتے شہر کے قریب پہنچ گئے۔

"اے سنو۔" میں نے بائیک کی اسپیڈ آہستہ کرتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"کیا ہوا۔۔۔" اس نے پیچھے سے سر نکالا۔

"وہ دیکھو۔۔۔ سفید کوٹھی۔۔۔" میں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

"او، ہاں کس کی ہے، بہت خوب صورت ہے۔" وہ بھی ادھر دیکھنے لگی۔

"مجھے نہیں پتا کس کی ہے۔ بس مجھے بہت پسند ہے۔ اگر مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤ تو یہی لے کر دوں گا۔"

"توبہ ہے تم سے۔" اس نے میرے کندھے پر مکا مارا "پھر وہی بات۔۔۔ چلو اب تیز چلاؤ، پہلے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔"

"تو اتنی اچھی آفر دے رہا ہوں اور تم کو مذاق لگ رہا ہے۔"

"کیا واقعی تم سیریس ہو"۔ اس نے قدرے رک کر سوال کیا تو میں حیران ہوا "ہاں۔۔۔ کیوں؟"

"اگر تم نے واقعی دل سے یہ خواہش کی ہے تو میرے لیے یہ جملہ ہی سب سے قیمتی ہے، بات کوٹھیوں، بنگلوں کی نہیں ہے زین، بات تو جذبات کی ہوتی ہے۔۔۔ میں کہیں بھی رہوں یہ کوٹھی اس جملے کے بعد ہمیشہ مجھے اپنی ہی لگے گی"۔

"دیٹس دی اسپرٹ" میں واقعی بہت خوش ہوا اس کی بات سن کر۔۔۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بعض جملے زندگی میں صرف اس لیے امر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے کہنے میں شفاف جذبات اور اچھی نیت کا بہت دخل ہوتا ہے۔ میں نجانے اس کوٹھی کے سامنے سے کتنی بار گزرا، کبھی بہت مصروف تو کبھی کسی بات میں الجھا ہوا، لیکن پھر بھی اس پہ نظر پڑتے ہی لمحہ بھر کو سالوں پیچھے چلا جاتا۔

زندگی محبت کے رنگوں سے بھری ہو تو ایک ایک قدم یادگار بن جاتا ہے اور وہ تو عید تھی۔ اگرچہ یہ ہماری ایک ساتھ چوتھی عید تھی لیکن اس بار میں اسے کوئی

بہت اسپیشل گفٹ دینا چاہتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وقت کے ساتھ سبین کے لیے میرے جذبات مزید گہرے ہو چکے تھے۔ بار بار دل میں ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ اس کو سونے کا تحفہ دوں لیکن اپنے حالات بھی پیش نظر تھے ابا کے انتقال کے بعد گھر کا خرچ ان کی پینشن اور ان کے بچائے ہوئے کچھ بینک بیلنس سے چل رہا تھا۔ میری جاب ابھی تو نہیں لگی تھی لیکن امید بندھ چکی تھی، اندازہ یہی تھا کہ چند ماہ کے اندر نوکری مل جائے گی۔ میں نے اماں سے جھوٹ بولا کہ ایک دوست کو پیسوں کی سخت ضرورت ہے اور وہ چند ماہ میں واپس کر دے گا۔ یوں سبین کے لیے ایک خوب صورت انگوٹھی خرید لی۔

عید میں ایک ہفتہ ابھی باقی تھا میں نے سوچنے کا کام اس کو سونپ دیا کیونکہ ملنے کی ترکیب اسی کے کارآمد دماغ سے نکلتی تھی اور اس وقت تو میں پوری طرح چکرا گیا جب اس نے عید کے دوسرے دن مجھے اپنے گھر پر ہی بلا لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے مجھے اپنی امی سے بھی ملوایا۔ اس کے والد، دو بہنیں اور بھائی کہیں رشتہ داروں کے ہاں گئے ہوئے تھے گھر پر اس کی والدہ اور وہ تھی، مجھے اس کی امی سے مل کر بہت اچھا لگا۔ وہ بہت ہی نرم مزاج اور مسکراتے چہرے والی معصوم سی خاتون تھیں۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر جب مجھے دعا دی تو میں بری طرح شرما گیا۔ بعد میں سبین مجھے گھر کی چھت پر لے آئی تب میں نے باقاعدہ اس کے کان کھینچے

"بدتمیز پہلے سے بتاتا تھا تم نے گھر بلایا اور میں بھی منہ اٹھا کر چل پڑا۔۔۔ اچھا امی سے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔۔۔؟ ڈانٹ تو نہیں پڑی؟" میں حیرت سے سوال کیے جا رہا تھا اور وہ نیچے دیکھتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔

"امی کو سب پتا ہے۔۔۔ وہ مجھے جانتی ہیں انہیں پتا ہے کہ میں نے اگر کسی آدمی پر بھروسا کیا ہے تو ضرور وہ اس قابل ہو گا اور وہ تمہیں دیکھنا اور تم سے ملنا بھی چاہتی تھیں۔ اس لیے میں نے گھر بلانے کا پلان ترتیب دیا۔ اچھا اب حیران ہونا چھوڑو اور بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں"۔ اس نے میری توجہ مانگی تو میں نے مسکراتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیا وہ میرے پسند کیے ہوئے گہرے سبز سوٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے لیکن گہرے کالے تھے اور بہت خوب صورتی سے اسٹیپس میں کٹے ہوئے تھے۔ اس کی ہوا میں لہراتی لٹیں اور گلابی چہرہ دیکھ کر میں رشک کر رہا تھا کہ اس حسین چہرے والی لڑکی کا حسین دل صرف میرے لیے دھڑکتا ہے، میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے جیب سے انگوٹھی نکال کر سامنے کی وہ صرف خاموشی سے دیکھ رہی تھی میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی پہنائی اور کہا "منگنی مبارک ہو۔۔۔"

"یہ تو اصلی ہے زین۔۔۔" میرے جملوں پر دھیان دینے کے بجائے وہ انگوٹھی جانچنے میں پڑ گئی۔

"جی ہاں انگوٹھی تو اصلی ہے لیکن منگنی نقلی۔۔۔" میں نے منہ بنایا۔

"زین مجھ سے پوچھ تو لیتے۔۔۔ یہ تو بہت زیادہ۔"

"بس بس۔۔۔ مجھے اس موضوع پر لیکچر نہیں سننا۔۔۔ فی الحال بہت بھوک لگی ہے گھر آئے مہمان کو کچھ چائے پانی بھی پوچھ لیتے ہیں۔"

"اوہ سوری" وہ بری طرح جھینپ گئی "میں لاتی ہوں" وہ جانے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

"جانتی ہو میں نے یہ گفٹ کیوں دیا؟" وہ جواباً صرف میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیونکہ جب بھی ہم کہیں جاتے ہیں تو تم کچھ نہ کچھ ایسا کرنا چاہتی ہو جو بہت سالوں بعد بھی یاد رہے، کبھی کوئی جملہ تو کبھی کوئی جگہ، میں نے سوچا ایک یادگار ایسی بھی ہونی چاہیے جو ہر وقت تمہارے پاس ہو، جس کے لیے کہیں جانا نہ پڑے اور جس کو دیکھ کر تم کبھی بھی مجھے یاد کر سکو اس کے لیے مجھے سب سے مناسب تحفہ یہی لگا جو نہ صرف تمہارے بہت قریب ہو بلکہ اصلی بھی ہو، ہماری محبت کی طرح۔۔۔" میں نے بہت

جذب اور سنجیدگی سے یہ الفاظ کہے تھے۔ سبین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"تھینک یو زین ــــ میں بھی اسے خود سے الگ نہیں کروں گی لیکن۔" وہ کہتے کہتے رکی۔

"لیکن کیا؟" میں نے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"اگر یہ منگنی واقعی اصلی ہوتی تو کیا زیادہ اچھا نہیں تھا ــــ چار سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا ایک دوسرے کو جاننے کے لیے کیا تم اب بھی کنفیوژ ہو ہماری محبت کو لے کر ــــ"

"نہیں سبین ــــ" میں نے اس کی بات کاٹی "میں تمہاری محبت کے معاملے میں کبھی بھی کنفیوژ نہیں تھا۔ ہاں تم خود میرے ماضی سے واقف ہونے کی وجہ سے میرے بارے میں ضرور ایسی رائے رکھتی تھیں۔ البتہ گزرے چار سالوں میں تمہاری اپنی تسلی ہو گئی ہو کہ تم میرے لیے رباب اور تانیہ کی طرح نہیں ہو تو میں آج ہی اپنے گھر والوں کو تمہارے ہاں بھیج سکتا ہوں۔"

"آج ہی ــــ" اس نے اپنی خوب صورت آنکھیں پھیلائیں تو میں ہنس دیا۔

"جی جناب ــــ آج ہی۔" میں مسکرانے لگا۔

میں اس شام نہایت خوشی اور جوش کے جذبات لیے اماں کے پاس آیا اور کچھ جھجکتے، گھبراتے اپنے اور سبین کے بارے میں بتا دیا۔ وہ کچھ دیر تو نہایت سنجیدگی سے مجھے گھورتی رہیں اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بنا کچھ کہے تسبیح اٹھالی۔ میں ان کے رویے پر کافی پریشان اور نروس سا ہو گیا۔

"کیا بات ہے اماں ــــ آپ ناراض ہو گئیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مجھے تم سے اس بچکانہ رویے کی ہرگز امید نہیں تھی زین ــــ تم نے کتنی آسانی سے اپنی شادی کی بات کرلی ــــ تمہاری آپا تم سے پانچ سال بڑی ہیں اور ہم برسوں سے کسی اچھے رشتے کی راہ دیکھ رہے ہیں، تم رافیہ سے پہلے شادی کرو گے ــــ کیا یہی ہوتی ہے ایک بھائی کی محبت اور غیرت۔" جملے نہیں تھے، ایک گرم لاوا تھا جو مجھے شرمندگی سے پگھلائے جا رہا تھا۔ میں نے اتنی سبکی اپنی پوری زندگی میں محسوس نہیں کی تھی، اماں کے چند جملوں نے جیسے مجھے کسی گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

بھائیوں کا بہنوں کے لیے پیار ہوتا ہے بے غرض اور بے پناہ اور اسی لیے مجھے بھی اپنی آپا میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن رشتے لے کر آنے والے بھلا میری نظر سے آپا کو کیسے دیکھ سکتے تھے ــــ ان کے اپنے معیار ہوتے تھے جن پر شاید آپا پوری نہیں اترتی تھیں مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ آپا بہت قبول صورت تھیں اماں ــــ اکثر آئے گئے کے سامنے یہ بڑبڑاتی تھیں کہ اللہ بیٹی دے تو خوب صورت ہی دے ــــ بیٹوں کا کیا ہے ان کی صورت کس نے دیکھی ہے۔ ایسا کہتے ہوئے جب وہ مجھے بغور دیکھا کرتیں تو بچپن میں یہ بات میرے سر پر سے گزر جاتی تھی لیکن گزرتے وقت اور آئینے نے یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھا دی تھی۔ میں ہو بہو اپنے دادا کی تصویر تھا، جو نہایت خوبرو اور وجیہہ انسان تھے۔ لیکن خیر میری خوب صورتی میں میرا ذاتی قصور تو زیرو پرسنٹ تھا، البتہ اماں کے وہم بھی کچھ ایسے بے جا نہیں تھے۔

مجھے اچانک آپا کی محرومیوں کے احساس نے گھیر لیا، کبھی کبھی ہم اپنے بہت قریب رہنے والوں کے دل کی بات سمجھ نہیں پاتے، معلوم نہیں آپا کیا سوچتی رہتی ہوں گی ایک ایسی محرومی ان کی زندگی پر گرہن بن کر چھائی ہوئی تھی جس پہ ان کا زور تھا نہ اختیار۔

مجھے آنے والے کئی دنوں تک جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ پھر ایک دن اچانک اماں نے مجھے بلایا اور سبین کی بات کرنے لگیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس کا کوئی بھائی بھی ہے، میں نے انہیں عمیر کا بتایا تو وہ اس کے بارے میں سوالات کرنے لگیں جیسے شادی، تعلیم وغیرہ، میں نے انہیں بتایا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ میں دل میں حیران بھی تھا، اماں کے سوالات میری سمجھ سے باہر تھے

لیکن بہرحال انہوں نے جلد ہی میری حیرت کو یہ کہہ کر پریشانی میں بدل دیا کہ اگر سبین سے شادی کرنی ہے تو رافیہ اور عمیر کا رشتہ کروا دو ــــ میں تو ہکا بکا بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

عمیر اور آپا کی عمروں میں کئی سال کا فرق تھا عمیر تو سبین سے بھی دو سال چھوٹا تھا۔ میں نے اماں سے تقریباً "چیختے" ہوئے لہجے میں احتجاج کیا لیکن انہیں ان باریکیوں سے کوئی سروکار نہ تھا، میں وہاں سے اٹھ آیا۔ صرف ایک ہی سوچ میرے دل و دماغ پہ حاوی تھی کہ اماں نے سبین کے حصول کی رہی سہی امید بھی ختم کردی ہے، میرے مزاج میں یک لخت عجیب سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ ایک گہری سنجیدگی اور چپ نے مجھے گھیر لیا تھا۔

میری عادت ہے کہ شدید پریشانی مجھے گونگا کر دیتی ہے۔ معمول کی گفتگو کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ یہی حال ان دنوں بھی تھا۔ ادھر سبین عید والی ملاقات کے بعد سے ہماری آمد کی منتظر تھی۔ لیکن اب میں اسے کیا کہتا۔ بہت بار کوشش کی کہ اس کو حقیقت بتا دوں لیکن اماں کی سوچ تو خود مجھے ہی شرمندہ کیے دے رہی تھی ــــ بہت چاہنے پر بھی میں مناسب الفاظ کا چناؤ نہ کر پاتا ــــ ویسے تو سبین نے بھی دوبارہ مجھ سے نہیں پوچھا کہ شادی کے معاملے پر میری اماں سے کیا بات ہوئی ــــ وہ تو بس میرے بدلے رویے سے خائف تھی ــــ روزانہ اس کا یہی شکوہ ہوتا کہ میں اب پہلے والا زین نہیں رہا۔ وہ چونکہ میرے معاملے میں حد سے زیادہ جذباتی تھی اس لیے میری خاموشی اور سنجیدگی سے یہ اخذ کیا کہ میں اب اس سے پیار نہیں کرتا۔ روز ہمارے بیچ بحثیں اور جھگڑے ہونے لگے بلکہ زیادہ تر وہی بول بول کر فون پٹخ دیتی۔ میرا تو وضاحتیں دینے کو ہی دل نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھے فون کیا، وہ کافی سنجیدہ لگ رہی تھی۔ چھوٹتے ہی اس نے کہا کہ میں اس کی تصویریں، کارڈز اور چند ایک خطوط جو کبھی ایک دوسرے کو لکھے تھے وہ سب اس کو واپس کر دوں۔ اس نے مجھے دن، وقت اور جگہ بتا کر فون رکھ دیا۔ بہت دنوں بعد میرے ہونٹوں کو ہنسی چھو گئی۔ میں ایک دم بڑی ترنگ میں آگیا یہ سوچ کر کہ سبین مجھ سے ملنا، مجھے دیکھنا چاہتی ہے اور بہانہ دیکھو کیا ڈھونڈا، میں ہنس پڑا اور مقررہ وقت پر اس کی فیورٹ آئس کریم لیے پارک آگیا۔ وہ اس روز ہلکے اورنج سوٹ کے ساتھ سفید کڑھائی والی چادر پہنے بہت ہی پیاری لگ رہی تھی، میرے موڈ پر طاری گزرے دنوں کی دھند جیسے چھٹنے لگی۔

میں نے قریبی بنچ کی طرف اشارہ کیا تاکہ بیٹھ کر باتیں کر سکیں لیکن اس نے بنا دھیان دیے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما کر مجھ سے شاپر لے لیا لیکن اندر جب اپنی مطلوبہ اشیاء کی جگہ آئس کریم پر نظر پڑی تو بہت غصے سے مجھے گھورا جواباً" میں شرارت سے مسکرایا لیکن اس نے شاپر غصے سے میرے سینے پر پھینکا اور پارک کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں سمجھا مذاق کر رہی ہے اور ابھی واپس آجائے گی لیکن وہ سچ مچ بہت غصے میں تھی۔ میں بھی باہر آگیا اور بائیک اس کے قریب لے جا کر بیٹھنے کو کہا لیکن اس نے ایک شکوہ بھری نظر میری طرف ڈالی، وہ رو رہی تھی ــــ اس نے ایک رکشا کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔

میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس واقعے نے مجھ پر کتنا برا اثر ڈالا۔ مجھے سبین کے رویے نے حد سے زیادہ مایوس کیا تھا۔ وہ پر یقین تھی کہ میں اس کے ساتھ رباب اور تانیہ والا سلوک کر رہا ہوں ــــ حالانکہ دیکھا جائے تو ان دونوں کے معاملے میں بھی قصور میرا نہیں تھا۔ دونوں مرتبہ چھوڑنے کے معاملے میں پہل ان کی طرف سے ہوئی تھی۔

سبین نے فون کرنا بھی بند کر دیا تھا ــــ اور میں فون کرتا تو وہ اٹھاتی نہیں تھی کئی ہفتوں بعد بالآخر ایک دن اس کی آواز سنائی دے گئی ــــ وہ بہت اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بات کرنے سے ہمارے بیچ جھگڑے بڑھتے ہیں اس لیے دوری بہتر ہے، ہم ایک

دوسرے کو فون نہ ہی کیا کریں تو اچھا ہوگا۔ میں جانتا تھا اس نے خود پر بہت جبر کرکے یہ فیصلہ کیا تھا لیکن میرے لیے تو یہ سوچنا بھی ناممکنات میں سے تھا۔

سبین اب میری عادت میں شامل ہو چکی تھی۔ جس سے روز کا کھانا پینا تک آپ ڈسکس کرتے ہوں ' اس سے ہمیشہ کی دوری کی بات بھی مضحکہ خیز تھی۔ مجبور ہو کر میں نے سبین کو اماں والی بات بتادی۔ مجھے یقین تھا یہ سب سن کر اس کا ہر گلہ دور ہو جائے گا جو اسے میرے بدلے رویے سے تھا۔ لیکن سبین کے جواب نے تو مجھے شاکڈ کر دیا۔ اس نے نہایت طنز بھرے لہجے میں کہا کہ اگر میری اماں یہ شرط نہ رکھتیں تو کون سا میں اسے اپنا لیتا۔

"تمہاری غیر مستقل مزاج طبیعت نے میرے ساتھ لگا تار چار سال مکمل کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے زیادہ کسی ایک لڑکی کے ساتھ وقت گزارنا تم افورڈ ہی نہیں کر سکتے۔۔۔" سبین نے تیکھے لہجے میں کہا اور میں نے اس کے لفظوں کے تیر نہایت تحمل سے برداشت کرتے ہوئے بنا کچھ کہے فون رکھ دیا۔ کیونکہ یہی میرے غصے کی انتہا تھی جسے وہ چار سالوں میں نہیں سمجھ پائی تھی اور میرے چپ رہنے کو شاید میری شرمندگی سمجھ کر دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا۔ جبکہ مجھے میری انا یہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ دوبارہ خود سے کال کروں۔ البتہ دل یہی کہتا تھا کہ اس کا غصہ وقتی ثابت ہوگا اور بہت جلد سب کچھ معمول پر آجائے گا۔

معمول سے میری مراد وہی ایک دوسرے کو فون کرنا اور کبھی کبھار مل لینا تھا۔ شادی ہونے نہ ہونے کی بات پر جیسے میں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلی تھیں۔ بس میں چاہتا تھا سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے اور یہ ٹاپک بیچ میں سے نکل جائے لیکن سبین نے میری آنکھوں سے خوش گمانی کی پٹی بہت جلد اتار دی۔

تین ماہ ہو گئے تھے الگ ہوئے۔۔۔ اس روز سبین کی سالگرہ تھی۔ میں نے مجبور ہو کر کال ملا لی۔ دوسری کوشش میں اس نے فون اٹھا لیا۔ اس دس منٹ کی گفتگو میں اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس کا رشتہ اپنے ماموں زاد سہیل کے ساتھ ہو گیا ہے اور شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی ہے۔ مجھے تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ لیکن وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔ انیس فروری کو اس کی شادی تھی۔ وہ واقعی ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور جا رہی تھی۔ کہنے کو کچھ رہا نہیں تھا۔ دن بہت بے کیف سے گزرنے لگے اور پھر انیس فروری بھی آکر گزر گئی۔ سبین مجھ سے جدا ہو چکی تھی لیکن میں گزرے آٹھ سالوں کے ایک لمحے میں بھی اس کی یادوں اس کے خیالوں سے خود کو جدا نہیں کر پایا تھا۔ دل چاہتا تھا کبھی راہ چلتے ہی ہمارا آمنا سامنا ہو جائے لیکن قدرت کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ اس لیے آٹھ سالوں میں کبھی اتفاقاً" بھی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

گزرے آٹھ برسوں میں ویسے تو اور بھی بہت کچھ بدلا تھا جیسے سبین کی شادی کے ایک سال بعد آپا کے لیے مراد احمد کا رشتہ آیا۔ ان کی عمر کوئی پینتالیس پچاس کے آس پاس تھی۔ معقول کماتے تھے بس ایک بات کھٹکتی تھی کہ یہ ان کی دوسری شادی تھی۔ لیکن بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ پہلی بیوی کی وفات پر بہنیں ان کی دوسری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میں تو سوچ بچار میں تھا لیکن اماں زیرک خاتون تھیں۔ دور تک کی سوچ رکھتی تھیں ' انہوں نے ہاں کردی اور یوں آپا بیاہ کر مراد احمد کے ہاں چلی گئیں۔

خوش قسمتی سے مراد بھائی بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے۔ اماں کے چہرے پر ان دنوں مجھے ایک الگ ہی اطمینان دکھائی دیتا اور مجھے انہیں پر سکون دیکھ کر دلی خوشی محسوس ہوتی۔ اماں نے ان دنوں میرے لیے بھی لڑکی دیکھنا شروع کردی۔ میں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اماں کی خوشی کی خاطر میں کسی سے بھی شادی کر لیتا لیکن قسمت کی بات کہ کافی جدوجہد کے باوجود میری شادی کا معاملہ کسی نہ کسی وجہ سے رکاوٹوں کا شکار ہوتا رہا۔ ادھر آپا کی خوشیوں کو بھی معلوم نہیں کس کی نظر لگ گئی۔ شادی کے پانچ برس بعد ہی مراد بھائی پیٹ کے کینسر میں مبتلا ہو کر محض چھ ماہ کے اندر

خالق حقیقی سے جا ملے اور آپا ایک بیٹے اور ایک بیٹی کے ساتھ دوبارہ ہمارے گھر آگئیں۔ یہ صدمہ ہم سب کے لیے بہت بڑا تھا۔ میری ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں گزشتہ دو سال سے میں صرف اماں ـــــ آپا اور اپنے بھانجے ' بھانجی کی خوشیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حالانکہ اب آپا نے سنجیدگی سے میری شادی کے معاملے کو دوبارہ اٹھایا تھا اور شاید جلد ہی وہ اپنے مشن میں کامیاب ہونے والی تھیں کیونکہ پچھلے دنوں انہوں نے ایک ساتھ تین ' چار لڑکیاں پسند کرلی تھیں ' جن میں سے کوئی ایک یقیناً" بہت جلد فائنل ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

سیٹھ عثمان نے زمین خرید کر رقم مجھے ادا کردی تھی۔ جب نوٹوں سے بھرا بیگ میں نے اماں اور آپا کے سامنے رکھا تو ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔

"اللہ اماں اتنی رقم ایک ساتھ تو میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔" راضیہ آپا نے شدت جذبات سے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"دعا دو اپنے باپ کو۔۔۔ جن کی بدولت آج بیٹھے بٹھائے اتنا پیسہ ہاتھ آگیا۔"

"ہاں اماں۔۔۔ میں تو کہتی ہوں ' ہم سب سے پہلے قرآن خوانی کرا لیتے ہیں۔"

میں اسی خوشی میں انہیں مصروف چھوڑ کر مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ اب ان دونوں نے کاغذ قلم سنبھال کر سامان آسائش کی لمبی چوڑی لسٹ تیار کرنا شروع کردی تھی اور کیوں نہ کرتیں ' ان کا بھی پورا حق بنتا تھا کہ اپنی ادھوری خواہشات کی تکمیل کریں۔۔۔ میں نے فون کے قریب آکر ایک نمبر گھمایا۔

"آفاق صاحب ہیں کیا۔۔۔؟"

"جی میں ہی آفاق ہوں۔۔۔ فرمایئے۔"

"سر کیا کل کسی ٹائم آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ مجھے ایک پراپرٹی خریدنی ہے۔"

"اوہ اچھا۔۔۔ آپ کل ایک بجے میرے آفس آجائیں۔ وہیں بات کر لیتے ہیں۔"

"بہتر ہے۔۔۔ شکریہ۔" میں نے فون رکھ دیا۔

اگلے دن میں ٹھیک وقت پر ان کے آفس پہنچ گیا۔ آفاق صاحب شہر کے بڑے پراپرٹی ڈیلر سمجھے جاتے تھے اور آج کل ان کے اپنے دو مکان برائے فروخت تھے۔ مجھے ان کا نمبر گھر پہ لگے بورڈ سے ہی ملا تھا۔ میری یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ آفس بند کرکے وہ میرے ساتھ ہی نکلے ' ان کا پروگرام مجھے مکان اندر سے دکھانے کا تھا رقم وہ کافی مناسب بتا رہے تھے اور نہ بھی بتاتے تو شاید میں منہ مانگی رقم بھی ان کو دے دیتا کیونکہ آج میرا برسوں پرانا خواب پورا ہونے والا تھا۔ وہ بلو ماربل کے ڈیزائن والی سفید کوٹھی آفاق صاحب کی ہی تھی جس پر گزشتہ ڈیڑھ سال سے برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا لیکن باوجود شدید خواہش کے میرے حالات مجھے اسے خریدنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن آج میرے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ کوٹھی جس میں میں نے کبھی اپنے اور سبین کے ایک ساتھ رہنے کے سپنے دیکھے تھے۔ آج اس میں اماں ' آپا اور ان کے بچوں کے ساتھ رہ کر کم از کم محبت کی ایک یادگار کو اپنا تو بنا سکتا تھا۔۔۔ جوش جذبات سے میرے ہاتھوں میں پسینہ آگیا تھا۔ گاڑی سے اتر کر میں اور آفاق صاحب کوٹھی کی طرف بڑھنے لگے۔

لیکن یہ کیا۔۔۔ آفاق صاحب کا رخ بلو ماربل والی سفید کوٹھی کے بجائے ساتھ والی سفید کوٹھی کی طرف تھا۔ انہوں نے گیٹ کا لاک کھولنے کا ارادہ کیا تو میں نے انہیں روکا۔

"ایک منٹ آفاق صاحب۔۔۔ میں نے آپ سے اس دوسری کوٹھی کی بات کی تھی۔" میں نے دوسری کوٹھی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی حیران ہوئے۔

"اوہ۔۔۔ وہ" کہتے کہتے رکے۔

"کیا ہوا آفاق صاحب۔۔۔؟"

"گھر تو دونوں ہی برائے فروخت ہیں لیکن اسے آپ سے پہلے ایک پارٹی پسند کر چکی ہے۔۔۔ ایک دو روز میں معاملات طے ہو جائیں گے۔"

"اف۔۔۔" میں نے مایوسی سے ہونٹ کاٹے۔

"اچھا آپ یہ دوسرا مکان دیکھ تو لیں۔۔۔ آپ کو یقیناً" بہت پسند آئے گا۔" آفاق صاحب نے پیشہ ورانہ انداز اپنایا لیکن میرا الجھا دماغ اور مایوس دل اس وقت بالکل ان باتوں کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"معذرت چاہتا ہوں آفاق صاحب لیکن مجھے صرف اسی مکان میں دلچسپی تھی۔"

"اوہ۔۔۔" آفاق صاحب کس سوچ میں پڑ گئے۔

"اچھا تو ایسا کریں، میں آپ کو اس دوسری پارٹی سے ملوا دیتا ہوں۔ اگر آپ ان کو یہ دوسری کوٹھی خریدنے پر راضی کر لیں تو میرا کام بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں دونوں گھر ایک ساتھ ہی بک جائیں۔ قیمت تو ویسے بھی دونوں کی کم و بیش ایک ہی ہے۔"

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں ایک کوشش کر لیتا ہوں۔"

"تو آپ کل صبح نو بجے کورٹ آجائیں۔"

"کورٹ کیوں۔۔۔" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تو وہ ہنس پڑے۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں، دراصل وہ پیشے سے وکیل ہیں اور کل ہم عدالت میں ان کے چیمبر میں ان سے ملاقات کر لیں گے۔"

"جی بہتر۔۔۔" میں نے مصافحہ کر کے ان سے اجازت لی۔

میں اگر چیمبر میں داخل ہونے سے پہلے باہر لگی تختی دیکھ لیتا تو اتنا حیران نہ ہوتا۔۔۔ جبین کو وکیل کے ڈریس میں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگنا لازمی تھا۔ میرے لیے اپنی حالت سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔۔۔ وہ بھی کچھ ایسے ہی احساسات سے دوچار تھی۔ لیکن بہرحال ہمیں جلد ہی خود کو اس جھٹکے سے باہر نکالنا پڑا کیونکہ ایک تیسرا فرد بھی وہاں موجود تھا۔

آفاق صاحب نے جب جبین سے کہا کہ میں بھی وہی گھر لینے میں انٹرسٹڈ ہوں تو اس نے فوراً ہی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے آپ مکان ان کو بیچ دیں۔ جواباً" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ کوئی بات نہیں چاہیں تو مکان آپ خرید لیں۔ اس پر آفاق صاحب نے باری باری ہم دونوں کو حیرت سے دیکھا جو بجائے ایک دوسرے کو قائل کرنے کے ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہو رہے تھے۔

اچھا آپ لوگ خود ہی آپس میں طے کر لیں۔ میرا مقصد آپ کو ملوانا تھا۔ آپ بس چند دنوں میں فیصلہ کر کے مجھے بتا دیں۔" آفاق صاحب کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے میں نے صرف مصافحہ کر کے انہیں رخصت کیا فی الحال جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کرسی کھینچی اور سامنے بیٹھتے ہوئے جبین کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرایا۔

"ایک کامیاب وکیل بننے پر بہت مبارک ہو۔" میں نے ایک نظر اس کے نفاست سے سجے کمرے پر ڈالی۔

"شکریہ۔" اس نے مختصر جواب دیا اور کچھ دیر کے لیے ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ برسوں بعد اچانک ٹکراؤ نے ایک فطری جھجک حائل کر دی تھی اور وہ پرانا بے ساختہ پن جیسے ماضی میں ہی کہیں رہ گیا تھا۔

"اور۔۔۔ تم کیا کر رہے ہو آج کل۔۔۔" بالآخر جبین نے ہی بہت سوچ کر آغاز لیا۔

"لگتا ہے کافی پیسہ کما رہے ہو؟" اس کا اشارہ غالباً" کوٹھی خریدنے کی طرف تھا۔

"ارے نہیں۔۔۔ میں تو ایک پرائیویٹ کمپنی میں سپروائزر کی جاب کر رہا ہوں البتہ ابا کی زمین کا سودا ہونے پر واقعی لاٹری نکل آئی ہے۔" میں نے وضاحت کی تو اس نے سر ہلا دیا۔ ایک بار پھر ہمارے بیچ خاموشی چھا گئی۔

"تمہیں یاد تھا وہ گھر۔۔۔ ابھی تک۔" میں نے کچھ جھجک کر سوال کیا تو وہ ایک دم جھینپ گئی۔

"میری پھوٹو۔۔۔ تمہیں کیوں خیال آیا اس گھر کو لینے کا۔۔۔ میرا مطلب ہے آج کل تو نئے نئے ڈیزائن کے بے شمار گھر بن گئے ہیں شہر میں۔۔۔ بیوی کو پہلے دکھا ضرور دینا شاید اسے زیادہ پسند نہ آئے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے شرارت کی تو میں بھی جواب میں ہنس دیا۔ وضاحت کرنے کو نہ میرا دل چاہا نہ اس نے موقع دیا۔

"اچھا اور میں سوچ رہا تھا کہ تم نے اپنے میاں صاحب کو کیسے "وہ" مکان خریدنے پر قائل کیا ہو گا۔"

"ضرورت ہی نہیں پڑی۔" اس نے فوراً" کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"میرا مطلب ہے 'وہ میری ہر بات مانتے ہیں۔"

"ماشاء اللہ یہ تو اچھی بات ہے۔۔۔ خیر تو کیا طے کیا۔۔۔ میں چاہتا ہوں آفاق صاحب کو آج ہی فائنل جواب دے دوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ تم ہی خرید لو یہ گھر۔۔۔ مجھے تو بس قیمت مناسب لگ رہی تھی اس لیے لینے کا ارادہ کر لیا تھا ورنہ دو' چار اور گھر بھی ہم نے دیکھ رکھے ہیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کوئی اور دیکھ لوں گی۔۔۔" اس نے صفائی دینے کا موقع ضائع نہیں ہونے دیا۔ میں ہنس پڑا۔ چوری پکڑے جانے پر بندے کا کچھ ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہ رہی تھی کہ میں اس کے "وہی" گھر خریدنے کو اس کی محبت پہ محمول کروں میں بنا کچھ کہے باہر آگیا۔

کورٹ سے نکل کر میں پارکنگ میں آیا اور بائیک سنبھالی لیکن اسٹارٹ نہیں کر سکا بس بیٹھا رہ گیا۔ بہت دیر خود کو نارمل دیکھ لیا تھا اب برداشت جواب دے گئی تھی۔ وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ عجیب بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ آج پورے آٹھ برس بعد اس ظالم کو دیکھا تھا۔۔۔ اس سے بات کی تھی۔۔۔ وہ جو میرے معمول کا' میرے وجود کا' میری سوچوں کا مستقل حصہ تھی۔۔۔ کیا وہ واقعی مجسم میرے سامنے تھی۔ میں نے سر جھٹکا "ہاں میرے سامنے ضرور تھی۔۔۔ لیکن اب میری نہیں تھی"۔ میں نے خود ہی اپنے سوالوں کو جواب فراہم کیا اور پھیکا سا ہنس کر بائیک اسٹارٹ کر دی۔

گھر کی پے منٹ کرنے' کاغذات وغیرہ میرے نام ہونے کے سارے معاملات میں ایک ہفتہ لگا اور آج آفاق صاحب نے چابی میرے ہاتھ پہ رکھ دی۔ مزید انہوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ وکیل صاحبہ اب ساتھ والا گھر خرید رہی ہیں۔۔۔ مجھے سن کر کچھ عجیب تو لگا لیکن بنا کوئی تبصرہ کیے چابی لے کر سیدھا نئے گھر آ گیا۔

اماں اور آپا کو گھر پہلے ہی دکھا دیا تھا۔ دونوں نے ہی بہت پسند کیا تھا آج اکیلے آنے کا مقصد یہاں کچھ وقت اکیلے گزارنا تھا۔۔۔ اس گھر کے حوالے سے کی گئی میری اور جبین کی گفتگو جیسے پورے گھر میں گونجنے لگی تھی۔ اس کی ہنسی' اس کے جملے گویا برسوں کا فاصلہ عبور کر کے اس منظر میں آن بسے تھے۔۔۔ لیکن بیل کی آواز مجھے ایک ہی پل میں ماضی سے حال میں کھینچ لائی تھی۔ میں کچھ حیران سا گیٹ پر آیا۔۔۔ دروازہ کھولا تو آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔۔۔ سامنے جبین کھڑی تھی۔ کچھ دیر واقعی مجھ سے بولا نہیں گیا۔ بس اسے دیکھتا ہی رہا۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا تو میں جواب بھی نہیں دے پایا۔ فوری طور پر یہی خیال آیا کہ شاید وہ غلطی سے یہاں آ گئی ہے۔ کیونکہ وہ تو ساتھ والا گھر خریدنے والی تھی۔

"آج بھی یہی سوچ رہے ہو کہ میں غلطی سے اس گھر آگئی"۔ اس نے میرے خیالات پڑھ کر سوال کیا۔

"آج بھی مطلب۔۔۔؟" میں واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"ہاں بہت وقت گزر گیا ہے' یادداشت کہاں اتنا کام کرتی ہے۔ شیخ صاحب کی بیٹی عالیہ کی شادی والی رات بھی تم یہی سمجھے تھے کہ میں غلطی سے تمہارے گھر آ گئی ہوں۔ جب تم نے سیفٹی پن لا کر دی تھی"۔ اس نے یاد دلایا تو میں شرمندہ سا ہنس دیا' لیکن میری حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔ بلکہ یہ پریشانی بھی تھی کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔ اور اس کا شوہر کہاں ہے وغیرہ۔ لیکن جبین میری سائیڈ سے گزر کر اندر آ گئی۔

"فکر نہ کریں میں اکیلی ہوں۔" اس نے پھر میری سوچ پڑھی تو میں سر ہلا کر مڑا وہ دوسری طرف منہ کیے گھر دیکھ رہی تھی۔

"سبین تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا۔۔۔ تم۔"

"ہاں میں جب بھی اپنی مرضی کرتی ہوں، تمہیں اعتراض ہی ہوتا ہے۔" اس نے ماتھے پہ بل ڈالے۔

"ارے میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا کیا ہے، میں تو اپنے گھر کھڑا ہوں، آئی تو تم ہو۔۔۔" مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔

"اچھا تو اگر کوئی اعتراض کرے گا تو تم کھڑے منہ دیکھتے رہو گے، میرا ساتھ نہیں دو گے۔" اس نے بھی ویسا لہجہ اپنایا۔

"جیسے۔۔۔ مجھے کیا کہنا چاہیے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہہ کر سینے پہ ہاتھ باندھے۔

"جیسے پہلے ہم ساتھ گھوما کرتے تھے بنا کسی ڈر خوف کے، تب کوئی روک دیتا، کچھ پوچھ لیتا تو تم کیا کہتے۔" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"عجیب باتیں کرتی ہو، تب تم شادی شدہ کہاں تھیں؟ کہہ دیتا میری بیوی ہو یا منگیتر۔"

"تو اب بھی یہی کہہ دینا۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگی۔

"اچھا جی۔۔۔ اور تمہارا شوہر ہی پوچھ لے تو۔۔۔" میں نے ابرو چڑھا کر اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔۔۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بنا کچھ بولے دیکھتی چلی گئی۔ وہ ایک دم سنجیدہ لگ رہی تھی۔ عجیب کھوئی کھوئی سی نظر تھی میں ذرا گڑبڑا گیا۔

"اس روز بتایا کیوں نہیں کہ تم نے شادی نہیں کی۔"

"بس ویسے ہی۔۔۔ پھر تم نے موقع ہی کہاں دیا تھا وضاحت کا۔" میں نے ماتھے پہ بل ڈالا "ویسے بھی اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔۔۔ وقت بدل گیا ہے اب۔"

"کچھ نہیں بدلا زین۔" اس نے میری بات کاٹی اور ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"بس میری بے اعتباری نے مجھے آٹھ برسوں کی سزا دینا تھی۔ جو شاید اب ختم ہونے والی ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" میں کچھ چونک سا گیا۔

"اب بھی نہیں سمجھے۔۔۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تو میں چپ چاپ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں بھی تمہاری طرح اکیلی ہوں زین۔۔۔ تب سے ہی۔" بالآخر اس نے کہہ دیا۔

"اور تمہاری شادی۔۔۔" مجھے اپنی سماعتوں پہ دھوکا گزرا۔

"ہاں۔۔۔ ان دنوں میری شادی کی بات واقعی چل رہی تھی۔ لیکن رشتہ طے ہونے اور تاریخ رکھے جانے کی بات میں نے جھوٹ کہی تھی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"لیکن کیوں۔۔۔" میں تو چیخ ہی اٹھا۔

"زین اگر تم اس وقت اور ان حالات کو دوبارہ اپنے ذہن میں لاؤ تو شاید میرا فیصلہ تمہیں بھی ٹھیک لگے۔ میں جانتی ہوں کہ ان دنوں میرا تم پر سے اعتبار مکمل طور پر اٹھ چکا تھا۔۔۔ اور میں یہی سمجھنے لگی تھی کہ تم بدل گئے ہو لیکن سچ کہو تم بھی تو یہی چاہتے تھے کہ ہماری دوستی تو قائم رہے لیکن شادی کی بات بیچ میں نہ آئے۔ مجھے یہ سوچ کر ہی اپنی ہتک محسوس ہوتی تھی کہ تم مجھے شادی کے قابل نہیں سمجھتے، بس ٹائم پاس کر رہے ہو۔ تب خود پہ بہت جبر کر کے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور ہو جانا چاہیے لیکن تم سے یہ بات منوانا تقریباً ناممکن تھا۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم رابطے میں تو رہیں لیکن ہر وقت ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ کر بحث مباحثوں میں گرفتار رہیں۔"

اس نے تفصیلی جواب دے کر میری طرف دیکھا تو میں نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ بات معقول تھی۔ اس وقت واقعی ہمارے حالات ایسے ہو گئے تھے کہ شادی ہونا تقریباً ناممکن تھا پھر رابطے میں رہ کر ہم کیا پا لیتے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

"مجھے معاف کر دو سبین۔"

"نہیں زین۔۔۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔ "میں نے تمہارا بھروسا نہیں کیا۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ میری شادی۔۔۔؟" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی اس نے آنکھیں صاف کر کے چہرہ اٹھایا۔

"وہ آفاق صاحب سے ساتھ گھر لینے کے موقع پر میں نے خود ہی تمہارا ذکر چھیڑ دیا تو باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ اچھا ہوا زین صاحب نے بڑا گھر لیا۔ فی الحال تو ان کی فیملی چھوٹی ہے۔ لیکن شادی کے بعد انہیں بڑے گھر کا فائدہ ہو گا"۔

"ہوں۔" میں مسکرانے لگا "تو اب کیا سزا دوں۔"

"جو چاہے۔۔۔" اس نے ہنس کر شرمندگی سے سر جھکایا۔

"ہاتھ آگے کرو۔۔۔" میں نے کہا تو اس نے حیران ہو کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں آج بھی برسوں پرانی یاد جگمگا رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"سزا نہیں مل سکتی۔۔۔ برسوں کی دوری اگر محبت کے گہرے نقوش کو دھندلا نہیں کر پائی تو سمجھو ہم نے آج بھی کچھ نہیں کھویا۔ کبھی کبھی قریب رہ کر آپ فاصلے کی اس حد کو پار نہیں کر سکتے۔ جو دوری کا درد آپ کو سمجھا جاتا ہے۔"

"بڑا فلاسفر ہو گئے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں شاید۔۔۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا۔۔۔؟"

"آفاق صاحب سے تمہیں یہ تو پتا چل گیا کہ میں نے اب تک شادی نہیں کی لیکن تم نے یہ کیسے جانا کہ میں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے حساب سے تو آٹھ سالوں میں کم از کم دو، تین لڑکیاں اور میری زندگی میں آ جانی چاہیے تھیں۔" میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تو وہ سمجھنے والے انداز میں ہنس دی۔

"صحیح کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن دوری نے صرف تمہیں ہی فلاسفر نہیں بنایا، تھوڑی سی عقل مجھے بھی دی ہے۔۔۔ برسوں بعد بھی تم وہی گھر خریدنا چاہتے ہو جو تم کبھی میرے لیے لینا چاہتے تھے۔۔۔ اب تم دس اور لڑکیوں سے بھی دوستی کر لو۔۔۔ اس گھر سے تمہاری وابستگی تو صرف میرے حوالے سے ہے نا۔"

"کیوں۔۔۔ کیا میں باقی لڑکیوں سے وہی بات نہیں کہہ سکتا جو اس روز تم سے کہی تھی۔" میں پوری طرح تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

"نہیں۔" وہ پورے یقین سے مسکرائی "مت بھولو کہ آج میں اور تم اسی گھر کی وجہ سے دوبارہ ایک دوسرے سے ملے ہیں یہ اس سچائی کا ثبوت ہے۔ جو میں نے اس روز تمہارے لہجے میں محسوس کی تھی۔" اس کے لہجے کے اعتماد کے آگے میری ایک نہیں چلی۔ میں ہنس پڑا۔

"تو آؤ۔۔۔ اپنا گھر دیکھو۔۔۔ تم ہی نے کہا تھا کہ پہلے اپنی بیوی کو دکھا دوں، ہو سکتا ہے اسے پسند نہ آئے۔"

"شکر کرو۔۔۔ تمہیں ویسی نخروں والی بیوی نہیں مل رہی۔ میں نے تو برسوں پہلے صرف باہر سے دیکھ کر ہی اسے پاس کر دیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے ساتھ چلنے لگی۔

اور میں نے سر آسمان کی طرف اٹھا کر دل ہی دل میں اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کیا جس نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر عطا کر دیا تھا۔ میں تو برسوں سے صرف محبت کی اس یادگار کو اپنا بنانے کی دعائیں مانگ رہا تھا اور میرے مہربان مالک نے نہ صرف محبت کی یادگار بلکہ میری محبت، میری سبین مجھے عطا کر دی تھی۔

بڑے سچ کہتے ہیں کہ اللہ کے کرم کی بارش اور خزانے کبھی کم نہیں ہوتے اس لیے دعا ہمیشہ مکمل اور پوری مانگنی چاہیے، آدھی ادھوری دعا اس کے شایان شان نہیں اور میں تو آج آنکھیں بند کر کے یقین لے آیا کیونکہ مجھے تو اس نے بنا مانگے مکمل خوشی بخش دی تھی۔ الحمدللہ۔

☆ ☆

فرحین اظفر

کمرے کے ماحول پر فسوں طاری تھا۔

کھڑکیوں اور دروازوں پر گرے بھاری پردوں کے باعث باہر کے وقت کا اندازا کرنا مشکل تھا اور مسلسل جلتی اگربتیوں کا دھواں اور خوشبو آنکھوں میں گھسنے کے باعث گھٹن سی ہو رہی تھی۔ اے سی کی ٹھنڈک خواتین کے مجمع میں اپنی کارکردگی دکھانے سے قاصر تھی۔

خاموشی کا یہ عالم تھا کہ کپڑوں کی سرسراہٹ تک سنی جا سکتی تھی حالانکہ مثل مشہور ہے کہ جہاں دو عورتیں خاموش بیٹھی ہوں تو سمجھ لو کہ وہ بیمار ہیں۔ مگر یہاں تو بڑا سارا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ تمام خواتین کی نظریں، کان اور دھیان ایک ہی جانب مرکوز تھے۔

جہاں دیوار سے لگا کر رکھے گئے بڑے بڑے مخملیں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے "پیرانی بی بی" وجد کے عالم میں جلوہ افروز تھیں۔

سر سے پیر تک سفید براق لبادے میں ملبوس، سفید بے داغ بڑا سا جارجٹ کا حسین، دیدہ زیب لیس لگا دوپٹہ نماز کی طرح لپیٹے ان کی دائیں ہاتھ میں ایک چار تہ کیا ہوا کاغذ انگوٹھے اور درمیانی انگلی کے بیچ دبا تھا۔ انگشت شہادت سے وہ اسے سہلاتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہل رہی تھیں۔ اتنی ہی آہستگی سے بے آواز ان کے ہونٹ چل رہے تھے۔

بند آنکھوں کے پیچھے خدا ہی جانتا تھا کہ کیا جہان آباد تھا۔ فی الحال تو وہ اپنے موکلوں کے ساتھ مصروف تھیں۔

"تھوڑے پردے سرکا دو بیٹی، بہت ـــ" ایک خاتون نے جھجک کر کہنا چاہا۔

"شی ـــ ی ی۔" کی آوازیں جواباً ایک ساتھ ابھریں۔

"بی بی صاحبہ دم کر رہی ہیں۔ انہیں ڈسٹرب نہ کریں۔" ایک عقیدت مند عورت بڑے جذب اور احترام سے بولی۔ خاتون سر جھکا کر مودب ہو گئیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ پیرانی صاحبہ نے سر اٹھایا۔ پاس بیٹھی درخواست گزار مودب عورت کی طرف بڑھا دیا۔

"اسے صبح نہار منہ گھول کر بیٹے کو پلا دینا۔ اللہ نے چاہا تو ضرور شفایاب ہو گا۔" عورت نے ادب سے سر ہلاتے ہوئے تعویذ پکڑ لیا۔

"اور ہاں پنج وقتہ نماز کی پابندی ہر حال میں کیا کرو۔ بندے اور اللہ کا رابطہ دعا کے سوا اور کسی صورت ممکن نہیں۔ ہمارا کام ہے دوا اور دعا۔ ایک کے بنا دوجا ادھورا۔ اللہ سے امید اور کوشش ہی مل کر بندے کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ باقی جو اللہ کی مرضی۔"

وہ ایک شان بے نیازی سے بات مکمل کر کے اگلے حاجت مند کی طرف متوجہ ہو گئیں عورتیں لاجواب ہو کر سر دھننے لگیں۔

"اور ہاں، کمرے میں واقعی گھٹن ہے۔ کسی کو بھی سانس لینے میں مسئلہ ہو سکتا ہے۔ پردے تھوڑے سرکا دو تاکہ محض ہماری وجہ سے کسی کو بے آرامی محسوس نہ ہو۔"

کئی عورتوں نے شکر گزاری کے جذبات سے انہیں دیکھا۔ جو اپنی سرخ آنکھیں آگے بیٹھی عورت پر گاڑے سن رہی تھیں۔

"بالکل بدل گیا ہے میری ایک نہیں سنتا۔ جب سے اس چڑیل کے چنگل میں گیا ہے۔ ضرور اس نے کوئی سفلی کروایا ہے میرے بیٹے پر پچھلے ہفتے میں شدید بیمار رہی۔ ایک بار پلٹ کر ماں کو نہیں پوچھا۔" عورت بات مکمل کرتے ہوئے رونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ نبیل سے جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بات کچھ ایسی تھی کہ شروع ہوتی تو جھگڑے پر ہی ختم ہوتی اس وقت بھی وہ منہ پھیر کر سونے لیٹ چکا تھا۔ بیہ آنسو بہاتی بیٹھی رہ گئی تھی۔

اس کی اور نبیل کی محبت کی شادی تھی اور اس شادی کا سب سے تاریک پہلو یہ تھا کہ یہ شادی نبیل کے گھر والوں کی شدید مخالفت مول لے کر بلکہ ان کے

تم ہی لائے بغیر ہی تی تھی۔ نبیل وعدے کے مطابق بہت جلد اسے گھر والوں کے سامنے لے گیا۔ مگران کا رد عمل اس کی توقع کے برخلاف کہیں زیادہ سخت تھا۔

"شرم نہیں آئی تجھے بے غیرت، جوان بہن گھر پر بیٹھی ہے اور تو' تو شادی رچا کر آگیا وہ بھی میری مرضی اور اجازت تو دور' مجھے اطلاع دینے تک کا خیال نہ آیا۔"

سفید دوپٹے کے ہالے میں سفید جلالی چہرہ دیکھ کر وہ ڈر سی گئی۔

دونوں ہی خواتین اپنے حلیے سے بہت نیک اور عبادت گزار دکھائی دیتی تھیں۔ ایک تو نبیل کی والدہ ہی تھیں دوسری ظاہر ہے ان کی بیٹی اور نبیل کی بہن تھی۔

"امی میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔۔۔ منایا بھی تھا اور آخر میں یہ تک کہا تھا کہ اگر آپ نے دیر کی تو میں خود شادی کرلوں گا۔ لیکن آپ کے پاس میری بات سننے کے لیے فرصت ہی کہاں تھی۔"

"تو کیا تیری بات سنی نہیں تھی میں نے۔" وہ اچانک اتنی زور سے چلائیں کہ بیبہ نے ڈر کر نبیل کا بازو تھام لیا۔

"میں نے تیری بات سنی بھی تھی اور پوری کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن تجھ پر تو بھوت سوار تھا۔ تجھے ماں کی بات سمجھ ہی کب آئی تھی۔"

وہ اپنی لہورنگ آنکھیں بیبہ پر گاڑ کر اس قدر سختی سے بولیں کہ اس کا دل بند ہونے لگا۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا امی بیبہ کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کردیتے اور میں آپ کے وعدے کے انتظار میں بیٹھا رہ جاتا۔"

وہ جب سے بیبہ کو لایا تھا وہیں لاؤنج میں کھڑا سوال جواب کرتے تھک گیا تھا۔

"اور اب' اب ماں کا جو دل دکھایا ہے۔ اس کا اپنے خدا کو کیا جواب دے گا بول۔" وہ تیزی سے ایک قدم آگے آئیں۔ بیبہ بے ساختہ گھبرا سی گئی۔

"تم اوپر چلی جاؤ سیڑھیوں کے بعد جو پہلا کمرہ ہے وہ میرا ہے۔ میں آتا ہوں۔" وہ بیبہ کی گھبراہٹ بھانپ کر تسلی دینے کی خاطر بولا۔

"نہیں' یہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میری اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔" وہ غصہ اور نفرت آمیز لہجے میں بول رہی تھیں۔

"امی خدا کے لیے۔ اس کا نہیں تو میرا خیال کریں۔ میں صبح سے مارا مارا پھر تا رہا ہوں۔ بھوکا پیاسا ہوں۔ مجھے اور پریشان مت کریں۔ چلو بیبہ!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

بیبہ نے آخری نظر اٹھائی تو دونوں چہروں پر نفرت کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ہر جمعرات کی طرح اس جمعرات بھی نذر نیاز' عطاو جزا کی یہ بابرکت محفل جمی تھی۔ زمانے بھر کی ستائی ہوئی عورتیں پیرانی بی بی کے پاس مسائل کے حل کے لیے آتی تھیں۔ فخرالنساء کوئی عالمہ نہ تھیں' نہ انہیں جادو ٹونے یا وظائف و تعویذات کی کوئی خاص شدبد تھی۔ بلکہ وہ جگہ جگہ بیٹھے لوٹ مار کرتے' پیروں فقیروں کی ماڈرن اور قدرے حساس قسم سے تعلق رکھتی تھیں۔

پنجگانہ نماز کی تلقین ہر عورت کو کرنا ان کا فرض تھا۔ خدا پر یقین و نماز کی پابندی اور دعاؤں میں خضوع و خشوع سے تو یوں بھی آدھے دنیاوی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی کامیابی سے اپنی حکمت عملی پر عمل پیرا تھیں۔

تعویذات پر عام طور پر لوح قرآنی درج ہوتی یا دو ایک اثر پذیر نقش تعویذات کو کھول کر دیکھنے کی شدید ممانعت تھی۔

قرآنی صورتوں کی تسبیحات کی نصیحتیں۔

ساس اور بہو کی ازلی' روایتی چپقلش۔

گھر میں نحوست کے سائے' بیماری' بیٹی کے رشتے میں رکاوٹیں۔

انہیں ڈھیروں وظیفے اور مسنون دعاؤں کے علاوہ چھوٹی بڑی ہزاروں بے ضرر' خیر و برکت کی عام سی دعائیں' طویل و مختصر ازبر تھیں۔ مستقلاً "بلاناغہ قرآن پاک پڑھنے سے' آدھے سے زیادہ قرآن انہیں حفظ تھا۔

کبھی ساس کو بہو کے لیے دل نرم کرنے کا کہتے ہوئے' کبھی کسی بہو کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے' کبھی کسی بوڑھے والدین کی ستائی اولاد کو فرماں برداری کا درس دیتے ہوئے۔ حسب ضرورت بڑی خوب صورتی سے آیتوں کے ترجمے سنایا کرتیں۔ خواتین ان کی فہم و فراست کی قائل تھیں۔

ان کا کاروبار بڑی کامیابی سے جاری تھا۔ کیونکہ پہلے سے ہی انہوں نے آنے والی تمام حاجت مندوں سے کہہ رکھا تھا چونکہ وہ ایک بیوہ اور بے سہارا عورت ہیں دو بچوں کی ماں ہیں للذا یہ خدمت خلق فی سبیل اللہ کا بیڑہ وہ نہیں اٹھا سکتیں۔ ان کی صاف گوئی بھی ان کی خوبی ٹھہری۔

"بجائے اس کے کہ میں یہ کہوں کہ میں کوئی فیس نہیں لیتی آپ اپنی مرضی سے جو مرضی نذرانہ دینا چاہیں دے دیں۔ آپ یہاں سے یونہی اپنا فائدہ لے کر نہیں جانا چاہیں گی۔ تو بہتر ہے کہ میں آپ سے خود ہی کہہ دوں۔ میں یہ کام اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لیے کرتی ہوں بے شک۔ میری روزی' روزگار بھی یہی ہے۔ میں جھوٹ کیوں بولوں۔ دنیاوی تعلیم تو بس واجبی سی ہے۔ دینی تعلیم سے اگر کچھ فائدہ ہو جائے اور کچھ مجھ غریب بے سہارا کا بھی بھلا ہو جائے تو کیا برا ہے۔"

وہ اپنا مطمع نظر بڑی خوب صورتی سے بیان کرتی تھیں۔ کوئی چاہ کر بھی اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ کام بے شک دو نمبر تھا مگر انہوں نے دل سے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ وہ اپنے پاس آنے والی عورتوں کو ہمیشہ ہی پیار محبت اور حسن اخلاق کا درس دیتی تھیں۔

کبھی بھول کر بھی کسی سفلی یا کالے جادو کا نام نہ لیا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ وہ خود بھی لوگوں کے دلوں میں برے جذبات کو نمو دینا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں کسی بھی قسم کے جادو یا کالے علم کا توڑ سرے سے آتا ہی نہ تھا۔

عورتوں نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ وہ موکلوں سے بات کرتی ہیں اور ان پر وجد طاری ہوتا ہے اور انہوں نے تردید کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

کسی کام کی گارنٹی دے کر بیڑہ نہ اٹھاتیں اور بات کے آخر میں "آگے جو اللہ کو منظور" کہنا نہ بھولتیں۔

رفتہ رفتہ انہیں اپنے کام میں مہارت حاصل ہوتی گئی۔ ان کی مقبولیت کا گراف اتنا بلند ہو گیا کہ اس میں اپر کلاس کی خواتین بھی شامل ہو گئی تھیں۔

کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کی ملاوٹ کے ساتھ "اللہ کے بھروسے ان کا کام خوب چل نکلا تھا۔ اب تو ان کی فیس بھی درجہ بہ درجہ ترتیب پا چکی تھی اور ایک حد تک غریب غربا کی پہنچ سے باہر بھی نکل چکی تھی۔

تعویذ خود سے لکھ کر دینے کے ریٹ الگ تھے۔ تسبیحات اور درود و وظائف کے الگ۔ کبھی کسی کی حاجت پوری کرنے کے لیے انہیں خود بھی وظیفہ پڑھنا پڑتا جس کی فیس اب بڑھتے بڑھتے تمام ہی خواتین کی قوت برداشت سے تجاوز کر چکی تھی۔ چند ایک معاشی لحاظ سے مضبوط خواتین ہی اسے برداشت کر سکتی تھیں۔

کبھی وہ کسی کو از خود کوئی چھوٹی موٹی وظائف کی کتاب تحفتاً" دے دیتیں۔ تو لینے والی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا اور باقی عورتیں رشک و حسد کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھتیں جسے پیرانی بی بی نے اپنے قابل سمجھا۔

☆ ☆ ☆
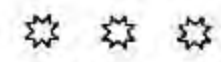
"امی!۔۔۔ امی مجھے معاف کر دیں میں مجبور تھا۔ دیکھیں اتنا انتظار نہیں کر سکتا تھا میں۔" وہ جواب دیے بنا منہ موڑ گئیں۔

"مجھ سے منہ مت موڑیں امی۔ میرا دل دکھ رہا ہے۔ مجھے اندازا ہے آپ کو میری وجہ سے دکھ پہنچا۔ لیکن بیبہ بہت اچھی ہے۔ آپ کے سارے دکھوں کی تلافی کر دے گی۔ بہت خدمت کرے گی آپ کی۔ وہ

صرف آپ کی محبت کی بھوکی ہے۔ امی آپ کی ذرا سی توجہ اور محبت پر آپ کی غلام بن جائے گی
"واہ بھئی واہ۔" کافی دیر سے دوسرے صوفے پر بیٹھی رضوانہ کو بھائی سے شدید چڑ محسوس ہوئی۔
"وہ اگر اتنی اچھی ہے تو یوں چوری چھپے شادی رچانے کی ضرورت کیا تھی۔" نبیل لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا۔
"اس کے گھر والوں نے شرط رکھی تھی کہ وہ امی کی رضامندی کے بغیر اس کی شادی نہیں کریں گے مجھ سے وہ اس کا رشتہ کہیں اور طے کرنے والے تھے۔"
"بے چارے۔ تمہاری بیگم نے تو من کی مراد پالی۔ لیکن اس کے گھر والوں پر کیا گزری یہ سوچنے کا ٹائم شاید نہ ہو ان کے پاس۔"
"تم چپ رہو۔"
"اوہ! مجھے چپ کرا رہے ہو' ہو جاتی ہوں۔ لیکن کس کس کی زبانیں پکڑو گے تم۔" وہ اور تیز ہوئی۔
"امی! مجھے آپ کے سوا کسی کی پروا نہیں۔ مجھے صرف آپ سے معافی چاہیے۔"
"یہ اچھا ہے۔ پہلے لڑکی بھگاؤ۔ پھر آ کر معافی مانگ لو۔ ہیپی اینڈنگ۔"
"بکواس بند کرو۔" نبیل کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے وہ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والیوں کو زمانہ کن ناموں سے یاد کرتا ہے اندازا ہے تمہیں۔" انہیں پھر غصہ چڑھا۔
"امی زمانہ تو ہر ایک کو کسی نہ کسی نام سے یاد کرتا ہے۔"
"ہاں مگر ہر ایک کو برے ناموں سے یاد نہیں کرتا۔ غضب خدا کا نہ نسب دیکھا نہ خاندان۔ صرف شکل پر فدا ہو کر یہ گل کھلا بیٹھے نبیل۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔" آواز میں زبردستی رقت پیدا کر کے انہوں نے دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔
"امی کہہ تو رہا ہوں۔ مجبوری میں قدم اٹھانا پڑا۔ بیہ خود بہت اچھے کردار کی لڑکی ہے۔ یہ سب کرنا اس کے لیے بھی کوئی آسان نہ تھا۔" اس نے پھر لجلجا کر امی کے لتے پکڑ لیے۔
"ارے چل یہاں سے بے غیرت خوب جانتی ہوں میں ایسیوں کے کردار کو جانے کیا کیا چاند چڑھا کر آئی ہے اور معافی تو تو اب بھول جا میرا دل دکھانے کی سزا خوب ملے گی تجھے۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ ناک رگڑ رہی تھیں۔
"مجھے آپ کی ناراضی کا احساس تو تھا۔ لیکن یہ اندازا نہیں تھا کہ آپ بددعاؤں پر اتر آئیں گی۔"
"میں تجھے کوئی بددعا نہیں دے رہی۔" وہ تڑپ کر بولیں۔
"لیکن دکھی ماں کے دل سے آہ بھی نکلتی ہے تا تو اثر رکھتی ہے۔ سمجھا۔ چلا جا میری نظروں کے سامنے سے مجھے تجھ سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

☼ ☼ ☼

محفل برخاست ہو چکی تھی۔
فخرالنسا مغرب کی نماز وہیں ادا کر کے اٹھیں اور اپنے کمرے میں آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک مخملیں ڈبیا تھی۔
"رضوانہ یہ دیکھو۔" انہوں نے وہ ڈبیا کھول کر اس میں سے ایک جھلملاتا ہوا بریسلیٹ نکالا۔
"ہائے اللہ امی۔ یہ کہاں سے آیا۔" رضوانہ اچھل پڑی۔
"وہ بیگ صاحب کی بیگم ہیں موٹی سی جو ڈیفنس سے آتی ہیں۔ لڑکی کا رشتہ ہو گیا نا۔ تو نذرانہ لائی ہیں۔"
"کتنا پیارا ہے اور کتنا مہنگا ہو گا نا۔"
"ہاں۔" وہ گہرا سانس لے کر دوپٹہ کھولتی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔
"ساری زندگی گزر گئی ٹٹ پونجیوں سے ہزار پانچ سو سمیٹتے۔ اصل پھل کھانے کا وقت تو اب آیا ہے۔ سنا ہے تین تین بیٹیوں کی ماں ہیں۔"
وہ بڑے مگن انداز میں اپنا مخصوص دوپٹہ تہ کر رہی تھیں۔ رضوانہ شوق سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اب کہوں گی نصیبن سے میری بیٹی کے لیے بھی کوئی اونچا گھرانہ دیکھو اور یہ کم بخت نبیل۔" ان کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔
"جانے کن بھک منگوں کی سوغات سمیٹ کر لایا ہے۔ ہوتا نا آج کنوارا تو جہاں دل چاہتا وٹے سٹے میں رشتہ کر دیتی۔ ارے اتنا مانتی ہیں مجھے یہ عورتیں بھلا انکار کی جرات تھی کسی میں مگر اس حرافہ کا جادو سر سے اترے تب نا۔"
وہ کچھ دیر پہلے کی نرم گفتاری بھلا کر تنفر زدہ لہجے میں اسے تین چار ہلکی پھلکی گالیوں سے نواز گئیں۔ جبکہ رضوانہ جگر جگر کرتے بریسلیٹ کو کلائی میں پہن کر دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

نبیل کی کوششیں اور بیہ کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ اسے بہت جلد جدہ میں نوکری مل گئی۔ وہ اسے ڈھیروں تسلیاں اور چند دن میں اپنے پاس بلانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ پیچھے تنہا رہ گئی بیہ۔
رضوانہ اور فخرالنسا بات کرنا تو دور اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کے اپنے کمرے سے نکلنے پر پابندی تھی۔ وہ روزانہ صبح سے دوپہر تک بھوک برداشت کرتی اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ فخرالنساء اور رضوانہ دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے کمروں میں جا چکی ہوں گی تب نیچے اترتی۔
باورچی خانے میں کبھی کبھی کچھ کھانے کو مل جاتا۔ تو وہ ندیدوں کی طرح جلدی جلدی ٹھونستی اور کبھی خالی برتن اور لاک لگا ہوا فریج اس کا منہ چڑا رہے ہوتے۔ رات کا کھانا بھی بارہ بجے کے بعد کسی دن کھانے کو ملتا۔ کسی دن نہیں۔
نبیل کو گئے بارہ' پندرہ دن گزر گئے تھے۔ وہ اپنا سیل پاکستان میں اس کے پاس چھوڑ گیا تھا درمیان میں اس کی وہاں سے دو بار بے انتہا مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ بھی کسی پبلک بوتھ سے اس نے کہا تو تھا کہ جلد موبائل لے لے گا۔ تب تک بیہ اپنی اکلوتی دوست اسماء سے باتیں کر کے دل بہلاتی رہتی۔ اپنے کھانے پینے کی مشکل کا ذکر بھی اس نے اسماء سے کیا تھا۔
"ارے اس طرح تو تم آئندہ دس دن میں بھوکی مر جاؤ گی۔"
"تو اور کیا کروں؟" اس کے انداز میں بے چارگی سی تھی۔
"تاک جھانک کرتی رہو اور موقع دیکھ کر فریج میں سے پھل وغیرہ نکال کر اوپر رکھ لو۔ اب تک کیا صرف پانی پر زندہ ہو حد ہو گئی۔" اسماء نے اپنا سر پیٹ لیا۔
اس نے اسماء کی ہدایت پر عمل کیا۔ خیر گزری کہ کسی نے اسے چوری کرتے دیکھا نہیں۔ ورنہ اس کی ساس اور نند دیکھ لیتیں تو حشر کر دیتیں۔
جمعرات کے دن کا درس اور پیرانی بی بی کے معمول کا انکشاف بھی ایک دن یونہی اچانک ہوا۔ وہ اپنی ساس کا یہ روپ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔
اس دن وہ ٹیرس سے نت نئے چہروں والی عورتوں کو اور وہ بھی اتنی تعداد میں لگاتار گھر میں آتا دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ دبے قدموں جا کر ڈرائنگ روم میں جھانکا تو وہاں درس دیا جا رہا تھا۔
پیرانی بی بی سفید چادر پر میرون گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے اگربتی کے دھوئیں کے اس پار اپنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح گھماتے ہوئے بڑے رقت آمیز انداز میں دور حاضر کی نفسانفسی پر افسوس کر رہی تھیں۔
اس ایک لمحے میں بھی ان کی چیل جیسی نظروں نے بیہ کو دیکھا۔ بیان کے تسلسل میں رکاوٹ آ گئی۔ وہ لمحہ بھر کو چپ رہ گئیں اور عورتوں نے مڑ مڑ کر اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ بیہ حسب معمول گھبرا کر پلٹی اور تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔
"یتیم بچی ہے۔ ماں اور بھائی عمرہ کرنے گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے چھوڑ گئے۔ آئیں گے تو چلی جائے گی اپنے گھر۔" لمحہ بھر میں بیان بنا کر انہوں نے حاضرین محفل کی تسلی کے لیے جاری کر دیا۔ معتقدین کے دل میں ان کے درجات بلند ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

جمعہ کی نماز پڑھ کر اس نے خضوع و خشوع سے اپنے اور نبیل کے رشتے کی پائیداری کے لیے دعا کی ' اس کی سلامتی اور رزق و روزگار میں کشادگی کے لیے دعا کی۔ اس پل اس نے خود کو بے حد تنہا محسوس کیا۔

جب سے اسے اپنی ساس کی مصروفیت اور ذریعہ آمدنی کا پتا چلا تھا دل عجیب طرح کے وہموں اور خدشوں میں گھرا رہتا تھا۔

کبھی اسے لگتا وہ کوئی دم درود کر کے اس کا دماغ الٹ دیں گی کبھی لگتا نبیل کا دل اس سے پھیر دیں گی اور اب تو اسے لگتا کہ اس کے اور نبیل کے درمیان دوری بھی ان ہی کی پیدا کردہ ہے۔

"ارے تم تو پاگل ہو۔ اکیلی ہو نا اس لیے یہ خیالات ستاتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ میں آجاؤں تم سے ملنے۔" اسماء پوچھنے لگی۔

"پاگل ہوئی ہو۔"

"تو اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے۔ جمعرات کو عورتیں آئی ہیں نا۔ میں بھی آجاؤں گی۔ کس کو پتا چلے گا۔ تم اپنے گھر کا نقشہ سمجھاؤ۔ میں گیٹ پر آکر بیل دوں گی۔ تم ٹیرس سے مجھے دیکھ کے سیڑھیوں پر آجانا۔" اس نے منٹوں میں سیٹنگ کر ڈالی ' وہ ایسی تھی۔ سوچنے سمجھنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ' فیصلہ کرنے اور کر گزرنے والی۔

اگلے دن وہ اس کے روبرو تھی۔ بیہ کتنی ہی دیر اس کے گلے لگ کر سسکتی رہی۔

"جانے میں کہاں پھنس گئی ہوں اسماء۔ اب دیکھو نبیل نے اب تک اپنا فون نمبر نہیں بھیجا۔ ایڈریس بھی مستقل نہیں ہے میں کیا کروں۔"

"خدا پر یقین رکھو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے جی بھر کے تسلی دی۔ پھر اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔

تھوڑے سے پھل چاکلیٹس ' بسکٹس اور چپس کے پیکٹ ' دودھ اور جوس۔ اتنی ساری چیزیں دیکھ کر بیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میں کیسے تمہارا احسان اتاروں گی اسماء۔"

"تم اس احسان کو یاد نہ کرو تو یہی میرے احسان کا بدلہ ہو گا۔ اچھا وقت کم ہے۔ ایک ہفتہ اس سے کام چلاؤ۔ پھر میں نیکسٹ تھرس ڈے کو اور لے آؤں گی۔"

وقت کم تھا وہ جتنی خاموشی سے آئی تھی اتنی ہی خاموشی سے چلی گئی۔ اس رات نبیل نے اپنے موبائل سے فون کر کے اس سے پوری رات باتیں کیں۔

"اسماء نے ٹھیک کہا تھا۔ سب دھیرے دھیرے ہی ٹھیک ہوتا ہے۔"

فجر کی نماز ادا کر کے بہت دن بعد سکون کی نیند سوئی تھی۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ مسافر منزل پر آکر بھٹک بھی جاتے ہیں۔ یا بھٹکا دیے جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

دیر سے سونے کی وجہ سے دوسرے دن دوپہر کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک سیب دھو کر کاٹے بغیر کچر کچر کھا لیا اور دیر تک اسماء کو دعائیں دیتی رہی۔

ظہر کی نماز ادا کر کے موبائل کی تلاش میں نظریں دوڑائیں کہ نبیل نے اپنا سیل لے لیا تھا۔ مگر سیل وہاں نہیں تھا۔ جہاں رات کو اس نے رکھا تھا۔

وہ ہونق ہو گئی۔ پورا کمرہ چھان مارا ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دی مگر سیل وہاں ہوتا تو ملتا نا۔ وہ بے بسی سے رونے بیٹھ گئی۔

اسے شک تھا کہ رضوانہ نے اس کے کمرے سے موبائل اٹھا لیا ہے۔ ان کے پاس ہر کمرے کے لاک کی چابی موجود تھی اور کل جب نبیل نے اسے فون کیا۔ اس سے پہلے وہ یقیناً "فخر النساء کو یہ بات بتا چکا ہو گا کہ اب میں بیہ سے اپنے موبائل پر بات کروں گا۔

مصیبت یہ تھی کہ وہ ان سے پوچھ سکتی تھی نہ کچھ کہہ سکتی تھی اور نیچے جا کر سیل تلاش کرنا تو ناممکنات میں سے تھا۔

اسے لگ رہا تھا کل وہ رسیوں کی جکڑن سے آزاد

ہوئی تھی اور آج کسی نے اس کے ہاتھ پیر ہی کاٹ ڈالے تھے۔

☼ ☼ ☼

فخر النساء نے فاتحانہ انداز میں موبائل کو دیکھا۔

"یہ کب لائیں؟"

"آپ نے اب دیکھا ہے۔ ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔" رضوانہ آواز دبا کر ہنسی۔ فخر النساء نے اس کا ساتھ دیا۔

"اچھا جبھی نبیل کہہ رہا تھا کہ میرا موبائل کیوں بند جا رہا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔ مجھے کیا پتا۔" انہوں نے دوپٹا اٹھا کر لپیٹا۔

"اچھا میں اندر جا رہی ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھو اور دعا کرو کہ آج بیگ صاحب کی بیگم کوئی امید افزا جواب دے کر ہی جائیں۔"

"اس کا کیا کرنا ہے؟" رضوانہ نے موبائل کا پوچھا۔

"الماری میں ڈال دو اور باقی آکر بتاؤں گی۔" وہ ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئیں۔

ان کی اداکاری میں پہلے سے زیادہ جان آگئی تھی۔ ان کی مریدنیوں میں بیگمات کی وسیع تعداد شامل ہو گئی تھی۔ انہیں اپنے لباس ' انداز اور گفتگو پر خاص توجہ دینی پڑتی تھی۔ زیادہ ملمع کاری میں محنت بھی زیادہ لگتی تھی۔ جبھی درس کے اختتام پر وہ کچھ تھکی تھکی سی تھیں۔

"کیا ہوا؟ بیگ صاحب کی بیگم آج آئی تھیں۔"

"نہیں طبیعت ٹھیک نہیں۔ ملازمہ کو بھیج کر دم کا پانی منگوا لیا بس۔" ان کی تھکن کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

"ہاں مگر ان ہی کے محلے کی ایک دوسری بیگم صاحبہ آئی تھیں آج۔ بڑی پریشان تھیں۔ بہو بیٹے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"تو آپ نے کیا کہا۔"

"میں نے کیا اور کرنا ہے۔ اسم باری تعالیٰ کا ورد کروں گی آج۔ ایک ہفتے کے پندرہ ہزار دے کر گئی ہیں۔" آخر میں انہوں نے فخریہ بتایا۔

"پندرہ ہزار۔ ایسی دو چار اور بے وقوف مل جائیں نا تو آرام سے گزارا ہو جائے۔" رضوانہ ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ اپنے اخلاق سدھرتے نہیں اور شکایتیں دوسروں سے ' نہ نماز پڑھیں نہ روزہ اور خدا سے بے سکونی کا شکوہ۔ ایسی ایسی گالیاں میرے سامنے بھرے مجمع میں اپنی بہو کو دے رہی تھیں۔ بھلا بتاؤں اکیلے میں کیا حشر کرتی ہوں گی۔ مجھے تو بتا دیکھے ہی اس بے چاری پر ترس آنے لگا۔"

فخر النساء افسوس سے کہتے ہوئے اپنی بہو کے ساتھ اپنے ناروا رویے کو یکسر فراموش کر گئیں۔

"ارے ہاں۔ سن رضوانہ یہ دیکھ۔" انہوں نے دوپٹے کے پلو سے بندھی ایک ننھی سی شیشی نکالی۔

"روز رات کو دودھ میں ملا دیا کر۔ چٹکی بھر بھی نا۔" پیرانی بی بی نے یکدم ہی کسی سازشی جادوگرنی کا روپ دھار لیا۔

"اور خبردار جو کچن میں دودھ کے علاوہ کھانے کی کوئی چیز چھوڑی۔" وہ خاص تاکید کر کے کمر سیدھی کرنے لیٹ گئیں۔

یہ شیشی انہوں نے اپنی ایک بہت قریبی معتقد خاص سے بہت آنے بہانے کر کے منگوائی تھی۔

☼ ☼ ☼

پچھلے ایک ہفتے سے اس کی نہ نبیل سے بات ہو سکی نہ اسماء سے ' جمعرات کی شام بھی امید و بیم کے درمیان ڈولتی ہوئی گزر گئی۔ اسما نہیں آئی اور وہ اتنی بے بس تھی کہ صرف اس کا انتظار کرتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ صبح سے فکر کے مارے کچھ کھایا نہیں گیا۔ رات گہری ہوتے ہوتے وہ بھوک سے تڑپتی ہوئی کچن تک آئی۔ اسماء کا دیا ہوا سامان نہ ہونے کے برابر تھا اور چولہے پر دھری دودھ کی دیگچی کے سوا کچھ نہ پا کر وہیں کھڑے کھڑے رونے لگی۔

کورٹ میرج ہزاروں لڑکیاں کرتی ہوں گی۔ مگر اس کی مشکلات الگ ہی نوعیت کی تھیں۔ باہر کھٹکا ہوا اس

کا دل سہم گیا۔

اسے ویسے بھی یہ گھر اور اس کے مکین عجیب پراسرار سے لگنے لگے تھے۔ پورا دن گھر پر خاموشی چھائی رہتی۔ عصر کے وقت اگر بتیاں جل جاتیں۔ اور خاص کر جمعرات کو۔ اس کی ساس کی بارعب اور بھاری آواز نت نئی عورتوں کی آمد اور بھنبھناہٹ اس کے دل کو طرح طرح کے اندیشے اور واہمے ستاتے رہتے۔

اس وقت بھی اس نے گھبراہٹ میں دیگچی منہ سے لگا کر تھوڑا دودھ پیا، تھوڑا گرایا پیٹ تو نہیں بھرا تھا۔ وہ یوں ہی ترستی نگاہوں سے کچن میں کھانے کی کوئی اور چیز تلاش کرتی، مایوسی سے اوپر چلی گئی۔ بمشکل آٹھ یا دس منٹ بعد اسے گہری نیند نے آلیا۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے ایک ہفتے سے روزانہ ہی فون کر رہا تھا۔

"پوچھیں تو اس سے موبائل آف کیوں ہے آخر۔"

"نا! میں نہیں پوچھتی۔" امی کا ایک ہی جواب تھا وہ بے طرح زچ ہو چکا تھا۔

"اگر آپ کچھ چھپا رہی ہیں تو ایسا مت کریں۔ میری اس سے بات کرائیں۔ امی میں بہت پریشان ہوں۔ خدارا میں بہت پریشان ہوں، آپ سمجھتیں کیوں نہیں۔"

"ارے میں تو سب سمجھتی ہوں۔ اب کیا بتاؤں تمہیں۔ سارا دن ساری رات کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ رضوانہ جب بھی کمرے میں گئی اسے سوتا ہوا ہی پایا۔ خدا جانے کیا بات ہے۔"

"تو کیا کھانا وانا بھی نہیں کھاتی۔" اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ فخرالنساء کا دل جل کر خاک ہو گیا۔

"کھانا تو خیر کھا لیتی ہے۔ میں خود ہی دوپہر اور رات میں کچن میں رکھ دیتی ہوں۔ جب ہم کمروں میں ہوتے ہیں۔ تب آ کر کھا لیتی ہے۔"

وہ چپ ہو گیا پھر بولا "اچھا ابھی میری اس سے بات کروائیں۔"

انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر سیل لے کر کمرے میں آ گئیں۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ بے خبر پڑی تھی۔

"اے لڑکی!" انہوں نے آواز دبا کر پکارا۔

"ہونہہ ۔۔۔ ول، ول۔" وہ گہری نیند میں کروٹ لے کر پھر غافل ہو گئی۔

"لو ۔۔۔ بس وہ تو اپنے حواسوں میں نہیں۔" نبیل پر گہری خاموشی طاری تھی۔

"دل تو نہیں مانتا مگر بیٹا مجھے لگتا ہے اکیلے پن سے گھبرا کر وہ نیند کی گولیاں لینے لگی ہے۔ جبھی ۔۔۔" انہوں نے کمال خوب صورتی سے نبیل کے ذہن میں شک کا بیج بونا چاہا۔

"تو اس تنہائی اور اکیلے پن کی ذمہ دار وہ خود تو نہیں۔" ان کا ہمدردانہ وار الٹا پڑ گیا۔ فخرالنساء تپ گئیں۔

"ارے ہاں۔ سارے کیڑے تو ہم میں ہیں۔"

☼ ☼ ☼

رضوانہ دودھ کا گلاس لے کر سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے مندی آنکھوں اور سوئے ذہن کے ساتھ اسے دیکھا اس نے جھک کر دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ ٹھنڈا، میٹھا دودھ حلق سے اتارنے لگی۔

"ایسا کب تک چلے گا امی۔" وہ کمرے میں آ کر فخرالنساء سے اکتا کر پوچھنے لگی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب بند کر کے اسے دیکھا۔

"ہاں میں خود بھی سوچ رہی تھی۔ بلاوجہ ۔۔۔ دن ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔" وہ ادھوری سی مبہم بات کر کے دوبارہ کتاب پر جھک گئیں۔ رضوانہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اپنا سیل لے کر بیٹھ گئی۔

جانے کون سا پہر تھا۔ دن تھا کہ رات، صبح تھی یا شام، سہ پہر، دوپہر، کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ بس ایک نشے میں ڈولتا، نیند بھرا مدہوش انداز اور کچھ ادھورے سپنے۔ کسی نے اس کے سینے پر بھاری وزن رکھ دیا۔ دباؤ

بڑھنے لگا گھٹن بڑھنے لگی۔ پھر تناؤ بڑھ کر گردن پر آ گیا۔ اس نے کسمسا کر گردن کو چھڑانا چاہا۔ لیکن اس بوجھ سے آزاد ہونے میں ناکام رہی سانس لینے میں شدید دشواری کے سبب اس کی آنکھ کھل گئی۔

ادھ سوئے اور آدھے جاگے حواسوں میں کسی کو اس نے خود پر جھکے دیکھا۔ چہرے پر بکھرے بال اور لمبا سفید چوغہ۔ وہ جو کوئی بھی تھا یا تھی۔ بری طرح اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ اس نے ادھ مرے ہاتھوں سے دور ہٹانا چاہا مگر بے سود۔ اس کے حواس بے دار ہونے لگے۔ جان تقریباً نکلنے والی ہو گئی۔ اس کے لب پھڑپھڑانے لگے۔

"کیا مجھے مارنے کی کوشش ۔۔۔" بے جان جسم اور سن دماغ میں اتنی ہی سوچ ابھری تھی۔ اس نے پوری قوت سے خود پر جھکے شخص کو دھکیلا اور اٹھنے کی کوشش میں بیڈ سے گر کر چند لمحے کے لیے بے حرکت ہو گئی۔ پھر کسی نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"چھ ۔۔۔ چھوڑو ۔۔۔ مجھے۔" پوری طاقت صرف کر کے بھی اس کی آواز معمول سے بھی کہیں دھیمی اور ٹوٹی ہوئی تھی اور ہاتھوں کی گرفت اس سے بھی کمزور اور بے دم۔

وہ جو کوئی بھی تھا اسے بے دردی سے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے کر گیا اور باہر لے جا کر سیڑھیوں سے دھکا دے دیا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی مانند دور تک لڑھکتی چلی گئی اور آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ہوش سے بے گانہ ہو گئی۔

فخرالنساء نفرت آمیز انداز میں اس کے سرہانے کھڑی اس کے بے سدھ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔ فجر کی اذانوں کے بعد، صبح صادق کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ گھنٹوں گزر چکے تھے بیہ کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق نہ جاگی تھی۔ اس کے چہرے پر نیل کے نشان نمایاں ہونے لگے تھے اور سر پھٹنے سے بہنے والا خون جم چکا تھا۔ انہوں نے بغور اس کا جائزہ لیا اور پاس کھڑی رضوانہ سے بولیں۔

"چلو بیگ اٹھاؤ ہم لوگ کل تک واپس آ جائیں گے۔ تب تک یہ یہیں پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ان کی بے رحمی اور سفاکی اپنی فطرت کی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ، وہی پیرانی بی بی تھیں جو عورتوں کی اچھی خاصی جماعت کو ہر ہفتے محبت اور مساوات کا سبق دیتی تھیں۔ ان کے جھگڑے اور مسائل ختم کرنے کے لیے تعویذ دیتی تھیں وظائف پڑھتی تھیں

اس وقت ان کے دل و دماغ میں ایک نہایت گھناؤنا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچنے ہی والا تھا۔ اس وقت وہ ایک عورت تھیں۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جھلستی عورت انہیں ہر صورت میں اپنے بیٹے کو اس عورت سے چھٹکارا دلانا تھا۔ جو ان کا کچھ بگاڑنے والی نہ تھی اور ان کے اکلوتے بیٹے کے دل کی خوشی بھی تھی۔

"وہ تو پچھلے کئی دن سے نشہ آور چیزیں استعمال کر رہی تھی۔ صبح، دوپہر، شام رات کوئی یونہی تو اتنی اتنی دیر نہیں سو سکتا۔ وہ تو دھت پڑی رہتی تھی بھئی ہمیں تو پتا نہیں جانے کتنی نازک حالت میں تھی کہ سیڑھیوں سے گر گئی۔ میں اور رضوانہ گھر پر نہیں تھے احتیاط" باہر سے تالا لگا گئے تھے۔ سر پر ایسی چوٹ لگی کہ بس آنا" فانا" چوپٹ ہو گئی۔" رٹا رٹایا بیان انہوں نے رضوانہ کو بھی رٹوایا اور اپنی ایک دور دراز کی رشتے دار سے ملنے ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔

انہیں یقین تھا شام میں ان کی واپسی تک ان کا گوہر مقصود انہیں مل جائے گا۔ نکلنے سے پہلے وہ نبیل کو فون کرنا نہیں بھولی تھیں۔

"تمہاری حسینہ خالہ بہت دن سے یاد کر رہی ہیں۔ ان کی طرف جا رہی ہوں۔ ناشتا بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ نوابن اٹھیں گی تو کھا لیں گے۔ ابھی تو سوئی پڑی ہیں۔" انہوں نے نبیل کو زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ وہ باتھ روم سے نکلی تو ٹی وی دیکھتے اپنے شوہر کو گھورا۔

"کب سے فون بج رہا ہے۔ آپ کو آواز نہیں آتی۔"

"آتی ہے۔ اٹھنے کا دل نہیں کرتا۔" جواب حاضر تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی فون پھر بجنے لگا۔ اس نے تیزی سے بڑھ کر اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔" اس کے چہرے پر الجھن ابھری اور چند پل کے بعد وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"ہیلو بیہ!۔۔۔ بیہ کیا ہوا۔ ہاں ہاں بولو۔ کہاں ہو تم۔ ہاں ہاں میں سن رہی ہوں۔ اسماء ہی ہوں۔ ہاں بولو نا' ہاں ہاں' میری جان کیا ہوا بولو نا۔"

معظم ٹی وی کا والیوم کم کر کے اس کی طرف متوجہ ہوا جواب بات کرتے ہوئے رونا شروع ہو گئی تھی۔

"میں آ رہی ہوں۔۔۔ ہاں' ہاں میں آتی ہوں۔" فون پٹخ کر وہ معظم کی جانب گھوم گئی۔

"معظم وہ بیہ۔۔۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔" وہ بری طرح رو پڑی۔

"مجھے فوراً" اس کے پاس جانا ہے۔"

☼ ☼ ☼

چہرے اور ہاتھوں پر خون کے دھبے تھے اور سر میں درد کے دھماکے' اس کے پورے وجود میں شدید درد اکڑن اور کھنچاؤ تھا۔ پورے جسم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

وہ آنکھیں کھول کر کتنی دیر یاد کرتی رہی کہ وہ کہاں ہے اور اتنی تکلیف میں کیوں ہے پھر رفتہ رفتہ یادداشت کی کھڑکی کھلی اور بے پناہ خوف نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بے حد ڈرے سہمے انداز میں اس نے کسی کو پکارنے کی کوشش کی۔

"امی۔۔۔ رضوانہ۔۔۔ نبیل۔"

کوئی جواب نہ تھا' کوئی آواز نہ تھی۔ بس چاروں طرف خاموشی یا ہوا کی پراسرار آہٹیں۔

"کوئی۔۔۔ کوئی ہے؟" ہتھیلیوں پر دباؤ ڈال کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

اس کے ہاتھوں پر خون لگا تھا۔ سر کے جس حصے میں سب سے زیادہ درد تھا وہاں ہاتھ لگا کر دیکھا تو شدید درد کی ٹیس نے اور بے حال کر دیا۔ مزید خوفزدہ کر دینے والا احساس چپچپاہٹ کا تھا۔ اس کا تنفس تیز ہوتا گیا۔

گھر خالی تھا۔ یقیناً" یہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ بیرونی دروازہ لاکڈ تھا۔ وہ گھسٹتی ہوئی' امی کے کمرے تک پہنچی۔ سامنے اسٹینڈ پر فون دھرا تھا۔

کتنی دیر وہ ریسیور ہاتھ میں لیے اسما کا نمبر یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر دماغ عجیب سن سی کیفیت کی لپیٹ میں تھا۔ سر جھٹکنے کی کوشش نے درد میں اضافہ ہی کیا۔ بالآخر اسے اس کے گھر کا نمبر یاد آ ہی گیا۔

کس طرح اس نے فون ملایا کیا بات کی اور اسماء نے کیا کہا۔ کچھ بھی یاد نہیں تھا اسے ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

فون رکھ کر وہ وہیں نیچے بیٹھ گئی گھٹنے سمیٹے اور بازو لپیٹ کر سر چھپا لیا۔ اس کی ٹانگوں میں بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"کب آئے گی۔۔۔ اسماء۔۔۔ امی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

لمحہ لمحہ بڑھتے خوف نے سر اٹھا کر دیکھنے کی قوت بھی چھین لی تھی۔ یکایک شور سا اٹھا۔ جانے کتنی دیر گزری تھی۔ جب اس شور میں عجیب و غریب سی آوازیں آنے لگیں۔

"دھم۔۔۔ دھم' ٹھک ٹھک۔" اس نے سر اٹھا کر سننے کی کوشش کی۔

"کون ہے۔۔۔ کوئی ہے۔"

اس نے گھر میں لاتعداد سفید سائے بھٹکتے دیکھے۔ یہ گھر آسیب زدہ ہو چلا تھا۔ اسے یاد آیا فخر النساء کے پاس جن قید تھے۔ جواب یقیناً" آزاد ہو چکے تھے۔ اسے اکیلا پا کر اس کا خون چوسنے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"نہیں۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے تم کو قید نہیں کیا تھا۔" وہ خوفزدہ سی مزید سمٹ گئی۔

"بیہ!۔۔۔ بیہ۔" "معاً" کسی نے اسے پکارا۔ یہ آواز تو بہت مانوس تھی۔ اندھیرے چھٹنے لگے' خوف سکڑنے لگا۔ آواز پھر آ رہی تھی۔

"بیہ دروازہ کھولو۔" وہ تیزی سے اٹھی اور اسی لمحے اس کی نگاہ سامنے قد آدم آئینے پر پڑی۔ بکھرے بال اور خون آلود چہرہ۔ اس کے لبوں سے دلخراش چیخ نکلی۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔ وہ متواتر چیخیں مارتی آنے والے کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس مرحلے کے لیے کب سے تیار تھیں۔ دوسرے ہی دن نبیل کا فون آ گیا۔ حالانکہ کل شام واپسی پر خالی ڈھنڈار گھر اور ٹوٹے ہوئے تالے نے انہیں اچھا خاصا حواس باختہ کر دیا تھا۔ لیکن رات کٹتے کٹتے حواس بھی واپس آ گئے اور یادداشت بھی۔

بیہ کی موت انہیں اچھے خاصے جھنجھٹ میں ڈال سکتی تھی۔ لیکن اس طرح غائب ہونے سے ہاتھ بھی بچ گئے تھے اور راستے کا کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ یعنی سانپ مر چکا تھا اور لاٹھی سلامت تھی۔ وہ کہاں جاتی ہے کیا کرتی ہے' ان کی جانے بلا۔ پر یہ بلا سر سے تو ٹل گئی تھی نا۔ ان کا پلان بگڑ کر بھی کامیاب رہا تھا۔

"وہ تو سو رہی ہے۔" ہمیشہ والا جواب حاضر تھا۔ نبیل حقیقی معنوں میں پریشان ہوا تھا۔

"اچھا جیسے ہی اٹھے گی میں فوراً" بات کرا دوں گی۔"

وہ اپنے پلان کے مطابق بات کر رہی تھیں۔

نبیل روز فون کرتا رہا۔ ادھر ایک ہی جواب۔ گھر پر نہ ہونے کا بہانہ' کبھی نیند۔ کردار کشی اور الزام تراشی۔

"بغیر بتائے چلی جاتی ہے۔ رات گئے ڈولتی جھومتی آتی ہے۔ میری تو محلے بھر میں ناک کٹوا دی۔ لوگ کیا کیا باتیں بنانے لگے ہیں۔ اب تو میرے پاس آنے میں سائل عورتیں بھی شرم کھانے لگی ہیں۔ بتاؤ جب میرے جیسی پاکیزہ اور باکردار عورت کے گھر میں

یہ کھیل تماشے ہوں گے۔ تو کون آئے گا' کوئی بھٹکے گا بھی نہیں۔ اچھے بھلے چلتے کاروبار پر پانی پھیر گئی بد بخت۔" وہ کمال کی اداکارہ تھیں اور یہ بات وہ خود اور ان کی بیٹی اچھی طرح جانتی تھی۔

فون پر فون آتے رہے۔ نبیل نے اس کے گھر والوں سے رابطہ کی کوشش کی تو وہ بھی لاعلم نکلے۔ بیہ کی صرف ایک ہی دوست تھی۔ جسے وہ جانتا تو تھا۔ مگر اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

"مجھے تو لگتا ہے میری شریانیں پھٹ جائیں گی دماغ کی۔" ایک دن وہ بے حد جذباتی انداز میں فون پر بولا۔ فخرالنساء پسیج گئیں۔

"وہ..... آخر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی امی۔ میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا۔ یہاں آکر بھی بات ہوتی رہی۔ مجھے پتا ہے وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں تھی امی۔ دو مہینے یا اس سے کچھ زیادہ ہی دن گزرے ہوں گے۔ اتنی جلدی ایسا کیا ہو گیا۔ اگر اب بھی میری اس سے بات نہ ہوئی تو میں سب چھوڑ کر پاکستان آجاؤں گا واپس۔" وہ اس کے لہجے اور انداز سے تھوڑا گھبرا گئیں۔

"نہیں نہیں، تمہیں آنے کی ضرورت نہیں۔ بس بیٹا کیا بتاؤں بات ہی کچھ ایسی ہے کہ....."

وہ آواز دھیمی کرکے اپنی من گھڑت اور من پسند کتھا اسے سناتی چلی گئیں۔

"میرے اندر تمہیں بتانے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے اپنے طور پر کسی سے پتا کروایا تھا۔ مگر وہ تو اپنے گھر بھی نہیں گئی بیٹا۔" نبیل سن دماغ کے ساتھ ایک ایک حرف بے یقینی سے سن رہا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"میں نے اسے اپنی بہو اور گھر کا فرد اسی دن مان لیا تھا۔ جس دن تم اس گھر سے گئے تھے۔ بیٹا تم یہاں سے ہزاروں میل دور چلے گئے تھے۔ میں نے تو سوچا تھا۔ وہ میرے بیٹے کی خوشی اور میری آنے والی نسل کی امین ہو گی۔ مگر....." فخرالنساء سسکیاں بھرنے لگیں۔

"بس کیا بتاؤں اپنا سمجھ کر ہی اسے ہر وقت کمرہ بند کرکے رہنے سے منع کیا تھا۔ باہر نکلو ہنسو بولو۔ گھر کے معاملات دیکھو۔ رضوانہ تمہاری بہن جیسی ہے اس کے ساتھ کچن میں ہاتھ بٹا لیا کرو۔ ارے میں نے تو یہ تک کہا تھا کہ میں تم پر کبھی کوئی ذمہ داری نہیں ڈالوں گی کہ تمہیں بوجھ محسوس ہونے لگے پر اس کے دماغ میں تو اول دن سے خلل تھا۔ اس نے تمہارے جاتے ہی اول دن ہی مجھے جتا دیا تھا کہ وہ یہاں نوکروں یا بے گاروں کی طرح خدمتیں نہیں کرے گی۔"

اس کے اندر مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے فون رکھ دیا۔

فخرالنساء نے ایک دو بار ہیلو کہا پھر فتح مندی کے احساس سے دوچار سرشار ہو کر فون رکھ دیا۔ ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ وضو کرتے وقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ آج درس کے بعد انہیں وچولن کے ذریعے بیگ صاحب کی بیگم کے کان میں بات ڈالنی تھی رضوانہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

بیگ صاحب کی بیگم کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے جو بگڑی تھی تو اب تک سنبھلنے کا نام نہ لیا تھا۔ فخرالنساء کی بات اور رضوانہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر بات چلانے کی کوشش تو کی۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی۔ بنتی ہوئی بات بگڑ بگڑ جاتی۔ وہ مسز بیگ سے مکمل طور پر مایوس نہیں تو کوئی بہت پر امید بھی نہیں رہی تھیں۔

"آپ تو دنیا جہان کے مسئلے مسائل کے لیے دم درود کرتی ہیں بی بی اپنی بیٹی کے لیے بھی کچھ....."

ایک دن ان کی پریشانی بھانپ کر کسی خاتون نے ہمدردی میں مشورہ دے ڈالا۔ وہ اسے گھور کر رہ گئیں۔ اپنی شخصیت پر بڑی محنت سے چڑھائی نرم گفتاری اور خوش اخلاقی کی چادر اتارنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔ ورنہ جی تو کرتا تھا اس کو کھری کھری سنا دیں۔

"رضوانہ ابھی صرف ستائیس کی ہے۔ کوئی اس کی عمر نہیں نکل گئی جو میں اس کے لیے چلے کاٹتی

پھروں۔" نہیں کافی دیر تک پتنگے لگے رہے۔

نبیل ہر ماہ اتنی رقم بھیج دیتا تھا کہ گزارا بفضل خدا ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا۔

ان کا دل اپنے جمعرات والے معمول سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ یوں بھی ایک عمر سے ڈراما کر رہی تھیں اب تھکنے لگی تھیں۔ گھر میں سناٹے بولتے تھے۔ رضوانہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ اور نبیل تھا کسی طرح شادی کے لیے راضی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ نام سے ہی بدک جاتا تھا۔

"تو کب آئے گا پاکستان۔ ایک سال ہونے والا ہے۔ رضوانہ کی بھی کہیں بات نہیں بن رہی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کیا میرا مرا ہوا منہ دیکھنے کا انتظار کر رہا ہے۔" نبیل چند لمحے خاموش رہا۔

"میں کبھی پاکستان نہیں آؤں گا امی۔"

"ہیں کیوں؟ ایسے کیوں کہہ رہا ہے۔" وہ ہول سی گئیں۔

"اس لیے کہ میں یہاں ایک مکمل خوشیوں بھری زندگی گزار رہا ہوں۔" فخرالنساء کو لگا انہیں سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔

"ارے باؤلا ہوا ہے کیا۔ اکیلے گزرتی ہے کبھی زندگی اور وہ بھی مکمل اور خوشیوں بھری۔"

"ہاں اکیلے نہیں گزرتی مگر آپ نے تو مجھے اکیلا کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔"

فخرالنساء کے الفاظ منہ میں رہ گئے منہ کھل گیا۔

"میں یہاں اکیلا کب ہوں امی۔ میری بیوی ہے میرے پاس۔"

"ک..... کون؟" وہ بدقت تمام بولیں۔

"ثوبیہ..... میری بیوی..... جو ایک دن اچانک گھر سے کہیں چلی گئی تھی۔"

ریسیور فخرالنساء کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہتی ہو بوا۔" بیگ صاحب کی آواز ریسیور سے نکل کر پورے کمرے میں پھیل رہی تھی۔

"توبہ کرو توبہ۔" پاس بیٹھی بوا کھسیانی جبکہ فخرالنساء ہونق ہو گئیں۔

"کیوں بیگم صاحبہ وہ اچھی بھلی تو ہیں۔"

"ارے وہ نہیں رہیں گی تو اور کون رہے گا چنگا بھلا۔ جس دن سے ان کی لڑکی کو دیکھ کر آئی ہوں مانو بستر کی ہو کے رہ گئی ہوں۔ ارے ایسی جھاڑ پھونک کرنے والی کی لڑکی لا کر مجھے اتنی جلدی قبر کا منہ نہیں دیکھنا۔"

بوا کے چھکے چھوٹے فخرالنساء کے پسینے۔

"بیٹھے بٹھائے پتے میں پتھری نکل آئی۔ ابھی آپریشن سے اٹھی نہیں کہ سیڑھیوں سے پیر پھسل گیا۔ ارے میں خوب جانتی ہوں ان عورتوں کے چکروں کو۔ ایک پھونک مار کر بیٹی کی شادی سے پہلے اس کی ساس کو لڑھکا دے گی اس کی ماں نہ بابا میں بھر پائی۔"

ان کی چھکا چھک چلتی زبان کو روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ فخرالنساء تو بالکل رونی صورت کی ہو کر رہ گئیں۔ بالآخر بوا نے ہی گھبرا کر لائن کاٹ دی۔ دونوں خواتین ایک دوسرے سے نظریں چراتی رہیں۔ بالآخر بوا بنا کچھ بولے اٹھ کر گھر کو سدھار گئیں۔

اس دن فخرالنساء سچ مچ کے آنسو بہا رہی تھیں۔ بیٹی کی شادی میں رکاوٹ' انکار اپنا وجود اور وہ جھوٹا ڈرا بن گیا تھا۔ جس سے وہ اپنے تئیں خود کو بہت کامیاب سمجھتی رہی تھیں۔ بیٹا دور جا چکا تھا۔ وہ لوگوں کے گھریلو مسائل حل کرنے کے لیے اسم باری تعالیٰ اور اسم محبت کا جادو سکھاتی تھیں۔ لیکن اپنے گھر کے مسئلے میں الٹا فار مولا لگا بیٹھیں جب ہی "پیرانی بی بی" ناکام ہو گئی تھیں۔

☼ ☼

بقیہ: نگہت اسلم چودھری

میں ان کی مشکور ہوں کہ ان کے اندازو اطوار جو اکثر کچھ جتانے کی کوشش میں رہتے ہیں، میرے اندر انقلاب سا برپا کر دیتے ہیں اور ایسے لوگوں کا میری زندگی میں یونہی سلامت رہنا میری کامیابی کی ضمانت ہے اگر یہ لوگ نہ ہوں ان کے طنز کے تیر نہ ہوں تو میں کبھی کامیابی کی سیڑھی عبور نہیں کر سکتی ایک دفعہ پھر میں ان سب کی مشکور ہوں جو مجھ سے حسد رکھتے ہیں، کیونکہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

ہمیں حاسد لوگوں سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

س : کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟
ج : میرے نزدیک کامیابی ناکامی سے بڑھ کر کبھی بھی اہمیت کے حامل نہیں ہو سکتی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کبھی نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر سنبھلنا کمال ہے۔
س : سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا واقعی یہ ترقی ہے؟
ج : اگر اسے ہم ترقی کا نام دے دیں تو پستی کس چڑیا کا نام ہے کیونکہ میرے خیال سے ایک قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنا کام خود نہیں کرتی مگر موجودہ صورت حال کے پیش نظر ہم مشینوں پر منحصر کر کے ست الوجود ہو گئے ہیں ہم دوسروں پر انحصار کرنے لگے ہیں یہ سستی یہ کاہلی ہمیں پستی میں دھکیل رہی ہے۔
س : کوئی عجیب خواہش یا خواب؟
ج : بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ ڈنر (اب ہنسی کیوں آرہی ہے آپ نے سوال ہی ایسا پوچھا ہے)
س : برکھارت کو کس طرح انجوائے کرتی ہیں؟
ج : پانی میں خوب بھیگ کر، ٹھنڈے ٹھنڈے قطروں کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کر کے
س : آپ جو ہیں نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟
ج : میں ضرور ریڈیو کی کمپیئر ہوتی اور ریگولر سوشل پروگرامز کرتی۔
س : آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟
ج : جب اپنے بچپن کو یاد کرتی ہوں وہ چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں، پاپا جانی اور مما جانی کی ڈانٹ، اسکول سے چھٹی کی بہانے اور تمام تر دکھوں اور غموں سے بے گانہ زندگی۔
س : آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟
ج : شریا گھوشال کی مدھر آواز۔
س : کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پا لیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟
ج : ہاں بھی اور نہیں بھی، ہاں اس لیے کیونکہ میں اپنے فیورٹ سبجیکٹ میتھس میں پڑھنا چاہتی تھی اور پڑھ بھی رہی ہوں اور نہیں اس لیے کہ میں آرٹسٹ بننا چاہتی تھی جو کہ میرا دیرینہ خواب تھا مگر ادھورا ہے فیملی کے اختلاف کے باعث۔
س : اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟
ج : دوسروں کے غموں میں غمزدہ ہو جاتی ہوں۔۔۔ غصہ کرنے والی بات پہ رو دیتی ہوں بجائے غصے کے۔
س : کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دے؟
ج : بھیا کی شادی پہ پلازو کے نیچے ہائی ہیل پہن کر بڑی سرشاری سے چل رہی تھی کہ وہ میری ہائی ہیل سینڈل سے ایسا الجھا کہ میں اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ پائی اور اچانک۔۔۔ بس بس وہی ہوا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ بات آج بھی مجھے خفت میں مبتلا کر دیتی ہے۔
س : آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟
ج : اُفوہ مجھے بڑا خوف آتا ہے کہ پتا نہیں میں جیتوں گی یا ہاروں گی۔ ہار کے تو تصور سے ہی میری جان جاتی ہے۔

س : کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہے؟
ج : مقبوضہ کشمیریوں پر کیے جانے والے ظلم و جبر کو نہ ختم نہ کروا سکا۔
س : متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟
ج : قیامت کی نشانیاں، نگہت عبداللہ، فنا (عامر خان اور کاجل)
س : آپ کا غرور؟
ج : میرے تینوں بھائی اور میری آواز کیونکہ آواز کی دنیا میں یہی میری پہچان ہے۔
س : کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جو آپ کو حسد میں مبتلا کرے؟
ج : سادھنا سرگم کی آواز اور ان کی حاصل کی ہوئی کامیابی (ہم عام سے بندوں سے تھوڑی جیلس ہوتے ہیں۔)
س : مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟
ج : مطالعہ ہمارے نالج میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔
س : آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی؟
ج : کٹھن اور آزمائش سے بھرپور جہاں ہر چیز کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے خوشیاں بنا آنسوؤں کے نہیں خریدی جاسکتیں۔
س : آپ کی پسندیدہ شخصیت؟
ج : نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔
س : پسندیدہ مقام؟
ج : میں نہیں جانتی کہ کس مقام کو کس بنیاد پر اپنا پسندیدہ ہونے کا شرف دیا جاتا ہے مگر میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے لیے میرپور بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ وہاں میرا بہت ہی پیارا بہت ہی کیوٹ 93 FM جو ہے جس سے میرے چھوٹے چھوٹے سپنے منسوب ہیں۔

☼ ☼

مردے کے متعلق تین آدمیوں کی گواہی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "جو بندہ مسلم فوت ہوجائے اور اس کے تین قریبی پڑوسی اس کے لیے خیر کی گواہی دے دیں۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' میں نے اپنے بندوں کی شہادت ان کے علم کے مطابق قبول کرلی اور اپنے علم کے مطابق جو جانتا ہوں اسے پوشیدہ کرکے اسے معاف کردیا۔"

9284

(مسند احمد بن حنبل)

امینہ شریف۔۔۔ کراچی

بہترین رہنمائی

خلیفہ الحکم بن خلیفہ عبدالرحمن ثالث کو اپنا محل بنوانا تھا۔ اتفاق سے جو زمین پسند کی گئی اس میں ایک غریب بیوہ کا جھونپڑا آتا تھا۔ اس بیوہ کو کہا گیا کہ یہ زمین قیمتاً" دے دے' مگر اس نے انکار کردیا۔ خلیفہ نے زبردستی اس زمین پر قبضہ کرکے محل بنوالیا۔ اس بیوہ نے قاضی کی خدمت میں حاضر ہوکر خلیفہ کی شکایت کی۔ قاضی نے اسے تسلی دے کر کہا کہ "تم اس وقت جاؤ' میں کسی مناسب موقع پر تمہیں انصاف دلوانے کی کوشش کروں گا۔"

خلیفہ الحکم نے جس دن پہلی مرتبہ محل اور باغ کا دورہ کیا تو اس وقت قاضی بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے خلیفہ سے ایک بوری مٹی لینے کی اجازت چاہی جسے خلیفہ نے قبول کرلیا۔ جب قاضی بوری کو مٹی سے بھر چکے تو خلیفہ نے درخواست کی کہ مہربانی فرماکر اس بورے کے اٹھانے میں ان کی مدد کی جائے۔ خلیفہ نے اسے ایک مذاق سمجھا اور بورے کو ہاتھ لگاکر اٹھانے کی کوشش کی' چونکہ وزن زیادہ تھا۔ اس لیے خلیفہ سے وہ بوری نہیں اٹھائی گئی۔

یہ صورت حال دیکھ کر قاضی نے کہا۔ "اے خلیفہ! جب تو اتنا سا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تو قیامت کے دن جب ہم سب کا مالک انصاف کرنے کے لیے عرش پر جلوہ افروز ہوگا اور جس وقت وہ غریب بیوہ جس کی زمین تو نے بہ زور لےلی ہے' اپنے پروردگار سے انصاف کی خواہاں ہوگی تو اس تمام زمین کے بوجھ کو کس طرح اٹھاسکے گا؟" خلیفہ اس نصیحت سے بہت متاثر ہوا اور فوراً" محل کا ایک حصہ مع تمام سازوسامان کے اس بیوہ کو عطا کردیا۔

خالدہ پروین۔۔۔ بھائی پھیرو

آخری معیار

قطرہ اپنے اندر قلزم کے جلوہ دیکھے یا قلزم کے اندر جاکر اپنا جلوہ دیکھے۔ حقیقت حال کو بیان نہیں کرسکتا۔ قطرہ قطرہ قلزم ہوجائے تو بھی قلزم بیان میں نہ آئے گا۔ ہزار مضامین لکھو' بات بیان ہی نہ ہوپائے گی۔ مبلغین کی خیال آرائیاں' مشائخ کرام کی طریقتیں اور طور طریقے' سیاستدانوں کی تقریریں اور تحریریں اور کوششیں اور نہ جانے کیا' کیا اور پھر حکمرانوں کے احکامات' بس حکم ہی حکم۔۔۔ یہ سب کوششیں ہیں' حقیقت آشنائی کے انداز اور پھر حقیقت بیان سے باہر' ہمیشہ ہی بیان سے باہر۔۔۔ وسعت بیان مل بھی جائے تو بھی بیان وسعت ممکن نہیں۔ بس صرف رونق ہے' صرف جلوہ ہے' دیکھنے والا منظر' غور والی بات' حاصل صرف فنا ہے' صرف اور صرف فنا۔ میرے بعد کیا ہوگا؟ تجھ سے پہلے کیا تھا؟ میں اس کو نہیں مانتا؟ تجھے کون مانتا ہے؟ میں علم تک پہنچ گیا۔ جہالت سے کب جدا ہوا؟ میں ہمیشہ رہوں گا۔ کس کے لیے؟ تم جس کے لیے بھی رہو گے وہ ہمیشہ نہیں رہ سکے گا۔ بہرحال یہ کہانی ختم نہیں ہوسکتی۔ نہ کوئی معیار آخری ہے۔۔۔ نہ کوئی اسلوب انتہائی۔۔۔ لائبریری سے باہر بھی علم ہے اور علم سے باہر بھی علم ہے۔

واصف علی واصف

مدثرہ علوی۔۔۔ کراچی

اہل عشق

کبھی یہ چپ میں کبھی میری بات میں تھا
تمہارا عکس میری ساری کائنات میں تھا

ہم اہل عشق بہت بدگمان ہوتے ہیں
اسی طرح کا کوئی وصف تیری ذات میں تھا

سحرش ساجد۔۔۔ موہڑہ دھمیال

دکھ

رائیگاں جانے کا دکھ
پھر نا لمحہ گئے لمحے کا دکھ
وہ جو گزشتہ تھے وہ آئندہ نہیں
اور آئندہ کبھی پایا نہیں
کچھ اگر پایا تو فقط
رائیگاں جانے کا دکھ

عبیداللہ علیم

نسبت گیلانی۔۔۔ کھروڑپکا

دھیان دیجیے

☆ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آپ کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔

☆ اگر شخصیت میں پختگی ہو تو عادات میں سادگی خود بخود آجائے گی۔

☆ اگر تم والدین کی باتوں پر توجہ دو تو لوہے کی' پتھر کی سلیں بھی تمہارے ہاتھوں موم بن جائیں گی۔

☆ اپنی لاعلمی کے احساس کا نام ہی علم ہے۔

☆ تجسس ذہین لوگوں کی مستقل خصوصیت ہے۔

☆ سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں۔

☆ آدمی اس وقت مرتا ہے جب دل سے اترتا ہے اور زندہ تب ہوتا ہے جب دل میں اترتا ہے۔

☆ دکھ انسانی شخصیت کا جزو ہے۔

☆ محبت تو پتوں کی سائیں سائیں کی طرح ہوتی ہے' نہ دکھائی دیتی ہے' نہ پکڑ میں آتی ہے' بس اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔

☆ وہاں رہنا آپ کی نادانی ہے جہاں آپ کی ضرورت اور قدر نہ ہو۔

☆ اعتبار کی دیواروں کو اتنا مضبوط کرلو کہ اسے شک کا کوئی طوفان گرا نہ سکے۔

ثریا شاف۔۔۔ کھروڑپکا

انمول ہیرے

☆ جو لوگ مال و دولت پر فخر کرتے ہیں انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی دولت کی مثال ایسی ہے کہ جیسے جلتی شمع کو تیز ہوا کے درمیان میں رکھ دیا گیا ہو۔

☆ اگر کچھ لوگ آپ سے زیادہ ذہین ہیں تو مغموم ہونے کی ضرورت نہیں' آپ ان سے زیادہ محنتی بن سکتے ہیں۔

☆ وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں۔ اکثر وقت آنے پر سمجھ نہیں آتی اور سمجھ آنے تک وقت گزر جاتا ہے۔

☆ ہر لفظ کے کئی مطلب ہوتے ہیں اور ہر مطلب میں فرق ہوتا ہے۔

☆ نیند آدھی موت ہے اور موت مکمل نیند۔

☆ اگر تمہارے پاس مال و زر نہیں تو غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں' کیونکہ اگر تمہارے پاس احساس کرنے والا خوب صورت دل ہے تو تم دنیا کے مال دار شخص ہو۔

حافظہ سمیرا۔۔۔ 157 این بی

علاج

ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ کی آنکھ میں کچھ ایسا زخم ہوا کہ طبیب نے معائنہ کرنے کے بعد کہہ دیا کہ حضرت اب اس کا علاج یہی ہے کہ آپ اس آنکھ کو پانی سے بچا کے رکھیں' ورنہ پانی پڑنے کی صورت میں بینائی زائل ہونے کا امکان ہے۔ یہ سن کر آپ مسکرائے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔
"ہم تو نذرانہ جان لیے کھڑے ہیں اور طبیب بینائی جانے سے ڈرا رہا ہے۔" چنانچہ آپ نے اس غیر مسلم طبیب کی بات کا بالکل خیال نہ کیا اور وضو کرکے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کردی اور حسب معمول ساری رات عبادت میں گزاری۔

اگلے دن جب وہ طبیب معائنے کے لیے آیا تو اس نے حیرت سے آپ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
"حضرت یہ آنکھ ایک ہی رات میں کیسے درست ہوگئی۔"
"وضو کرنے سے" جنید بغدادی رحمتہ اللہ نے اطمینان بھرے لہجے میں اسے جواب دیا' یہ سن کر طبیب بہت شرمندہ اور صدق دل سے ایمان لے آیا۔

شبانہ افضل۔۔۔ قصور۔

انمول موتی

☆ ساری دنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لیے چاہتے ہیں۔ صرف ایک تیرا رب ہی ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔

☆ جب رب راضی ہونے لگتا ہے تو بندہ کو اپنے عیبوں کا پتا چلنے لگتا ہے اور یہ اس کی رحمت کی پہلی نشانی ہے۔

☆ کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا رب کریم اپنے بندہ کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔

☆ محبت چہروں سے نہیں دلوں سے' روحوں سے کی جاتی ہے۔ چہرے تو روپ بدل سکتے ہیں' چہرے ایک جیسے ہوسکتے ہیں' لیکن روحیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

☆ خواب ضرور دیکھو' مگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کرو۔ کیونکہ حقیقت کا رنگ صرف اللہ بھر سکتا ہے۔ اس کی مدد کی دعا کرو۔

☆ خوش اخلاقی ایسی خوشبو ہے جو میلوں دور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

☆ سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی' مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔

بنت عبدالملک۔۔۔ کراچی

سکون

ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے اس فنکار کے لیے ایک بڑے انعام کا اعلان کیا جو سکون کی بہترین تصویر بنائے گا۔

کئی فنکاروں نے کوشش کی بادشاہ نے تمام تصویروں کو دیکھا لیکن صرف دو تصویریں ایسی تھیں جو اسے حقیقت میں پسند آئی تھیں اسے ان دونوں میں سے کوئی ایک منتخب کرنی تھی۔

ایک تصویر ایک پرسکون جھیل کی تھی' اس کے اطراف میں بلند و بالا پرسکون پہاڑ تھے جو سکون کا مکمل آئینہ تھے جس کسی نے بھی وہ تصویر دیکھی اس کا خیال یہی تھا کہ یہ سکون کی ایک بھرپور اور مکمل تصویر ہے۔

دوسری تصویر میں بھی پہاڑ تھے لیکن وہ ناہموار' اونچے نیچے اور بے برگ تھے اوپر ابر آلود آسمان تھا جس سے بارش برس رہی تھی اور اس میں بجلیاں کڑک رہی تھیں پہاڑ کے نیچے دامن میں ایک آبشار تھی جس کے گرنے سے جھاگ بلند ہورہے تھے' یہ تصویر کسی طور پر پرسکون نظر نہیں آرہی تھی۔

لیکن جب بادشاہ نے قریب جاکر غور سے وہ تصویر

دیکھی تو اسے آبشار کے عقب میں ایک چٹان کی دراڑ میں ایک چھوٹی سی جھاڑی اگی ہوئی دکھائی دی' اس جھاڑی میں ایک چڑیا نے اپنا گھونسلہ بنایا ہوا تھا اس بپھرے ہوئے تیز بہاؤ کے پانی کے درمیان وہ چڑیا کامل سکون سے اپنے گھونسلے میں بیٹھی تھی۔

" آپ کے خیال میں انعام کون سی تصویر کو ملنا چاہیے تھا؟" بادشاہ نے دوسری تصویر کا انتخاب کیا۔
"آپ جانتے ہیں کیوں۔"
"اس لیے۔" بادشاہ نے وضاحت کی "سکون کا مطلب ایسی جگہ موجود ہونا نہیں ہے جہاں کوئی شور و غل کوئی دشواری' کوئی آواز یا مشقت نہ ہو سکون کا مطلب ہے کہ آپ ان تمام چیزوں کے عین درمیان موجود ہوں اور اس کے باوجود آپ کے قلب میں سکون ہو سکون کے حقیقی معنی یہی ہیں۔"

صغریٰ یاسین۔ کراچی

وہ لفظ جو پھول بنے

○ کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں۔ اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔

○ اگر آپ کو کوئی یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں اصل چیز یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کردے۔

○ ہر چھوڑ کر جانے والا شخص بے وفا نہیں ہوتا اور اسی طرح یہ ہے کہ ہر ساتھ دینے والا شخص آپ کا اپنا نہیں ہوتا۔

○ کچھ غلط فہمیاں انسان کو اپنی ذات کے بارے میں ہوتی ہیں اگر وہ دور ہوجائیں تو اچھا ہے۔

○ بندہ مرے تو یہ اس کا حق ہے ناں کہ اس کی ایک کچی ہی سہی اپنی قبر ہو تاکہ لوگ وہاں آئیں۔ اس پہ ہار پھول چڑھائیں فاتحہ پڑھیں۔

○ اپنا آپ چھپانا نہیں چاہیے ورنہ لوگ کھوج میں لگ جاتے ہیں۔

○ بد اخلاقی دلوں میں سے محبت کو ختم کردیتی ہے جس طرح چھتے میں سے شہد نچوڑ لیا جاتا ہے۔

○ زندگی نشیب و فراز کا نام ہے جہاں کسی کے لیے دکھ' آنسو' غربت ہے اور کسی کے لیے دولت خوشی اور عیش و عشرت ہے۔

صابرہ یار محمد۔ کراچی

رنگ چرائے قوس و قزح کے

* عادتیں شروع میں کچے دھاگے کی طرح ہوتی ہیں مگر بعد میں یہ لوہے کی تاروں کی مانند ہوتی ہیں جن میں انسان جکڑ کر رہ جاتا ہے۔

* دریا اور زندگی دونوں پہ بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا پہ مٹی کا بند اور پیکر خاکی کو ضبط کا بند درکار ہوتا ہے۔

* انسان مایوسی کی انتہا پر پہنچتا ہے تو وہ معجزوں کو آواز دیتا ہے۔

* مظلوم کا ہر آنسو ظالم کے لیے بد دعا بن کر اس کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔

* روح کی گہرائی سے نکلی ہوئی بات روح کی گہرائی تک ضرور جائے گی۔

* جن کا کوئی اپنا مرجاتا ہے ان کے پاس سوگ منانے کا واضح جواز ہوتا ہے مگر ان لوگوں کا کیا کیا جائے جو اپنی اداس صورتوں کی وضاحت نہیں کرپاتے کیونکہ ان کے زندہ بھی مردوں جیسے ہوتے ہیں۔

* انسان کے تخیل اور خواہشات کے درمیان کافی فاصلہ ہے اور یہ فاصلہ صرف آرزو ہی پوری کرسکتی ہے۔

نور الایمان احمد' ڈلوال

☆ ☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے

خالدہ، کی ڈائری میں تحریر
احمد فراز کی غزل

سبھی شریکِ سفر ہیں،

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے
یہاں پہ قافلۂ رنگ و بو اگر ٹھہرے

تو حسن خیمہ برگ و گلاب سب کا ہے
یہاں خزاں کے بگولے اٹھیں تو ہم نفسو

چراغ سب کے بجھیں گے عذاب سب کا ہے
تمہیں خبر ہے کہ جنگاہ جب پکارتی ہے

تو غازیانِ وطن ہی فقط نہیں جاتے
تمام قوم ہی لشکر کا روپ دھارتی ہے

محاذ جنگ پہ مردانِ حر، تو شہروں میں
تمام خلق بدن پر زرہ سنوارتی ہے

ملوں میں چہرۂ مزدور تمتماتا ہے
تو کھیتیوں میں کسان اور خون بھرتے ہیں

وطن پہ جب بھی کوئی سخت وقت آتا ہے
تو شاعرانِ دل افگار کا غیور قلم

مجاہدانِ جری کے رجز سناتا ہے
جلیں گے ساتھ سبھی کیمیا سبھی ہوں گے

اور اب جو آگ لگی ہے مرے دریاؤں میں
تو اس بلا سے نبرد آزما سبھی ہوں گے

سپاہیوں کے علم ہوں کہ شاعروں کے قلم
مرے وطن تیرے درد آشنا سبھی ہوں گے

بشریٰ مزمل فاطمہ، کی ڈائری میں تحریر
فہمیدہ ریاض کی نظم

زبانوں کا بوسہ،

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے
یہ بوسہ کہ جس سے محبت کی صہبا کی اٹھتی ہے خوشبو
یہ بدمست خوشبو جو گہرا، غنودہ نشہ لا رہی ہے
یہ کیسا نشہ ہے!
مرے ذہن کے ریزے ریزے میں ایک آنکھ سی کھل گئی ہے۔
تم اپنی زباں میرے منہ میں رکھے جیسے پاتال سے میری جاں کھینچتے ہو
یہ بھیگا ہوا گرم و تاریک بوسہ
اماوس کی کالی برستی ہوئی رات جیسے امڈتی چلی آ رہی ہے
کہیں کوئی ساعت ازل سے رمیدہ
مری روح کے دشت میں اڑ رہی تھی
وہ ساعت قریں تر چلی آ رہی ہے
مجھے ایسا لگتا ہے
تاریکیوں کے
لرزتے ہوئے پل کو
میں پار کرتی چلی جا رہی ہوں
یہ پل ختم ہونے کو ہے
اور اب
اس کے آگے
کہیں روشنی ہے

تسلیم فلک کی ڈائری میں تحریر،
امجد اسلام امجد کی نظم،

کوئی خواب دشتِ فراق میں سرِ شام چہرا کشا ہوا
مری چشمِ تر میں رکا نہیں کہ تمہارت جگوں کا ڈسا ہوا
میرے دل کو رکھتا ہے شادماں میرے ہونٹوں کو رکھتا ہے گل نشاں
وہی ایک لفظ جو آپ نے مرے کان میں ہے کہا ہوا
ہے نگاہ میں میری آج تک وہ نگاہ کوئی جھکی ہوئی
وہ جو دھیان تھا کسی دھیان میں وہیں آج بھی ہے لگا ہوا
مرے رت جگوں کے فشار میں مری خواہشوں کے غبار میں
وہی ایک وعدہ گلاب سا، سرِ نخلِ جاں ہے کھلا ہوا
تیری چشمِ خوش کی پناہ میں کسی خواب زار کی راہ میں
مرے غم کا چاند ٹھہر گیا کہ تمہارات بھر کا تھکا ہوا
ہے یہ مختصر رہِ عشق پر، نہیں آپ ہم، رہے ہمسفر
تو ہو کس لیے یہ مباحثہ کہاں کون کیسے جدا ہوا
کسی دل کشا سی پکار سے، اسی ایک بادِ بہار سے
کہیں برگ برگ نمو ملی، کہیں زخم زخم ہرا ہوا
ترے شہرِ عدل سے آج کیا سبھی درد مند چلے گئے
نہیں کاغذی کوئی پیرہن، نہیں ہاتھ کوئی اٹھا ہوا

نرگس رحمان کی ڈائری میں تحریر
سلیم کوثر کی نظم،

ابھی کچھ دیر پہلے رات نے پلکیں جھکائی ہیں
مری مٹھی میں اب تک
رات کی پلکوں سے ٹوٹے کچھ ستارے ہیں
دکھوں کے استعارے ہیں
میں ان کو دیکھتا ہوں تو!
تو میری آنکھوں میں ڈھیروں خواب
تعبیروں کے دکھ میں کوئی چہرہ سوچتے ہیں
اور وہ چہرے
شناسا شناسا سے
کئی چہروں میں تبدیل ہوتا ہے
سفر تحلیل ہوتا ہے
پھر ان چہروں سے یادوں کے کئی منظر ابھرتے ہیں
نظر میں رقص کرتے ہیں
وہ چہرے
جو مری تنہائیوں کے اشک پارے ہیں
مجھے ہر حال میں خود سے بھی پیارے ہیں
سب ہی چہرے تمہارے ہیں

مصباح ارم، کی ڈائری میں تحریر
شفیق احمد خان کی نظم

دیوار

تیری آنکھوں نے میرے گرد اک دیوار کھینچی ہے
میں اس سے بھاگ کر جانا بھی چاہوں تو کہیں اب جا نہیں سکتا
کہ پیروں سے کوئی زنجیر بے آواز لپٹی ہے
یہ وہ دیوار ہے جس میں کوئی روزن نہیں کھلتا
میں اس میں در بناتا ہوں تو ہر ایک وحشت میرا راستہ روکے
میرے کانوں میں اک پُر کیف سی آواز آتی ہے
یہاں سے بھاگ کر جانا کوئی آساں نہیں ہے
محبت اس قدر کمزور میری جاں نہیں ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے
میں اس کو توڑنا چاہوں تو شیشہ سر کو آتا ہے
یہاں اڑتا کہاں اس طائرِ بے پر کو آتا ہے
میری ساری توانائی یہاں ناکام ہوتی ہے
یہیں اب صبح ہوتی ہے یہیں اب شام ہوتی ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے
مجھے اس سے مفر کا ایک بھی رستہ نہیں ملتا
کہ اس دیوار کے پیچھے بھی اک دیوار لگتی ہے۔

روبینہ علی کی ڈائری میں تحریر
خاطر غزنوی کی غزل

دل روتا ہے، آنکھوں کے سمندر نہیں روتے
ہم موسمِ باراں میں بھی کھل کر نہیں روتے

اک دردِ بلاخیز کا مرکز ہے دل اپنا
مدت سے ہیں اس درد کے خوگر نہیں روتے

جو فرش نشینِ عرش نشیں ہو گئے روتے
ہم اوجِ ثریا سے بھی گر کر نہیں روتے

کہساروں کے دل پگھلے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں روتے

بے وقت تو آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں آنسو
ہو رونے کا ہنگام تو اکثر نہیں روتے

ہم زخموں کے اشکوں کو بھی بہنے نہیں دیتے
خاطر جو ہیں زخموں کے رفوگر نہیں روتے

فرحت چوہدری، کی ڈائری میں تحریر
نوشی گیلانی کی نظم

اقرار

تم نے اپنی چاہتوں کا اقرار مانگا ہے
تو سنو
دل کے سچے جذبے
اظہار کے محتاج نہیں ہوتے
یہ تو وہ جذبے ہیں جو جگنو بن کر
آنکھوں میں چمکتے ہیں
ہونٹوں کے نرم گوشوں میں رہ کر
دل میں بستے ہیں
تم مجھ میں اسی طرح سمائے ہوئے ہو
کہ جیسے
پھول میں خوشبو
تاروں میں چمک
تتلی میں رنگ
میرا تمہارا رشتہ اٹوٹ ہے
جسم و جاں کا ہے
جو جڑا رہے تو زندگی
اور ٹوٹ جائے تو موت

عظمیٰ طفیل، کی ڈائری میں تحریر
فیض احمد فیض کی نظم

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے

غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدہ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد کرے
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

فرح دیا راؤ، کی ڈائری میں تحریر
محمد محمود احمد کی غزل

چاندنی، ساحل، ہوا، پھولوں کی پلٹی اور میں
رقص میں ڈوبا ہوا تیرا کلفٹن اور میں
راہ میں حائل ہزاروں کائناتوں کی خلیج
جنتِ گم گشتہ ڈھونڈیں جانِ ملٹن اور میں
حافظِ شیراز کی زندہ غزل کے تین شعر
تم تمہارے ہاتھ آنکھیں دل کی دھڑکن اور میں
میں نے لکھا تھا اچھلتے پانیوں پر اس کا نام
بر لبِ ساحل ملے تھے ایک برہمن اور میں

شگفتہ سلیمان

نگہت فیروز ______ کراچی
حسرت سے تک رہا تھا کھلونے کھڑا ہوا
بچہ غریب کا وہ دکانوں کے سامنے

عذرا ناصر ______ کراچی
غریبِ شہر تو فاقے سے مر گیا عارف
امیرِ شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

سونیا تابانی ______ مورہڑہ دھیال
وہ جسے نیند کہا کرتے ہیں سب چین کی نیند
وہ تیرے بعد کبھی آنکھ میں اتری ہی نہیں

ندا یوسف ______ فیصل آباد
تم کو معلوم تو ہو گی یہ کرامت اپنی
سنگِ مرمر پہ دھرو پاؤں تو مخمل کر دو

نمرہ، اقرا ______ کراچی
ہجر کا ناگ تو پتھر گھائل کر دیتا ہے
سونے جیسے شخص کو پیتل کر دیتا ہے
آنکھ کے ریگستان کو تیری یاد کا بادل
چھو جائے تو پل میں جل تھل کر دیتا ہے

گیلانی سسٹرز ______ کھروڑپکا
بہت یکسانیت لگتی ہے اس میں
کہانی میں نیا موڑ لا دو
بظاہر درمیاں کچھ نہ تھا
مقدر ہو گیا حائل بتا دو

نسبت زہرا ______ کھروڑپکا
وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی
ہم لہجہ بدلتے گئے، وہ اجنبی ہو گئے

گڑیا شاہ ______ کھروڑپکا
ہر جرم میری ذات سے منسوب ہے محسن
کیا مرے سوا شہر میں معصوم تھے سارے

صائمہ جیمی ______ کراچی
شاید کسی جہاز کے ٹوٹے ہیں بادباں
پاگل ہوئی ہے ریت سمندر کے آس پاس

خالدہ بشیر ______ ترنڈہ محمد پناہ
قدموں میں تھی زمین سفر فاصلوں میں تھا
وہ تھا میرے قریب مگر راستوں میں تھا
ملنا تھا اتفاق بچھڑنا نصیب تھا
وہ اتنا ہی دور ہو گیا جتنا قریب تھا

کرن، بینش ______ کراچی
غمِ عاشقی سے کہہ دو، رہ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت میرے نام تک نہ پہنچے
جو نقاب رخ اٹھا دی تو یہ شرط بھی لگا دی
اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

امبر گل ______ جھڈو (سندھ)
وجہ بتلانے کی ضرورت ہی نہ رہی
ہم لہجہ بدلتے گئے وہ اجنبی ہو گئے

سنیعہ ______ کھروڑپکا
تیرے بس میں تھی اگر مشعل جذبات کی لو
تیرے رخسار میں گلزار نہ بھڑکا ہوتا
حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ کاجل تیری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات
کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے
جو زخم دیے اس نے غنیمت ہیں کہ عارف
ہر شخص کو یہ قیمتی تحفے نہیں ملتے

ایس۔ آر مسکان ______ جام پور
بساطِ عشق پہ بچھائے گئے مہرے
ذرا سے غلط کیا چلے کہ بازی ہار گئے

حرا قریشی ________ ملتان

ہم اردگرد کے موسم سے جب بھی گھبرائیں
ترے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں

سحرش ساجد ________ موہڑہ دھمیال

چاہتوں کی چاندنی تھی، ہجر کا سایا نہ تھا
تجھ سے ہٹ کر سوچتے وہ مرحلہ آیا نہ تھا
آرزو تھی بے نیاز لفظ و معنی ان دنوں
اب وہ نغمہ ہے لبوں پر جو کبھی گایا نہ تھا

رمشا سحر صدیقی ________ کوٹ چھٹہ

دُکھ بھی دیتا ہے وہ، دعا بھی دیتا ہے
مجھے وہ محبت کرنے کی عجب سزا بھی دیتا ہے
سنگ مرمر پہ دھرو پاؤں تو عمل کر دو
میں یاد کروں تو اسے یاد آتی ہے میری
ورنہ اکثر وہ مجھے بھلا بھی دیتا ہے

مدیحہ ________ کراچی

ہنستے ہوئے لوگوں کو رُلایا نہیں کرتے
ہم زخم جگر اپنا دکھایا نہیں کرتے

سسٹرز ________ کھرڈ

اک بار جسے اپنی نگاہوں سے گرا دیں
اس شخص کو پھر دل میں بسایا نہیں کرتے

فرحی بنت اکرم ________ کلیانہ، گجرات

چلو کائنات بانٹ لیتے ہیں
تم میرے، باقی سب کچھ تمہارا

مدیحہ گوہر ________ چکوال

دُنیا پکارتی تھی تو اُٹھتے نہ تھے قدم
گو بھی تیری صدا تو قدم رقص کر گئے

فوزیہ ________ گجرات

ایک قطرہ تو کیا ہم دریا بھی اس کے نام کر دیتے
وہ کہتا تو سہی ایک بار پہلے سے لکھے ہیں
اس کو یقین دلایا مگر مجھ کو ہی نہ اعتبار آیا
نجانے ایسی بات کیا تھی اس بے وفا کے لہجے میں

عائشہ ________ کراچی

وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اُسے میری چُپ نے رُلا دیا جسے گفتگو میں کمال تھا

روبینہ نعیم ________ کراچی

جب تصوّر مرا چپکے سے تجھے چھو جائے
اپنی ہر سانس سے مجھ کو تری خوشبو آئے
پیار میں ہم نے کوئی فرق نہ چھوڑا باقی
جھیل میں عکس تو میرا ہو نظر تو آئے

مریم ________ محراب پور

تیری تصویر کو سینے سے لگا کر روئے
ہم تصوّر میں تجھے پاس بٹھا کر روئے
تجھ کو سو بار پکارا شبِ تنہائی میں
اور ہر بار تجھے پاس نہ پا کر روئے

تحریم فاطمہ ________ سکھر

تصوّر، آرزو، یادیں، تمنا، شوق و بے تابی
یہ سب چیزیں تمہاری ہیں تم آ کر چھین لو مجھ سے

لیلیٰ شاہ ________ گجرات

بکتا نہ کبھی خون غریبوں کا جہاں میں
دُنیا میں اگر اس کے خریدار نہ ہوتے

آمنہ ناز محمد ________ میرپور ساکرو

غریب دل نے بہت آرزوئیں پیدا کیں
مگر نصیب کا لکھا کہ سب کا خون ہوا

سعدیہ عرفان ________ گاڈن

خود کر اس غریب کی خوشیاں
کتنے صدموں سے مر گئی ہوں گی
جن کو پیمان دوستی دے کر
تیری آنکھیں بکھر گئی ہوں گی

فرزانہ ________ کراچی

ہوئی ہے شہر میں تعمیر اک عمارت پھر
اور اک غریب کا کچا مکان ٹوٹ گیا

رضوانہ ________ لاہور

سات رنگوں سے کھیلنے والا
اک نیا رنگ اُبھار سکتا ہے
زلف ہو یا غریب کی قسمت
دوسرا کب سنوار سکتا تھا

ثمینہ اکرم ________ کراچی

اب کیا کریں کہ پھر سے کوئی یاد آ گیا
بیٹھے تھے آنکھ پونچھ کر، دامن نچوڑ کر

ایم آر کے ________ مظفر گڑھ

دیکھنا اک روز مجھ کو یہ بلا کھا جائے گی
غم پڑا ہے میرے پیچھے گھر کے بھیدی کی طرح

قمر حیات ________ دلاور چیمہ

یہ ضروری تو نہیں ہے کہ آگ سے جل جائے بشر
بعض لوگوں کو مقدر بھی جلا دیتے ہیں

نورین ابرار ________ کراچی

اچھی تو بہت لگتی ہیں یہ جھیل سی آنکھیں
دل اس لیے دھڑکا ہے کہ گہرائی بہت ہے

راحیلہ ________ جمرو سٹی

عجیب چیز ہے یارو یہ منزلوں کی ہوس
کہ راہزن بھی مسافر کو رہنما سا لگے

شازیہ خورشید ________ کبیر والا

سکوت دل میں صدا ہو گیا کوئی نہ کوئی
نہ مل سکا تو دعا ہو گیا کوئی نہ کوئی
امیر شہر نے ایسی رعایتیں بانٹیں
گلی گلی میں خدا ہو گیا کوئی نہ کوئی

مسز نجمہ اشرف ________ بہاول نگر

تو نہ ہو رسوا اس لیے ہم نے
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا
جھوٹ بولا تو عمر بھر بولا
تم نے اس میں بھی ضابطہ رکھا

ایم۔ این۔ جے ________ مظفر گڑھ

اس رات کی فضا میں چھپی تیری باس ہے
تنہا تو میں نہیں ہوں تیری یاد پاس ہے
تو اس کو دیکھ لے تو میرا غم سمجھ سکے
یہ چودھویں کا چاند بھی کتنا اُداس ہے

رفعت جبیں ________ راجن پور

جل رہے ہیں جو دشتِ ظلمت میں
ان چراغوں کی بھی ضیا دیکھو

شہلا شفقت ________ ملتان

اسی سے ہوتا ہے ظاہر جو حال درد کا ہے
سبھی کو کوئی نہ کوئی وبال درد کا ہے
دلوں پہ زندہ تھے دل ہی نہیں رہے ہیں یہاں
اب ایسے شہر میں جینا محال درد کا ہے

عظمیٰ امین ________ کراچی

اُجالے اس قدر بے نور کیوں ہیں
کتابیں زندگی سے دُور کیوں ہیں
کبھی یوں ہو کہ پتھر چوٹ کھائیں
یہ ہر دم آئینے ہی چُور کیوں ہیں

صائمہ بانو تبسم ________ بوچھال

ہم تو محروم ہیں سایوں کی رفاقت سے مگر
آنے والوں کے لیے پیڑ لگا دیتے ہیں

فوزیہ شبیر ________ کراچی

جو دوستی نہیں ممکن تو پھر یہ عہد کریں
کہ دشمنی میں بہت دُور تک نہ جائیں گے

وجیہہ تسنیم ________ اوکاڑہ

سو گئے ہیں چراغ بستی کے
اور پنگھٹ پہ کوئی شور نہیں
دل بہت اُداس ہے لیکن
تم نہ آؤ تو کوئی زور نہیں

عابدہ اکرم عوزی ________ راجن پور

پتھر نہ تراشو کہ یہ چہرے ہی بہت ہیں
تخلیق کو شیشے کی ضرورت نہیں رہتی

فرزانہ قیوم ________ اٹک

چُپ رہتے تو دم گھٹتا اور درد سوا ہوتا
کچھ منہ سے نکل جاتا تو کوئی خفا ہوتا
وہ جب بھی ذرا روٹھا تو چُپ بیٹھے رہے ہم بھی
ایک بار منا لیتے تو روز خفا ہوتا

صائمہ ________ نامعلوم

ہم نہیں جانچتے اُلفت کو تحائف سے مگر
تحفہ دیتے ہیں تو بس جان کا دیا کرتے ہیں

رُباب علی ________ کھلابٹ کالونی

اسی لیے مانگا نہیں اُسے خدا سے کبھی
دُعائیں ہوتی ہیں مغموم، بے ثمر ہو کر
بجھا بجھا اُسے پایا تو کچھ ہوئی تسکین
کہ خوش تو وہ بھی نہیں ہم سے بے خبر ہو کر

❄

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

اروی کوفتہ کری

اشیا :

اروی	آدھا کلو (بڑے سائز کی)
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل (فرائی کرنے کے لیے)	حسب ضرورت

اشیا (برائے کری)

پیاز	دو عدد
ادرک ،لہسن کا پیسٹ	دو چائے کے چمچے
پسی ہوئی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	دو عدد
تیز پات	دو عدد
ٹماٹر	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	ایک کپ

ترکیب :

اروی کو ابال کر گلانے کے بعد چھیل لیں اور ٹھنڈا کرکے اس میں نمک ' مرچ اور باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا ملا کر بھرتہ بنالیں اب اس کے چھوٹے سائز کے کوفتے بنالیں اور فرائی کرکے ایک پلیٹ میں نکال کر رکھتی جائیں اب پیاز کو پیس لیں اور اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ بھی شامل کرلیں اب ایک دیگچی میں آئل گرم کریں بڑی الائچی اور تیز پات ڈال دیں اب اس میں پیاز اور ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کرکے ذرا سا بھونیں اب اس میں چوپ کیے ہوئے ٹماٹر ڈال دیں۔ نمک اور مرچ بھی شامل کرکے اچھی طرح بھون لیں کہ ٹماٹر اچھی طرح مکس ہوجائیں اب حسب ضرورت پانی ڈال کر ایک ابال آنے پر آنچ ہلکی کرکے کترا ہوا دھنیا چھڑک دیں اور چولہا بند کردیں۔ جب پیش کرنا ہو تو اس شوربے میں تیار کیے ہوئے کوفتے بھی ڈال دیں۔ مزیدار اروی کوفتہ کری تیار ہے۔

ٹنڈے کڑاہی

اشیا :

ٹنڈے (ایک جیسے چھوٹے چھوٹے ہوں)	ایک کلو
پیاز	ایک پاؤ (باریک کاٹ لیں)
ٹماٹر	آدھا کلو (باریک کاٹ لیں)
ہری مرچ	10 عدد (کاٹ لیں)
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ ایک پسا ہوا
ہرا دھنیا	گارنش کے لیے
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ٹنڈے چھیل کر دھولیں اور ایک ایک ٹنڈے کو چھری سے چار کٹ لگالیں۔ قاشیں الگ نہیں ہونی چاہئیں ایک کڑاہی میں تیل گرم کرلیں تھوڑے تھوڑے ٹنڈے ڈال کر لائٹ براؤن فرائی کرلیں اور الگ رکھ لیں اس طرح تمام ٹنڈے فرائی کرلیں۔ اب دوسرا برتن لیں جس تیل میں ٹنڈے فرائی کیے تھے اس میں سے چار کھانے کے چمچے تیل لے کر اس برتن میں ڈال دیں گرم ہونے پر پیاز ڈال دیں پیاز جب نرم ہوجائے (لال نہیں کرنی) تو ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال دیں ذرا سا بھون کر سرخ مرچ ' ہلدی اور نمک ڈال دیں ذرا سا چمچہ چلا کر ٹماٹر ڈال دیں اور بھون لیں۔ جب ٹماٹر کا پانی خشک ہوجائے اور مسالا تیل چھوڑ دے تو ہری مرچیں ڈال دیں اور آنچ ہلکی کردیں۔ اب اس مسالے کے اوپر فرائی ٹنڈے رکھتی جائیں ایک دفعہ چمچہ چلائیں تاکہ مسالا اچھی طرح ٹنڈوں کو لگ جائے اب اس میں گرم مسالا ڈال کر دو منٹ کے لیے دم پر لگادیں۔ مزے دار ٹنڈے تیار ہیں۔ ہرے دھنیا سے گارنش کرلیں۔

اشیا :

کریلے	ایک کلو
چنے کی دال	آدھا کلو (20 منٹ بھیگی ہوئی)
پیاز (درمیانی)	چار عدد
کٹی ہوئی لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
لہسن	6 جوے (کٹے ہوئے)
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا (کٹا ہوا)
کلونجی	دو کھانے کے چمچے
املی کا پیسٹ	چار کھانے کے چمچے
ہری مرچ (چھوٹی)	8 سے 10 عدد
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
کوکنگ آئل	آدھا ایک کپ

ترکیب :

سب سے پہلے کریلوں کو چھیل کر ہلکا سا نمک لگا کر پندرہ منٹ کے لیے چھلنی میں رکھ دیں۔ اس کے بعد اسے نچوڑ کر درمیان سے کٹ لگا کر الگ رکھ لیں۔ ایک پتیلی میں ایک کپ آئل ڈال کر گرم کرلیں اب اس میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر کچی پکی کرلیں اس میں لہسن کے جوے 'ادرک ' ثابت گرم مسالا ڈال کر ہلکا سا فرائی کرلیں اب اس میں ہری مرچیں دھو کر ڈنڈی توڑ کر ثابت ڈال دیں۔ اب کٹی ہوئی لال مرچ ' ہلدی ' نمک اور تھوڑا سا پانی ڈال کر بھونیں۔ بھیگی ہوئی دال ڈال کر دو کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر گلالیں جب دال گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو املی کا پیسٹ بھی شامل کردیں۔ اس پکی ہوئی دال میں سے تھوڑی دال نکال کر کریلوں میں بھریں اور اسے دھاگے سے لپیٹ کر بند کردیں۔ پھر الگ پین میں بچا ہوا آدھا کپ آئل ڈال کر ان کریلوں کو ہلکی آنچ پر تل لیں جب یہ ذرا سے نرم اور سنہرے ہوجائیں تو انہیں نکال کر دال میں ڈال دیں اور بچا ہوا تیل بھی ' دال میں ڈال دیں۔ اب کلونجی اور ہرا دھنیا ڈال کر ہلکا سا پانی کا چھینٹا دے کر پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ کریلے چنے کی دال تیار ہے۔

آلو میتھی

اشیا :

آلو	دو عدد (بڑے)
میتھی چھوٹے پتے والی	چار گڈی
مٹن	آدھا کلو
پیاز	چار عدد
ٹماٹر	چار عدد (بڑے)
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	چار عدد
ادرک لہسن کا پیسٹ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
تیل	ایک کپ

ترکیب :

آلو کے ٹکڑے کرلیں۔ میتھی کو کاٹ کر اچھی طرح دھولیں۔ پیاز کو سلائس کی شکل میں کاٹ لیں۔ ٹماٹر چوپ کرلیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے مٹن' پیاز' نمک' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' ادرک لہسن کا پیسٹ' ہری مرچیں ڈال کر گلنے دیں گلنے کے بعد اس میں ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔ مسالے بھوننے لگے تو اس میں آلو اور میتھی ڈال کر بھونیں اتنا کہ میتھی کی اچھی سی خوشبو آنے لگے اور تیل الگ ہونے لگے تو آلو گلنے تک دھیمی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ جب آلو گل جائیں اور تیل اوپر آجائے تو چولہا بند کردیں۔

سبزی قورمہ

اشیا :

آلو	500 گرام
ٹنڈے	500 گرام
ثابت گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
جائفل' جاوتری	چوتھائی چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	چوتھائی چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد (سلائس کاٹ لیں)
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
دہی	ایک کپ
تیل	آدھا کپ
کیوڑا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کرکے اس میں پیاز ڈال کر براؤن کرلیں اور نکال کر پیس لیں۔ اب اسی تیل میں ثابت گرم مسالا' جائفل' جاوتری' لال مرچ پاؤڈر' دھنیا پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر' لہسن کا پیسٹ اور ادرک کا پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو دہی ڈال کر دوبارہ بھونیں اب اس میں آلو اور ٹنڈے شامل کرکے چمچہ چلائیں تھوڑی دیر بعد اس میں تلی ہوئی پیاز ڈال دیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر سبزیوں کے گل جانے تک پکائیں۔ آخر میں جائفل جاوتری اور کیوڑا شامل کرکے دم پر لگادیں مزے دار سبزی قورمہ تیار ہے۔

آم کا اچار

اشیا :

کچے آم	چار کلو (چار چار ٹکڑوں میں تقسیم کرلیں)
میتھی دانہ	100 گرام
کلونجی	125 گرام
رائی	125 گرام
ہلدی پاؤڈر	100 گرام
ثابت سرخ مرچیں	100 گرام (گرائنڈ کرلیں)
نمک	250 گرام
سونف	250 گرام
سرسوں کا تیل	تین سے چار لیٹر

ترکیب :

آم کے ٹکڑوں کو دھولیجیے اور صاف کاٹن کے کپڑے پر پھیلا دیں تاکہ خشک ہوجائیں۔ جب اچھی طرح خشک ہوجائیں تو ان میں ہلدی پاؤڈر اور نمک اچھی طرح مکس کرلیں اور مرتبان میں ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں اوپر سے ململ کا دوہرا کپڑا باندھ دیں اور 24 گھنٹے کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔ دوسرے دن مرتبان کھولیں۔ جمع شدہ پانی بہادیں اور ٹکڑوں کو دوبارہ صاف کاٹن کے کپڑے پر پھیلا کر خشک کرلیں۔ اسی دوران مرتبان کو بھی دھو کر خشک کرلیں۔ اب ایک فرائنگ پین میں تیل اچھی طرح گرم کرنے کے بعد ٹھنڈا کرلیں۔

آم کے ٹکڑے جو کہ خشک ہوچکے ہیں' ان میں میتھی دانہ' کلونجی' رائی' ثابت مرچیں اور سونف اچھی طرح مکس کرلیں اور خشک مرتبان میں ڈال دیں اور اوپر

سے ٹھنڈا کیا گیا تیل ڈال دیں۔

مرتبان ڈھک کر اوپر صاف ململ کا دوہرا کپڑا باندھ دیں' ایک ہفتے تک مرتبان دھوپ میں رکھیں ایک ہفتہ بعد اچار تیار ہوجائے گا۔

بادام کا شربت

اشیاء

بادام کی گری عمدہ قسم کی	آدھا کلو
چینی	ڈیڑھ کلو
الائچی سبز	بارہ عدد
پانی	ایک کلو

ترکیب :

بادام کی گری ایک دن پہلے پانی میں بھگودیں۔ دوسرے دن گریاں چھیل کر سل پر باریک پیس لیں۔ پھر اس میں تھوڑا پانی ڈال کر اتارلیں اور باریک کپڑے میں چھان لیں۔ کپڑے کے بادام نکال کر دوبارہ باریک پیس لیں۔ تین چار مرتبہ ایسا کرنے سے بادام مکمل طور پر پس جائیں گے اور اگر بادام کے موٹے ذرات رہ بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں یہ پسے ہوئے بادام چینی کے ساتھ پانی میں ڈال کر پکنے کے لیے چولہے پر چڑھادیں۔ جب قوام تیار ہوجائے تو الائچی بھی باریک پیس کر اس میں شامل کردیں اور اس کو گاڑھا ہونے دیں۔ یہ شربت بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ اب اسے چولہے سے اتارلیں ٹھنڈا ہونے پر کسی مرتبان میں ڈال لیں۔ دو چمچے ایک گلاس پانی یا دودھ میں ڈال کر نوش فرمائیں۔ دل و دماغ کے لیے مفرح ہوتا ہے۔

شربت لیموں

لیموں کا رس	پانچ چھٹانک
چینی	تین پاؤ
پانی	ایک کلو

ترکیب :

لیموں کے رس کو پانی میں ملا کر کسی صاف قلعی دار برتن میں ہلکی ہلکی آنچ پر جوش دیں پھر چینی کا قوام تیار کریں قوام پر سے میل اتارلیں اور باقی شربتوں کی نسبت اس کا قوام پتلا رکھیں دونوں چیزوں کو پکا کر اسے بھی دوسرے شربتوں کی طرح صاف اور خشک بوتلوں میں محفوظ کرلیں۔ پورے رمضان کام آئے گا۔

نوٹ : شربت تیار کرتے وقت دو باتوں کا خیال رکھیں۔

ا ۔ قوام جس قدر گاڑھا ہوگا وہ شربت جلدی خراب نہیں ہوگا۔

۲ ۔ جن بوتلوں میں شربت محفوظ کرنا ہو انہیں پہلے خوب اچھی طرح دھو کر صاف اور خشک کرلیں اگر بوتلوں میں ذرا بھی پانی رہ گیا تو شربت خراب ہونے کا ڈر ہے۔

شربت بادام

اشیاء

مغز بادام	ایک پاؤ
پانی	سادہ تین پاؤ
چینی	تین پاؤ
دودھ	آدھا پاؤ

ترکیب :

پہلے مغز بادام بھگو کر چھلکا اتار دیں جب چھلکا اتر جائے تو پانی کا چھینٹا دے کر پیس لیں اور چھان کر دیگچی میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں پھر چینی ڈال کر قوام تیار کیجیے قوام کو آدھا پاؤ دودھ کا چھینٹا دیجیے جو میل وغیرہ ہو اوپر سے اتارلیں جب قوام تیار ہوجائے تو نیچے اتارلیں اور ٹھنڈا ہونے پر خشک بوتلوں میں بھرلیں اور نیا کاک لگا کر موم لگادیں ایک تولہ شربت دو چھٹانک پانی میں ملا کر پئیں۔ دماغی کمزوری کے لیے مفید ہے۔

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

ہنر

جعل سازی کے جرم میں جیل پہنچنے والے ایک نئے قیدی سے جیلر نے کہا۔

"یہاں تمہیں کوئی نہ کوئی کام بھی کرنا پڑے گا تمہیں کیا کام آتا ہے؟"

"سر! بس پریکٹس کے لیے دو دن دے دیں۔" قیدی نے درخواست کی۔ "اس کے بعد جیل کے تمام افسران کے چیک میں سائن کیا کروں گا۔"

نسبت منیبعہ۔ کہروڑپکا

مہا کنجوس

ریحان صاحب، نومی صاحب اور سعد صاحب بہت امیر کنجوس آدمی تھے۔ تینوں نہاری کھانے کے لیے فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں گئے۔ خوب اچھی طرح کھا کر وہ تینوں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔

ریحان صاحب نے نومی سے کہا "آپ کا نیا بنگلہ تیار ہوا ہے۔ اس خوشی میں نہاری کا بل آپ ادا کریں۔" تو نومی نے ریحان سے کہا۔ "آپ نے بھی تو پچیس لاکھ کی نئی گاڑی خریدی ہے تو اس خوشی میں ہمارا بل ادا کردیں۔" مگر ریحان ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا سعد سے مخاطب ہوا۔ "تم نے دوسری شادی کی ہے تو اس خوشی میں نہاری کا بل تم ادا کرو۔"

تینوں کنجوس دوست جھگڑنے لگے۔ اتنے میں بیرا آگیا۔ "آپ تینوں کو بل ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"مگر کیوں؟" تینوں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ تینوں کے کپڑے اتنے میلے کچیلے تھے کہ ایک صاحب جس کا نام فرحان خان ہے اس نے آپ کے حلیے کو دیکھ کر باہر بیٹھے غریب آدمیوں کا بل ادا کرنے کے ساتھ ساتھ آپ تینوں کنجوسوں کا بھی بل ادا کردیا ہے۔" بیرے نے کہا۔

زینب صدیقی۔ کوٹ چھٹہ

دلچسپ درخواستیں

ہمارے ملک کے کلرک طبقے کو عام طور پر انگریزی بس برائے نام ہی آتی ہے، لیکن دفتری مجبوری کے تحت انہیں درخواستیں انگریزی میں ہی لکھنی پڑتی ہیں مختصر چھٹیوں کے لیے دی گئی چند درخواستوں کے اردو ترجمے پیش خدمت ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے۔

☆ مجھے اپنے ایک رشتہ دار کی تدفین کے سلسلے میں ٹھیک بارہ بجے قبرستان پہنچنا ہے ہوسکتا ہے کہ میں واپس نہ آسکوں لہٰذا مجھے باقی وقت کے لیے رخصت مرحمت فرمائی جائے۔

☆ اپنی مالی مجبوریوں کی بنا پر مجھے گاؤں کی زمین فروخت کرنی ہے۔ بیوی بھی ساتھ ہوگی، ایک ہفتہ کی رخصت کی درخواست ہے۔

☆ گاؤں میں میری ساس کا انتقال ہوگیا ہے اور چونکہ میں تمام امور میں مکمل طور پر ذمہ دار ہوں اس لیے دس روز کی رخصت منظور کی جائے۔

سعیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑپکا

چاندنی رات

نوجوان ماہر نفسیات کی بیوی نے شوہر سے کہا۔

"کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ چاندنی رات میں کسی

پاگل شخص کا پاگل پن حد سے گزر جاتا ہے؟"

ماہر نفسیات نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اس مسئلہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکوں گا کیونکہ وہ چاندنی رات ہی تھی، جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔"

ثمینہ اعجاز۔ خانیوال

دیدہ دلیری

ایک آدمی تیزی سے ہوٹل میں داخل ہوا اور اس نے کافی لانے کا آرڈر دیا۔ کافی آتے ہی اس نے اسی سرعت سے اسے پی لیا اور پھر پچاس روپے کا نوٹ ویٹر کو دے کر چلا گیا۔

ویٹر نے وہ نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا اور پھر ہوٹل کے مالک کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا، جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ویٹر اس کے پاس پہنچ کر شکایتی لہجے میں بولا۔ "عجیب دیدہ دلیر شخص تھا، تیزی سے آیا، کافی پی، مجھ کو ٹپ دی مگر کافی کی قیمت ادا کیے بغیر ہی رفوچکر ہوگیا۔"

امن عامر۔ کراچی

صحیح طریقہ

ایک لڑکا محلے کی ایک دکان پر پہنچا۔ دکان دار سے ٹیلیفون کرنے کی اجازت مانگی اور فون کرنے لگا۔ دکان دار اس کی باتیں سن رہا تھا۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔ "وکیل صاحب! آپ کو باغ کی دیکھ بھال کے لیے کسی لڑکے کی ضرورت تو نہیں؟ اچھا۔ کوئی لڑکا پہلے ہی آپ کے پاس کام کررہا ہے۔ آپ اس کے کام سے خوش ہیں؟ اچھا جناب بہت شکریہ۔"

"یہ تو اچھا نہیں ہوا کہ تمہیں نوکری نہیں ملی۔" دکان دار نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہوا جناب۔ میں وکیل صاحب کے ہاں ہی ملازم ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "دراصل میں اپنے اور کام کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔"

عائشہ بشیر۔ بھائی پھیرو

لاجواب

دو شادی شدہ خواتین بڑی عمر کی ایک سہیلی کو چھیڑ رہی تھیں، جس کی ابھی تک شادی نہ ہوسکی تھی۔ ایک شادی شدہ خاتون نے کہا۔ "اچھا سچ سچ بتاؤ! ابھی کسی نے تمہیں شادی کے لیے پسند بھی کیا یا نہیں؟"

کنواری سہیلی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "یہ بات تم دونوں اپنے شوہروں سے پوچھتیں تو بہتر تھا۔"

صائمہ ناز۔ چکوال

قابل دید

ایک نوجوان اپنے ایک ڈاکٹر دوست کا مہمان بنا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک شام گونگے، بہروں کے اسکول میں ہونے والے رقص میں شرکت کی دعوت دی۔

نوجوان نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کسی گونگی، بہری لڑکی سے رقص کی درخواست کیسے کروں گا؟"

"اشاروں سے۔" ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ "بس مسکرا کر اس کے سامنے جھکنا اور اس کا ہاتھ پکڑ لینا۔"

تقریب میں نوجوان نے ایک خوب صورت لڑکی کا انتخاب کیا اور ایک گھنٹے تک مسلسل اس کے ساتھ رقص کرتا رہا۔ اتنے میں ایک خوش شکل آدمی لڑکی کے پاس آیا اور بولا۔ "اتنی دیر ہوگئی ہے کیا میرے ساتھ رقص نہیں کروگی؟ ذرا یہ تو خیال کرو کہ میں تمہارا منگیتر ہوں۔"

"اب تم یہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" لڑکی نے آہ بھر کر کہا۔ "اس گونگے بہرے لڑکے سے نجات پانے کی کوئی ترکیب ہی سمجھ میں نہیں آرہی۔"

افشاں شریف۔ کراچی

ہم بھی کسی سے کم نہیں

ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ویٹر کو بلا کر اے سی بند کرنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد اسی خاتون نے ویٹر کو اے سی چلانے کو کہا۔ جب اس قسم

کی فرمائشیں جاری رہیں تو ساتھ والی میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اسی ویٹر کو بلا کر کہا۔ "یہ عورت تم کو بار بار اے سی چلانے اور بند کرنے کا کہہ کر پاگل بنا رہی ہے۔"

ویٹر نے کہا۔ "ارے صاحب! پاگل تو اسے میں بنا رہا ہوں۔ ہمارے پاس اے سی ہی نہیں ہے۔"

یاسمین۔ فیصل آباد

شامت اعمال

ایک صاحب اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔ "گزشتہ رات میرے ساتھ بہت برا ہوا۔ میں رات کو تین بجے گھر پہنچا۔ میری بیوی سو رہی تھی اسے میرے آنے کی آہٹ ہوئی تو غنودگی میں پوچھنے لگی کہ "کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے جلدی سے کہا۔ "صرف بارہ بجے ہیں جان" لیکن عین اسی وقت کم بخت وال کلاک نے تین گھنٹیاں بجا دیں۔"

"پھر تو تم واقعی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہو گے۔" دوست نے کہا۔

"ہاں یار۔۔۔! مجھے دیوار کے ساتھ لگ کر اپنے منہ سے نو گھنٹیوں کی مزید آوازیں نکالنی پڑیں۔" ان صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

ثنا شہزادی۔ کراچی

ازدواجیات

شوہر۔ "ڈاکٹر صاحب میری بیوی کے حلق سے کافی دنوں سے کوئی آواز نہیں نکل رہی، کوئی ایسی دوا دیں کہ وہ باتیں کرنے لگے۔"

ڈاکٹر۔ "بہت آسان ترکیب ہے، آج شام ہی کسی گرل فرینڈ کو گھر لے جائیں۔"

☼ ☼ ☼

ایک شخص ایسا روبوٹ گھر لایا، جو جھوٹ بولنے پر تھپڑ رسید کر دیتا تھا۔ اگلی صبح اس کا بیٹا بولا۔

"پاپا آج میں اسکول نہیں جاؤں گا۔ میرے پیٹ میں درد ہے۔"

روبوٹ نے اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

باپ نے کہا۔ "دیکھو بیٹا! آپ نے جھوٹ بولا، اسی لیے آپ کو سزا ملی ہے، میں جب آپ جتنا تھا تو کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔"

روبوٹ نے باپ کو بھی ایک تھپڑ جڑ دیا۔ بیوی ہنستے ہوئے بولی۔

"آپ ہی کا بیٹا ہے۔"

اب کے تھپڑ پڑنے کی آواز بیوی کے گال پر سے آئی۔

فرح بشیر۔ بھائی پھیرو

محبت نامہ

لڑکی اپنی سہیلی کو اپنے محبوب اور ہونے والے شوہر کا خط پڑھ کر سنا رہی تھی۔

"انہوں نے لکھا ہے کہ میں ہر وقت تمہارے پانچ فٹ تین انچ قد، تمہاری اٹھائیس انچ کمر، ڈیڑھ فٹ کی لمبی زلفوں، بادامی آنکھوں اور تمہارے بائیں پاؤں کی ہلکی سی لنگڑاہٹ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

"یہ کچھ عجیب سا محبت نامہ نہیں ہے؟" سہیلی نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! دراصل میرے منگیتر تھانے میں ہوتے ہیں اور "تلاش گمشدہ" کی رپورٹ اکثر وہی لکھتے ہیں۔" لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

شبانہ۔۔۔ لاہور

ذہانت شرط ہے

اس علاقے میں پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی ممنوع تھی۔ پھر بھی ایک شخص نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرے ہی دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے جرم کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے اور اسے گرفتار کیا جانے والا ہے۔ اس نے علاقے کے حاکم کو اطلاع دی کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ حاکم نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا۔

اس شخص نے اپنی دونوں بیویوں کو کار میں بٹھایا اور

حاکم سے ملنے روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک قبرستان پڑتا تھا۔ اس نے پہلی بیوی کو قبرستان میں اتار دیا اور دوسری بیوی کے ساتھ حاکم کے پاس پہنچ گیا۔ حاکم نے دریافت کیا۔

"تمہارے علم میں آیا ہے کہ تم نے دوسری شادی کی ہے۔"

"درست ہے جناب!" اس شخص نے اقرار کیا۔ "یہ ہے وہ عورت، جس سے میں نے دوسری شادی کی ہے۔"

حاکم گرج کر بولا۔ "تمہاری پہلی بیوی کہاں ہے؟"

اس شخص نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میری پہلی بیوی اس وقت قبرستان میں ہے۔"

"اوہ مجھے افسوس ہے۔۔۔؟" حاکم نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "آپ جائیں، سپاہی آپ کو تنگ نہیں کریں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔"

کشور منیر۔ کراچی

خدمت

ایک زیر تفتیش مشتبہ ملزم نے ایک پولیس افسر کی دعوت کی۔ دعوت میں پولیس افسر اکیلا دو مرغ چٹ کر گیا۔ کھانے کے بعد پولیس افسر نے صحن میں ایک بوڑھے مرغ کو سینہ نکالے تن کر چلتے ہوئے دیکھا تو بولا۔

"واہ بھئی واہ! آپ نے مرغ کو دیکھا کیسے سینہ تان کر چل رہا ہے۔"

"جی ہاں، کیوں نہیں! سینہ تان کر فخر سے چلے کہ اس کے دو بیٹوں نے ایک پولیس افسر کی خدمت کی ہے۔"

میزبان نے جل کر طنز کیا۔

نادیہ قدیر۔ ٹنڈو الہ یار

کفایت شعاری

کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مرغ پال لیتے ہیں، تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر حلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان کی بانگ سن کر۔۔۔ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کے اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

فریدہ۔ لاہور

پشیمانی

ایک صاحب اپنے دوست سے نئی نسل کی بے راہ روی کی شکایت کر رہے تھے۔

"میں نے اپنے بیٹے کو یونیورسٹی میں اس لیے داخل کرایا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا مگر وہ وہاں نشہ کر کے خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔" دوست نے دلاسا دیا اور کہا کہ "آج کل کے نوجوان یونیورسٹیوں میں ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔" باپ کے منہ سے سرد آہ نکلی اور وہ بے اختیار بولا۔

"اس سے تو اچھا تھا کہ میں بیٹے کو دکان پر بٹھاتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔"

ارم الیاس خانزادہ۔ ٹنڈو الہ یار

زمانہ

استاد شاگرد سے۔ "بتاؤ یہ کون سا زمانہ ہے۔"

"میں نقل کر رہا ہوں، وہ نقل کر رہا ہے، آپ نقل کر رہے ہیں۔"

شاگرد۔ "سر! امتحان کا زمانہ ہے۔"

ردا شکیل۔ کورنگی کراچی

حسن و صحت

ادارہ

دھوپ میں باہر نکلنا صرف اسی صورت میں نقصان دہ ثابت ہوتا ہے جب اس کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی جائے۔ اگر آپ اپنے بالوں کو دھوپ کی تمازت کے باعث پہنچنے والے نقصان سے بچانا چاہتی ہیں تو پھر درج ذیل احتیاطی تدابیر پر عمل کیجئے۔

1 ۔ دھوپ میں باہر نکلنے سے قبل اپنے بالوں کو دوپٹے' ہیٹ یا اسکارف سے ڈھانپ لیا کریں۔

2 ۔ دھوپ کی تمازت سے بالوں کو بچانے والے کچھ لوشن بھی بازار سے مل جاتے ہیں اگر آپ ہیٹ یا اسکارف سے اپنا سر ڈھانپنا نہیں چاہتی تو پھر اپنے بالوں پر لوشن خرید کر لگائیں۔ یہ لوشن ایک قسم کے کنڈیشن کریم ہوتی ہیں' جو بالوں کو سورج کی گرم شعاعیں بالوں پر پڑ کر انہیں خشک اور کھردرا بناتی ہیں' اس کے لیے کوشش یہ ہی کرنی چاہیے کہ بالوں پر دھوپ نہ پڑ سکے۔

3 ۔ گرم اور مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے آپ کے بالوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اپنے بالوں کو کنڈیشنز اور جیلز ضرور لگائیں۔

4 ۔ سمندر اور دریا کے کنارے پر پیراکی کرنے والی خواتین کو چاہیے کہ وہ بہت زیادہ احتیاط کریں۔

5 ۔ گرم موسم کی طرح سردی کا موسم بھی بالوں کے لیے خیر خواہ ثابت نہیں ہوتا۔ سرد اور خشک ہوائیں بالوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ بالوں کو سرد ہونے سے بچانے کے لیے گھر سے باہر نکلتے وقت سر کو گرم اسکارف سے ڈھانپ لیا جائے۔ دوپٹہ اور شال بھی اس سلسلے میں کام آسکتی ہیں۔

سرطان سے بچنے والی سبزیاں

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بعض غذائی اشیاء میں خاص مقویات' کیمیائی مرکبات اور بیکٹیریا ہوتے ہیں جو اکثر بیماریوں کو روکتے اور اکثر دور کرتے ہیں۔ نیز ان سے توانائی میں اضافہ ہوتا ہے' سیکڑوں تحقیقی مطالعوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سبزیاں اور پھل بیماریوں کا بڑا موثر دفاع کرتے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ سبزیوں میں بند گوبھی' پھول گوبھی' شاخ گوبھی' بروکلی اور پالک وغیرہ سرطان اور بعض دیگر امراض سے محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں مانع تکسید اینٹی اوکسیڈنٹ عنصر خوب ہوتا ہے۔ کروسیفورس سبزیاں مثلاً" پھول گوبھی کے نوع یا فیملی کی یہ سبزیاں غذا کا ایک اہم جز بن جائیں تو ہم اپنی صحت کو متعدد خرابیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں' انہیں کچا بھی کھایئے اور پکا کر بھی' لیکن کوشش یہ کیجئے کہ روزانہ ان میں سے ایک سبزی ضرور کھالیں' البتہ یہ نہ کیجئے کہ روزانہ بس ایک ہی سبزی کھاتے رہیں' سبزیاں بدل کر کھایئے' کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی مقویات ہیں اور اپنے اپنے فائدے۔ آیئے ایک نظر ڈالتے ہیں کہ یہ مقویات کیا ہیں۔

1 شاخ گوبھی

خصوصیات کے لحاظ سے اس نوع میں یہ سبزی سب سے آگے ہے گہرے سبز رنگ کی یہ پھول گوبھی ہمارے ملک میں دستیاب نہیں تھی۔ لیکن اب اکثر

شہروں میں مل جاتی ہے' بروکلی یا شاخ گوبھی میں بیٹا کیروٹنی' حیاتین ج' پوٹاشیم' کیلشیم' فولک ایسڈ اور متعدد کانباتاتی کیمیکلز ہوتے ہیں۔

2 برسلز اسپراؤٹ یا نبتہ

ان میں سلفورافین اور دیگر نباتی کیمیکلز خوب ہوتے ہیں اور مانع تکسید اجزاء بھی پائے جاتے ہیں' غذائی ریشے کے حصول کے لیے یہ سبزی بہت اچھی ہے۔

3 بند گوبھی

بند گوبھی بھی کی مختلف اقسام میں متعدد مانع تکسید مرکبات پائے جاتے ہیں' چائنا کی بند گوبھی میں بیٹا کیروٹین' حیاتین ج' پوٹاشیم اور کیلشیم کی مقدار خصوصی طور پر زیادہ ہوتی ہے۔

4 پالک

اس میں بیٹا کیروٹین کی مقدار شاخ گوبھی کی نسبت چار گنا ہوتی ہے اور حیاتین ج اور کے حصول کا بھی یہ اچھا ذریعہ ہے۔ لیکن اس میں ترشک کا تیزاب Oxalic Asid بھی پایا جاتا ہے۔ جو جسم میں فولاد اور کیلشیم کے جذب ہونے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

جاپان میں ہرے پتوں والی سبزیاں ہمیشہ سے خوب کھائی جاتی ہیں اور وہاں مغربی ملکوں کی نسبت چھاتی کے سرطان کا مرض ہمیشہ کم رہا ہے۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

فرحت واحد علی ______ لطیف آباد
س۔ تم پاس کھڑے دیکھا ہی کیے اور ڈوبنے والا ڈوب گیا
ساحل کو تم دریا سمجھے تم لذت طوفاں کیا جانو
ج۔ تم تلاطم کی بات کرتے ہو
لوگ ساحل پہ ڈوب جاتے ہیں

نگہت واحد علی ______ لطیف آباد
س۔ عمر اور وقت میں کیا قدرِ مشترک ہے؟۔
ج۔ دونوں گزر جاتے ہیں۔

نشی ______ کراچی
س۔ اگر آپ چڑا ہوتے تو اپنی ساتھی چڑیا کو کیسے پہچانتے کیونکہ سب چڑیاں تو ایک جیسی ہوتی ہیں؟۔
ج۔ چڑیا خود مجھے پہچان لیتی۔

حسینہ نقوی ______ فیصل آباد
س۔ نین بھیا! مجھے دو سخت بیماریاں لگ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جب آنکھیں بند کرتی ہوں تو نظر نہیں آتا۔ جب پیٹ بھر کر کھاتی ہوں تو بھوک نہیں لگتی۔ پلیز بتلائیے میں کیا کروں؟
ج۔ پیٹ بھر کر کھانا چھوڑ دو اور آنکھیں بند کرکے سونا۔

یاسین کنول ______ شکارپور
س۔ جو خواتین کم بولتی ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے نین جی؟۔
ج۔ مجھے تو ان کے خواتین ہونے پہ شبہ ہونے لگے گا۔
س۔ خواب حقیقت بن سکتے ہیں؟
ج۔ خوابوں میں۔

مسرت جبیں قادری ______ جلال پور پیر والا
س۔ گھر کے مہمانوں اور سپنوں کے مہمانوں میں کیا فرق ہے؟۔
ج۔ گھر کے مہمان کبھی کبھی زحمت بن جاتے ہیں۔
س۔ لاہور کا چڑیا گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک پنجرہ خالی تھا۔ کیا آپ اس خلا کو پر کر سکتے ہیں؟
ج۔ تم کیوں واپس آ گئیں۔

نسیم جہاں زمرد ______ راولپنڈی
س۔ اگر آپ کے سینے میں سونے کا دل ہوتا تو پھر آپ کون سا کاروبار کرتے؟
ج۔ کاروبار کرنے کے لیے زندہ کہاں رہتے۔ لوگ سینہ چیر کر دل ہی نکال چکے ہوتے۔

نورین عزیز ______ شکارپور
س۔ دشمن ہی سمجھتے ہیں غم دوست تجھے ہم
دشمن تو کبھی دل میں بسائے نہیں جاتے
ج۔ دل ہوتا نہیں غیروں کے ہاتھوں پاش پاش
دوستوں پر دوست یہ کرتے ہیں احسان دیکھیے

شاہجہان عثمان مرزا ______ کراچی
س۔ کبھی تم ہم سے خفا کبھی ہم تم سے خفا
کیا یہی ہے دوستی کیا یہی ہے زندگی
ج۔ آج کل میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔

افشاں پروین ______ کراچی
س۔ گزشتہ دنوں اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے اعلان ہوا تھا کہ ذوالقرنین نامی کسی شخص کی عقل گم ہو گئی ہے۔ بائی دا وے وہ تم تو نہیں؟
ج۔ نام میں غلطی ہو گئی۔ میں نے تو افشاں پروین سنا تھا۔
س۔ خبردار! خواتین کی محفل میں سر جھکا کر بیٹھا کرو؟
ج۔ نہیں بیٹھتا۔ کر لو جو کرنا ہے۔

جمیلہ اختر ______ کوئٹہ
س۔ اگر حسن والوں پر ٹیکس لگا دیا جائے تو حسن کا کیا بنے گا؟
ج۔ بے چارہ ٹیکس ادا کرتے کرتے ہی خرچ ہو جائے گا۔

قمر سلطانہ ______ کراچی
س۔ اے نین بھیا! جب کوئی روتا ہے تو اپنا چہرا کیوں چھپا لیتا ہے؟۔
ج۔ تاکہ لوگ ڈر نہ جائیں۔

شگفتہ نورین شگفی ______ سمہ سٹہ
س۔ دیکھنے والے میری مسکراہٹ پر نہ جا
یہ تو ایک پردہ ہے درد و غم چھپانے کے لیے
ج۔ شدتِ غم کو تبسم میں چھپانے والے
دل کا ہر راز نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

سیدہ نگہت نقوی ______ بہاول پور
س۔ نینو جی! سچ سچ بتاؤ اتنے ڈھیر سارے خطوط کا مقابلہ اکیلے کیسے کر لیتے ہو جبکہ دیکھنے میں تو دبلے سے لگتے ہو، باریک سے۔
ج۔ یہ نہیں ہو تاکہ حوصلے کی داد دو۔

جمیلہ رحمٰن ______ بہاول نگر
س۔ ذوالقرنین صاحب ذرا جلدی سے بتائیے کہ انسان اور بندر میں کیا فرق ہے؟
ج۔ جو مجھ میں اور تم میں ہے۔

سعیدہ گل ______ فیصل آباد
س۔ تین وہ سوال چپکے سے میرے کان میں بتادو جس پر انعام دینا ہے تاکہ ہم بھول جائیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں۔ ہاں میں بہت بری ہوں۔
ج۔ تم بھی کان کھول کر سن لو ہاں میں بہت برا ہوں!
س۔ نین بھیا!
اک پردیسی میرا دل لے گیا
جاتے جاتے میٹھا میٹھا غم دے گیا
ج۔ دل دیا تھا نذرانہ سمجھ کر
کمبخت کھا گیا خربوزہ سمجھ کر

شیریں نذیر ______ راولپنڈی
س۔ نین بھیا! کیا تاج محل واقعی محبت کی نشانی ہے؟۔
ج۔ ہوتی ہوگی کبھی۔

اسماء صدیقی ______ گوجرانوالہ
س۔ بھیا جی! سچائی کے راستے پر چلنے والوں کو پھول زیادہ ملتے ہیں یا کانٹے؟۔
ج۔ اگر پھول ملیں تو سب ہی نہ چل پڑیں اس راستے پر۔

شفقت سلطان ______ منچن آباد
دل میں کر جائے اگر گھر کوئی
نقش مٹتا نہیں مٹانے سے
ج۔ تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم
تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

شازیہ نسرین ______ سبی
س۔ دل اداس ہو تو کیا کرنا چاہیے؟۔
ج۔ کیسٹ لگا کر سنجیدہ قسم کے گانے سنیں۔
س۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔
ج۔ مایوسی ہوگی۔

عشرت ناز ______ کراچی
س۔ بھیا! آرزو کب سوہانِ روح بنتی ہے؟۔
ج۔ جب پوری نہیں ہوتی ہے۔

شاہدہ رحمٰن فضل ______ بہاول نگر
س۔ ذوالقرنین بھیا! اللہ دیکھ رہا ہے؟۔
ج۔ تمہیں اب پتا چلا ہے۔
س۔ بھیا جی! ادھیڑ عمر خواتین آپ کا کالم "جلے پہ دہلا" شوق سے کیوں پڑھتی ہیں۔ جواب ہضم نہیں کرنا جی۔
ج۔ بیتے دنوں کو یاد کرنے کے لیے۔

نامے میرے نام

عائشہ خان۔۔ ٹنڈو محمد خان

اپریل کا کرن 13 تاریخ کو مل گیا' مگر بوجہ مصروفیت پڑھنا دیر سے شروع کیا۔
سب سے پہلے سحرش بانو کا "ساتھ دل کے چلے" پڑھا بہت زبردست ناول ہے۔ بے شک انسان سے کتنی بھی بڑی غلطی ہوجائے رب کی ذات اسے معاف کردیتی ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان کے گناہوں سے زیادہ رب کی رحمتیں ہیں۔
مستقل سلسلوں میں سیدہ بنت زہرہ چھائی رہیں۔ گڈ۔
مسکراتی کرنیں میں "گارنٹی" سیدہ بنت زہرہ۔ "معذرت عائشہ" بشریٰ اور "نصیحت" روبینہ سرفراز پسند آئے۔
ذوقی بھیا کے نہلے پہ دہلا میں زبیدہ رانی کا سوال۔ اور بھیا کا جواب پسند آیا۔
"مقابل ہے آئینہ" میں ظل ہما کے جواب پسند آئے خاص طور پر سوال کمزوری اور طاقت؟ پر جواب شاندار لگا۔
شیخ بن بھائی کا انٹرویو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں' مگر پھر بھی اچھا لگا شہزاد کی صاف گو باتیں اچھی لگیں۔
"کرن کا دستر خوان" میں رنگین سلاد کی ترکیب پسند آئی۔ تفصیلی تبصرہ نہ کرنے پر معذرت چاہتی ہوں' باقی کا کرن ابھی زیر مطالعہ ہے۔

سونیا مبین۔۔ موہڑہ دھمیال

آج ہی صبح کرن کی شکل نظر آئی' میرا خیال تھا کہ میں نے دیر کردی ہے۔ مگر اپنا نام دیکھ کر احساس ہوا کہ دیر نہیں ہوئی تھی' مگر افسوس کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی میرا وہی گلہ کہ جواب میں دو' چار لفظ ہی کہہ دیں بھئی شادی کی مبارک باد ہی دے دیتیں۔
خیر شکوے اور شکایت بھی تو اپنوں سے ہوتے ہیں۔ اب بات ہوجائے کرن پہ۔ میں افسانے پڑھ چکی ہوں' سوان پہ بات کرتی ہوں۔ ردا ایم سرور کا افسانہ بس ٹھیک تھا۔ حنا یاسمین کا "دل لگی" سچ مچ دل کو لگا۔ ندا جیسی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو عقل استعمال نہیں کرتیں اور اپنے گھر خراب کرلیتی ہیں اور ہمایوں جیسے مرد ہر طرف پائے جاتے ہیں' مگر چلو بیٹی کی وجہ سے ہی سہی ندا کو عقل تو آئی "راہیں کھلتی ہیں" بس ٹھیک ہی تھا۔

ج ۔ آپ کو شادی کی بہت مبارک ہو۔ دعا ہے زندگی کے اس نئے سفر میں آپ کو ڈھیروں خوشیاں ملیں۔ (آمین)

سمیرا تعبیر۔۔ سرگودھا

اس مرتبہ کرن خلاف معمول 12 کو مل گیا تھا۔
ٹائٹل گرل ایک آنکھ نہ بھائی' کافی عرصے کے بعد دردل پر دستک دی صرف زری کو پڑھنے کے لیے' لیکن زری کو تو نبیلہ جی نے مکھن میں سے بال کی طرح نکال پھینکا ہے دل آور کی ہسٹری پڑھ کر پہلی بار اس پر ترس آیا۔
آخر جودت اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو ہی گیا' میں نے اس منحوس کی گردن مروڑ دینی ہے اگر اس نے مریم کے ساتھ کچھ کیا تو۔۔۔! ویسے آپ کو بڑی حویلی کچھ زیادہ ہی نہیں پسند آگئی ہر دوسرے تیسرے بندے کو آپ ان کے نرغے میں دے دیتی ہیں زہر لگتی ہے مجھے یہ بڑی حویلی' بہرحال بور ہوگیا ہے آپ کا ناول جلدی سے اس کا اینڈ کریں۔ "دست کوزہ گر" پڑھا زبردست ویلڈن فوزیہ یاسمین مزا آگیا اتنا پیارا ناول لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کریں شروع سے لے کر اینڈ تک آپ کی تحریر نے جکڑے رکھا آخر میں سب کی نوک جھوک مزا دے گئی' لیکن پلیز اب غائب مت ہویئے گا۔
مکمل ناولز میں میرے "ادھورے چاند" شازیہ جمال نیر بہت خوب آپ کی تحریر بھی بہت اچھی تھی ویسے بھی آپ اچھا لکھتی ہیں' ماہ رخ کا کردار پسند آیا "ساتھ دل کے چلے" سحرش بانو آپ کی کہانی تو اچھی تھی' لیکن خوامخواہ کی طوالت لیے ہوئے تھی لفظ "غلطی" تو تقریباً" ہزاروں بار استعمال کیا گیا تھا ہیروئن صاحبہ کے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے تھے "دل کا آسمان" عنبرین صاحبہ یہ آپ کی ہیروئن نے اتنی اکڑ کیوں دکھائی پتا نہیں کیا سمجھ رہی تھی خود کو "چلو بھئی اینڈ تو اچھا ہوا" اچھا تھا آپ کا انداز تحریر بھی سمیرا گل آپ کی "سچی گواہی" تو میرے سر کے اوپر سے گزر گئی معذرت ردا ایم سرور آپ نے بھی سو سو لکھا۔
"مستقل سلسلے سارے ہی اچھے ہوتے ہیں "نامے میرے نام" میں امبر گل کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ "یادوں کے دریچے سے" انیقہ انا اور حرا قریشی کا انتخاب اچھا لگا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" سب کے اشعار اچھے لگے۔ "کرن کرن خوشبو میں" بشریٰ مزمل' انیقہ انا اور فوزیہ ثمروٹ کی کرنیں پسند آئیں "مقابل ہے آئینہ میں" ظل ہما سے ملاقات اچھی رہی۔
کس کس کی تعریف کروں کرن سارا ہی اچھا تھا۔
میرا خط ضرور شامل کیجیے گا ورنہ۔۔۔! میں نے آم رس گولیاں کھا کر خودکشی کرلینی ہے۔۔۔ ہاہاہا۔

شمع مسکان۔۔۔ جام پور

شمع مسکان کی طرف سے "حریم بہاراں" کا دلکش خوشبو میں بسا سلام قبول ہو
موسم نے انگڑائی لی' بہار کا دلکش موسم بھی قلب و روح پر چھائی اداسی کی کثافت کو دور کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ وہی بے زاری مصروفیت کے ساتھ ساتھ بوریت نے بھی چولی دامن کا ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہوا ہے۔ ایسے میں 13 تاریخ کو "کرن" کی آمد نے میرے من کو روشن کردیا۔ چار سو چاندنی ہی چاندنی۔۔۔! سب سے پہلے "حمد و نعت" سے روح و قلب کو منور کیا۔ فہرست پر نظر ڈال کر "اداریہ" پڑھا۔
"دست کوزہ گر" کی لاسٹ ایپی سوڈ سب سے پہلے پڑھی۔ بہت زبردست' ایکسی لینٹ اینڈ کیا۔ اسپیشل ہوٹل کے واقعات اور ستمبل کے ساتھ ہونے والا واقعہ بے ساختہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا۔ عظمت خلیل جیسے انا پرست لوگ کبھی خوشیوں میں بھی کھل کر سانس نہیں لے سکتے۔ فوزیہ جی دعا ہے کہ "زور قلم اور زیادہ" آمین' اب جلد از جلد کوئی مکمل ناول لکھیں۔
"دردل" پڑھا۔ اف۔۔۔ دل آور کے انکشاف نے لہو رلا دیا۔ دکھ ہی دکھ اذیت ہی اذیت۔ وقار آفندی کا بھیانک چہرہ سامنے آیا۔ اچھائی کا نقاب اتر گیا۔ بہت برا ہوا زہرہ بتول شاہ کے ساتھ۔ علیزے تو اپنے ڈرائیور کے ساتھ ہی رہے گی۔ جودت یقیناً" مریم کو بغیر کسی نقصان کے چھوڑ دے گا۔ وقار آفندی کی حقیقت کھلنے کا اتنا اثر تو ہوگا ہی۔۔۔!!
"ساتھ دل کے" پہلی قسط میں تو دل چاہا کہ داؤد ابراہیم کو بیچ چوراہے پہ لا کر شوٹ کردوں۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ یقیناً" ماں کا ہی بدلہ رہا ہے' مگر یہ کیسا بدلہ کہ عشاء کی عزت اس کی زندگی سے ہی کھیل گیا۔ پر عشاء کو بھی محبت میں اتنا اندھا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپنی عزت عصمت و حرمت کا تو خیال ہونا چاہیے۔ دوسری ایپی سوڈ کے لیے کہوں گی کہ

ادب پہلا قرینہ ہے — محبت کے قرینوں میں

نایاب سعید۔۔ ڈیرہ غازی خان

اس ماہ کا کرن 15 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بس ٹھیک لگا۔ سب سے پہلے نبیلہ جی کا ناول "دردل" پڑھا۔ پڑھ کر ہمیشہ کی طرح زری پہ ترس آیا۔ پلیز نبیلہ جی زری اور دل آور شاہ کو ملا دیجیے اور علیزہ کو آذر کے ساتھ شادی کرلینی چاہیے۔ اس کے بعد آتے ہیں فوزیہ یاسمین کے ناول "دست کوزہ گر" کی آخری قسط بھی بہت پسند آئی۔ فرحانہ ناز ملک کا "شام آرزو" ناول کی پہلی قسط پڑھ کے ہی دل بور ہوگیا۔ دوسری قسط پڑھنے کا دل ہی نہیں چاہا۔ اس کے بعد سب مکمل ناول ناولٹ اور افسانے سب ہی اچھے تھے۔
پلیز میرا خط ضرور شائع کیجیے گا تاکہ اگلے ماہ اپنا خط دیکھ کر دل خوش ہوجائے۔

فوزیہ ثمروٹ۔۔ گجرات

اپریل کا شمارہ چودہ تاریخ کو مل گیا۔ خوشی دوبالا

ہوئی۔ ایک تو کرن جلدی ملنے کی اور دوسری میری دوست ثمرو نعیم کی سالگرہ ہوتی ہے۔ ہے نا خوشی کی بات۔ سرورق کچھ کچھ اچھا لگا۔ جیولری کچھ خاص نہ تھی۔ ماڈل ایئر رنگ نہ بھی پہنتی تب بھی اچھی لگ رہی تھیں حسب عادت حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول ؐ سے ذہن و دل کو سرشاد کیا۔ انٹرویوز میں "شہزاد شیخ" اور "مسول شیخ" سے ملاقات اچھی رہی۔ مثبت سوچ کی مالک "ظل ہما" سے مل کر اچھا لگا۔

مکمل دونوں ناول اس ماہ کے بہترین تحریریں تھیں۔ سحرش بانو اور شازیہ جمال نے بہترین موضوع پر لکھا۔ مکمل ناول "ساتھ دل کے چلے" دو اقساط میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ آپ کو بتا نہیں سکتی کہ مجھے یہ تحریر کتنی اچھی لگی۔

"میرے اچھے چاند" بہن اور بھائی کا بے مثال پیار آنکھیں بھگو گیا۔ تحریر کا نچوڑ ہی تھا کہ رشتے تعلق کو نام ملنا چاہیے ورنہ پھر ایسی ہی غلطی فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رشتوں میں تلخیاں بڑھ جاتی ہیں۔

"سچی گواہی" سمیرا گل کی تحریر یقین جانیں۔ مجھے بے حد اچھی لگی۔ کیا غضب کا ہیرو تھا۔ مزا آیا تحریر پڑھ کر۔ دشمنی میں یا تو معاف کر دو یا پھر اپنا بدلہ لے — جنگ کا اصول ہے۔ معاف کرنا ہر کسی کا شیوہ نہیں ہوتا۔ سمیرا گل کے کسی رومینٹک ناول کے منتظر ہیں ہم۔

"دل کا آسمان" عنبرین ولی کا ناولٹ فقطی فقطی تحریر رہی۔ کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ افسانے صرف "دل لگی" اچھا لگا۔ تعریف کسے نہیں اچھی لگتی، مگر عورت کا کسی نامحرم سے تعریف کروانا ٹھیک نہیں۔

مستقل سلسلے "کرن کرن خوشبو" کچھ خاص نہ تھے۔ شاعری میں نوشین اقبال کا شعر بے حد پسند آیا۔ "مسکراتی کرنیں" مجال ہے جو لبوں کو ہنسی چھو جائے۔ ہر مسکراہٹ کو مسکرا کر پڑھا شاید کہ کسی ایک پہ ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑے، لیکن ناکامی ہوئی۔

فرحی ارمان۔۔ گجرات

ماہ اپریل کا "کرن" خلاف توقع 14 کو ملا۔ ماڈل اچھی تھی، مگر پلیز دوپٹا اوڑھایا کریں۔ دیکھنے والے ٹائٹل سے ہی شمارے کے معیار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ سب سے پہلے "تمامے میرے نام" کے طرف چل پڑے ہاہ ہ! یہ کیا؟ نہ ہم نہ ہمارا لیٹر!!! لیکن کیا کیجیے؟

"مقابل ہے آئینہ" ظل ہما کے جوابات اچھے تھے۔ "شام آرزو" بہت اچھا ناول ہے، یہ تحریم جیسی بیٹیاں بھی ہوتی ہیں، عقیدت میرا فیورٹ کریکٹر ہے۔ "تنہائی ہے کچھ بات کر" شہزادی عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھا رہی تھی تو قائم رہتی۔ اچھا نہیں لگا۔ "ساتھ دل کے چلے" زبردست اینڈ، لیکن عام زندگی میں اتنے اتفاقات ناقابل یقین سی بات لگتی ہے۔ "راہیں کھلتی ہیں" اچھا اور جامع افسانہ تھا۔

آخر کار "در دل" میں حقیقت کھل ہی گئی۔ علیزے مر جائے گی وہ پاگل ہو جائے گی اور زری کو کیوں اب پھر درمیان میں لا رہی ہیں نبیلہ جی؟ "دل لگی" میں ندا کو میرے خیال میں دوبارہ موقع نہیں ملنا چاہیے تھا۔ "دست کوزہ گر" فوزیہ جی پتا نہیں کیوں لمبی لمبی سی لگی۔ سنبل کو بھی اگنور کر دیا اور گھر والے بھی غائب رہے۔ "میرے اچھے چاند" سارے شمارے میں فرسٹ پوزیشن پر۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" عائشہ اور فوزیہ کے اشعار پسند آئے۔

سندس افتخار خان، شازیہ افتخار خان۔۔ لاہور

ہم کئی سالوں سے کرن کے خاموش قاری ہیں۔ آج کئی سالوں بعد "در دل" اور "دست کوزہ گر" کی رائٹرز نے ہمیں قلم اٹھانے پہ مجبور کر دیا۔ "دست کوزہ گر" کا اختتام انتہائی بھرپور طریقے سے ہوا ہے ویلڈن فوزیہ یاسمین، نبیلہ عزیز جی کرن کے تمام قارئین جو مرضی کہیں مگر مجھے تو زری اور دل آور شاہ ہی ایک ساتھ اچھے لگتے ہیں۔ پلیز! جو مرضی کریں مگر ان کو ملا دیں حالانکہ یہ ناممکن ہے۔ "شام آرزو" بھی اچھا لگا۔ ہمارا خط ضرور شائع کیجیے گا ہم نے پہلی بار کسی کو خط لکھا ہے۔ ان شاء اللہ میں آئندہ ماہ پھر حاضر ہوں گی اگر میرا خط شائع ہو گیا تو۔

ج۔ آپ کی تحریر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔